(ڈاکٹر اُدے سرن ارمان بلاری)

چپّل کی شرارت

"وحید برسات میں چپّل پہن کر باہر مت جایا کرو" ماں نے وحید کو سکول جاتے ہوئے سمجھایا۔

"کیوں؟" وحید نے بستہ کاندھے پر سنبھالتے ہوئے ماں سے پوچھا

"بیٹا راستے کی کیچڑ چپّلوں سے اُچھل اُچھل کر کپڑے خراب کر دیتی ہے"

"تمہاری تو یہی باتیں رہتی ہیں ماں۔ دُنیا چپّل پہن کر باہر نکلتی ہے"۔ وحید یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل کر باہر کھڑے ہم سکول بچوں کے ساتھ سکول چلا گیا لیکن جب وہ سکول سے واپس آیا اور بستہ رکھ کر کپڑے بدلنے لگا تو ماں نے کہا "کپڑے بدلنے سے پیشتر میرے پاس آؤ"۔

"ابھی آیا اماں جی" اُچھلتا ہوا وحید ماں کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کیا بات ہے ماں۔

"تم پائجامہ بدل کر آؤ"۔

"ابھی لیجئے"۔ وحید نے کمر بند کھولنا شروع کر دیا لیکن بارش کے باعث بھیگ جانے کی وجہ سے اسکی گرہ اس کے نرم نازک پوروں سے کھل نہیں پا رہی تھی ماں اس کی پریشانی کو تاڑ گئی اور اس نے وحید کے ازاربند کی اُلجھی ہوئی گانٹھ کھول دی تو وحید نے پائجامہ اتارا تو اس کا پچھلا حصہ دکھاتے ہوئے وحید سے کہا۔ برسات میں چپل پہن کر باہر اس لئے نہیں جاتے ہیں۔ ہو گیا نہ تمہارا پائجامہ گندہ" وحید پائجامہ پر مٹی کی بے شمار چھینٹیں دیکھ کر جھینپ گیا اور اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے کہنے لگا "اماں جی آپ ٹھیک کہتی ہیں میں اب کبھی چپل پہن کر باہر نہیں جاؤں گا لیکن ماں ایک بات بتاؤ بہت سارے بچے سکول میں ایسے آتے ہیں جو چپّل پہنے ہوتے ہیں کیا ان کے ماں باپ اُنھیں تمہاری طرح نہیں سمجھاتے۔"

"ہو سکتا ہے وہ غریب ہوں ان کے پاس اور جوتے نہ ہوں یا پھر وہ بچے تمہاری طرح اپنی ماؤں کا کہنا نہیں مانتے ہوں گے۔"

یہ سُن کر وحید کو پھر شرم سی محسوس ہوئی کیونکہ یہ بات بھی اس کے گال پر ایک طمانچہ ہی تو تھا۔ وحید شرما گیا اور ماں اس کے بھولے پن پر ہنس رہی تھی اور من ہی من میں خوش ہو رہی تھی کچھ ہی لمحوں کے بعد وحید گھر سے باہر آیا اور بولا۔ اماں جی ایک بات تو بتاؤ

سانپ آدمی کو کاٹ لیتا ہے تو آدمی مر جاتا ہے مگر سانپ خود کیوں نہیں مرتا جب کہ وہی زہر ہر وقت اس کے منہ میں بھرا رہتا ہے"

"بیٹا اگر ایک سانپ دوسرے سانپ کو ڈس لے ...."

ابھی وحید کی ماں بات پوری بھی نہ کرنے پائی تھی کہ پڑوسی رام چندر کے گھر سے غصے بھری آواز سُنائی دی۔

"نصرت کی یہ ہمّت کیسے ہوئی کہ اس نے میری بہن کے پانی سے بھرے مٹکے میں پیچھے سے کنکر مارا۔" اس کے بعد دوسرے بھائی نے کہا "ہم تو پانچ بھائی ہیں اور وہ کُل دو ہی ہیں چلو اس کی ہڈّی پسلی توڑ دیں۔ ہندوؤں کے گاؤں میں ایک مسلمان کی یہ ہمّت" اس پر تیسرے بھائی نے گنّے کاٹنے والی گنڈاسی کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا چلو آج اسے اس چھیڑ خوانی کا مزہ چکھا دیں۔"

"دونوں بھائی باہر ہیں اُنھیں آجانے دو جب چلیں گے پھر پتا جی بھی تو یہاں نہیں ہیں۔ ذرا اور ٹھہر جاؤ۔ ایک بھائی نے کہا۔

"کیا ہم تینوں کائر ہیں جو ان کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتے نصرت تو کُل دو ہی بھائی ہیں اور ہم تین ہیں اس سے اب بھی زیادہ ہیں پھر ڈر کس بات کا۔ اگر بہن کے ساتھ اس سے بھی بڑی گھٹنا ہو جاتی تب بھی کیا ہم ان کا انتظار کرتے۔ دوسرے نے جواب دیا۔ ان الفاظ نے تینوں کے گال پر طمانچے کا کام کیا اور تینوں گھر سے باہر نکل پڑے۔

"آج خیریت نہیں ہے نصرت نے بُرا کیا ہے لیکن آپ اس مصیبت کو ٹالنے کی کوشش کیجیے گا ورنہ غضب ہو جائے گا، وحید کی ماں نے اپنے شوہر حمید سے کہا۔ حمید نے فوراً موقع کی نزاکت کو پہچان لیا اور باہر نکل گئے اِدھر اُدھر دیکھا وہ تینوں گلی میں کچھ کانا پھوسی کر رہے تھے" ارے بیٹے رادھے کیا چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کچھ میرے لائق خدمت ہو تو بتاؤ۔"

"تاؤ جی سلام" تینوں نے سلام کیا۔

"جیتے رہو بیٹو بڑی عمر ہو کوئی خاص بات ہے کیا" کہتے کہتے حمید ان کے پاس پہنچ گئے تینوں کے ہاتھ میں ہتھیار تھے۔ حمید نے سمجھ لیا کہ سچ مچ آج خیر نہیں ہے انھوں نے بڑی سنجیدگی اور سمجھداری سے کام

لیا اور ہتھیاروں کی طرف نظروں سے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے۔ کیا آج کسی دشمن پر چڑھائی کا ارادہ ہے۔ جواب دیتے ہوئے ایک بھائی بولا "تاؤ جی نصرت نے ہماری بہن کے پانی سے بھرے مٹکے میں پیچھے سے کنکر مارا ہے ہم اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"بالکل ایسا ہی ہونا چاہئے اس بدتمیزی کا جواب یہی ہے جو تم دینے جارہے ہو بستی کی لڑکی چاہے کسی بھی قوم کی ہو سارے بستی والوں کی بیٹی ہوتی ہے اس کمینے کو اس کی سزا ملنی ہی چاہئے۔ تاکہ کسی دوسرے کو آئندہ اس قسم کی حرکت کرنے کی ہمت نہ ہوسکے۔"

"مگر اگر میری ایک صلاح ہو تو عرض کروں۔"

تینوں بھائی بیک زبان ہو کر کہنے لگے تاؤ جی۔ آپ حکم کریں ہم آپ کا کہنا کیسے ٹال سکتے ہیں۔ ہمارے محلے میں آپ ہی ایک ایسے بڑے ہیں جس کا کہنا ٹالا نہیں جاسکتا ہے۔ بڑے بھائی نے کہا۔

"اگر تم نے اس نالائق کا قتل کر دیا تو پولیس تم تینوں کو گرفتار کرے گی۔ سارے گھر پر مصیبت آجائے گی وہ تو جان سے جائے گا ہی مگر تم کو عذاب میں ڈال جائے گا اُلٹے مجرم بننے سے کیا فائدہ اس کو سزا ملے اور تم بالکل بے داغ رہو تو کیا رہے یعنی سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میں اس کو چار آدمیوں کے سامنے بلاتا ہوں اور بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کیجائے گی گاؤں کے اچھے اچھے معزز اور سمجھدار لوگ وہاں موجود ہوں گے جو وہ فیصلہ دیں گے وہی کیا جائے گا۔ ٹھیک ہے نا، حمید نے پیار سے سمجھاتے ہوئے تینوں بھائیوں سے کہا۔

"ٹھیک ہے تاؤ جی" اور گرمی کی دوپہر میں مرجھائے سبزے کی طرح تینوں سر خم کئے گھر کو چلے گئے۔ حمید نے بستی کے معززین کو بُلایا اور نصرت کو بھی بُلایا گیا۔ سب کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا جس نے بھی سنا نصرت کو تھو تھو کرتے ہوئے بُرا بھلا کہنے لگا۔ نصرت جو ایک ملزم کی طرح ایک طرف کھڑا تھا جھنجھلا کر بولا۔

"تم لوگوں نے مل کر یہ کس خطا کی سزا دے کر مجھ سے بدلہ لینے کی ٹھانی ہے۔ ایک لڑکی کی غلط بات کو صحیح مان لیا اور مجھے غلط ٹھہرایا جا رہا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے۔"

"کیا تم نے اس کے مٹکے پر کنکری نہیں پھینکی"؟ حمید نے پوچھا۔

"بالکل نہیں"، نصرت نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"کوئی مجرم اپنے جرم کا اقبال تھوڑے ہی کرتا ہے"۔ لچھمی کے باپ رام چندر نے خفگی کے لہجے میں کہا۔

"بالکل صحیح ہے ہر آدمی اپنے عیب کو چھپانے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا" حاجی غفار حسین نے کہا۔

"میں قرآن شریف کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس لڑکی کے مٹکے کو کنکر نہیں مارا تھا میں تو صرف اپنے دروازے پر کھڑا تھا اور اس کی دونوں لمبی لمبی چوٹیوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ ہندوستان کی عورتیں ان چوٹیوں کو بنانے میں گھنٹوں صرف بیکار کر دیتی ہیں اگر سبھی عورتیں اندرا گاندھی کی طرح باب کٹ بال رکھنے لگیں تو لاکھوں لوگوں کے تن ڈھک سکتے ہیں۔ اسی دوران لچھمی نے میری طرف دیکھا تو مجھے اچانک اپنے اس خیال پر ہنسی آگئی اور یہ آگے بڑھ گئی بس مجھے کیا پتہ تھا کہ قوم کی بھلائی کے لئے سوچنا یہ مصیبت نازل کر دے گا" یہ بات سن کر مسلمانوں کی بیٹھک کچھ بھاری ہوئی اور ریک طرفہ شرارت کا پہلو اُبھرنا شروع ہوا۔ حمید نے لچھمی سے پوچھا بیٹی تم کو یہ کیسے یقین ہے کہ کنکر نصرت نے ہی مارا تھا۔"

"تاؤ جی اس وقت یہی باہر کھڑا تھا اور کنویں کے آس پاس دُور تک کوئی چڑیا بھی نہیں تھی۔ کنکر پیچھے سے لگا تھا اور یہ مسکرا رہا تھا۔ ایسی حالت میں آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حرکت نصرت کی ہی ہوسکتی ہے یا نہیں۔ رہا قسم کھانے کا معاملہ تو قسم کھائی ہی اسی لئے جاتی ہے کہ دوسرے دھوکے میں آجائیں۔ لچھمی نڈرتا سے یہ کہہ کر اور نظریں جھکا کر چپ ہوگئی۔ کچھ دیر سب لوگ ایسے چپ بیٹھے رہے جیسے کسی کی ماتم پرسی میں آئے ہوں۔ سب اپنی اپنی جگہ مسئلے کے سلجھاؤ کی ترکیبیں سوچ رہے تھے مگر حمید کو یہ خاموشی اچھی نہیں لگی اور اس نے بڑی خود اعتمادی سے کہا۔

"لچھمی بہن تم کنویں پر چپل پہن کر گئی تھی کہ جوتے"

"چپل"

"بہن ذرا ادھر تو آنا۔ لچھمی اپنے باپ سے اجازت لے کر حمید کے قریب آگئی۔ سب لوگوں نے سوچنا چھوڑ کر دونوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ دیکھو! آپ جی لچھمی بہن چپل پہن کر پانی بھرنے گئی تھی چپلوں نے اتنی گندگی اچھالی ہے کہ اس کی ساڑھی کمر تک خراب ہوگئی ہے ہوسکتا ہے کہ کیچڑ سے لپٹا کنکر کا کوئی ٹکڑا اس کی چپل کے ساتھ

(بقیہ ص ۳۲ پر)

DANISH ALIGARHI

IMTIYAZ JAIPURI (AHMEDABAD)

CHETRAM "REHBER"

ایم۔ یوسف ثانی - پالی (مارواڑ)

FAHEEM RAJA

"RAZA" KHANDWI

"NOOR" SHAHJAHANPURI

DILAWAR KHAN "SAHIL"

ABURAM MAJOTRA SAFA

SHABAB DAWAR

'AMEER" ROORKEE

S. MALIKNIZAM-MAHEDVI

AKHTAR SHAHJAHANPURI

AMEEN BEODVI

SYED ASHIQ Chindwara

HAROON ALI "PALI"

AYAZ QAMAR BHOPAL

HANIF SOJATI

MUKHLIS "PUSAD"

QUMAR-UD-DIN "BARTAR"
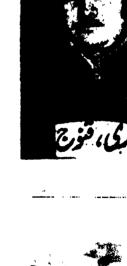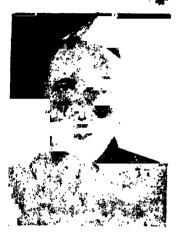
KIM SHABBEER "KANPURI"
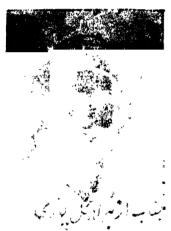
SHAFIQ AHMAD SIDDIQI

QAZI TANVEER

GUL KHALIQI

HAKIM RAIS SAMBHALI

اولنائے علام خاتم العروض حضرت سحر عشق آبادی

DINKAR HYDERABADI

[illegible]

NIKHAT KHAN

PRAKASH NARAIN SAXENA "Ja

HILAL BHARTI

QAMAR

FAIYAZ-GWALIORI

SHAH KUKAB-UL-QADRI

Dr. UDAI SARAN "ARMAN"

آپ ہیں جناب ڈاکٹر اُدے سرن صاحب ارمان جو قصبہ بلاری ضلع مرادآباد (یو پی) میں اپنے آبائی پیشہ زمینداری کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کے نیک جذبہ کے تحت بھولے بھالے دیہاتیوں کی طبی خدمات انجام دیکر انہیں بیماریوں سے نجات دلاتے ہیں۔ آپ ایک اچھے شاعر بھی ہیں حضرت ادیب لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ادیب صاحب کے یہ شاگرد بھی رہے ہیں اس لئے ان کے ذہن پر ادیب صاحب کی گہری چھاپ ہے۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ارمان صاحب نے اپنے استاد محترم کے نقش قدم پر چلنے کی دل وجان سے کوشش کی ہے۔ اس وقت ان کے چار شعری مجموعے رازونیاز۔ ساز و آواز۔ ارمان دل اور آئینہ نیز دو ناول "آشیرواد" اور "مسلمان کا مندر" شائع ہو چکے ہیں۔ بارہ ناول اشاعت کے لئے تیار ہیں۔ جن میں دو ناول بچوں کی بہبودی کے لئے ہیں۔ نظموں کے تین مجموعے بھی تیار ہیں۔ ڈاکٹر ارمان ۷۰ سال کے ہیں مگر ایک جوان رعنا کی طرح دن رات مریضوں کی خدمت کرنے میں چاق و چوبند ہیں۔ کمیونزم خیالات کے حامی ہیں۔

ماہنامہ شان ہند کے لئے اس سال ایک ہزار نئے خریدار بنائے جانے کے پروگرام کے سلسلے میں آپ نے ایک صد نئے خریدار بنانے کا وعدہ فرمایا ہے اور اپنے وعدے کی تکمیل کے سلسلے میں ارمان صاحب نے باون (۵۲) نئے خریداروں کا زر سالانہ بذریعہ بینک ڈرافٹ بھیج کر ماہنامہ شان ہند کی ٹھوس خدمت کی ہے۔ ڈاکٹر ارمان کے اس ٹھوس ادبی کارنامے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں اُردو سے کس قدر لگاؤ ہے۔

آئیے اب ان کے کچھ قطعات ملاحظہ فرمائیے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

جو لوگ کہ دیوانۂ ایمان و یقین ہیں — جو لوگ کہ تہذیب گرفتہ کے امیں ہیں
جن کو کہ ابھی تک ہے حقیقت سے محبت — وہ آج کی تہذیب کے قابل ہی نہیں ہیں

حکمرانوں کو بھی معمول رہنا چاہئے — دل رفاہ عام میں مشغول رہنا چاہئے
کرتی ہے برباد عالم کو برائے انتقام — حاکمان وقت کو معقول رہنا چاہئے

ڈاکٹر ارمان سے ایک مرتبہ ملئے پھر آپ انہیں بھول نہیں سکتے۔ چہرہ ہر وقت مسکراہٹ لئے ہوئے۔ کمیونزم خیالات رکھنے کے باوجود خدا کے وجود کے قائل ہی نہیں بلکہ یہ یقین کامل رکھتے ہیں کہ اس کی مرضی کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا۔ حال ہی میں ایڈیٹر شان ہند کی درخواست پر ڈاکٹر ارمان نے ایک یادگاری ادبی کارنامے کی بسم اللہ کی ہے جب یہ ادبی کارنامہ منصۂ شہود پہ جلوہ گر ہوگا تو اُردو اور ہندی دونوں زبانیں ان کی مرہون منت ہوں گی۔

حضرت فیاض گوالیاری

یومِ جمہوریت زندہ باد

چھبیس جنوری مری چھبیس جنوری!
اُتری تری فضاؤں میں جمہور کی پری!
انسانیت کی جس سے ہے کھیتی ہری بھری
بھارت کو جس کے دم سے میسر ہے برتری!

جمہوریت عظیم ترین شانِ ہند ہے!
جمہور کا نظام ہی ایمانِ ہند ہے!
شان اپنی آج یہ ہے یہ احسانِ ہند ہے!
جو جان دے وطن پہ وہ ہی جانِ ہند ہے!
اپنی جگہ عظیم ہر انسانِ ہند ہے!
تنویرِ طورِ شمعِ فروزانِ ہند ہے!

رہ پائے گی نہ آمریت بے لگام اب!
فاضل ججوں کا کام کریں گے عوام اب!
مل کر قدم بڑھائیں گے سب خاص و عام اب!
زردوں کے رام کرنے کو ہم سب ہیں رام اب!
لے گا نہ کوئی پھوٹ کا لالچ کا نام اب!
جن کو چنا ہے عقل سے لیں گے وہ کام اب!
جمہوریت کا کیوں نہ کریں احترام اب!
جس نے دیا ہے چھین کبھی سکتا ہے جام اب!
اونچا اٹھائیں گے بھارت کا نام اب!
اس نام کو کرے گا نہ مانہ سلام اب!!

پندرہ اگست کیسے کرے تیری ہمسری؟
آکاش کی فضاؤں سے اُتری ہوئی پری!
چھبیس جنوری مری چھبیس جنوری!
چھبیس جنوری مری چھبیس جنوری!

وید پرکاش سرکر ایڈیٹر پرنٹر پبلیشر نے لیتھو کرومنیات خواجہ پریس، چھتہ شیخ منگلو جامع مسجد دہلی اور سہ رنگا پائیلٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شان ہند فلیٹ نمبر ۵ انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بچّے نہیں اِتّفاق سے بلکہ اپنی مرضی سے

غیر متوقع حمل آپ کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا سکتا ہے۔
لوگ اکثر اس کا شکار ہوتے ہیں۔ آپ ایسی غلطی ہرگز نہ کریں۔

یاد رکھیں علاج سے احتیاط بہتر ہے۔ حالات کو اِتّفاق پر نہ چھوڑیں۔

نِرودھ استعمال کریں مردوں کے لئے آسان اور سادہ طریقہ
آپ کے قریبی کیمسٹ یا نزدیکی فیملی ویلفیئر سنٹر سے مِل سکتا ہے۔

نِرودھ

ایک لازمی
احتیاط

پُر مسرت زندگی کے متلاشی شوہر اور بیوی
کے لئے ایک قابلِ اعتماد مانعِ حمل تدبیر

کے پڑھنے سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ حضرات جن کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے اور مظلومین جمشید پور یا علی گڑھ کے نام پر امدادی رقوم وصول کر کے سلامت علی مہدی نے شراب نوشی اور عیاشی پر یہ روپیہ اڑا دیا وہ لوگ قانونی چارہ جوئی سے کیوں گھبراتے ہیں۔ ہو سکتا ہو کہ یہ لوگ

(۱) عدالتی چکروں سے گھبراتے ہوں یا

(۲) مظلومین جمشید پور یا علی گڑھ کی نسبت سلامت علی مہدی کو ہی سب سے بڑا مظلوم سمجھ کر اس کی شراب نوشی اور عیاشی کو مقدم خیال کر کے خاموش رہنا پسند کرتے ہوں۔ مگر نہ تو اس کی اسلام ہی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی عام اخلاق ہی اس کے آڑے آتا ہے کہ اس قسم کے بدقماش جرنلسٹ (جسے جرنلسٹ کہنا بھی جرنلزم کی توہین ہے) کو قانون کے حوالے نہ کیا جائے۔ جن حضرات کے خطوط عوام میں شائع ہوئے ہیں اگر وہ واقعی مظلومین جمشید پور اور علی گڑھ کے خیر خواہ ہیں تو انھیں قانون کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہئے وہ مسلم ادارے اور جماعتیں جو مظلومین جمشید پور اور علی گڑھ کی امداد کی ضامن ہیں نہ معلوم وہ اس سلسلہ میں کیوں خاموش ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کا اپنا حساب کتاب بھی گڑبڑ ہو اور وہ اسی میں سلامتی سمجھتے ہوں کہ یہ معاملہ دبا ہی رہے۔ مگر کوئی بھی ایسا شخص جس نے اس مد میں روپیہ بھجوایا ہے وہ حساب فہمی کا قانونی مطالبہ کر سکتا ہے اور جس کسی سے بھی دھوکہ ہوا ہو اس کا معاملہ سرکار اپنے ہاتھ میں لے لیگی۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ایک بھی ایسا مسلمان نہیں جو مظلومین جمشید پور اور علی گڑھ کا دلی طور پر خیر خواہ ہو۔ ورنہ اب تک تو اس قسم کے بددیانت لوگ اپنے جرائم کی پاداش میں سرکاری مہمان خانے میں ہوتے۔

ہمیں افسوس ہے کہ اس دھرہ میں ہفت روزہ "نئی دنیا" کا بھی ذکر آیا ہے۔ اگر ہندوستانی مسلمان اور عوام بھڑکے نہ ہوں تو نئی دنیا نے مصیبت کے سلسلے میں ہندوستانی عوام اور مسلمانوں کا معقول رقم خرد برد کر لی تھی لہذا انھی دنیا سے بھی مظلومین جمشید پور اور علی گڑھ کے نام پر جمع کئے ہوئے روپیہ کے بارے میں حساب فہمی ہو جانی چاہئے۔ شاہی امام صاحب جامع مسجد کا فرض ہے کہ وہ اس سلسلے میں تحریک شروع کریں تاکہ مظلومین جمشید پور اور علی گڑھ کے نام پر لاکھوں روپیہ جو فراہم کیا گیا ہے اس کی حساب فہمی ہو سکے۔

ہندی کے مسلمان شعراء

قمر رتن پشاوری نے اپنی عمر کے پچاس سال اور زندگی بھر کی جمع پونجی صرف کر کے اس بیش بہا کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ کن کن مشکلات پر قابو پانے کے بعد یہ کتاب مکمل ہو سکی۔ اس کی تفصیل کتاب میں پڑھیے گا۔ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اس موضوع پر آج تک ایسی مکمل اور نادر و نگار کتاب شائع نہیں ہوئی۔ پچھلے چودہ سو سال میں ہندی کے جس قدر مسلمان شاعر ہوئے ہیں یا اب موجود ہیں ان کا مفصل تذکرہ اور کلام کا انتخاب پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مؤلف کا دیباچہ اپنے طور پر ہندی شاعری کی تاریخ ہے۔ ہندی زبان کی مختصر تاریخ۔ ہندی زبان کی خصوصیات۔ ہندی اور اردو۔ ہندی اور مسلمان عنوانات سے فاضل مؤلف نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہتوں کے لئے کئی پہلوؤں سے مفید اور ان کی معلومات میں اضافے کا موجب ہوگا۔ قریباً پونے چار صد ہندی کے مسلمان شعراء کا تذکرہ تفصیلی طور پر اور ان کے کلام کا انتخاب (اردو رسم الخط میں) آپ ملاحظہ فرمائیں گے تو داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

اس قابل قدر کتاب کی اشاعت پر دس ہزار روپیہ اخراجات کا تخمینہ ہے۔ جناب ڈاکٹر آدوسے سرن صاحب ارکان جناب سردار گورپال سنگھ واآمد اور مشہور فلمی گیت کار جناب راجندر کرشن صاحب نے ایڈیٹر شانِ ہند کی درخواست پر اکیس اکیس سو روپیہ اس کتاب کی اشاعت کیلئے مرحمت فرمایا ہے۔ بقیہ روپیہ بھی دو مزید مشہور شخصیتوں سے حاصل کرنے کیلئے ایڈیٹر شانِ ہند بہت جلد سلسلہ جنبانی کر رہا ہے۔ کتاب کی بہترین کتابت ہو رہی ہے امید ہے کہ پانچ صفحات (۲۲×۱۸ سائز) تک کتاب کی ضخامت ہو جائیگی۔ ماہ مارچ کے آخر تک قریباً دو صد صفحات پریس میں طباعت کے لئے بھجوا دیئے جائیں گے۔ اندازاً پچاس کے قریب تصاویر سے بھی کتاب مزین ہوگی۔ قیمت کا اعلان اور دیگر تفصیلات شانِ ہند کی آئندہ اشاعتوں میں ملاحظہ فرمایئے گا۔

●●●

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

سرور تونسوی

سنہ ۱۹۵۰ء کے شروع میں ایک سوامی جی سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہاں تشریف لائے اور انھوں نے حضرت اکبر پھپوندوی کا ایک خط سردار صاحب کے حوالے کیا جس میں اکبر صاحب نے لکھا تھا کہ رقعہ حامل سوامی پارس ناتھ جی ہندوستان کے صدر بننے کے حق دار ہیں۔ آپ دہلی میں رہتے ہیں ان کے لئے کوشش فرمایئے۔ تاکہ یہ صدر جمہوریہ ہند بن سکیں۔

گرمی کا موسم تھا سردار صاحب کے ہاں محفل کا آغاز آٹھ بجے شروع ہوتا تھا۔ حسب معمول پوری پارٹی اکٹھی ہوئی تو سردار صاحب نے سوامی پارس ناتھ کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ سوامی جی بہت بڑے شاعر ہیں جوانی میں انھوں نے ایک مشہور ہندو شاعرہ کو دیکھ کر اپنا دل ان پر فدا کر دیا اور آج تک اس انتظار میں ہیں کہ شاید اس شاعرہ تک ان کی رسائی ہو سکے جبکہ ان کی محبوبہ اس وقت پچاس سال کا پُر بہار عرصۂ حیات گزار چکی ہے۔ اور غالباً نصف درجن بچوں کی ماں بھی ہیں۔ سردار صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ سوامی جی کا خیال ہے کہ موجودہ صدر محترم ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب ہندوستان ایسے ملک کی صدارت کے اہل نہیں ہیں اگر سوامی جی صدر جمہوریہ ہند بن جائیں تو ملک کی کایا ہی پلٹ دیں۔ لہٰذا ہم سب کا فرض ہے کہ سوامی جی کو ہندوستان کا صدر بنائیں اس لئے حضرت جوش ملیح آبادی کی خدمات بھی حاصل کی جائیں گی تاکہ وہ پنڈت جواہر لال صاحب نہرو سے کہیں کہ ڈاکٹر راجندر بابو کو صدارت سے ہٹا کر سوامی جی کو صدر بنایا جائے۔ سردار صاحب اپنے آپ ہی قہقہے لگاتے ہوئے سلسلۂ تقریر جاری نہ رکھ سکے تو ہم سب نے تالیوں سے سوامی جی کا خیر مقدم کیا۔

ماسٹر امیر چند کھنہ فرمانے لگے کہ سب سے پہلے سوامی جی سے ان کا کلام سُنا جائے یہ کہنے کی دیر تھی کہ سوامی جی فرمانے لگے کہ میرے ہر شعر میں ایک لفظ راجہ یا رانی ہوتا ہے۔ سب نے یک زبان ہو کر کہا ارشاد ارشاد اور سوامی جی فرمانے لگے کہ یہ ایک شعر صنم کے ابرو عنوان سے کہا ہے ؎

نظر کو زہر سمجھے اور ابرو کو کٹار اسے
نظر سے جو نہ مر جائے اسے ابرو نے مارا ہے

واہ تھی کہ پڑوسیوں نے دیواروں سے اُچک اُچک کر دیکھنا شروع کر دیا سوامی جی فرمانے لگے کہ اس شعر میں ابرو راجہ ہے۔

اس کے بعد سوامی جی فرمانے لگے کہ اس شعر کا عنوان ہے "گئو موتر" سنئے ارشاد فرماتے ہیں ؎

ایک ہزار بیماریاں انسان کو گھیرے ہوئے ہیں۔
دوا سب کی ایک ہے "گئو موتر" پینا چاہئے

(اگر مرار جی ڈیسائی کی دریافت آبِ حیات "کا ظہور اس وقت ہوا ہوتا تو اس سلسلے میں سوامی پارس ناتھ یقیناً مرار جی بھائی کو شکست دے جاتے)

اس شعر پر بھی داد حسب سابق دل کھول کر دی گئی تو سوامی جی اپنے کلام بلاغت نظام کو گا کر سنانے لگے جس سے پڑوسیوں نے سیڑھیاں لگا کر یا چارپائیوں پر کھڑے ہو کر دیواروں سے جھانکنا شروع کر دیا ہے۔ سوامی فرما رہے ہیں ؎

دمہ گرمی سے گر ہو دے تو نسخہ ایک ملتا ہے
صبح شبنم کے پینے سے دمہ کا دم نکلتا ہے

سوامی جی نے بتایا کہ اس شعر میں دم راجہ ہے۔ اور اگلا شعر بھی ترنم سے عطا ہوا ہے ؎

سمجھو اپنی سے دنیا میں ہر اک انسان لق لق ہے
خدا کی نظر میں لیکن ہر انسان احمق ہے

کھانا کھانے تک سوامی جی کا کلام خوب سُنا گیا اور جی بھر کے سب نے داد دی۔ سردار صاحب نے تجویز رکھی کہ سب سے پہلے سوامی جی کا مجموعہ کلام شائع کیا جائے اور اس مجموعہ کے لئے ملک کے

بڑے بڑے لیڈروں اور دانشوروں سے آرا طلب کی جائیں اور جب یہ مجموعہ چھپ جائے تو اسے سوامی جی کی ادبی یادگار کے طور میں ہندوستان کا صدر کیوں بنانا چاہتا ہوں۔ ہر ممبر پارلیمنٹ اور حکومت ہند کے ہر وزیر کے پاس بھجوایا جائے۔ یہ مشورہ [illegible] ایڈیٹر ریاست نے مضطر ہاشمی فرماتے تھے کہ مجموعہ کلام کا نام کیا رکھا جائے۔ راقم الحروف کا تجویز کردہ نام "دیوارِ قہقہہ" منظور پایا اور اس کی اشاعت کی ذمہ داری بھی مجھے ہی سونپی گئی۔ اور یہ بھی طے پایا کہ یہ مجموعہ جشن آزادی کے موقع پر ۱۵ اگست کو پیش کیا جائے۔

ہر شام کو سوامی جی، تفریح کا سامان مہیا کرتے۔ اور سوامی جی کی شہرت کے باعث سردار صاحب کے ہاں شام کو ایک خاصا مجمع لگ جاتا جن کی خاطر مدارات سردار صاحب بخوشی [illegible] مگر سوامی جی کی شہرت نے عیاں [illegible] افزوں بن جانے مہمانوں کا [illegible] سردار صاحب کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں کو بھی اکھرنے لگا۔ مگر قدرت کو سردار صاحب کی مہمان نوازی کی شان کو برقرار رکھنا منظور تھا کہ سوامی جی نے از خود ہمارا پور کسی مندر میں کوئی چلہ کاٹنے کے لئے عارضی رہائش اختیار کر لی اور اور سوامی جی کے مداحوں کی تعداد صرف وہی رہ گئی جو کہ ان کے دہلی میں ورودِ مسعود کے وقت تھی۔ ۱۵ اگست ۱۹۵۸ء کو سوامی پارس ناتھ کا مجموعہ کلام "دیوارِ قہقہہ" پوری تابانی کے ساتھ شائع ہو کر منصۂ شہود پر آگیا تو سردار صاحب نے اس کی رسم رونمائی دیوان کو پیش کرنے کیلئے ایک جامع پروگرام بنایا۔ اور ہندوستان کی زبانی پروپیگنڈہ کرایا گیا کہ سوامی پارس ناتھ کے دیوان کی رسم اشاعت کی کارروائی ریڈیو سے نشر ہو گی اور اکابرین ملک کے پیغامات تہنیت بھی ریڈیو پر سنائے جائیں گے۔ یہ خبر دلی کے باذوق حلقوں تک کسی نہ کسی طرح پہنچا دی گئی۔ سردار دیوان سنگھ کوٹھی کے باہر سے سردار دیوان سنگھ مفتون نے ورزش کی مشین منگائی جس کے بارے میں سوامی جی کو بتایا گیا یہ براڈکاسٹنگ کی مشین ہے۔ تاریخ مقررہ پر دفتر ریاست میں زندہ دلان [illegible] کے آنے پر ٹھیک [illegible] بجے یہ کارروائی شروع ہوئی۔ [illegible] سوامی جی کو کرسی صدارت پر بٹھایا گیا۔ مضطر ہاشمی کو اناؤنسر کے فرائض انجام دینے کیلئے مقرر کیا گیا۔ بجلی کی ایک تار کو ورزش کی مشین سے باندھ کر چھت پر ریڈیو کے ایریل کے تار کے ساتھ لٹکا دیا گیا۔ ورزش کی مشین کے بالمقابل ایک کرسی پر سوامی جی کو بٹھایا گیا اور ان کے گلے میں

حاضرین نے پھولوں کے ہار ڈالے اور مضطر ہاشمی نے بجلی کا ایک قمقمہ رسی سے باندھ کر ورزش کی مشین سے باندھ دیا اور اس قمقمے کو ہاتھ میں تھامے مائیک کا کام لیتے ہوئے فرمانا شروع کیا۔ حضرات یہ تمام دنیا کے رہنے والوں کے لئے عزت کا مقام ہے کہ آج سوامی جی کا دیوان "دیوارِ قہقہہ" کی رسم اجرا کی جا رہی ہے۔ یہ مجموعہ ایسی بیش بہا تصنیف ہے کہ دنیا کی ہر مصیبت کا علاج اس کتاب سے ہو سکتا ہے۔ حضرات اس بیش بہا تصنیف کی رسم اجرا ہندوستان کے مشہور صحافی سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر ریاست فرمائیں گے اور اس کے بعد سوامی جی اپنا کلام بلاغت نظام عنایت فرمائیں گے۔ دیوارِ قہقہہ کی ایک جلد سنہری کاغذ میں لپٹی ہوئی جو ایک خوشنما دھاگے سے بندھی ہوئی تھی سوامی جی نے سردار صاحب کے دست مبارک میں دی اور انہوں نے اس بند پیکٹ کو کھولتے ہوئے کتاب کا اجرا فرمایا۔ اور اس کے ساتھ ہی سب حاضرین نے پر جوش تالیوں سے سوامی جی کو مبارکباد پیش کی اور سوامی جی کی لمبی ناک اور بھی بڑھتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اب مضطر ہاشمی نے بجلی کا قمقمہ جو محض ایک سوتی رسی سے بندھا ہوا تھا سوامی جی کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اعلان کیا کہ دنیا کے رہنے والو! اب ہندوستان کی صدارت کے امیدوار سوامی پارس ناتھ جی کا کلام بلاغت نظام ان کی زبانِ مبارک سے سنئے۔ سوامی جی نے پہلا شعر ہی پڑھا تھا کہ مضطر صاحب کو مخاطب کر کے سوامی جی کہنے لگے کہ یہ بلب تو کرنٹ مار رہا ہے بس ہنسی کا ایک طوفان تھا کہ تھمنے میں نہیں آ رہا تھا۔ سردار دیوان سنگھ کا تو ہنستے ہنستے برا حال تھا۔ جب ہنسی کا زور کم ہوا تو مضطر صاحب نے ملازم سے پانی کا ایک گلاس منگایا اور اس رسی کو بھگو دیا جس سے بجلی کا بلب بندھا ہوا تھا۔ اور سوامی جی سے کہا کہ اب یہ بلب کرنٹ نہیں مارے گا۔ آپ کلام شروع رکھئے۔ سوامی جی تھوڑی [illegible] تو مضطر صاحب نے انہیں پانی کا ایک گلاس [illegible] جسے سوامی جی ایک ہی سانس میں پی گئے اور کہنے لگے کہ یہ مشین سانس کو کھینچتی ہے۔ پھر ہنسی کا سیلاب کہ تھمنے میں نہیں آ رہا۔ جب ہنسی کچھ رکی تو مضطر صاحب نے اعلان فرمایا کہ اب سوامی جی تقریر فرمائیں گے اور یہ بتائیں گے کہ انہیں ہندوستان کا صدر کیوں بنایا جائے۔ بس پھر کیا تھا سوامی جی نے جو کچھ بھی ان کے منہ میں آیا اول جلول تقریر کی اور یہ یادگاری پروگرام ختم کرتے

کا اعلان کیا گیا ۔ دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ سردار صاحب کے ہاں ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے کا تانتا بندھ گیا جو بھی ٹیلیفون آرہا ہے سوامی جی کو مبارکباد دے رہا ہے کہ ابھی ریڈیو پر پروگرام سنا ہماری طرف سے سوامی پاس ناتھ کو مبارکباد پہنچا دیجئے ۔ اس پر سردار صاحب نے سوامی جی کو ہی ٹیلیفون کے نزدیک بٹھا دیا تاکہ جو بھی ٹیلیفون آئے وہ خود ہی سنیں ۔ پوری پلان کے مطابق رات کے دس بجے تک پندرہ سولہ ٹیلی فون آتے رہے اور سوامی جی اپنے اس کامیاب پروگرام پر پھولے نہیں سما رہے تھے ۔ دو تین دنوں کے بعد قریب و جوار نیز بڑے بڑے شہروں سے خطوط آنے شروع ہو گئے جس میں سوامی جی کو انتہائی شاندار پروگرام پر مبارکباد دی گئی تھی یہ سب کچھ سردار صاحب کا ترتیب دیا ہوا پری پلان تھا ۔ سوامی جی بازار میں نکلتے تو طے شدہ سکیم کے تحت دو چار اشخاص انھیں مبارکباد دیتے ۔

اس دوران ہم سب نے مل کر سوامی جی کا وہ بیان ترتیب دیا جو انھوں نے ممبران پارلیمنٹ اور وزرائے ہند کو اپنے دستخط کے ساتھ بھجوانا تھا ۔ سردار صاحب نے اس بیان کا انگریزی ترجمہ کرایا اور اسے بہترین انداز میں چھپوایا گیا اور سردار صاحب نے آناً فاناً سوامی جی کی جناب راجندر بابو صدر جمہوریہ ہند سے ملاقات کا وقت بھی مقرر کرا دیا ۔

سوامی جی راشٹرپتی بھون پہنچے تو محترم راجندر پرشاد جی کو آپ نے اپنا مطبوعہ بیان دیا جسے راشٹرپتی صاحب نے بغور پڑھا اور جب آخر میں انھوں نے یہ پڑھا کہ حضرت ان کی جگہ راشٹرپتی بننے کے امیدوار ہیں تو وہ بھی ہنس دیئے اور فرمانے لگے سوامی جی مجھے تو اس ذمہ داری پر بیٹھے رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے مگر بھارت واسیوں نے مجھے یہ سیوا سونپ رکھی ہے جب بھی مجھے بھارت واسی حکم دیں گے میں یہ پدوی چھوڑ دوں گا ۔ آپ جواہر لال جی مولانا آزاد صاحب اور دوسرے لیڈروں سے ملئے میں ہر وقت یہ جگہ چھوڑنے کو تیار رہوں ۔ سوامی جی کہنے لگے کہ راشٹرپتی جی آپ بھارت کے کرشی منتری کا عہدہ سنبھالنے کی سوچ رہے ہیں یہ تو بتائیے کہ آپ کا دھرم پتنی کو بھی ۔ راشٹرپتی اس استفسار کا جواب سوائے مسکراہٹ کے کیا دے سکتے تھے ۔ اس پر سوامی جی فرمانے لگے جبھی تو میں کہتا ہوں کہ وزیروں کو وہ عہدے دیئے جائیں جن کا ان کو پتہ ہو اب تو یہ وزیر رات بسر ہیں اور آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ جوئی مادہ جوئی ہوتی ہے ۔ اس پر راجندر پرشاد جی نے مسکراتے ہوئے سوامی جی کو رخصت کیا اور شام کو سوامی جی نے راشٹرپتی سے اپنی تاریخی ملاقات کی یہ تفصیل بتائی جسے ہم سب نے خوب مزے لیتے ہوئے سنا ۔

(جاری ہے)

ہر پھر ڈھونڈا کریں گے کہہ کے دیوانہ تجھے
یاد آتے سے نہیں ہے جام و مینا تو تجھے
بھیجتا ہے دید کو پیر میخانہ تجھے
آپ نے سر کی قسم سیکھی کا دیوانہ بنا
تم سر محفل جو کہہ دو اپنا دیوانہ مجھے

ہم مولانا اختر صاحب فرما رہے ہیں کہ آج صابری صاحب موزوں ہو رہے ہیں یہ مصرع کیا تو لطف نہ آتا صرف یہی غزل ایسی ہے حضرت جگر کی غزل پر بھاری ہے ورنہ صابری کا کلام تو مطلع دیوتا ہے حال میں ایک ہنگامہ برپا ہے یار لوگ تالیاں بجا کر آگئے ہیں اور صابری صاحب حاضرین و سامعین کو توانائی اور زندگی عطا کرتے جا رہے اور اب ایک نوجوان اور مترنم شاعر عبدالحق سحر منظر عام پر آکر گویا ہیں سے

یہ سلوک کہ تکلف جدا رہنا وہ مجھ سے
کہیں تیرا نام میں لوں کہیں میرا نام تو لے
مرے پاس کتنے آئے سبھی رنگ بدل گئے ہیں
یہ جنوں کا ظرف ہی تھا مرا راستہ وہ بھولے

دوسرے مصرعہ پر ستائش و داد دی جا رہی ہے اور آپ اسی مستی سے ارشاد رہے ہیں سے

ہیں بجھے ہوئے چمن میں ابھی ہر طرف شگوفے
کوئی نوشگفتہ پرندہ یہاں خوش ہو نہ جھولے
کوئی رہ بھٹک تو جائے زیادہ شب زندگی میں
ابھی تک کے بیٹھ جائیں یہ روائتی بگولے

پھر وارثی بگولے پر ستائش و داد دی جا رہی ہے اور آپ یوں محفل کو گرما رہے ہیں سے

کوئی چھوڑ کر چلا گیا تو بجھ گئی زندگی کو
گلہ خلد خیر آباد سے ہو خوب نہ یہی ہم سے

پھر داد و شاباش پہنچے اور سحر صاحب کامران پلٹ رہے ہیں اور نشاط و فخر گلوکار یوں نشترزنی کرنے چلے ہیں سے

ظالم ترے فراق میں حالت یہ ہو گئی ہے
زخموں سے خون بہتا ہے نکسیر کی طرح

شب وصال اس نے جو کھینچا تانی کی
بغل نکل گئی میری شیروانی کی

نشتر صاحب رواں دواں تشریف لے جا چکے تھے اور نہایت اعتماد سے ظفر مسعود گنگوہی فرما رہے ہیں سے

عمر بھر غم اٹھانے کسی کے لئے
ہم کو مرنا پڑا زندگی کے لئے
تیرے طرز عمل سے یہ ثابت ہوا
دشمنی شرط ہے دوستی کے لئے

دوسرے مصرع پر ستائش و داد دی جا رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں سے

شام فرقت کی تاریکیاں بڑھ گئیں
دل جلاؤ ذرا روشنی کے لئے
اک طرف کعبہ ہے اک طرف بتکدہ
سر جھکائیں کہاں بندگی کے لئے

مسعود صاحب خوب خوب داد وصول کر کے جدا ہو رہے ہیں۔
اور ڈاکٹر احتشام کنتولی رواں دواں یوں گلوخلاصی کر رہے ہیں سے

سڑک پہ آئے کوئی اس کی کار کے آگے
وہ اک رئیس کا بیٹا تھا کس طرح سہتا
رگڑ کے پھینک دیا اس کی یہ بلا جانے
تڑپنے والا بھکاری تھا کوئی کیا کہتا

ڈاکٹر احتشام صاحب آہ اور واہ کے شور میں مشاعرہ کے انتظام میں جٹ گئے ہیں اب اس ضلع ہی کے مشہور اور مقبول مترنم شاعر تمنا جمالی محفل کا جائزہ لے کر یوں سحر کاری کرنے چلے ہیں سے

کرم کے ساتھ یہ رسم ستمگری کیا ہے
خدا ہی جانے یہ انداز دلبری کیا ہے
ابھی تو جسم میں تھوڑی سی جان باقی ہے
یہ دیکھنا ہے ستم ان کا آخری کیا ہے

پہلی بار داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے کئی بار دہرا کر اسی بانکپن سے کہہ رہے ہیں سے

فضا کی شادابی میرے کارواں سے ہے
ذرا شعور نہیں ہے کہ رہبری کیا ہے

تمنا صاحب پنڈال کو گرما کر مسند پر پلٹ رہے ہیں اور اب زیب

سخن ور دے رہے ہیں دیو بند کے ایک ابھرتے خوش فکر شاعر محمد نواز خاں نواز

۔ نواز صاحب غزل سرا ہیں ؎

اک روز یہ بھی حال ہمارا کریں گے لوگ
پتھر اٹھا کے راہ سے پیارا کریں گے لوگ
آپس میں ذکر جب بھی تمہارا کریں گے لوگ
میری طرف ضرور اشارا کریں گے لوگ

داد کا عالم مت پوچھئے کچھ سنائی نہیں دے رہا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کئی بار ٹھہر ٹھہر کر اسے بیچ بیچ سے دہرا رہے ہیں ؎

یہ کیا خبر تھی سازش طوفاں کے فیض سے
ساحل سے ڈوبتوں کا نظارا کریں گے لوگ
میں تو نواز ان پہ زمانے نواز دوں
لیکن یہ بات کیسے گوارا کریں گے لوگ

پھر دوسرے مصرع پر ایک ہنگامہ سا ہنگامہ ہے اور نواز صاحب کامراں جا رہے ہیں اب نسیم میرٹھی دہلوی سنائی غزل الاپ رہے ہیں ؎

وہ دل جس کو حاصل نہیں درد انساں
حقیقت میں پتھر ہے شیشہ نہیں ہے
مقدر سے اپنے شکایت ہے مجھ کو
مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے

نسیم صاحب جا رہے ہیں اور اب درخواست غزل کی جا رہی ہے مشیر جھنجھانوی سے ۔ چونکہ مشیر صاحب کو ابھی لدھیانہ جانا ہے لہذا وہ خود ہی اپنا نام پیش کر کے آئے ہیں پھر اپنے روایتی انداز سے عطا فرما رہے ہیں ؎

آ اور ان کو پھر وہی رفتار بخش دے
لمحے ٹھہر گئے ہیں ترے انتظار میں

حادثوں کو تلاش کرتا تھا
زندگی تیرے در پہ لے آئی

تو نے کبھی جو درد کے پودے لگائے تھے
اب آ کے دیکھ ان میں بہت پھول آ گئے ہیں

آپ کو داد جناب دی جا رہی ہے اور آپ فرما رہے ہیں کہ یہ بھی [illegible] قسم کا ہے حکیم سیف صاحب کا نذر ہے میں اب تو بجا آوری ہو گیا ہوں حکیم صاحب شکریہ ادا کر رہے ہیں اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے اور مشیر صاحب عنایت کر رہے ہیں ؎

اس قدر بے چراغ ہیں کچھ اور احتیاط
جلتے ہوئے چراغ کو تنہا نہ چھوڑیئے

پھر داد نے ہنگامہ کا روپ دھار لیا ہے اور آپ فرما رہے ہیں ؎

غم کو ہم حادثہ سمجھتے تھے ✦ کیا خبر تھی کہ سلسلہ ہوگا

غرض مشیر صاحب خوب خوب داد تحسین پا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور حتا صاحب نے معراج فیض آبادی کو مائک سونپ دیا ہے معراج صاحب دعوت فکر دے رہے ہیں ایک نوجوان شاعر ماجد دیوبندی کو ۔ ماجد صاحب یوں گلوکاری کا مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

عشق ہے دل نادان جان و دل گنوا دینا
رات دن ستم سہنا اور انہیں دعا دینا
خاک و خون کی منزل تک آ گئے ہیں دیوانے
اور مسکرا دینا اور حوصلہ دینا

آہ اور واہ کے شور میں مقطع اسی ... دلکشی سے الاپ رہے ہیں ؎

ماجد ان نگاہوں پر ، شب ہیں مٹی ہیں
قہقہوں میں چھپ رہنا غم میں مسکرا دینا

ماجد صاحب داد و ترنم لئے جا رہے ہیں اور اب معراج صاحب اقبال ادیب مشکو انداز سے غزل سرا ہیں ؎

خنجر بدست اجنبی لے سمیٹ لو
میں راکھ ہو چکا ہوں یہ قصے سمیٹ لو
جن کاندھوں پہ دم تھا وہ کیا آپ ہی سے گئے
تم راہ میں گرے ہوئے تنکے سمیٹ لو

داد نے ہنگامہ کو جنم دیا ہے کئی بار ٹھہر ٹھہر کر اسی بیچ بیچ سے دہرا رہے ہیں ؎

تم اندھیرے گی سے پریشان ہو گئے
آؤ بجھے چراغ اٹھا لے سمیٹ لو
کوئی نہ بادشاہ نہ بیگم نہ غلام
اب کھیل ختم ہو گیا پتے سمیٹ لو

پسینے کے دامن پہ ہمارے خون کی چھینٹیں ملیں
کہہ تو دوں محفل میں سچی بات لیکن اے حفیظؔ
اہلِ محفل کی جبینوں پر اگر شکنیں ملیں

حفیظؔ صاحب محفل کو گرما کر تالیوں کے شور میں مائک سے جدا ہو رہے ہیں احساس عالم میں افسرؔ آغا لکھنوی متانت سے ایک بہت پیاری غزل پیش کر رہے ہیں ؎

نہ یہ کہ عزم سکندر کہاں سے لاؤ گے
سوال یہ ہے مقدر کہاں سے لاؤ گے
زمیں کی خاک سروں پہ اٹھائے لاکھ پھرو
جنوں نوردوں کے سے تیور کہاں سے لاؤ گے
غزل کو یہ گدو چنبر سڑک کی چھوڑ دے کر
شمیم زلفِ معطر کہاں سے لاؤ گے

افسرؔ صاحب کو بھی خوب داد دی گئی اور پھر وسیمؔ بریلوی تالیوں کی جھنکار میں آکر محفل کا جائزہ لیکر فرمائشوں کو نظر انداز کر کے سنا رہے ہیں ؎

ذرا سی ٹھیس لگنا اور شیشہ سا بکھر جانا
کوئی سیکھے ترے خوابوں سے دریا پار اتر جانا
بہت ہے ربط سا اک ربط کس نے کس قدر جانا
وہ میرا نام آنا اور ترا چہرہ اتر جانا
بہت باتیں نکل آئیں گی کوئی بات کرنے سے
بس اتنا ہی بہت ہے تو نے مجھ کو ہمسفر جانا
نہ جانے کیوں گراں گزرے ہے ان موسم فروشوں کو
ہوا کے ایک جھونکے کا ادھر ہو کر گزر جانا

وسیمؔ صاحب ایک گیت اور سنا کر تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں اور اب عالمؔ فتحپوری یوں گرج اور برس رہے ہیں ؎

تڑپتے پھر رہے ہیں میکشوں کے کارواں ساقی
ترے میخانہ پہ چھایا ہے کوئی کہساں ساقی
پلانا تو کجا مجھکو تو پینا تک نہیں آتا
کہاں تو اور کہاں میخانۂ ہندوستاں ساقی

عالمؔ صاحب جس طرح گرج رہے ہیں اسی انداز سے داد پا کر جا رہے ہیں ؎

دوستوں نے وہ فریب راہزن کھائے کہ بس
رہنما اس کو بنا کر کتنے پچھتائے کہ بس
پھول مسلے ڈالیاں توڑیں کیا غنچوں کا خون
باغباں بن کر چمن میں ظلم وہ ڈھائے کہ بس

عالمؔ صاحب گھن گرج کر ایک نظم اور کے شور میں چلے گئے اور اب الحاج شمیمؔ جے پوری اپنے مخصوص ترنم سے غزل سرا ہیں ؎

ٹھوکروں سے غم دوراں کی بچائے رکھیو
غم جاناں مجھے سینے سے لگائے رکھیو
تم سے بچھڑا تو میں خود سے بھی بچھڑ جاؤں گا
مری آواز سے آواز ملائے رکھیو
کہیں پڑ جائیں نہ دنیا کی نگاہیں ان پر
میرے خط بھی نہ کتابوں میں چھپائے رکھیو
مجھکو غیروں کا ہر اک ظلم گوارا لیکن
میرے اللہ اب اپنوں سے بچائے رکھیو

شمیمؔ صاحب محفل کو معطر کر کے شاداں جا رہے ہیں اور اب صدرِ محترم فرما رہے ہیں :-

میں الہ آباد کی جانب سے اردو کے بارے میں تاثرات لایا ہوں۔ میں ادھر پہلے بھی آ چکا ہوں لیکن آج اس مشاعرہ کی غرض سے آیا ہوں تین جملے کہہ کر رخصت ہوتا ہوں۔ مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ اشعار سننے والوں سے کتاب اور اردو پڑھنے والوں کی ضرورت ہے — تالیاں — اردو پڑھنے والے پیدا کئے جائیں — حضور والا یہاں تو غزلیں الاپنے والے پیدا کئے جا رہے ہیں یہی اردو کی بدنصیبی ہے — تاکہ اردو کو بچایا جائے کچھ سیاسی کچھ داخلی مسائل ہیں۔ میں سیاسی مسائل کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا — الہ آباد میں اردو کے سات آٹھ سکول چلا رہا ہوں — تالیاں — وہاں پانچ سو بچے پڑھتے ہیں۔ فروغ اردو کا یہ ناچیز صدر ہے — جن لوگوں کو اردو سے کوئی تعلق نہیں ہے آج وہ اردو کے لئے ہزاروں روپیہ خرچ کر رہے ہیں۔ اردو ہندی الگ چیز نہیں ہے لیڈروں نے اسکو الگ الگ کر دیا۔ اردو غیر اردو والوں کی طرف لے جانے ہیں اردو نہیں جانتے ان کو اردو پڑھائیے وغیرہ تالیوں کے شور میں محترم

کسے بھی اپنی جگہ آگئے ہیں اور میں سوچ رہا ہوں تنہا کیہ جی جن کو سرکاری ڈیلی ٹی بھی ادا کرتا ہے قی ہے اور ساتھ ہی اردو کے لئے یہ شب و روز جد و جہد اور سات اٹھا اسکول بھی چلا رہے ہیں اور اس طرح اردو کو زندہ رکھنے کے شعا دعا ہیں کہاں مقام بنائے جا رہے ہیں اور شعرا کرام صرف مشاعروں کا اردو کو زندہ رکھنا سمجھتے ہیں یہ کتنی بڑی اور بہادر سی غلطی کر رہے ہیں اس طرح اردو زندہ رہ سکتی ہے یہ سب تفریحی اور لیکچر کا سامان تو ہو سکتا ہے۔

لیکن اردو سے اسکو کوئی واسطہ ہے نہ مطلب کاش آج کا شاعر کم از کم اردو پڑھ سکے اور پڑھا سکے یہ اردو کے بدترین دشمن ہیں اردو کی تباہی میں آج کے شعراء کا اہم اور نمایاں حصہ ہے۔ خدا کرے مرے ملک کو ڈی۔ این۔ آر جیسی ایسے مخلص اور فنکار شیدائے اردو مل سکیں تاکہ وہ اردو کو غیر اردو داں لوگوں تک پہونچا سکیں دیکھیے تو اقبال سہواروی فرما رہے ہیں ؂

قندیلِ آگہی بھی اک شمع لیکن جل گئی
یہ بھی سنتا ہوں جلی ہے وہ اسی چال سے
میں یہ کہتا ہوں وہ پھر جل رہی آج بھی
ہم تو اس کو دیکھتے آئے ہیں ڈھائی سال سے

پل ۲ بجے ہلال صاحب کے ساتھ ہی یہ واجپائی۔ کامیاب اور یادگاری مشاعرہ ختم ہو رہا ہے اس مشاعرہ کا کئی تاریخیں بدل گئی ہیں۔ اور کتنے ہی مقامی شعراء نے شمولیت نہیں کی ویسے ان حضرات نے کسی قسم کی لیشہ دوانی یا غلط بات نہیں کی نہ ہی اس مشاعرہ کو بیدک کے مشاعرہ کی طرح اڑوایا۔ یہ ان کی دانشمندی کی بات ہے کاش یہ حضرات بھی اس مشاعرہ میں شرکت کرتے تو کچھ اور بات ہوتی ہر جگہ ایسی ہی چپقلش اور گروپ بندیاں نظر آتی ہیں اور پر تکلف بات یہ کہ سب ہی اردو کے نام لیوا۔ شیدا۔ کمانڈو۔ فنکاری کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں لیکن ایسے موقع پہ نہ جانے کیوں اختلافات ختم نہیں ہو سکتے جبکہ کیا اسطرح گھر کی بات منظرِ عام پر نہیں آتی ہے۔ یہ نظریہ غلط ہے یہ سلیم صاحب جانیں کیوں ایسا ہوا میں تو اتنا جانتا ہوں کہ سلیم صاحب نے اس مشاعرہ کے لئے خوب خوب جد و جہد کی اور مخلص شعراء کرام کو اپنی بستی میں بلانے میں کامیاب رہے جب کہ آج کا مشاعرہ کاروبار۔ پیشہ ور اور موقع پرست ہو کر رہ گیا۔ لیکن یہاں ایسا نہیں ہوا اور کیا عرض کروں ؂

جا رہے ہو تو لئے جاؤ کہ یہ کام آئیں گی
کام آئیں گی برے وقت ہچکیاں ہو کر

●●●

غزل

اوم پرکاش نرمل کش
بھگوانہ

ملک کے سونی وادیوں میں گنگناتا کون ہے
میری دل کی دھڑکنوں کو گدگداتا کون ہے

چل رہا ہے ساتھ میرے بن کے میرا ہم سفر
میرا ہی سایہ ہے ورنہ ساتھ جاتا کون ہے

کیوں ندامت سے جھکا جاتا ہے سر احباب کا
آئینہ عہدِ گذشتہ کا دکھاتا کون ہے

روحِ چنگیز و ہلاکو کیوں ہے رقصاں ہر طرف
خونِ آدم پی کے دیکھو لہلہاتا کون ہے

ہر طرف مایوسیاں، لاچاریاں، ناداریاں
جل رہا ہے روم یہ بنسی بجاتا کون ہے

باش او مشاعرہ اک دن بھید یہ کھل جائے گا
لکھ کے دیتا کون ہے پڑھ کر سناتا کون ہے

داغ و مومن کی سی وہ شوخی کہاں تحریر میں
اب رموزِ شاعری کو گن بتاتا کون ہے

کس نے برپا کر دیا طوفان دلِ نرمل کش میں
وادیٔ پُرخار سے اسکو بلاتا کون ہے

جمہوری نظام

توصیف علوی عارفی۔ بی اے کیمپ انوی

ہو جہاں آئین کا سب کی نظر میں احترام
زندگی کے ہو تقاضوں کا جہاں پر اہتمام
ہو جہاں انصاف کے ہاتھوں میں انسانی زمام
امن و الفت کا زمانے کو جہاں پر ہو پیام
وہ ہے جمہوری حکومت وہ ہے جمہوری نظام

دیوتا بن کر جہاں بیٹھیں نہ طاقت کے صنم
ہو جہاں دولت کے ہاتھوں میں نہ قسمت کے علم
سیم و زر کا ہو جہاں انساں نہ ممنونِ کرم
ہو جہاں جمہور کے ہاتھوں میں طاقت کا زمام
وہ ہے جمہوری حکومت وہ ہے جمہوری نظام

ہو جہاں جمہور کا جمہور سے راز و نیاز
کوئی بندہ ہو جہاں پر اور نہ ہو بندہ نواز
ایک ہی صف میں جہاں شامل ہوں محمود و ایاز
ہو جہاں ہر آدمی کا ایک با عزت مقام
وہ ہے جمہوری حکومت وہ ہے جمہوری نظام

باغباں ہی کا جہاں حق ہو نہ فصلِ گلستاں
بجلیوں سے ہو جہاں محفوظ ہر اک آشیاں
ہو نہ پابندِ قفس کوئی جہاں پر نغمہ خواں
ہو جہاں آئینِ گلشن لائقِ صد احترام
وہ ہے جمہوری حکومت وہ ہے جمہوری نظام

ہو نہ ساقی کی نگاہوں میں جہاں پر بیش و کم
ہوں جہاں سب کیلئے میخانہ کے جام و سبو
ہو جہاں ہر رند بزمِ مے کی جان آبرو
ہو نہ کچھ مخصوص ہاتھوں میں جہاں پر دورِ جام
وہ ہے جمہوری حکومت وہ ہے جمہوری نظام

ترجمانِ دل جہاں جمہور کے آواز ہو
دستِ محنت کش جہاں آئینہ اعجاز ہو
جذبۂ قومی جہاں ہر فرد کا دمساز ہو
زندگی ہر ایک میداں میں جہاں ہو شاد کام
وہ ہے جمہوری حکومت وہ ہے جمہوری نظام

گوشہ گوشہ میں عدالت کی جہاں تنویر ہو
رنگِ قومی سے جہاں رنگیں ہر تصویر ہو
اپنے ہی ہاتھوں جہاں تقدیر کی تعمیر ہو
ہو جہاں دنیا کے انساں کو محبت کا پیام
وہ ہے جمہوری حکومت وہ ہے جمہوری نظام

جشنِ جمہور

قاضی سکروڈھوی

جشنِ جمہور بصد شوق منائیں لیکن

ذہنِ انساں میں ہیں الجھے ہوئے افکار ابھی دل پہ ہے آتشِ اندوہ شرربار ابھی
زندگی موت سے ہے برسرِ پیکار ابھی دورِ حاضر کی سیاست ہے فسوں کار ابھی
جشنِ جمہور بصد شوق منائیں لیکن

دورِ افرنگ کی زندہ ہیں روایات ابھی ہیں وہی پہلے سے دن اور وہی رات ابھی
وہی افسردہ و بے کیف ہے لمحات ابھی راس آتے نہیں بدلے ہوئے حالات ابھی
جشنِ جمہور بصد شوق منائیں لیکن

ہیں وہی محورِ تقدیر کے انداز ابھی خاک کے ذروں کو آئی نہیں پرواز ابھی
خود فریبی پہ ہے معمولِ تگ و تاز ابھی اپنے انجام سے بیگانہ ہے آغاز ابھی
جشنِ جمہور بصد شوق منائیں لیکن

دھندلی دھندلی سی ہے فردوس کی تصویر ابھی روح فرسا ہے حسیں خواب کی تعبیر ابھی
وقت کے ہاتھ میں ہے قبضۂ شمشیر ابھی عہدِ حاضر کے ہیں ترکش میں بہت تیر ابھی
جشنِ جمہور بصد شوق منائیں لیکن

کارفرما ہے گراں باریٔ ایام ابھی کامرانی بھی ہے اک حسرتِ ناکام ابھی
عام ہے غربت و افلاس بہت عام ابھی عیش و آرام ہے منت کشِ آرام ابھی
جشنِ جمہور بصد شوق منائیں لیکن

مستی و کیف سے خالی ہے مئے ناب ابھی بادۂ عشرتِ محمود ہے نایاب ابھی
چہرۂ پیکرِ امید ہے بے آب ابھی دور ہے صبر و سکوں سے دلِ بیتاب ابھی
جشنِ جمہور بصد شوق منائیں لیکن

جلوۂ شاہدِ معنی بھی ہے مستور ابھی شام رنگیں کے نظارے بھی ہیں رنجور ابھی
چہرۂ صبحِ تمنا بھی ہے بے نور ابھی مختصر یہ ہے کہ منزل ہے بہت دور ابھی
بڑھتے ہی جائے دو معصوم تمناؤں پر
اک قدم اور بڑھو وقت کا تقاضا ہے

غزل

گل خلیقی جے پوری

رہِ وفا میں ملے اس قدر فریب مجھے
کہ زیست لگتی ہے ہر گام پر فریب مجھے

لٹا ہوں راہِ وفا میں کچھ اس طرح اے دوست
کہ اب تو لگتی ہے ہر رہ گزر فریب مجھے

کبھی خوشی سے کبھی غم سے ہمکنار رہا
دیئے ہیں وقت نے کیا خوب تر فریب مجھے

وہ اشک بن کے مری چشمِ تر میں رہتا ہے
دیئے ہیں جس نے کہ شام و سحر فریب مجھے

ہوا ہے دید کی حسرت میں دل کا یہ عالم
کہ اب تو دیتی ہے اپنی نظر فریب مجھے

غمِ حبیب کی دولت ہوئی ہے جب سے نصیب
نہ دے سکے گہر و سیم و زر فریب مجھے

نہ کوئی شکوہ ہے تم سے نہ کوئی عرضِ ملال
مرا نصیب ملے جس قدر فریب مجھے

بنا لیا ہے انھیں جزوِ زندگی میں نے
دیئے ہیں تو نے جو رشکِ قمر فریب مجھے

جو دیکھا برق نے تو بڑھ کے عزمِ نو نے کہا
کہ دینا برق ذرا سوچ کر فریب مجھے

ہے اشکبار وہی آج میری تربت پر
کہ جس نے ہنس کے دیئے عمر بھر فریب مجھے

دعائیں دیتا ہے دل اُس کو رات دن اے گل
دیئے ہیں جس نے ہر اک گام پر فریب مجھے

آل انڈیا مشاعرہ برسی حضرت ابر احسنی گنوری مرحوم

متین بدایونی

آج ۹، نومبر ہے۔ قصبہ گنور ضلع بدایوں یوپی کی تاریخ میں یہ دن خاص اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس دن کی پچھلی رات میں چند نامعلوم دشمنوں نے حضرت ابر احسنی گنوری کو سفاکانہ طور پر قتل کر دیا تھا یوں تو عالمگیر شہرت کے حامل اور ماہر فن اُستاد شاعر ہونے کے ناطے بھی ابر صاحب کی ہستی اس قابل تھی کہ ہند و پاک کے شہر شہر اور قریہ قریہ ان کی یاد منائی جاتی۔ لیکن ان کے خونِ ناحق کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اہلِ گنور اور شاگردانِ حضرت ابر نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ بطور رسم ہر سال ۹، نومبر کو گنور میں مرحوم کی برسی منائی جایا کرے۔ آج مرحوم کی چھٹی برسی ہے۔

اس سلسلے میں آل انڈیا بزم ابر کے زیر اہتمام آج آل انڈیا مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے۔

آئیے اب میں آپ کو مشاعرہ گاہ میں لے چلتا ہوں۔ تحصیل گراؤنڈ میں ایک بڑے تخت پر فرش فروش۔ قناتوں اور شامیانے پر مشتمل پنڈال ہے رات کے ۹ بج چکے ہیں۔ شعراء حضرات فرحت منزل میں کھانا کھانے گئے ہیں۔ فارغ ہو کر آیا ہی چاہتے ہیں۔ پنڈال بھرنے [illegible] ہے لہٰذا آپ جلدی سے اپنے بیٹھنے کی جگہ بنا لیجئے۔ یہ پٹرومیکس [illegible] گنور کی بدقسمتی ہے کہ یہاں بجلی کی ہمیشہ کمی رہتی ہے۔ شاید رات گئے تک وقت تھوڑی بہت دیر کے لئے لائٹ آ جائے۔

لیجئے شعرائے کرام تشریف لے آئے۔ ماسٹر زیب نگری [illegible] ہیں اور بزم کی بھاری اور شرکت رحمانی مشورہ دے رہے ہیں [illegible] ہی نے شعراء کی ترتیب قائم کی ہے اور جلسے کی نظامت کی [illegible] ماسٹر عارف صاحب کے سپرد ہیں۔ اور حضرت نسیم قریشی [illegible] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی صدارت کا اعلان کیا ہے۔ جو موصوف نہایت پُر مغز اور جامع تقریر فرمائی ہے۔ اب اسلم حنیف [illegible] ابر کی زندگی اور فن پر مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ [illegible] صاحب کے تلامذہ کی تعداد [illegible] ہزار ہے مرحوم نے اپنی ساری زندگی شاعری اور اصلاحِ شاعری کے لئے وقف کر دی تھی۔ اردو پر آپ کا عظیم احسان ہے۔ مقالہ جامع ہے۔ لیکن افسوس نہ جانے کیوں اسے مختصر کر دیا گیا۔ اب عارف صاحب نعیم [illegible] نعت پاک پڑھنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ موصوف اسٹیج پر دو زانو ہو کر بیٹھے [illegible] داد دی ہیں۔ عطا کر رہے ہیں ؎

یہ ہے توصیف سے قرآں رسولِ عربی
زیست اس شان پہ قرباں رسولِ عربی
کس کی ہمت ہے کرے بال جو بیکا اس کا
آپ ہوں جس کے نگہبان رسولِ عربی

لوگ ٹوپیاں اوڑھے اور رومال سروں سے باندھے گوش بر آواز ہیں اور جھوم رہے ہیں کہ سحر ٹوٹا اور اب [illegible] صاحب حضرت انیس گنوری سے درخواست کر رہے ہیں کہ وہ ابر صاحب کی غزل سے مشاعرے کا آغاز کریں۔ انیس صاحب ابر صاحب ہی کے ترنم اور انداز میں غزل سرا ہیں ؎

جان قرباں مری دوستی کے لئے
زندگی نذر ہے زندگی کے لئے
کس قدر گھور اندھیرا ہے چاروں طرف
شمع بن جاؤ خود روشنی کے لئے
آپ کا ذکر کیا بات اس دور کی
زندگی ہے عذاب آدمی کے لئے

سماں بندھا ہوا ہے۔ ہر طرف سے واہ واہ کی آواز نہایت سنجیدگی سے آ رہی ہے۔ پوری غزل مرصع اور دل آویز ہے لیجئے اب خاطر کے پہلے شاعر اعجاز سلطانی کو سنئے ؎

آپ بھی میرے مقدر کا تماشا دیکھئے
گلشن میں آ کر گرا ہے زرد پتا دیکھئے
آئینہ بیچتی پھرتی ہیں [illegible] بازار کی
آئینے گھر پہ سجا کر اپنا چہرہ دیکھئے

اعجاز سلطانی داد [illegible] پا کر جا رہے ہیں اور اب آخر میں [illegible] ابر

سامعین بے خود ہو چلے ہیں۔ مسلسل ہے کہ آپ کو تیسری غزل پڑھنے پر مجبور کیا گیا ہے ؎

رفتارِ طلب بڑھ جاتی ہے جب فاصلہ کم ہو جاتا ہے
منزل کے قریب آکر رہرو کچھ تیز قدم ہو جاتا ہے
تخریب حسیں کر دیتی ہے تعمیر کے نقشِ ناقص کو
بُتخانے کی قسمت کیا کہئے بگڑے تو حرم ہو جاتا ہے

کیا کہنے ہیں ۔ اے سبحان اللہ ۔ ہر غزل چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ اب حضرت کنول ڈبائیوی نے مائک پر آتے ہی چند قطعات کے بعد غزل شروع کی ہے اور داد حاصل کر رہے ہیں ؎

عشق کا شعلہ بجھنے لگا ہو ایسا بھی ہو سکتا ہے
ان کی کمی ہو میری خطا ہو ایسا بھی ہو سکتا ہے
چال پہ میرے کچھ نہ کہا ہو ایسا بھی ہو سکتا ہے
ضبط سے اس نے کام لیا ہو ایسا بھی ہو سکتا ہے

واہ واہ سبحان اللہ۔ اب آرہے ہیں قیدکوہلی اکبرآبادی سنئے ؎

کس کی یاد آئی مجھے کیوں مرے آنسو نکلے
کس تجسس میں سرِ شام یہ جگنو نکلے

بڑا حسین انداز ہے چنانچہ داد کے بادل برسنے لگے ہیں۔ ایک حسین شعر اور سنئے ؎

آہ یوں آئی شبِ غم مرے لب پر جیسے
اک پپیہے کا جگر چیر کے پی ہو نکلے

اب عارج صاحب زحمتِ غزل سرائی دے رہے ہیں رامانند جوز صاحب دموہی کو آپ چند متفرق اشعار سنانے کے بعد غزل شروع کر رہے ہیں ؎

ہم فضا کی وادیوں میں اس طرح زندہ رہے
جس طرح تارے اندھیری شب میں تابندہ رہے
ہر نفس اک تازہ آفت ہر قدم اک حادثہ
دورِ حاضر میں بھلا کیسے کوئی زندہ رہے

مشکل قوافی۔ دلنشیں انداز آپ نے خوب خوب داد سمیٹی ہے۔ اب مشکل یہ آپڑی ہے کہ خداداد نسر صاحب کو زحمتِ غزل سرائی کون دے۔ اس مشکل کو حضرت دلکش بدایونی نے حل کیا اور عارج صاحب مائک پر آکر نہایت دلکش ترنم کے ساتھ غزل سرا ہیں ؎

مسرت ہاتھ غم سے کھا گئی اب تو چلے آؤ
حیات اب موت سے گھبرا گئی اب تو چلے آؤ
نظر دل پر قیامت ڈھا گئی اب تو چلے آؤ
محبت دشمنی میں آگئی اب تو چلے آؤ

پوری غزل مرصع ہے۔ داد کے خزانے لوٹے عارج صاحب چلے اور ولی حسنپوری آئے ہیں۔ ارشاد ہو رہا ہے ؎

سمجھے ہیں یہی سوچ کے ہم چپ بھی غم بھی
شاید کہ ہو مائل بہ کرم چشمِ ستم بھی
اچھا ہی ہوا آپ نے دل لے لیا واللہ
ہو جاتے کہیں ورنہ یہاں پاس الم بھی

بقول خود ولی صاحب یہ مرحوم کے والدین کا کرم ہے کہ ولی نام رکھا لہٰذا وہ کتنے ہی گناہ کریں ولی رہیں گے۔ آپ مناسب داد پاکر جا رہے ہیں اب میرے ہم پیشہ یعنی مدھوپور (بہار) کے ٹی ٹی ای جناب اختر مدھوپوری تشریف لا رہے ہیں آپ نے پہلے ایک پھڑکتا ہوا قطعہ پھر ایک نظم بعنوان " بزمِ اکبر " گوش گزار کی ہے نظم پسند کی جا رہی ہے اب ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں فرماتے ہیں ؎

کمرے کی کھڑکیوں کو ذرا کھول دیجئے
دم گھٹ رہا ہے آئے ہوا کھول دیجئے
میں چاہتا ہوں گوہرِ شبنم خریدنا
میزانِ ابر تقاریں انھیں تول دیجئے
پھیکا ہے رنگ غازۂ رخسارِ کائنات
تھوڑا سا اس میں میرا لہو گھول دیجئے

یوں تو داد خوب مل رہی ہے لیکن مطلع میں قوافی " ذرا " اور " ہوا " اور شعروں میں " تول " اور " گھول " لہٰذا سخن فہم حضرات کان کھڑے کر رہے ہیں۔ اب عارج صاحب نے حضرت پیام گرگاڑی کا نام پکارا ہے۔ آپ نے آتے ہی ایک قطعہ پیش کیا ہے ؎

آنکھوں کا پرستار تو ہو جانے دو
زلفوں میں گرفتار تو ہو جانے دو
کیوں فکر ابھی سے ہے بھلائی کی

پہلے مجھے بیمار تو ہو جانے دو

اب غزل شروع کی ہے اور یوں گویا ہو رہے ہیں ؎

رخِ روشن پسِ دیوار رکھا جائے گا کب تک
نظر کو تشنۂ دیدار رکھا جائے گا کب تک
تم اپنی خامیاں میزان سے کب تک بچاؤ گے
ترازو میں مرا کردار رکھا جائے گا کب تک
وہ رہزن قافلہ والوں کو جس نے مدتوں لوٹا
اسی کو قافلہ سالار رکھا جائے گا کب تک

شستہ کلام، دلنشیں اندازِ بیان۔ اس تحت پہ ہزار ترنم نثار
اب حضرت سلطان نظامی کو زحمت دی جا رہی ہے آپ بڑے ترنم میں جوان غزل پیش کر رہے ہیں ؎

مجھ سے چھپ کر میری آواز سے پردا کرکے
اب پریشان ہیں دیوار کو اونچا کرکے
گردشِ وقت نے خود اپنا بھروسا کھویا
ہم سے آوارہ مزاجوں پہ بھروسہ کرکے

واہ واہ کا ہنگامہ ہے اور ہر شعر دھماکہ ثابت ہو رہا ہے۔ اب فاتح صاحب نے کسی کو شاعرِ اعظم کے نام سے پکارا ہے۔ جسکا عجیب نام تو شاعری بھی عجیب اور داد بھی بے سنگم۔ لیجئے اب مولانا تسلیم گھنوری کو سنئے۔ آپ ایک قطعہ کے بعد غزل پیش کر رہے ہیں ؎

زلف بردوش گھٹا جب بھی اٹھی ہے ساقی
جام و مینا نے بھی انگڑائی سی لی ہے ساقی

کلام صاف اور معیاری ہے۔ داد مل رہی ہے اور اب آ رہے ہیں تابش بن اثر احسنی گھنوری۔ آپ اثر صاحب ہی کے انداز میں ترنم ریز ہیں ؎

راہِ الفت میں ہر اک موڑ پہ گرنے والے
چند لمحے بھی غنیمت ہیں سنبھلنے کے لئے

آپ مناسب داد پا کر جا رہے ہیں اور اب آ رہے ہیں حضرت شرف رحمانی گھنوری۔ بجا بجا ترنم، پختہ کلام۔ آتے ہی سامعین پہ جادو سا کر دیا ہے ؎

ہر کرن حسن کی چلمن سے عیاں ہوتی ہے
یہ تجلی بھی مگر دیکھو کہاں ہوتی ہے

واہ واہ۔ ہر سحر آگ تو ہر رات دھواں ہوتی ہے
آج کل گردشِ افلاک کہاں ہوتی ہے

اس شعر پہ داد کا اتنا شدید دھماکہ ہوا کہ پنڈال لرز اٹھا۔ (دروغ بر گردنِ راوی) آپ نے مقطع پڑھا ہے اور اب زحمتِ غزل سرائی دی جا رہی ہے حضرت شوق اثری رامپوری کو۔ آپنے آتے ہی ایک شعر داغا ہے اور داد کا فوارہ چھوٹا ہے۔ اسی عالم میں آپنے کچھ رباعیات کچھ اشعار، کچھ قطعات طنزیہ، مزاحیہ اور سنجیدہ۔ غرض ہر رنگ کا اچھا پڑھے ہیں اور خوب خوب داد حاصل کی ہے۔ اب مشاعرہ اپنے انتہائی عروج پر ہے۔ اب فاتح صاحب نے مجھے پکارا ہے۔ میں نے آتے ہی ایک قطعہ پیش کیا ہے ؎

اب چھٹے ظلمت دھند کے شام کے
اب ہوئے چرچے ہمارے نام کے
ولولے دیکھیں دلِ ناکام کے
اہلِ دل بیٹھیں کلیجہ تھام کے

واقعی لوگ کلیجہ تھامنے لگے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ تھکن کی وجہ سے یا تاثیرِ کلام کی وجہ سے۔ اب میں غزل کے اشعار پیش کر رہا ہوں اور امید سے زیادہ داد پا رہا ہوں ؎

بڑی مشکل گھڑی آئی مدد کر اے خدا میری
وہ بالیں پہ ہیں اور ایسے میں آئی ہے قضا میری
اڑے ہیں ضد پہ دیکھیں آج کس کی جیت ہوتی ہے
ستم تیرا مری ہمت، جفا تیری وفا میری

میں بھی کچھ داد لیکے مائک سے جدا ہو رہا ہوں اور فاتح صاحب پکار رہے ہیں۔ آخری شاعر حضرت برقی جہانی کو۔ میں بھی جا رہا ہوں اور یقیناً برقی صاحب بھی سوچتے ہوں گے کہ بڑے پھنسے۔ لیکن آپ بھی کسی سے کم نہیں آتے ہی رباعی کا بم گرا دیا ہے۔ اور فاتحانہ انداز میں غزل شروع کی ہے ؎

اک حرف کو کتاب سمجھنے لگے ہیں لوگ
ذرہ ہوں آفتاب سمجھنے لگے ہیں لوگ
ابھریں گے جب بھی گوہرِ نایاب آئیں گے
وہ جن کو غرقِ آب سمجھنے لگے ہیں لوگ

سامعین نے بھی آخری شعر سنکے پھر داد کے سب ہی ترکش خالی
[illegible]

باوا رام داس

حاجی محمد جان انجم
وزیر آبادی (لاہور)

ذات پات نہ پوچھے کو
ہر کو بھجے سو ہر کو ہو

آج سے ۵۰ سال یا ۶۰ سال قبل اور آج کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اب یہ دنیا یکسر بدل گئی۔ اور بے راہروی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ ہم نے جو دور دیکھا اس کی یاد سے ہی کچھ سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ ورنہ آج کے معاشرے کو دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ جیتے جی اس دنیا کو خیرباد کر دیں۔

میرے گھر سے ملحقہ گھر سردار نانک سنگھ پتاشہ فروش کا تھا بالکل سامنے بابو بیلی رام کا۔ دائیں بازو میں ماسٹر پیارا رام کا جو علم ریاضی کے ماہر اور شہرت یافتہ استاد تھے۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر لالہ رشی رام تھے۔ جن کا طوطی پورے ہندوستان میں بول رہا تھا لائق۔ فائق۔ ہمدرد۔ مخلص اور مرنجان مرنج۔ ان کی ہر دلعزیزی اور قابلیت کا یہ عالم تھا کہ لڑکے ہندوستان سے وزیر آباد کے ایک سکول میں آ کر داخلہ لیتے جس کا نام VICtory DIAMond JuBLee H/School تھا۔ جس کی عمارت کچی اور خستہ تھی مگر وہ علم کی شمع سے جگمگا رہی تھی۔ میرے زمانۂ طالب علمی میں علی گڑھ انڈیا سے ایک لڑکا میر صاحب نے آ کر اسی سکول میں داخلہ لیا۔ جس کی سرگذشت یہ تھی کہ وہ انڈیا میں شاید چار دفعہ میٹرک کے امتحان میں فیل ہو چکا تھا۔ کسی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وزیر آباد جا کر ماسٹر رشی رام کی شاگردگی کرو۔ انشاء اللہ میٹرک کی سند حاصل کر لو گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور پہلے سال ہی بفضل خدا اس نے میٹرک امتحان درجہ دوئم میں پاس کیا۔ ماسٹر رشی رام آنجہانی میں سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ذات پات سے بالا تھے۔ وہ ہر مذہب کا احترام کرتے میں نے دیکھا ہوں کہ مذہبی تعلیم کے پیریڈ میں وہ اپنی مذہبی تعلیم چھوڑ کر مسلم مذہبی تعلیم میں تشریف لے آتے۔ کلام پاک ادب و احترام سے سنتے۔ نعت پر جھوم جھوم جاتے۔ تعصب کا نام و نشان تک نہ تھا میری والدہ محترمہ مرحومہ مغفورہ مائی برکت بی بی۔ نے جبہ ماسٹر

میاں نبی بخش۔ دریا راجپوت۔ بہت زیرک اور صاحب رائے تھے۔ ہندو مسلم سکھ صاحبان اہم گھریلو معاملات میں میری والدہ محترمہ سے مشورہ لیتے۔ ہندو اور سکھ صاحبان مرد و عورتیں میری والدہ محترمہ کا احترام میری قوم سے بڑھ کر کرتے۔ ہمارے شہر میں گرنتھی کی بیوی میری ماں کی منہ بولی بہن تھی۔ ان کی صاحبزادی ویرو اور اس کی سہیلی چھ کور میری بہنیں تھیں۔ خدا جانے وہ کہاں ہیں مگر میں آج بھی ان کو بہن کے مقدس نام سے یاد کر رہا ہوں۔

سر شام موسم گرما میں شب باشی کے لئے سبھی لوگ اپنے اپنے مکان کی بالائی منزل کی چھتوں پر آ جاتے اور رنگا رنگ کی آوازیں سنائی دیتیں مگر ان آوازوں میں تقدس تھا۔ بابو بیلی رام کا تکیہ کلام تھا

جپ پیارے سچا نام اونکار دا

سردار نانک سنگھ پکارتے۔ واہے گرو۔ واہے گرو۔ واہے گرو جی۔ میرے بائیں بازو میں حاجی شیخ عنایت اللہ، نیوز ایجنٹ مرحوم و مغفور، کا مکان تھا۔ ان کی آواز سنائی دیتی۔ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ تو ہی تو ہے تو ہی باقی دنیا دھوکہ۔ ماشاءاللہ یہ آوازیں اتنی مانوس تھیں کہ اگر اتفاق سے کسی دن کسی کی آواز سنائی نہ دیتی۔ تو استفسار کیا جاتا۔ کیوں بھائی پتہ ہے آج بابو بیلی رام کی آواز سنائی نہیں دی۔ سردار نانک سنگھ کے بول سنائی نہیں دیئے۔ شیخ حاجی عنایت اللہ آج کیوں خاموش ہیں؟ یہ انسانی برادری تھی۔ بھائی چارہ تھا اور انسانیت کا دور دورہ۔ آمدم برسر مطلب میں اپنے عنوان سے ذرا ہٹ گیا۔ سر چاہئے تو ہٹا بھی نہیں۔ عنوان کیلئے ضروری تھا کہ اس وقت کے ماحول کی عکاسی کر دی جائے۔

ہاں تو میرے گھر کے شمال مغربی گوشے میں سردار نانک سنگھ کے مکان کے ایک گوشہ میں ایک کمرہ کھنڈر نما تھا۔ جس کی چھت بیٹھی ہوئی تھی اور اس میں سے لسوڑی کے درخت کی شاخیں اور بالائی حصہ ایک چھتری کی طرح نمودار تھا۔ اسی کھنڈر کے ایک کونے میں چراغ دانی بھی تھی۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ اس کھنڈر میں باوا رام داس سمیت

وہ بچپن میں زندہ ہو زمین میں سما گئے تھے۔ ہم نے خصوصیت سے
گھر (۲۵۰/۱۳۳۱) اینچ اور T-۷ کے قدسکیپ پیمائش نہ تھے۔ اس سے
بچے کا فرمان چتر پر کہ فیر قائم بابا سام داس کا احترام کرتے۔ انہوں نے
پہنچے دوا ستے پاکستان اللہ بلتہ تو شب ہستوں سے کہ دیتے باقاعدہ
رکھا۔ بچے بابا سام داس ہیں۔ کوئی بھی ویسی چیز نیچے نہ گرے۔ کسی
قسم کی بے ادبی نہ ہونے پائے۔

میرا چچا زاد بھائی صوفی بابو اللہ رکھا جو آجکل خانیوال ملبرٹ
کالج روڈ میں ایک ناک انٹرنیشنل ہیں۔ لڑکپن میں بے حد شریر تھے۔ انہوں
نے ایک دن اس بڑے کے درخت کے پاس جاکر واہی تباہی بکنا شروع کر دیا
کہاں ہے بابا سام داس۔ اس کی ایسی تیسی جس تس۔ بجز اس امر کے کہ
اس نے کئی دن گذر گیا رات آگئی۔ اللہ رکھا کھانا کھا کر سو گیا۔ مگر چارپائی
سے تھوڑا سا ہی سو پایا تھا۔ جیسے اسے کسی نے چارپائی سے اٹھا کر زمین
پر پٹخ دیا ہو۔ اس نے رونا پیٹنا چلانا شروع کر دیا۔ اس کی والدہ میری
پھوپھی محترمہ بھاگی ہوئی آئی کیا ہوا۔ اللہ رکھا کیا ہوا؟ ماں مجھے بابا
سام داس مار رہا ہے۔ اللہ رکھا نے جواب دیا۔ پھوپھی محترمہ نے اسے
نہلایا لباس تبدیل کر دیا اور کہا چلو میرے ساتھ کان کو ہاتھ لگاؤ۔ توبہ
کرو آئندہ کسی اللہ کے بندے کے ساتھ گستاخی سے پیش نہ آؤ گے
بابا سام داس سے معافی مانگو۔ بابا جی، بالک ہے۔ اس سے غلطی
ہوئی ہے معاف فرما دیں۔ خدا کی قدرت۔ اب اسے چارپائی پر لٹایا تو وہ
سو گیا اور صبح تک خراٹے بھرتا رہا۔ مگر اس دن سے آج تک اس نے
ایسی حرکت بھی دوبارہ نہیں کی۔

میرے آبائی گھر کے دالان میں موسم گرما میں میری والدہ محترمہ چارپائی
بچھا کر آرام فرمایا کرتی تھیں۔

ایک دن حسب معمول والدہ محترمہ یونہی آرام فرما رہی تھیں۔ میں پاس
بیٹھا سکول کا کام کر رہا تھا۔ والدہ محترمہ کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے بیدار
ہو گئیں۔ میں نے کہا ماں کیا ہوا۔ کوئی برا سپنا دیکھا۔ آپ ہڑبڑا کر
اس طرح بیدار ہوئی ہیں جیسے بھونچال آگیا ہے۔ والدہ محترمہ نے فرمایا
میری چارپائی کا رخ بدل دو۔ پینتی سرہانے کی طرف اور سرہانہ پینتی کی
طرف کر دو۔ میں نے کہا کیوں؟

والدہ صاحبہ نے فرمایا۔ بابا سام داس خواب میں آئے اور کہا ماتا جی
تیرے پاؤں ہماری طرف پڑ جاتے ہیں۔ اللہ کے بندے مسلمان عورت

کرتی ماتا جی کہہ کر پکارا۔ اس سکھ نے جو بیٹے کی شکایت کی کہ محلہ میں
پالا ہوں یا جیون کا طالب علم تھا میرے گھر سے میری کتابیں۔ مکانوں کی دوسری
منزل چوبارہ میں ہوتے تھے۔ اس لئے مجھے کپڑے تبدیل کرنے کے لئے
کتابیں رکھنے کے لئے اور سستانے کے لئے چوبارہ میں اکثر جانا آنا پڑتا۔ جولائی
کی ایک دوپہر کو میں سکول سے گھر آیا تو سیڑھیاں چڑھ کر سیدھا اپنے
چوبارہ کی طرف بڑھا۔ میرے مکان کی نیچی منزل کی چھت اور سردار نانک
سنگھ کے مکان کی چھت برابر تھی۔ صرف ایک ہاتھ بھر کی دیوار تھی جو
بطور حد بندی کھنچوا دی گئی تھی وہ بھی درمیان سے ٹوٹی ہوئی۔ تاکہ آر
پار آنے جانے کا راستہ بنا رہے۔ نانک سنگھ کی صاحبزادیاں پھول
اور ستی اور ان کا صاحبزادہ سردار بھگت سنگھ بھی کا جاننے
ہمارے گھر آتے اور بے دھڑک دوسری منزل پہ چلے جاتے چاند دیکھ
کر اپنا برت ان سے توڑتا ہوتا۔ ستی اور پھول اور بھگت سنگھ
جو سب بیٹے بیٹیاں ملازم ہیں میرے لئے بھائی بہنیں تھیں۔ بفضل خدا
جا رہا جیون اسی طرح گزر سا۔

ہاں تو میں اپنے چوبارہ کی طرف بڑھا تو اتفاقاً میری نظر سردار
نانک سنگھ کے مکان پر پڑی۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس میں نے
ایک انتہائی خوبصورت اور تندرست سا لڑکا دیکھا۔ اس کا اوپر کا دھڑ
نمایاں تھا۔ بچہ ایسا ہی تھا جیسے ہندو بھائیوں کے بالے ہوتے ہیں
بالک کا نچلا دھڑ دیوار کی اوٹ میں تھا۔ وہ لباس سے بے نیاز تھا۔ اس
لئے نچلے حصے کی پردہ پوشی کے لئے دیوار کی اوٹ لے رکھی تھی۔ بچے کی عمر
۸-۹ سال کے لگ بھگ ہو گی۔ چھاتی کشادہ ابھری ہوئی اور سڈول
مسل ابھرے ہوئے۔ آنکھیں روشن کشادہ اور بچے موتیوں کی طرح آبدار
بچہ انتہائی خوبصورت رعب دار تھا۔ بال سنہرے گھنگھریلے اور ویسے
جیسے سادھو لوگ رکھتے ہیں۔ میں نے قریباً ۱۹-۲۰ سال انگریز
لوگوں میں کام کیا ہے۔ دفتروں کے علاوہ مجھے ان کے بنگلوں میں
بھی جانا پڑتا۔ ان لوگوں کو خصوصاً ان کی عورتوں کو اپنے بالوں پر
بڑا فخر ہوتا ہے۔ مگر میں نے اس قدر خوبصورت سنہری گھنگھریلے
بال آج تک نہیں دیکھے۔ جیسے اس بالے کے تھے۔ وہ جیتی کا زندہ
بالا میرے مکان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔ کیا دیکھ رہا تھا؟
یہ آج تک معلوم نہیں اور نہ ہی اتنا حوصلہ پڑا کہ پوچھ لوں۔ بالا بالو کیا
دیکھ رہے ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں یہ فیصلہ ہی نہ کر سکا کہ یہ بچے

کون ؟ ۔ ہاں میں نے یہ خیال ضرور کیا کہ نیچے جاکر والدہ صاحبہ سے یہ واقعہ بیان کرتا ہوں اور ماں کو اوپر لاکر بچہ دکھاتا ہوں اور دریافت کرتا ہوں کہ یہ بچہ کون ہو سکتا ہے۔

ہوا یوں کہ میں کپڑے بدل کر، کتابیں لیکر نیچے آنے لگا سردار نانک سنگھ کے مکان کی طرف دوبارہ دیکھا تو وہ بچہ غائب تھا۔ سو خواب تھا جو کچھ دیکھا۔ جو سنا افسانہ تھا۔ بادارہ پوش ہو چکا تھا۔ اس لئے میں نے والدہ محترمہ سے کوئی تذکرہ نہ کیا۔ ہاں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ باوا رام داس ہوگا۔ جس کے بارے میں ہمارے بڑے بزرگوں نے ہمیں بتا رکھا تھا۔

تقسیم پاک و ہند کے بعد تو بسلسلہ معاش لاہور میں مقیم ہوا بفضل خدا میرے بچے یہاں ملازم بھی ہیں۔ اور زیر تعلیم بھی۔

گو وزیر آباد سے قریباً ۶۰ میل کے فاصلہ پر ہوں۔ مگر مجھے اپنی جنم بھومی کے ذرہ ذرہ سے محبت و انس ہے۔ میں نے وہاں تعلیم حاصل کی میرا بچپن وہاں گزرا۔ میری جوانی وہاں گزری اور خوب ٹھاٹ سے گزری اللہ میاں نے ہمیں سب کچھ دے رکھا ہے۔ میرے برادر اکبر ماسٹر میاں حمید اللہ ملٹری کنٹریکٹر تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے ناز و نعم سے پالا پوسا کیونکہ میں صرف ۶ ماہ کا تھا کہ والد محترم کے سایہ عاطفت سے محروم رہ گیا۔

وزیر آباد میں میرے والدین کی قبریں ہیں۔ جن کی زیارت میرے لئے باعث رحمت اور خیر و برکت ہے۔ وہاں کے صاحب مزار اور ولی اللہ حضرات سے مجھے دلی لگاؤ اور عقیدت ہے میں ان کے مزارات کی حاضری کرتا ہوں۔

باوا رام داس کا میں اب بھی احترام کرتا ہوں۔ جس کا یہی ثبوت یہ مضمون ہے۔

سچ ہے ہر کسے بھی سو ہر کا ہو۔

●●●

غزل

خلش مسروری
پوسد۔ ضلع ایوت محل

گلشن زیست پُر بہار نہیں
حوصلے جن کے پائیدار نہیں

جس میں پھولوں پہ بھی نکھار نہیں — وہ خزاں ہے خزاں، بہار نہیں
دل مرا التجا گذار نہیں — اس لئے ان کو مجھ سے پیار نہیں
آپ کا اعتبار کیا کرتا — خود مجھے اپنا اعتبار نہیں
مجھ کو پہچان ہو گئی اپنی — اب مجھے تیرا انتظار نہیں
کیوں کروں التجائے لطف و کرم — کیوں شکوے ان کی بار بار نہیں
دیر کیوں ہے شیخ بادہ نوشی میں — کیا کوئی مے سازگار نہیں

شکر ہے کردار کی قسم خلش
دامن زیست داغدار نہیں

ہندوستان اور اسپتالوں کی تعمیر

ذائکہ اللہ آبادی

اپنے قومی رہنماؤں سے کوئی پوچھے سوال
آج کل ہندوستان بھر میں ہیں کتنے مریض
اور یہ بھی وہ بتائیں تو ہے یہ اُن کا کرم
آج تک کتنے وطن میں بن چکے ہیں اسپتال

دیش کی مردم شماری پر نگاہیں رکھ کر فقط
اسپتالوں کے دکھانے چاہیں تعمیری کمال
الغرض آبادی جتنی ہے وطن کی بہبود
اتنے ہی افراد کے قابل بنائیں اسپتال

ڈاکٹر ان میں نہوں یا وید جی کوئی حکیم
اور دوا دارو کا بھی پڑتا ہے پھر نہ دوا کا کال
غم تہی مرتے ہیں روزانہ ملاپ پیٹ بھر جو لوگ
قومی خدمت کے بتاتے جائیں جلد تک لازوال

بندیلکھنڈ کا ایک ابھرتا شاعر
ساغر ساگری

اختر ساگری

موجودہ مدھیہ پردیش کا شمال مغربی حصہ جو بندیلکھنڈ کہلاتا ہے صدیوں سے ہر لحاظ سے پسماندہ چلا آرہا ہے اور جسے ہندوستانی سیاست اور تاریخ میں ہمیشہ نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ اپنے گوناگوں مسائل اور جبلتوں کی وجہ سے انتہائی منفرد بھی ہے۔ یہ علاقہ اپنی جاگیردارانہ تہذیب اور ایک انتہائی رسیلی اور میٹھی زبان کا مرکز بھی ہے جس کی جڑیں ماضی میں بہت دُور تک چلی گئی ہیں۔ لیکن اردو زبان و ادب کے لئے یہ علاقہ اتنا ہی سنگلاخ سمجھا جاتا ہے۔ جتنا جنوبی ہند کا۔ کسی زبان کے لئے یوپی یا پنجاب۔ حالانکہ یہ نظریہ انتہائی لغو اور بے بنیاد ہے۔ یوپی۔ دہلی اور بھوپال والے جو اپنے آپ کو اہلِ زبان کہتے ہیں۔ انھوں نے کبھی اس علاقے کے شعراء اور ادباء کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ جبکہ بندیلکھنڈ کے کچھ شعراء کا کلام ہندوستان کے کسی بھی علاقے کے اردو شعراء کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔

ایک طویل بحث ہے اور علاقائی عصبیت کی بدترین مثال کہی جا سکتی ہے۔ بہرحال جناب ساغر انصاری اسی بندیلکھنڈ کے ایک مشہور شہر ساگر کے ایک اچھے غزل گو شاعر ہیں۔ ان کا پورا نام عبدالوہاب انصاری اور تخلص ساغر ہے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد ہی اپنے بڑے بھائی جناب کوثر سلامی کی غزلوں سے متاثر ہو کر ان کی طبیعت شعرگوئی کی طرف مائل ہونے لگی کیونکہ پورے شہر کا ماحول محترم سلام صاحب ساگری کی شاعرانہ سرگرمیوں کے سبب ہمیشہ سے شاعرانہ رہا ہے۔ طبیعت کی روانی کام آئی اور بہت جلد شعر کہنے لگے۔ غالباً ۱۹۶۲ء میں سلام صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل ہو گیا تھا اور تبھی سے باقاعدہ مشاعروں میں شریک ہو کر داد و تحسین حاصل کرنے لگے۔ یوم پیدائش ۱۰ نومبر ۴۲ء بتایا جاتا ہے اس حساب سے عمر عزیز کے چالیس سرد و گرم موسم دیکھ چکی ہے۔ لیکن شاعری کی عمر اکیس سال بنتی ہے۔ مگر ان کے شعری سرمائے پر نظر ڈالی جائے تو پچھلے اکیس سال کی مشق اپنی پوری جولانیوں کے ساتھ ان کے کلام میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں سے کچھ منتخب اشعار میں اپنی پسند سے قارئینِ "شانِ ہند" کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

وہ یہ کہتے ہیں کہ نکلے گا کبھی رات کو چاند
اور میں ہوں کہ اسی رات سے گھبراتا ہوں

سادگی تھی کہ ان کی شوخی تھی
رنگ جو بھی تھا قاتلانہ تھا

ایک جگہ غمِ جاناں کی وارفتگی میں فرماتے ہیں ؎

یہ سکونِ قلب تو ہے پیش خیمہ موت کا
تیرے قرباں اے نگاہِ شوق پھر تڑپا مجھے

بیتے ہوئے لمحوں کا ہر نقش ابھر آئے
اے شوخ نظر مجھ کو اس طرح سے تڑپانا

فکرِ ماضی سے غرض اور نہ حاضر سے گلہ
ہر نئے موڑ پہ اک عزمِ جواں روشن ہے

ٹوٹے ہوئے ساز پر رکھ دے تو اپنی انگلیاں
نکلے گی دلنواز دھن خود کو نہ اشکبار کر

ہرچند کہ ساغر کی غزلوں کا رنگ انتہائی قدیم ہے پھر بھی ان کے لہجے کا تیکھا پن ان کی فکری بصیرت کی غمازی کرتا نظر آتا ہے جو میرے خیال میں ان کے امید افزا مستقبل کا امین ہے۔

•••

ویران مسکن

عابد نقوی
لندن

میں تنہا ہوں۔ ہاں بالکل تنہا .... اس تنہائی کے لئے وہ ہمیشہ دعائیں مانگا کرتا تھا۔ اور تنہائی جو ایک سکون تھی ایک آرزو تھی لیکن اس کی یہ بھول تھی۔

اکثر تنہائی ایک عذاب بھی بن جاتی ہے اسی سے گھبرا کر لوگ خودکشی بھی کر لیتے ہیں۔

فرخ اپنے آپ بڑبڑاتے ہوئے جیب سے سگرٹ نکال کر سلگانے لگا۔ اسی تنہائی کی خاطر میں نے اپنے والدین کو چھوڑا۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو چھوڑا۔ میں کتنا بدنصیب ہوں۔ مجھے واقعی سزا ملنی چاہئے۔ میں نے خود ماں باپ بھائی بہن کی محبت اور نعمت کو ٹھکرایا۔ اب میں جلتی ہوئی سگریٹ کی طرح جل رہا ہوں۔ اب میرے والدین مجھے دوبارہ نہیں مل سکتے۔ اس کے دماغ میں یہ سوال اٹھا۔ اس کی وجہ؟

جب جوان اولاد۔ والدین کو ٹھکرا کر گھر سے نکل جاتی ہے۔ اور ان کی قدرتی محبت اور احسانات کو منوں مٹی کے نیچے دبا جاتے ہیں...... وہ جگہ جہاں ماں کا ہاتھ پکڑ کر زمین پر قدم رکھتا ہے۔ جہاں وہ اپنا بچپن گزارتا ہے۔ لیکن پروان چڑھنے کے لئے کہیں اور چلا جاتا ہے

وہ ٹھیک ہی کہتا تھا بیٹا باپ کا حق کبھی ادا نہیں کر سکتا چاہے ساری زندگی اس کے قدموں میں گذار دے۔

فرخ کے دل میں ایسے سوال اس طرح اٹھ رہے تھے۔ جس طرح موجیں دریا میں تھپیڑے مار رہی ہوں۔

اب اس کا سگرٹ جل کر انگلیوں تک آپہنچا تھا۔ اس وقت تو اسے سگریٹ بھی سکون نہ دے سکا۔ بلکہ سگریٹ کی جگہ وہ خود جل رہا تھا۔

خیالات کے اس سلسلے کو وہ مزید بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے گھبرا کر کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ باہر عجیب سماں تھا۔ بارش رک گئی تھی۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ ہوا تیز چل رہی تھی۔ درخت سسکیوں کی آوازیں فضا میں بکھر رہی تھیں۔ سڑک پر کاریں تیزی سے منزل کی طرف دوڑ رہی تھیں۔ گذرنے والوں کو کسی کے غم سے کیا سروکار

ہر شخص کو اپنی ہی سلگائی ہوئی آگ میں جلنا ہوتا ہے۔ باہر موسم خوشگوار تھا۔ لیکن وہ موسم بھی اسے سکون نہ دے سکا۔ وہ تو گزرے ہوئے حالات کے دلدل میں پھنس چکا تھا۔ جہاں سے واپسی ناممکن تھی۔

ایک مرتبہ پھر۔ کرامت اللہ صاحب کے وہ آخری کلمات جو انہوں نے اپنی دامادی میں لینے پر سنائے تھے۔ اس کے ذہن میں پانی کے بلبلے کی طرح آ اٹھے ...... پھر۔

نکل جاؤ اس چار دیواری سے۔ تم آج سے اس قابل نہیں ہو کہ یہاں چند منٹ بھی رہ سکو۔ میں نے تمہیں شریف آدمی سمجھ کر اپنی اولاد بنانا چاہا تھا۔ لیکن یہ ہرگز ہرگز سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ تم اتنی گھٹیا پسند کے مالک ہو گے۔ ایک ہیرے کو چھوڑ کر معمولی حیثیت کی ملازمہ پر اپنی پسند کا اظہار کرو گے ... تمہیں بڑے گھروں میں رہنے کا اور اونچی سوسائٹی میں بیٹھنے کا شعور بھی نہیں ہے۔

میں تمہیں بہت بلندی پر پہنچانا چاہتا تھا ـــــ لیکن تم نیچ ذات کے نکلے اور نالی میں گرے ہوئے کیڑوں کی دوڑ میں شامل ہو گئے۔

اسی لئے ہیرے جیسی لڑکی اور معمولی ملازمہ میں تمہیں تمیز نہیں رہی دفع ہو جاؤ میری نظروں سے اب دوبارہ تمہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔

اور پھر میں .... دوبارہ اسی ویران اور تنہا زندگی میں لوٹ آیا۔ اس نے خود اپنے آپ کو یقین دلایا۔ جیسے اسے خود اپنے پر اعتماد نہ ہو۔

ماضی کی مثال بھی برتن میں رکھے ہوئے دودھ کی سی ہے جو ذرا سی حرکت یا ٹھیس سے چھلک کر باہر آجاتا ہے۔ اور انسان کے سامنے وہ بیتے ہوئے لمحے گندی ہوئی یادیں ...... زندگی کے اتار چڑھاؤ۔ ایک فلم کی طرح گھوم جاتے ہیں۔ بعض لوگ پرانی یادوں کو ذہن میں لا کر خوشی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن بعض منزل زخموں کو پھر ہرا کر کے آنسو بہاتے ہیں۔ یادوں کے آنسو جو بظاہر ایک آنکھ سے نکل کر گرتے ہیں۔ لیکن کبھی خوشی کا نقاب اوڑھ لیتے ہیں اور کبھی غمی کا مگر ان کی اصلیت کا اندازہ ـــ آنسو گرانے والا یا جس کے لئے گرائے جاتے

ہیں وہ بھی مل سکتا ہے۔

میری پہلی ملاقات آج سے چند سال پہلے سیٹھ کرامت اللہ سے ایک بینک میں ہوئی تھی۔ وہ ڈائرکٹر تھے۔ اور میں معمولی کلرک ملازم ہوا تھا۔ لیکن میری کارکردگی سے بینک کے سب افسر خوش تھے ...

جب میری ذاتی عادت کا لوگوں کو علم ہوا اور اس کا ذکر ڈائرکٹر کرامت اللہ تک پہنچا تو انھوں نے ازراہِ ہمدردی یا اخلاق متاثر ہوکر مجھے اپنے گھر میں ایک کمرہ رہنے کے لئے دیدیا اس کے علاوہ میری ترقی کے متعلق بھی دلچسپی ظاہر کی ——

میں اب پھر ایک مرتبہ بھرے گھر میں منتقل ہوچکا تھا۔ جہاں مجھے ہر طرح کا آرام تھا۔ بلکہ گھر والوں سے محبت اور شفقت بھی ملی۔ اب میری ترقی ایک کلرک سے اکاؤنٹنٹ کی جگہ پر ہوچکی تھی۔ میں نے چند ہی دنوں میں محسوس کرلیا۔ اس اونچے ایوان میں میری حیثیت ایک بیوہ ماں کی سی تھی مجھے کتنا اوپر چڑھا دیا گیا ہے۔ پھر میں اپنے آپ سے اس اونچی سوسائٹی اور اطلس و کمخواب کے پردوں کے پیچھے گمشدہ تصور میں کھو جاتا۔ بیش بہا نعمتوں کے علاوہ مجھے اس گھر میں ایک خوبصورت سی دراز قد سنہرے بالوں والی لڑکی سے بھی محبت کرنے کا موقع ملا۔ جو خود بھی مجھ میں دلچسپی لیتی تھی۔

چند دنوں میں ہمارے درمیان تکلفات کی دیوار خود بخود گرگئی۔ اور ہم دونوں چاہتے تھے کہ جلد سے جلد ایک ہو جائیں۔ وہ سیٹھ کرامت کی بیٹی تھی۔ مجھے ہر چیز میسر تھی اور مجھے بھی اسی ماحول میں رہنا تھا۔

لیکن اسی گھر میں ایک غریب بیوہ عورت کی لڑکی بھی کام کرتی تھی۔ وہ اکثر میرے کمرے میں اپنی مالکہ کا حکم لیکر آجایا کرتی تھی اور ادھر ادھر کی باتیں کرکے میرا بھی دل بہلاتی۔ کئی بار وہ ڈانٹ بھی گئی۔ ثریا تیرا کام باورچی خانہ کا ہے جاؤ اپنا کام کرو۔ شاید وہ سیٹھ کی بیٹی کا دل اب دھڑکنے لگا تھا کہ ثریا جو خوبصورت بھی تھی لیکن ملازمہ تھی کہیں مجھ میں دلچسپی نہ لینے لگے۔ چونکہ اس معاملہ میں عورتیں بہت کچھ حاسد ہوتی ہیں۔

ایک دوپہر کو جب کہ گھر کے لوگ اپنے اپنے ایئرکنڈیشن کمروں میں آرام کر رہے تھے۔ مگر میں دفتر کے کام میں مصروف تھا گرمی شدت کی تھی.. میں نے سوچا ذرا کام ختم کرکے گھر جاکر تھوڑا سا آرام کروں۔ جب گھر پہنچا تو ثریا فوراً شربت بناکر میرے کمرے میں لے آئی۔ آخر میں ثریا کی خواہش کا خیال رکھتا تھا کہ آنکھ بچاکر اس کے اور اس کی ماں کے لئے کپڑے ضرورت کا سامان لادیتا۔ اور وہ بہت دعائیں دیتیں۔

میرے کمرے میں آتے ہی اس نے شربت کا گلاس پیش کرتے ہوئے کہا۔

بابوجی آپ نے میری ہر خواہش پوری کی ہے۔ لیکن میں ہوں ایک معمولی ملازمہ۔ مجھے آپ کے کمرے میں آنے اور بات کرنے سے منع کردیا گیا ہے۔

ہوں۔ کیوں؟ میرے منھ سے نکلا۔ لیکن اس نے لاپرواہی سے کیوں کا رُخ پھیر دیا۔ اور کہنے لگی آپ نے کبھی مجھ سے ایک بات کے متعلق نہیں پوچھا۔ وہ ہے میری پسند —— اچھا تو تم اب اپنی پسند بتانا چاہتی ہو۔ ضرور بتاؤ کون ہے وہ میں کوشش کروں گا کہ تمہاری زندگی بھی خوشیوں سے بھر جائے۔

وہ ایک لمحہ خاموش رہ کر بولی۔ بابوجی وہ آپ ہی تو ہیں۔

یہ تم کیا کہہ رہی ہو ثریا۔ میرے تو پاؤں تلے سے جیسے زمین نکل گئی ہو۔ میرے ہاتھ سے رومال گر پڑا جس سے میں پسینہ پونچھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ثریا تھوڑی دیر خاموشی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ بابوجی دنیا میں انسان خلوص و محبت کا بھوکا ہے۔ شکل و صورت کا نہیں دولت کا نہیں ... شاید آپ بُرا مان گئے۔ آپ خاموش کیوں ہیں۔ شاید میں نے آپ کی حیثیت کو نہیں پہچانا لیکن آپ کے خلوص و ہمدردی نے یہ احساس تک ختم کردیا تھا کہ میں ایک معمولی ملازمہ ہوں اور آپ ایک صاحب۔ اگر ہوسکے تو مجھے معاف کردیجئے گا۔ اور ثریا چلی گئی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے یہ الفاظ کہکر جاتے جاتے میرے منھ پر۔ سماج پر ایک بھرپور تھپڑ مارا ہے۔

مگر میرا سانس یوں پھول رہا تھا جیسے میلوں کی مسافت طے کرکے آیا ہوں۔ میرا سارا جسم ایئرکنڈیشن میں ہونے کے باوجود پسینہ سے بھیگ گیا۔ شاید وہ ٹھیک کہتی تھی نوکروں کو اتنی لفٹ نہیں دینا چاہئے۔ ورنہ وہ اپنی اوقات تک بھول جاتے ہیں۔

شریف رذیل

ڈاکٹر ارمان بلاری

"ساہو صاحب آپ کو داروغہ جی نے یاد کیا ہے" سپاہی نے کہا۔
"اسی وقت؟" شراب کا پیالہ ایک طرف رکھتے ہوئے ساہو صاحب نے سپاہی سے پوچھا۔
"جی ہاں اسی وقت۔ گستاخی معاف ہو"
"اچھا چلتا ہوں۔ خیریت تو ہے؟"
"خیریت کیوں نہیں ہوگی صاحب" سپاہی نے قمیض کا کالر ٹھیک کرتے ہوئے جواب دیا۔ ساہو صاحب اٹھے اور سپاہی کو ساتھ لے کر کار سے روانہ ہوئے۔ داروغہ جی تھانے میں ان کا انتظار کر ہی رہے تھے۔ دیکھتے ہی ان کا سواگت کیا اور کھڑے ہو گئے۔ ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ "بے وقت تکلیف دینے کی معافی چاہتا ہوں ساہو صاحب" داروغہ جی نے نرمی سے کہا۔
"نہیں نہیں صاحب ایسی بھی کیا بات ہے جب کام آپڑے تو وقت بے وقت کیا۔ حکم فرمائیے کیا خدمت ہے بندے کے لائق"
"یہ چار ڈکیت آپ کے چونہ بنانے کے بھٹے پر کہیں ڈکیتی ڈالنے کا پروگرام بناتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ کچھ بھاگ بھی گئے۔ میں نے سنا ہے کہ ایسا کئی بار ہوا ہے کیونکہ وہاں جنگل ہے کیا آپ کو اس کا پتہ نہیں؟"
"آپ نے سنا ہوگا مگر میں نے کبھی نہیں سنا بھٹے پر بسنے والے میرے نوکروں نے بھی کبھی اس قسم کی بات بتائی نہیں تھی۔ کیا یہ ڈکیت ہیں" چاروں گرفتار لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔
"جی ہاں چاروں ڈکیت ہیں ایک طمنچہ ان کے پاس سے برآمد ہوا ہے ان کے جو ساتھی بھاگ گئے ان کے پاس اور بھی خطرناک ہتھیار ہو سکتے ہیں" جنرل نیازی کی طرح گھبرائے انداز میں بولے۔ ساہو صاحب سردی کی زیادتی میں اوور کوٹ کا کالر سنبھالتے رہے اور کچھ سوچتے رہے ایک نظر ان چاروں پر پھر ڈالی سب نیم عریاں کمزور سا غریب بکھرے گھبرائے ایک طرف بیٹھے تھے۔ انداز بھکاریوں جیسا تھا۔ مگر یہ سب پولیس کی نظروں میں ڈکیت تھے۔ ساہو صاحب لمحہ بھر کے بعد ان سے بولے "کیوں بھئی تم لوگوں کو داروغہ جی نے میرے بھٹے پر سے پکڑا ہے؟"
"ہاں سرکار یہ سچ ہے"
"اور یہ طمنچہ بھی تمہارا ہی ہے؟"
"جی"
"اور تمہارے کچھ ساتھی بھی تھے جو بھاگ گئے ہیں"
"جی" کانپتے ہوئے ایک نے کہا۔
"ٹھیک ہے داروغہ جی جب مجرم خود اقرار کر رہا ہے تو اس سے بڑا اس کے مجرم ہونے کا اور ثبوت کیا ہو سکتا ہے جو بھی مناسب کاروائی سمجھو کر دیں چلا" ساہو صاحب یہاں سے سیدھے گھر کو جانے کا ارادہ سے اٹھے تھے لیکن راستے میں خیال بدل گیا اور بھٹے پر جا پہنچے۔
"پنڈت جی" اندر سے آواز لگائی۔ بھٹے پر سے پنڈت جی نے مالک کی آواز پہچان کر فوراً کہا۔
"آیا سرکار" پاس آکر نمسکار کی اور پھر بولے "اتنی رات گئے کیسے کشٹ کیا سرکار خیریت تو ہے"
"کیا داروغہ جی یہاں سے چار ڈکیت پکڑ کر لے گئے ہیں؟"
"جی ہاں چار آدمیوں کو پکڑ کر تو لے گئے ہیں لیکن وہ ڈکیت نہیں بھکاری ہیں۔ بہت دنوں سے رات کو یہاں آکر سو جاتے تھے دن بھر بھیک مانگتے ہیں۔"
"بھکاریوں کے پاس طمنچے کا کیا کام"
"سرکار طمنچے کی بات کرتے ہیں۔ جب میرے سامنے پکڑے گئے تھے تو ان کے پاس سے روپے کی نہ بھی برآمد نہیں ہوئی تھی تب تمہارے کسٹم ادھیکاری کی طرح سارا جسم دیکھ لیا تھا۔ صرف ایک لنگڑے بھکاری کے پاس صرف ایک ٹکڑا مردہ کی کھال تھی وہ تو سچ مچ بھکاری ہیں۔ پولیس والے تو ان کے پاس رائفل بھی دکھا سکتے

زندگی

از سعید متھراوی

صبح آٹھ بجے
ساتواں دو سالہ بچہ بابا کہہ کر بیدار کرتا ہے
نو بجے غسل
ساڑھے نو بجے ناشتہ، ایک کپ چائے دو سلائس
کے چیری
دس بجے آفس روانگی
ایک گھنٹہ بس کی لائن
ساڑھے گیارہ بجے آفس میں حاضری
باس کی غصہ اور حقارت میں بھری دو موٹی موٹی آنکھیں
ڈانٹ پھٹکار، احساس شرمندگی سے جھکی گردن
نگاہیں فرش پہ ٹکی ہوئی ہیں۔
ایک بجے دوپہر کو کھانے کی چھٹی
حسب معمول دو پاؤ ایک انڈا
دو بجے ڈیوٹی
چھ بجے چھٹی
دو گھنٹہ بس کی لائن۔ پھر بھی دھکا مکی
رات آٹھ بجے دالی بھات، بچوں کی چیخ پکار!!
نو بجے دو ٹاک کی فٹ پاتھ
کاوڑی گو ہیوں کی فرش دوکانیں
ساڑھے نو بجے جوا بازی کے گرجدار آواز!!
"آلا آنے لاؤ۔ صاحب دھندا نہیں ہوا ہے۔" عاجزانہ
آواز: "ہم نہیں جانتا، پیسہ لاؤ!" دوسری بات نہیں
دس روپیہ کا بیوپار۔ ڈھائی روپیہ بچت
ساڑھے بارہ بجے تھکی ماندی اضمحلال میں ڈوبی
ہوئی خلوت،
گلے سڑوں میں کرخت آواز
"ہم گئے، آگ لگے تمہارے دھندے میں، نہ سوتے
ہیں نہ سونے دیتے ہیں۔
چلو ہٹو... میرے پاس سے، نہیں تو...؟"
مایوسی کا کرب ناک طوفان
اس کا وجود عالم میں ایک حقیر سا تنکا
بغل میں مختصر سا بستر، حقارت سے پیر پٹخنے کی
آواز۔
جھٹکے سے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی ناگوار
اور مایوسانہ بازگشت
دل کی گہرائی سے نکلی ہوئی سرد آہ
رات... نو بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک کا ناگوار
فاصلہ۔
بیوی کی حقارت میں ڈوبی ہوئی انتقامی
کروٹ۔
دونوں طرف
بے کلی، اضطراب، بے چینی، پھر چوڑے روڈ
کے فٹ پاتھ۔
نیند کا ٹھنڈا آغوش، گہرا اندھیرا۔
کرب کی تلخی کا علاج۔ کچھ بھی نہیں؟
معاشی بدحالی، عارضی سکون، پھر اضطراب
بے چینی، لا علاج۔
وقت کا بے رحم چکر جو چل رہا ہے چلتا رہے گا

ایک سعادت مند شاگرد

کنہیالال کپور

سعادت مندی (فرمانبرداری) اور شاگردی دو متضاد چیزیں ہیں۔ آجکل شاگرد گستاخ ہو سکتا ہے، نافرمانبردار ہو سکتا ہے احسان فراموش ہو سکتا ہے۔ مگر سعادت مند نہیں۔ " وفا " کی طرح سعادت مندی پر بھی داغ دہلوی کا یہ شعر صادق آتا ہے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہہ دو ✦ کبھی گویا کسی میں تھی ہی نہیں

آج اگر چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں۔ مولانا حالی جیسا شاگرد جسے اپنے استاد غالب پر ناز تھا۔ یا سوامی وویکانند جیسا شاگرد جسے اپنے گورو سوامی رام کرشن پرم ہنس پر فخر تھا۔ نہیں مل سکتا۔ کبھی استاد اور شاگرد کا رشتہ ایک مقدس رشتہ ہوا کرتا تھا۔ آج کل وہ ایک مذاق بن کر رہ گیا ہے۔ تاہم آج کل بھی کبھی کبھار کسی ایسے شاگرد کا تذکرہ چھڑ جاتا ہے کہ اسے سن کر اس کی بلائیں لینے اور اسے دعائیں دینے کو بے اختیار جی چاہنے لگتا ہے۔

موگا کے سردار گوپال سنگھ واحد جو ایک نامور شاعر ہونے کے علاوہ مشہور و معروف جرنلسٹ بھی ہیں۔ اسی طرح کے شاگرد ہیں پچھلے دنوں ان کے استاد محترم جناب خواجہ محمد لطیف انصاری کا ڈسکہ ضلع سیالکوٹ (پاکستان) میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم نے ڈی ایم کالج موگا میں اردو اور فارسی کے پروفیسر کی حیثیت سے اکیس برس کام کیا تھا (مجھے بھی ان کا شاگرد ہونے کی سعادت نصیب ہوئی تھی) خواجہ صاحب عالم و فاضل ہونے کے علاوہ شیعہ مذہب کے مذہبی رہنما بھی تھے۔ وہ فارسی، اہل زبان کی طرح بولتے اور لکھتے تھے اور اس زبان کو فروغ دینے کے لئے انہوں نے متعدد کتابیں بھی لکھی تھیں جو اب نایاب ہیں۔

سردار گوپال سنگھ واحد کو اپنے استاد کی وفات کا جب علم ہوا۔ جب مرحوم کے چہلم میں صرف دو دن رہ گئے تھے۔ انہیں اپنے استاد سے جو عقیدت تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ ہر حال [illegible]۔ اور ان کے چہلم میں شرکت کرنے کی سعادت حاصل کریں۔ مگر اڑتالیس گھنٹوں میں ویزا حاصل کرنے کے لئے تمام مراحل طے کرنا ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ تاہم واحد صاحب نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ بھاگم بھاگ دہلی پہنچے۔ اور سفارت خانہ پاکستان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہاں ان کی ملاقات سفارت خانہ کے دو معزز اراکین جناب خاور زمان اور بی اے حلیم سے ہوئی۔ انہوں نے واحد صاحب کے اشتیاق اور عقیدت مندی کے پیش نظر انہیں صرف ۲۴ گھنٹوں میں ویزا جاری کر کے اپنے استاد کے چہلم میں شرکت کرنے کے قابل بنا دیا۔

جب واحد صاحب خواجہ صاحب کے آستانے پہنچے۔ انہیں شیعہ علماء دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ایک لمحہ کے لئے انہیں کچھ نہ سوجھا سید عطاء اللہ شاہ بخاری بہ نفس نفیس چہلم میں شرکت کے لئے تشریف لائے ہیں۔ یاد رہے واحد صاحب کی شکل خاصی حد تک بخاری صاحب سے ملتی جلتی ہے۔ جب انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو تمام مسلمانوں نے بسم اللہ، سبحان اللہ، جزاک اللہ کہہ کر ان کا استقبال کیا۔ اور فیصلہ کیا کہ واحد صاحب کی لائی ہوئی دستار (پگڑی) ہی دستار بندی کے لئے منتخب کی جائے۔ خواجہ صاحب مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے وقت انہوں نے اس جذباتی انداز میں تقریر کی کہ سامعین کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

واحد صاحب کی اس سعادت مندی اور عقیدت مندی کا ذکر پاکستان کی تمام اخباروں میں خاص اہتمام کے ساتھ کیا گیا۔ انہیں " سفیر انسانیت " کا خطاب دیا گیا اور ان کی مروت اور وضعداری کا بڑی فراخ دلی سے اعتراف کیا گیا۔ ایک مشہور صحافی نے خبر شائع کرتے وقت عنوان کے طور پر اس شعر کا حوالہ دیا

گزشتہ عہد کی یادوں کو پھر کرو تازہ
نئے چراغ جلاؤ۔ بڑا اندھیرا ہے

(فراق گورکھپوری)

●●●

امتیاز جے پوری

سید ملک نظام الدین مہدوی، احمد آباد

وطن جے پور۔ مگر کاروبار، مسکن احمد آباد۔ مجھے وہ زمانہ یاد ہے جب زمانہ طالب علمی میں سکول کے ہیڈ ماسٹر اور دوسرے اُستاد صاحبان امتیاز صاحب سے نغمے اور نظمیں سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ امتیاز کی اس خوبی کے باعث ان کو یہ رعایت حاصل تھی کہ تعلیم کے حصول کے ساتھ ساتھ زیادہ تر وقت ہر کلاس میں نظمیں پڑھیں۔ استاد صاحبان اور سکول کے طلباء امتیاز کی پُر سوز آواز میں کھو جاتے تھے۔ یہیں سے انھیں شعر و شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ اور امتیاز نے اپنی استعداد کے مطابق اشعار کہنے شروع کئے۔

جب تحریک گجرات شروع ہوئی تو امتیاز صاحب نے اس تحریک کی حمایت میں نظمیں کہیں اور انھیں اکثر جلسوں میں اپنی پُرسوز آواز میں سنایا۔ اور اسی وجہ سے امتیاز صاحب گجرات کے مزدور لیڈر آنجہانی اندولال یاگنک کی آنکھوں کا تارا بن گئے۔ اور سارے گجرات میں مزدور شاعر کے طور پر مشہور ہو گئے۔

آج خدا کے فضل و کرم سے امتیاز صاحب ہر صنفِ شاعری میں دسترس رکھتے ہیں۔ بے شک زمانہ بدل گیا ہے مگر جناب امتیاز کے مزاج میں وہی منکسر المزاجی۔ کم سخنی۔ ملنساری۔ اور شیریں بیانی موجود ہے۔ جھوٹی تعریف۔ جھوٹی شہرت۔ اور خود پسندی سے انہیں شروع سے بیر ہے۔

امتیاز گفتگو کرتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ اس کی زبان سے میر و غالب کی دلی کی ٹکسالی زبان پھر زندہ ہو رہی ہے۔ ایک بار ان سے ملاقات کرنے کے بعد یہ حسرت رہتی ہے کہ ان سے پھر سلسلہ ملاقات ہو سکے اور گفتگو کا موقع مل سکے۔ امتیاز نے کم عمری میں ہی زندگی کے نشیب و فراز دیکھ لئے ہیں۔ اس لئے اپنے تلخ تجربات کے باعث یہ ایک دُور اندیش فکر کا مالک ہو گیا ہے۔

شاعر وہی اچھا ہوتا ہے جو انسان اچھا ہو۔ امتیاز کسی کی دل شکنی گناہ سمجھتا ہے۔ فریب کھا سکتا ہے مگر کسی کو فریب نہیں دیتا۔

اُردو ادب اور اُردو شاعری کا امتیاز دلدادہ ہے اور اُردو کے لئے اپنی زندگی تک دینے کو تیار ہے۔ جب تک امتیاز ایسے جانباز زندہ ہیں۔ اُردو کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ امتیاز کے کچھ اشعار سنئے۔

اگر تو دیکھ کون مری چشمِ تر میں ہے
تیرا خیال تیرا تصور نظر میں ہے

میں جی رہا ہوں دہر میں شرمندگی کے ساتھ
یارب یہ کیا سلوک مری زندگی کے ساتھ

جیسا بھی جس نے چاہا مجھ کو تراش ڈالا
چٹان کی طرح میں پھر بھی کھڑا رہا

میں خوش نصیب ہوں کہ نظر تم نے پھیر لی
اچھا ہوا تمہارا نشانہ بدل گیا

مرے رقیب خبردار کر رہے ہیں مجھے
کسی رفیق کا خنجر مری تلاش میں ہے

میں بے وفائی کا الزام دوں تو کس کو دوں
ہر ایک شخص پیمبر ہے کیا کیا جائے

زندگی کی دیکھ کر تنہائیاں۔ موت بھی لینے لگی انگڑائیاں
لے چلو میرا جنازہ دھوم سے۔ اور بچھا دو لاش پر تنہائیاں

دعا ہے کہ امتیاز کو عمر طویل دے اور یہ ملک۔ قوم۔ اور اُردو کے لئے اسی طرح سینہ سپر رہے۔

شاب وادر (گوالیار)

چہرے پہ تجربات کی پرچھائیاں ملیں
رسوائیوں کا خوف تھا رسوائیاں ملیں
ماحول کوئی راس نہ آیا ترے بغیر
محفل کبھی ملی، کبھی تنہائیاں ملیں
کرتے رہے سفر ترے آنچل کی چھاؤں میں
صحرا کی آندھیوں میں بھی پُروائیاں ملیں
گھر لوٹ کر جو آئے تو عالم ہی اور تھا
دیوار و در پہ سیکڑوں پرچھائیاں ملیں
تم بھی ڈرے ہوئے ہو سمندر کے نام سے
شاید تمہیں بھی سطح پہ گہرائیاں ملیں
سائے کو میں نے اپنے الگ ہی سے ملا دیا
مجھکو مرے قریب جو پرچھائیاں ملیں
اے زندگی فریب بہت ہم نے کھائے ہیں
دشمن سے دوستوں کی شناسائیاں ملیں
بس نام ہی کا شہر ہے یہ شہر آرزو
آبادیوں میں بھی مجھے تنہائیاں ملیں
واؔور ہم اپنے گھر میں بھی بے نام ہی سے تھے
گھر سے چلے تو راہ میں رسوائیاں ملیں

● ● ●

حکیم شبیر علی صاحب شبیؔر کانپوری

تمہارے پاس رہا نقش اعتبار کہاں
خلوص دل میں کہاں اور نظر میں پیار کہاں
ابھی میں اسکو ہنر مند کہہ نہیں سکتا
کہ اس کا تیر نظر میرے دل کے پار کہاں
کچھ اور دیر لہو کے چراغ جلنے دے
ہوئی ہے زرد ابھی فصل انتظار کہاں
تمہارے وعدۂ فردا پہ کر تو لوں میں یقیں
مگر یہ ریت کی دیوار پائیدار کہاں
ہر اک خیال کو تتلی کا رنگ دے جائے
مری طرح کوئی اس فن میں ہوشیار کہاں
ہوں بے نیاز حکایات شعلہ و شبنم
رجوع مجھ سے ہوئی چشم گل عذار کہاں
میں قتل ہو کے بھی زندہ ہوں آج تک شبیؔر
یہ میری جیت کی خوشبو ہے میری ہار کہاں

● ● ●

صابر دہلوی - ملاڈ (بمبئی)

جس کو دیکھو وہ تمہارا ہی تمنائی ہے
آج کس شان سے ساون کی گھٹا چھائی ہے

جب بھی دنیا میں محبت کی فضا چھائی ہے
ہر طرف تیری ہی تصویر نظر آئی ہے

دیکھتے دیکھتے ڈوبی ہے مری کشتی دل
تیری آنکھوں میں سمندر کی سی گہرائی ہے

کیسے آئے گا یقین وعدۂ فردا تیرا
بارہا تو نے میرے سر کی قسم کھائی ہے

حسن کی ایک جھلک دیکھ کے شرما جانا
یہ تو عاشق کے لئے حوصلہ افزائی ہے

اب نہ آواز، نہ وہ سوز، نہ شہنائی ہے
میرے ہمراہ تو اک عالم تنہائی ہے

● ● ●

امین احمد امینؔ (رڑکی)

انجام سے واقف ہوں میں آغاز سے واقف
ملتے ہیں نشان منزل لاہوت پہ میرے

میں بھی ہوں محبت کے ہر اک راز سے واقف
دنیا ہے مری طاقت پرواز سے واقف

آنکھوں میں نمی دل میں خلش لب پہ تبسم
آغاز محبت ہے یہیں انجام کی باتیں

میں ہو ہی گیا جینے کے انداز سے واقف
شاید ترا دیوانہ ہے ہر راز سے واقف

کیسے کہے گا امینؔ اس کی حقیقت کو کہاں تک
کوئی نہ ہوا اس کے ہر اک راز سے واقف

ذکاءالدین شایاں

کوئی چلنے کا ارادہ تو کرے کانٹوں پہ
پھول خود آئیں گے قدموں میں مچل جائیں گے

دن کا سایہ ہیں، ہمیں دیکھ لو جی بھر کے تم
رات آئے گی، کسی خواب میں ڈھل جائیں گے

بھیگے بھیگے ہیں یہ ساون کا مہینہ
دھوپ جب چمکے گی پتھر بھی پگھل جائیں گے

دیال سنگھ کالج

کرنال

مشترکہ پنجاب میں نصف صدی اور کرنال (ہریانہ) میں چوتھائی صدی سے اپنی شاندار روایات کو قائم رکھے ہوئے ہے دیال سنگھ کالج کرنال میں طلباء کو ہمیشہ ڈسپلن، قومی یکجہتی اور ملک کی ہر طرح سے حفاظت کرنیکی تلقین کیجاتی ہے اور انھیں ایک اچھا شہری اور ایک ذمہ دار ہندوستانی بنانے کی کوشش کیجاتی ہے۔

اہل کرنال اور گردونواح کے طلباء کیلئے دیال سنگھ کالج ایک نعمت ہے اپنے بچوں کو اگر آپ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ ساتھ ایک اچھا شہری بنانا چاہتے ہیں تو دیال سنگھ کالج کرنال کی خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔

دیال ــــ سنگھ ــــ کالج ــــ کرنال ــــ (ہریانہ)

اراکین منتظمہ کمیٹی

غزلیں

امین ابنِ جود کی

ہر لمحہ خدا جانے وہ کیسا ہوگا
مرثیہ جب مجھے خود اپنا ہی لکھنا ہوگا
عصرِ نو میں روح بلکتی ہوئی آتی ہے نظر
راستہ مسلکِ عدم کو بھی جاتا ہوگا
کشتیِ وقت جہاں جا کے ٹھہر جائے گی
وہ مرے خوابِ پریشاں کا جزیرہ ہوگا
مرکزِ چشم سرِ راہ جو بن جائے گا
وہ مری حسرتِ ناکام کا لاشہ ہوگا
مرا افسانۂ مہمل ہے اسی میں شامل
آپ نے آج کا اخبار تو دیکھا ہوگا

عہدِ نو دردِ کسی کا نہیں محتاج آمین
اس لئے قسطوں میں اب غم تنہا ہوگا

یونس مخمور

ہر ایک شخص جو تنہا دکھائی دیتا ہے
مجھے یہ دور بدلتا دکھائی دیتا ہے
ہمارا شہر بھی سورج کا شہر ہے لوگو
یہ اور بات اندھیرا دکھائی دیتا ہے
وہ آفتاب جو تاریکیوں پہ چھائے گا
فرازِ دل سے ابھرتا دکھائی دیتا ہے
جہاں جہاں پہ اُجالوں کے بیج بکھرتے
وہیں وہیں پہ اندھیرا دکھائی دیتا ہے
جو اعتبارِ چمن تھا ہرا بھرا سبزہ
وہ پیڑ بھی تو فسردہ دکھائی دیتا ہے
انہیں تو لیتے ہیں اپنے نظر جہاں لئے
مجھے تو غیر بھی اپنا دکھائی دیتا ہے

خان ساحل پوسکر

نام مٹی پہ مرا لکھ کے مٹانے والے
یاد آؤں گا بہت مجھ کو بھلانے والے
میں نے دیکھی ہے تری چپ کے دریچوں سے حرکت
میری تصویر کو سینے سے لگانے والے
اس محبت میں تری قدر بھی ہوگی کہ نہیں
سر پہ اس دھوپ میں لے بوجھ اٹھانے والے

قاضی تنویر

بربادیِ آدم کا نشاں دیکھ رہا ہوں
دیکھا نہیں جاتا جو سماں دیکھ رہا ہوں
اللہ بچائے تجھے اب کے نشیمن
ہر سمت گلستاں میں دھواں دیکھ رہا ہوں
ہر پھول کے ہونٹوں سے ٹپکتے ہیں شرارے
ہر شاخ پہ اک برقِ تپاں دیکھ رہا ہوں
ٹوٹے ہوئے آئینۂ ہستی پہ نظر ہے
انجام تماشائے جہاں دیکھ رہا ہوں
وہ آنکھ جو تھی وقفِ پئے عیش و مسرت
اُس آنکھ کو خوں نابہ فشاں دیکھ رہا ہوں
دنیا کی فضاؤں سے مکدر ہے مرا دل
گھبرا کے ستاروں کا جہاں دیکھ رہا ہوں
تنویر نہ آ جائے کہیں دل سے زباں پر
اک راز جو سینے میں جواں دیکھ رہا ہوں

اخلاق سہسوانی

ترے جہاں کو یہ کیا ہو گیا مرے معبود!
خلوص و مہر و محبت آج ہو گئے مفقود
یہ تو نے کیوں حرم و دیر کی لگائی ہیں قیود
ہر ایک ذرے میں جلوے ہیں جب ترے موجود
لبوں پہ ذکرِ خدا دل میں شوقِ حور و بہشت
جہاں نے دیکھے ہیں زاہد ترے رکوع و سجود!
شبِ الم کبھی دیتے ہیں ساتھ ماہ و نجوم
رہیں گی یہ تری اختر شماریاں بے سود!
اب اٹھ کہ دامنِ تخریب چاک کرنا ہے
رہے گا تیرے عزائم میں تابکے یہ جمود!
جہاں جھکائی جبیں اک حرم نظر آیا
کوئی سمجھ نہ سکے گا مرا مذاقِ سجود
میں اب کبھی نہ کروں گا جفاؤں کے شکوے
مجھے تمہاری پشیمانیاں نہیں مقصود
کلی کلی ہے اداس اور پھول پھول ملول
چمن پہ ہو گئی جیسے شگفتگی مسدود
ہر ایک آنکھ ہے پُرنم ہر ایک دل ہے اداس
یہ ارتقاء کا زمانہ، یہ عصرِ نو کا وجود
نگاہِ غور سے دیکھو تو اے چمن والو
نشیمنوں ہی میں پوشیدہ ہے قفس کا وجود
اسے آ رہی ہے دمِ نزع ان کی یاد مجھے
کہ اپنا کام اٹھا! یہ ہے ساعتِ مسعود
یہ اپنا بخت! کہ ہم تو کسی جگہ آ کر
کرو گے کچھ بھی بس اک گام منزلِ مقصود
خلوص دیکھو تو اس میں چھپا ملے گا فریب
یہ عہدِ نو کی ہیں سرگرمیاں مرے معبود
ہے اب شریکِ سفر عزمِ مستقل جس میں
پکار لے گی مجھے خود ہی منزلِ مقصود
قفس سے چھٹ کے یہ اخلاق ہم بہت خوش تھے
چمن میں آئے تو دیکھا نشیمن [illegible]

انقلابِ تازہ سے متاثر ہوکر

نسیم شاہجہانپوری

شبنم کا کرب، گل کی گھٹن جانتے ہیں ہم بدلی ہے کیوں فضائے چمن جانتے ہیں ہم
اچھا اسی میں ہے کہ کھلوا نہ ئیے زباں اسبابِ انقلابِ وطن جانتے ہیں ہم

تاج محل

اُمید و تمنا کا کھنڈر کہتے ہیں شاعر تجھے معراجِ غزل کہتے ہیں
اربابِ جنوں کہتے ہیں تصویرِ وفا اربابِ خرد "تاج محل" کہتے ہیں

فطرتِ انقلاب پسند

میکدے میں نہیں کوئی تفریق خاص پیتے ہیں عام پیتے ہیں
جن کی فطرت ہے انقلاب پسند وہ بدل کر نظام پیتے ہیں

زہرِ حیات

تلخیٔ حادثات پیتے ہیں چاہے دن ہو کہ رات پیتے ہیں
کل جو آبِ حیات پیتے تھے آج زہرِ حیات پیتے ہیں

احساسِ کمتری

ہو کے احساسِ کمتری کا شکار اپنی نظروں سے گر گیا ہوگا
تم جب آئینہ دیکھتے ہوگے آئینہ تم کو دیکھتا ہوگا

جشنِ شکست

ہار کے مفہوم سے ہیں باخبر ہم حق پرست اور ہونگے وہ کہ جھکتے حوصلے ہوتے پست
جیتنے والے سمجھ لیں قدر و قیمت ہار کی اس لئے ہم نے منایا ہار کر جشنِ شکست

غزل

فہیم راجہ

اندھیروں کو تم روشنی میں بدل دو
وطن کے غموں کو خوشی میں بدل دو
ہر اک رنج و غم کو خوشی میں بدل دو
مرے آنسوؤں کو ہنسی میں بدل دو
زمانے میں کوئی بھی میرا نہیں ہے
مری زندگی عاشقی میں بدل دو
مری آرزو اب فغاں بن رہی ہے
مری گمرہی آگہی میں بدل دو
دعا ہے بنا دو مجھے آدمی تم
مری زندگی بندگی میں بدل دو
طلب ہے جو موقع تمہیں اے فہیم اب
تو ہر رنج و غم کو خوشی میں بدل دو

غزل

نصیر افسر

حالات کے سانچے میں ڈھلا میرے لئے ہے
محبوب کا ہر روپ نیا میرے لئے ہے
رنگین فضاؤں کے سمندر میں ہو گم کر
ساحل پہ کوئی دور کھڑا میرے لئے ہے
ساون کی جھڑی اور لگی آگ سی دل میں
تجھ سے یہ بچھڑنا بھی سزا میرے لئے ہے
افسر کو نہیں خوف زمانے میں کسی کا
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے

غزل

غزلیات

ڈاکٹر محمد عبدالغنی غنی قادری چشتی مشرقی

بے وفا باوفا نہیں ہوتا
ان کا وعدہ وفا نہیں ہوتا

ان کے عہدِ وفا کا کیا کہنا
ان کا وعدہ وفا نہیں ہوتا

پہلے ہر بات پر بگڑتا تھا
اب کبھی وہ خفا نہیں ہوتا

نازو انداز مسکرانے کا
اس پہ اب اکتفا نہیں ہوتا

زود و بات اس کی کیا کہنا
ستم بھی اب جفا نہیں ہوتا

گرچہ دشمن سے صلح کرلی ہے
قلب پھر بھی صفا نہیں ہوتا

ان کی وحدت میں کیسی کثرت ہے
حل یہ کیوں فلسفہ نہیں ہوتا

اے غنی ان سے جن کو نسبت ہے
ان کو خوفِ سزا نہیں ہوتا

> ڈاکٹر محمد عبدالغنی غنی قادری کا
> مجموعۂ کلام بہت جلد منظرِ شہود
> پر آرہا ہے۔
> دفتر
> شان ہند نئی دہلی ۲

دانش علی گڑھی

دل بھی ہے آپ کا جاں بھی آپکی
سچ تو یہ ہے کہ ہے زندگی آپ کی
میں تو مر کر بھی چاہوں گا بس آپکو
آپ چاہیں نہ چاہیں خوشی آپ کی
یوں ملے جیسے پہچانتے ہی نہیں
اب یہ فطرت ہے یا سادگی آپ کی
شب کی تاریکیاں ہیں مقدر مرا
چاند بھی آپ کا چاندنی آپ کی
اب کرم کی ضرورت ہے دانش کو یا
دے رہی ہے مزا بے رخی آپ کی

شمس یمن گرامی

خاک ہوئے تو ہم ہوئے تم تو مگر بہل گئے
ننھی سی ایک جان تھی پاؤں تلے کچل گئے
ہم نے بنائے قصرِ نو عہد رواں میں ڈال دی
عیش گہہِ قدیم کے سارے نقوش جل گئے
آپ کی بزم ناز میں ضبط فغاں کی شرط تھی
ہم نے بہت جتن کئے اشک مگر نکل گئے
اپنی نظر میں آپ ہی گمشدہ شخصیت ہوئے
سانس ابھی چلی نہ تھی ذرّوں میں ہم بدل گئے
کون سی حس نے دفعتاً تھام لیا خیال کو
عین حبابِ خار پہ پاؤں مرے سنبھل گئے
وقت طواف ناگہاں یاد بتوں کی آگئی
کعبہ کا منہ اتر گیا ہم جو ذرا پھسل گئے
چہرۂ دشت دیکھ کر اڑنے لگیں ہوائیاں
اے غم دہر دیکھنا شمس کہاں نکل گئے

محترمہ نورجہاں نور شاہجہاں پوری

چوٹ کھا کر بھی مسکراتے ہیں
ہم غموں کی ہنسی اڑاتے ہیں

دل سے جتنا انھیں بھلاتے ہیں
اور وہ ہم کو یاد آتے ہیں

شب فرقت میں روشنی کے لئے
آنسوؤں کے دیئے جلاتے ہیں

جو کبھی یاد بھی نہیں کرتے
وہ ہمیں یاد آئے جاتے ہیں

وہ سفینے کبھی ابھرتے نہیں
بحرِ غم میں جو ڈوب جاتے ہیں

مستقل کون ساتھ دیتا ہے
سب مصیبت میں بھول جاتے ہیں

خانۂ دل میں تیری یادوں کو
کس قرینے سے ہم سجاتے ہیں

غم الفت ہو یا غم دوراں
سب کو ہنس کر گلے لگاتے ہیں

لوگ ایسے بھی ہیں زمانے میں
پیار کرکے جو بھول جاتے ہیں

ان سے مل کر بچھڑتے ہی اے نور
دل میں کیا کیا خیال آتے ہیں

davp 79/166

ہریجنوں اور دوسرے کمزور طبقوں
کے معاشی معیار کو بلند کرنے کی سمت میں
دلّی اِنتظامیہ کی کامیابیاں

- ہریجنوں اور کمزور طبقوں کی بھلائی کی اسکیموں پر تیزی سے عمل۔
- ہریجن بہبود پر گذشتہ سال انتظامیہ نے ۶۶ لاکھ روپے صرف کئے جب کہ اس سال ایک کروڑ ۵ لاکھ روپے کی اسکیموں پر عملدرآمد۔
- ۲۰ ہریجن گھرانوں کو بسیں خریدنے کے لئے مالی امداد۔
- ایک ہزار سے زیادہ ہریجن طلبہ کو چار لاکھ ۲۵ ہزار روپے کے وظائف۔
- ۲۰۰ روپے سے کم آمدنی والے ہریجن والدین کے بچوں کو ۴۰ روپے فی بچہ کے حساب سے وظائف۔
- پسماندہ طبقوں اور کمزور طبقوں کے ۲،۷۰۰ طلبہ کو ۱۶ لاکھ ۲۹ ہزار روپے کے وظائف۔
- ہریجن طلبہ و طالبات کے لئے علیحدہ علیحدہ ہوسٹل۔
- ۵۰۰ روپے سے کم ماہانہ آمدنی والے والدین کے طالب علموں کے لئے ہوسٹلوں میں مفت رہنے کا بندوبست۔
- مقابلہ کے امتحانات میں بیٹھنے والے ہریجن اور پسماندہ طبقوں کے نوجوان لڑکے و لڑکیوں کو مفت تربیت دینے کی سہولت۔
- ۱،۰۰۰ ہریجن کاریگروں کو اپنے دھندے چلانے کیلئے ہر ایک کاریگر کو ۵۰۰ روپے کے مفت اوزار وغیرہ۔
- ۳۲۰۰ صفائی کرمچاریوں کو [illegible] لاکھ روپے کی لاگت کے ٹھیلے۔
- دلّی میں تقریباً ۱۴ ہزار ہریجن گھرانوں کو مکان بنانے کے لئے زمین۔
- ہریجن بستیوں کے سدھار پر ۲۰ لاکھ روپے خرچ۔
- ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں کے لوگوں کو مکان بنانے کے لئے ۱،۵۰۰ روپے فی گھر کے حساب سے مالی امداد۔
- ہریجن بہبود کے کاموں میں مصروف غیر سرکاری تنظیموں کو ۵۰ فیصد سے [illegible] فیصد تک مالی امداد۔

ہریجنوں اور پسماندہ طبقوں اور غریبوں کی حالت سدھارنے میں

سب سے آگے، دلّی اِنتظامیہ

جاری کردہ: محکمۂ اطلاعات و اشاعت، دلّی انتظامیہ دلّی

جمیل صدیقی

شعرائے کرام کے کلام میں شراب کی جھلکیاں

حاجی نعمت اللہ نعمت جلال آبادی — ترتیب و تالیف کنندہ

حضرات کرام کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا ہے کہ شعر و ادب یا شعراء کے کلام میں شراب کا ذکر کثرت سے کیوں پایا جاتا ہے؟

میرے خیال میں آپ کے سوال کا جواب وہی پرانا گنہگار دے سکتا ہے جو اپنے کو مست جام شراب ہونا کافی نہیں سمجھتا۔ بلکہ جو غرق م شراب ہر وقت رہتا ہو بہت ممکن ہے کہ وہ آپ کو اپنے جواب سے مطمئن کر سکے اور ہم جیسا ہر قسم کے انسان ہیں وہ تو صرف دور سے تماشہ دیکھ کر حظ اٹھا سکتے ہیں اور کچھ نہیں۔ ہم تو آپ کو صرف یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے شعراء آخر کس شراب میں مست ہیں ان کی شراب نئی ہے یا پرانی۔ کیا واقعی شراب طہور ہے یا شراب تیز تلخ اور ان کی سرمستی بادہ و ساغر والی مستی ہے یا وہ صرف کیف چشم دیکھ کر مست نظر آتے ہیں یا وہ بے پئے ہی جھومتے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ یا نظر کو چند وجوں پر جاکر بے خبر مدہوش اور بے چین نظر آرہے ہیں۔ یہ سب کیفیات ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔

دوستو اردو شاعری ابھی عہد طفولیت ہی کی منزل میں تھی کہ اس پر فارسی کا اثر شروع ہوا چونکہ فارسی غزل کی جان "عشق" محبت کی داستانیں ہیں یا رندی و سرمستی کے مرقع ہیں آخر یہ رندی و سرمستی پھر اردو میں کیوں نہیں آتی میاں یہ رندی اور سرمستی اردو میں آئی اور خوب آئی کہ جس نے غزل کو منزل معراج پر پہنچا کر ہی دم لیا۔ حقیقتاً پہلے پہل لوگ پیتے کم اور تھے جس سے ان کی مستی اور قسم کی ہوتی تھی، آگے چل کر ان کی شراب اور ان کی مستی اس دنیا کا جزو ہو کر رہ گئیں۔ اس کے بعد جو زمانہ آیا تو بے پئے ہی مستی دکھائی دینے لگی اور اچھے اچھے پرہیزگار اپنی غزلوں میں شراب کے مضامین باندھنے لگے جس کی وجہ صاف یہ تھی کہ ذکر شراب کے بغیر ان کی غزل نامکمل سمجھی جاتی تھی اور عیب سے گری ہوئی غزل کی وقعت اساتذہ کے نزدیک کچھ نہ تھی۔

کیوں کہ غزلیات کے عناصر میں شراب، ساقی، پیر مغاں، جام ساغر، مستی، و سرشاری، باغ و بہار سب شامل ہیں۔ مے خانہ کا مقابلہ مسجد سے ضرور کیا جاتا ہے۔ اور واعظ محتسب یا زاہد یا شیخ کی پگڑی کا اچھالنا بھی لازم و ملزوم سمجھا جاتا تھا۔ اس قسم کے مضامین زبان فارسی میں صدیوں تک باندھے جاتے رہے۔ اسی لئے فارسی کی تقلید اردو میں بھی کی گئی۔

کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آغاز فارسی میں جس طرح تصوف کا رنگ بہت گہرا ہے۔ اسی طرح اردو کے ابتدائی شاعر بھی تصوف کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ شاعری اور درویشی مترادف الفاظ تھے۔ صوفیوں کی طریقت کا راستہ شریعت سے الگ تھا شریعت ظاہری حالت پر زور دیتی تھی اور طریقت میں باطنی کیفیات سب کچھ ہوتی تھی۔ عالم باطنی سے مدارج طے کرتے اور معرفت الٰہی کے مدارج حاصل کرنے کے لئے عشق مجازی کے زینے سے گزرنا پڑتا تھا لیکن اس عالم میں اصطلاحات کے معنی کچھ اور تھے یعنی شراب سے عرفان، لب ساقی سے ساقی روز ازل اور پیر مغاں سے پیر طریقت مراد ہوتے تھے اور شیخ یا زاہد کی تضحیک اس وجہ سے کی جاتی تھی کہ وہ ظاہری حالت کو دیکھتا ہے باطن پر نظر نہیں کرتا جب تک تصوف کا دور دورہ رہا اس قسم کے مضامین میں کوئی ایسی چیز نہ ہوتی تھی جس کا اطلاق حقیقی رنگ پر نہ ہو سکے۔ تصوف کے مضامین کو اس طرح بیان کرنا کہ غزل کی لطافت قائم رہے اور معرفت الٰہی کے مضامین عشق مجازی سے بالکل ہم پہلو ہو جائیں یہیں سے گویا کمال تھا۔

اردو میں جناب ولی اورنگ آبادی سے حسرت موہانی کے کلام تک آپ دیکھ جائیے کہ شراب کے مضامین ان کے [illegible]

یہاں بکثرت ملتے ہیں۔ بلکہ ولی اورنگ آبادی کے دیوان کی بعض
مدعیوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بادۂ عشق و مشق سے بھی
واقف تھے گو بحیثیت مجموعی ان کے شراب کے مضامین میں
ان کا شراب معرفت مراد ہے یہ مضامین تغزل کے دائرے میں
بیان ہوتے ہیں۔

— ولی —

آلودہ کیوں نہ ہوئے دامانِ پاک زاہد
جب وسعت نازیں میں جام شراب ہووے

— درد —

شب و روز اس طرح سے گزرے ہے اپنی تو نہ پوچھ کچھ
صراحی صبح کو گر ہاتھ ہے تو شام ہے شیشہ
نگاہ مست ان آنکھوں کی کب ادھر بھی ہو ساقی
کہ ہم کو حوصلوں کے حق میں ہر اک جام ہے شیشہ

آتش مے سے جو زاہد نے اپنے بھڑکایا
زاہد خشک ہوا خوب ہی تر پانی میں

مگر اسی زمانہ میں [illegible] پر طعن کرنے والوں کو
شاعر کی طرف سے یہ درست جواب دیا گیا تھا۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

درد کے بعد میر تقی میر کا زمانہ ایک ہی ہے۔
لیکن میر تقی میر کے یہاں جو اشارے پائے جاتے ہیں اس میں
تصوف کی چاشنی سے زیادہ عشق مجازی کی گرمی زیادہ ملتی ہے
کیونکہ میر کے والد ایک درویش صفت انسان تھے مرتے وقت
بیٹے کو نصیحت کر گئے تھے کہ،

"عشق اختیار کرو"

اسی کے ساتھ دل نہایت دردمند اور گداز پایا تھا۔ چنانچہ میر کی
شاعری میں عشق و محبت کی چمک اور بے لاگ تصویریں ملتی ہیں
لیکن ان کا عام نقطۂ نظر صوفیانہ ہے لیکن ایک غزل ان کے یہاں ایسی
ملتی ہے جسے پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ بیان کی چیزیں
بھی شامل ہیں۔ گو یہ سادہ غزل خمریہ ہے اور خمریات کا بہترین نمونہ
ہے جو شخص میر کو صرف معتقد غم کا درجہ دیتے ہیں وہ دیکھیں
کہ اس غزل میں کیسے جوش و خروش سے فلسفۂ عشق و مسرت کی
تلقین کی گئی ہے۔

— غزل میر تقی میر —

شیخ جی آؤ مصلّیٰ گرو جام کرو
جنس تقویٰ کے تئیں صرف مے و جام کرو
فرش مستاں کرو سجادۂ بے تہ کے تئیں
مے کی تعظیم کرو شیشے کا اکرام کرو
دامن پاک کو آلودہ رکھو بادے سے
آپ کو مغبچوں کے قابل دشنام کرو
نیک نامی و تفاوت کو دعا جلد کہو
دین و دل پیشکش سادۂ خودکام کرو
ننگ و ناموس سے اب گزرو جوانوں کی طرح
پرفشانی کرو اور ساقی سے ابرام کرو
اٹھ کھڑے ہو جو جھکے گردن مینائے شراب
خدمت بادہ گساراں بھی سرانجام کرو
خشکی اتنی بھی تو لازم نہیں اس موسم میں
پاس جوش گل و دل گرمیٔ ایام کرو
سایۂ گل میں لب جو پہ گلابی رکھو
ہاتھ میں جام کو لو آپ کو بدنام کرو
آہ تا چند رہو خانقہ و مسجد میں
ایک تو صبح گلستاں میں بھی شام کرو

قطع نظر میر تقی میر کے علاوہ ان کے زمانہ میں بھی اور بعد میں
دوسرے شعراء کے یہاں شراب کے مضامین برابر نظر نواز ہوتے
ہیں۔ دیکھئے انشاء جیسا درباری شاعر بھی برف میں لگی ہوئی
صراحی طلب کرتا ہے۔ ناسخ کے زمانہ میں خمریات میں اک بانکپن
آچلا تھا حالانکہ یہ لوگ نہ تو بادۂ تصوف کے چشیدہ تھے نہ شاہد
باز۔ انھوں نے اپنے کلام میں شراب کے مضامین اس لئے باندھے
ہیں کہ ان سے پہلے باندھے جاتے تھے۔ خصوصاً محتسب کا ذکر تمام تر
رسمی ہو کر رہ گیا۔ آتش کے یہاں تصوف اور عشق دونوں کی گرمی
موجود ہے اس لئے ان کی مینا میں بھی رنگ باقی ہے۔ اسی زمانہ

نمایاں پایا جاتا ہے۔ [illegible] صفائی کے بجائے اگر ہم یہ کہیں کہ
یہ غالب مرحوم کی زندگی کا [illegible] پہلو نہ ہوگا۔
اب غالب کے بعد جناب داغ نے خمریات کے تمام
مدارج کو اپنی پیاری غزلوں میں سمولینے کی پوری پوری کوشش
کی ہے کہ جس سے [illegible] کو اندازہ ہوگا کہ دونوں حضرات
کس قدر ہم مشرب ہیں۔ مضامین خمریات کو داغ مرحوم نے اپنی
غزلیات میں شوخی و بیباکی اور رندانہ مضامین میں بڑے سلیقے
سے نمایاں طور پر واضح کیا ہے۔ اور اگر کہیں کوئی محاورہ ان کو نظم
کرنے کا موقع مل جاتا ہے تو شعر میں تمام خوبیاں آجاتی ہیں
جو کسی شعر میں آجاتی ہیں۔ داغ کے یہاں یہ خوبیاں بہت
نمایاں ہیں کہ معشوق سے چھیڑ چھاڑ اور باہمی طنز و مزاح بالکل
سامنے آجاتے ہیں۔ ان کے اسی طرز اختیار کرنے
سے معشوق اور زاہد بیچارے اپنا سا منہ لیکر رہ جاتے ہیں
یہی وجہ ہے کہ داغ مرحوم نے شعرائے کرام کی صف میں ایک
نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔ اسی لئے آپ کی غزلیات زبان
زد عوام ہو کر شہرت پذیر ہو گئیں کہ ہر کوئی اپنی محفلوں میں پڑھ
کر سامعین کو زعفران زار بنا دیتا ہے۔

— داغ مرحوم —

زاہد کو ایک قطرۂ زمزم پہ ناز ہے
[illegible] کے خم اٹھاتے ہیں پیر مغاں کے ساتھ

دیکھنا پیر مغاں حضرت واعظ تو نہیں
کوئی بیٹھا نظر آتا ہے پس خم مجھکو

کی ترک مے تو مائل پندار ہو گیا
میں توبہ کرکے اور گنہگار ہو گیا

مے انگور فرشتوں کا بھی قسمت میں نہیں
اس سے محروم رہی ایک قبلۂ حاجات [illegible]
پھر زہر دختر شراب انگور
کیسا [illegible] حرام ہو گیا ہے

جاکے پی آئے وہاں آتے ہی توبہ کرلی
اس قدر دور ہے مسجد سے خرابات بھی کیا

بیشک داغ کے یہاں حقیقی طور پر نمایاں ہے۔ خلاف اس کے امیر
مینائی کے یہاں رسمی معلوم ہوتا ہے۔ جو داغ کی تقلید ہے
اس لئے اچھے شعر کمیاب ہیں تاہم ایک شعر میں ضرور پیش کروں
گا۔

انگور میں بھی یہ مئے پانی کی چار بوندیں
یہ جب سے کھینچ گئی ہے تلوار ہو گئی ہے

مگر ان کے ایک شاگرد ریاض خیرآبادی نے جو مینائے امیر
کی مستی پر فخر کرتے ہیں۔ خمریات میں خاص طور پر کمال حاصل کیا
ریاض کی طبیعت میں غیر معمولی شوخی تھی اس لئے وہ ساری عمر جوان
رہے۔ تمام عمر عاشق اور حسن کی شوخی کا تو ذکر کیا ہے مگر ریاض
کی خصوصیت ہے کہ ان کے یہاں ایسی چلبلی مسکراہٹ ایک ایسی
شوخی ہے جس کا جواب جناب حسن کے پاس بھی نہیں۔ انھوں
نے تمام عمر شراب کے مضامین لکھے اور شراب کے لئے بڑے ہی
پیارے پیارے نام وضع کئے مگر امیر مینائی جیسے پرہیزگار کے
شاگرد کا دامن اس معصیت سے کیسے آلودہ ہوا چنانچہ یہ مشکل
سے ہی یقین آتا ہے کہ جس شاعر کے دیوان میں بقول سبحان اللہ
صاحب رئیس گورکھپوری تیرہ سو چھیاسٹھ اشعار خمریات کے ہوں
وہ کیسے شراب سے بچ نکلا ہوگا یہ مشکل سے ہی یقین آتا ہے بہرحال
یہ حقیقت ہے اور حقیقت اکثر تلخ ہوتی ہے چنانچہ ریاض کے حسب
ذیل بے مثل اشعار دراصل رسمی ہیں جن میں شراب سے صرف
وہ کیفیت مراد ہے جو عشق میں حاصل ہوتی ہے یا جوانی کے راستے
سے آکر دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی ہے۔

— ریاض خیرآبادی —

چھلکائیں لاؤ گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

جہاں ہم خشت خم رکھ دیں بنائے کعبہ پڑتی ہے
جہاں ساغر پٹک دیں وہیں چشمۂ زمزم نکلتا ہے

فرشتے مرحبا گاؤ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں
ہمیں بھی آج شغل لغزش مستانہ آیا ہے

اقبال نے سب سے پہلے خمریات کے پرانے کوچے میں ایک نیا ساز چھیڑا ہے اور اپنی بانگِ درا میں وہ ساقی سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتے کو تھام لے ساقی
جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی
کٹی ہے رات تو ہنگامہ گستری میں تری
سحر قریب ہے اللہ کا نام لے ساقی

لیکن اس سے زیادہ اہم ان کا وہ ساقی نامہ ہے جو بالِ جبریل میں شامل ہے اور جس میں انھوں نے دورِ حاضر کے اہم مسائل پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ ساقی نامہ اقبال کی بہترین تخلیق میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ یہاں شاعر، ساقی سے جو شراب مانگتا ہے وہ زندگی حرکت، عمل، خودی کی بلندی اور انسان کی معراج سے متعلق ہے اس کے ایک ایک شعر میں بڑے سے بڑا مضمون آگیا۔ بہار کی آمد ایک شعر میں یوں بیان کی جاتی ہے۔

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

اقبال اور کیا مانگتے ہیں:-

وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات
وہ مے جس سے ہے مستیِ کائنات
وہ مے جس سے ہے سوز و سازِ ازل
وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل
اٹھا ساقیا پردہ اس راہ سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

اقبال دورِ حاضر پر کس خوبی سے تبصرہ فرماتے ہیں۔

زمانہ کے انداز بدلے گئے ۔۔۔ نیا راگ ہے ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے ۔۔۔ زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا ۔۔۔ تماشا دکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ۔۔۔ ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے
مسلماں ہے توحید میں گرم جوش ۔۔۔ مگر دل ابھی تک ہے زنار پوش

تمدن، تصوف، شریعت، کلام ۔۔۔ بتانِ عجم کے پجاری تمام
حقیقت خرافات میں کھو گئی ۔۔۔ یہ امت روایات میں کھو گئی

جناب اقبال کیا چاہتے ہیں ذرا ان کی زبانی یہ بھی سنئے۔

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق میری نظر بخش دے
امنگیں میری آرزوئیں مری
امیدیں مری جستجوئیں مری
مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

موجودہ سیاسی انقلاب، تہذیبوں کی ٹکر اور جنگ کے بعد کی زندگی نے بادہ و ساغر کو ایک نیا کیف دیا ہے۔ اور ہمارے تمام اچھے شاعروں نے میکدہ کی ویرانی، ساقی کی لاپروائی اور رندوں کی لغزش کے پردے میں زندگی کے حقائق بیان کئے ہیں اسی طرح زندگی کو بہلانے کی بھی کوشش کی گئی ہے اور استہزا کی بھی۔ جوش نے حال میں "ساقی سے خطاب" میں موجودہ تنگ نظری پر بڑی خوبی سے طنز کی ہے۔ غزل گو شعرا بھی اس رنگ میں پیچھے نہیں رہے۔ انھوں نے ساقی و میخانہ کے رمز و ایماں میں جدید ہندوستان کے سنہرے خواب اور تلخ حقائق دونوں کو اس طرح سمو دیا ہے کہ ہر پیمانے میں ماہِ تمام کی تجلی آگئی ہے۔ غرضیکہ دانشورانِ ملک نے ہر ایک موقع پر سیاست دانوں کو مشعلِ راہ دکھائی ہے کہ سیدھے سیدھے راستے پر چل کر ترقی کی منزلیں طے کریں مگر آج کی یہ گندی سیاست ملک کو قعرِ مذلت میں دھکیل کر دم لے گی۔ آئے دن کی الیکشن نوازیوں نے ملک کو ہزارہا طبقات میں تقسیم کر دیا۔ ہر ایک لیڈر اپنے الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنسا کر ووٹر کو سبز باغ دکھانے کی کوشش کرتا ہوا ہے۔

قطعہ

ڈاکٹر لطیف اکبر آبادی

خاکِ میخانہ زمانہ جنھیں کہتا تھا کبھی
آج وہ مالک و مختار ہیں میخانوں کے
بن گئی تشنہ لبی ان کا مقدر اے لطیفؔ
منتظر جو تھے چھلکتے ہوئے پیمانوں کے

ناردرن ریلوے

عزیز طلباء، زائرین اور سیاحو!

ہندوستان ــــ دیکھئے ــــ سہل ــــ طریقے سے

ملک کے گرد سرکلر ٹور کیلئے اور دوسرے درجے کے سرکلر ٹور ٹکٹ مقررہ ریلوے سٹیشنوں سے خریدیئے میل ایکسپریس کے کرایوں میں ۱۵ فیصد رعایت تک۔ ساتھ یہ ٹکٹ ۳۰-۶۰-۹۰ دن کی مدت کے اندر قابل استعمال ہوں گے۔ مدت کا انحصار طے کئے جانے والے سفر کے کل فاصلے پر ہے۔ سفر کے دوران آپ جب چاہیں جتنی بار چاہیں اور جتنے عرصہ کے لئے چاہیں گے آگے کا سفر ملتوی کر کے کہیں بھی قیام کر سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ٹکٹ کی کل مقررہ میعاد استعمال نہیں بڑھ سکے گی۔

آپ کی سہولت اور ضرورت کی مناسبت سے ہم نے ایسے تیس سرکلر ٹورز کا بندوبست کیا ہے ان کے ذریعے اس سارے عظیم الشان علاقے کا احاطہ ہو سکے گا۔ جسے ہندوستان کہا جاتا ہے۔ ان ٹورز میں سے کسی کا انتخاب کر لیجئے۔ اور اگر آپ کا کوئی ایسا پروگرام ہے جو آپ کی انفرادی ضرورت کے مطابق ہو تو اس کیلئے ہم سے خود ملئے یا ہمیں اپنا پروگرام لکھ کر بھیجئے۔ ہم آپ ہی کے ٹور پروگرام کے لحاظ سے کرائے کا دھیان بھی رعایتی شرح پر لگا کر آپ کو مطلع کر دیں گے۔

یہ ٹور سرکلر ہونا چاہئے اور (۱) کا فاصلہ ۲۴۰۰ کیلومیٹر سے کم نہیں ہونا چاہئے اس کے ساتھ وہ فاصلہ جس کا کرایہ چارج کیا جا رہا ہے۔ ٹور پروگرام کے آغاز کے سٹیشن سے پروگرام کے آخر تک کے سٹیشن تک ان سٹیشنوں کے درمیان براہ راست مسافت کے فاصلے کے مقابلے میں کم از کم تین گنا سے زیادہ ہونا چاہئے۔

مزید معلومات کیلئے براہ کرم اپنے قریب ترین ریلوے سٹیشن ماسٹر یا متعلقہ ڈویژنل کمرشیل سپرنٹنڈنٹ سے ملئے۔ یا پھر ہم سے براہ راست رابطہ قائم کیجئے

چیف کمرشیل سپرنٹنڈنٹ

ناردرن ریلوے نئی دہلی

ٹیلیفون:- ۳۸-۷۳۲۶،
۳۸-۷۵۰۵،

شان

ذرا ٹھہریئے

وعدوں کے باوجود اس انگریز سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ مسلمان فلم کی ناٹ ذرہ فوٹنگ میں ہیرو اور ہیروئن کو خرستیوں سے فوٹنگ دیکھنے والے مشتعل ہو گئے اور پتھراؤ کیا۔

فلم مسٹر بلیک کے انعام نے اپنی ماجراؤں کو مرتے دم تک جاری رکھا اور عادی بدکار بنا دیا۔

اس مشاہدہ میں آج کا نوجوان ہو۔ کا جماعت۔ ہے شریف اور آج کے نواجی۔ کو جس بے غیرتی کا منظر دکھایا گیا ہے وہ کوئی نہیں بات نہیں بلکہ ایسے مناظر اکثر شریف اور تعلیم یافتہ گھرانوں میں ہر روز دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور آج کے باپ اور بھائی خود اپنے ہاتھوں ہندی۔ اُردو اور دوسری زبانوں کے کوک شاستر کو شرلنے والے رسائل بازار سے خرید کر اپنی نوجوان کنواری اور شادی شدہ بیٹیوں اور بہنوں کو مطالعہ کیلئے دیتے ہیں۔ اور بے تکلف بیبیاں اور کنواریاں ان رسائل کے مطالعہ سے ذہنی طور پر اور بعض عملی طور پر طوائفیت کے تمام مدارج طے کر جاتی ہیں ویسے شریف گھرانوں میں طوائفیت کے جراثیم پھیلانے میں ریڈیو، ٹی۔ وی اور فلموں نے بھی کچھ کم خدمات سر انجام نہیں دی ہیں۔ اور اب حالت یہ ہے کہ ہمیں جتنا ان کے لئے مفرح ہوتی ہیں۔ ان کو زیادہ لڑکیاں پسند کرتی ہیں۔

حال ہی میں "من کا آنگن" اور "گرم خون" وغیرہ کئی فلموں میں ایسے جنسی مناظر کی بہتات تھی کہ جن کو دیکھ کر عمر رسیدہ حضرات بھی ضبط ووصال کے "خوش آئند" تصور میں کھو کر رہ گئے۔ ایسے مناظر کو پردہ فلم پر دیکھتے ہوئے کنواری لڑکیاں جو آپس میں ذو معنی گفتگو کرتے ہوئے اظہار خیال کرتی ہیں۔ انہیں سننے کے بعد شاید ہی کوئی یقین کر سکے کہ یہ ماجرایاں ان تمام مراحل سے گزر چکی ہیں جو وہ پردہ فلم پر دیکھ رہی ہیں۔

جب گھروں میں ریڈیو فلمی گانے الاپتا ہے تو ہماری بہنیں اور بیٹیاں ریڈیو کے ساتھ ساتھ گنگناتی ہیں اور ان کی آنکھیں، کمر، ہاتھ، پاؤں اور انگلیاں تک موسیقی کے زیروبم کے ساتھ تھرکتی ہیں اور بے غیرتی کی انتہا ہے کہ ہم اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی اس طوائفانہ روش پر خوش ہوتے ہیں اور ان کے مہذب ہونے پر فخر کرتے ہیں۔

کاش کہ آج کا باپ اور بھائی شرافت اور طوائفیت میں فرق محسوس کر سکتا۔

مردم شماری اور ذہنی بددیانتی

ہندوستان میں مردم شماری ہونے والی ہے۔ مردم شماری میں ہر شخص کی مادری زبان بھی لکھی جاتی ہے۔ جس سے بعد میں یہ اعداد و شمار جمع کئے جاتے ہیں کہ کس زبان کے بولنے والے کتنے لوگ ہیں اور کس علاقہ میں کونسی زبان زیادہ تر بولی جاتی ہے۔

اُردو کے ساتھ حکومت کا رویہ اس کے اپنے مفاد کی روشنی میں ہی رہا ہے اور یہ رویہ کوئی خوشگوار یا اُردو کے حق میں بہتر نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے اگر ہم حکومتی کارندوں پر ہی انحصار کئے رہے تو یاد رکھئے کہ وہ کسی کی بھی مادری زبان اُردو نہیں لکھیں گے۔ لہٰذا اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ ہر شہر، ہر قصبہ اور ہر گاؤں میں اُردو کے بہی خواہان یہ دھیان رکھیں کہ جب سرکاری کارندے مردم شماری کے سلسلے میں کاغذات کی خانہ پری کے لئے آئیں تو اگر کوئی اپنی مادری زبان اُردو لکھاتا ہے تو یہ سرکاری کارندہ ایسا ہی لکھے۔ ایڈیٹر شان ہند کے ساتھ خود ایسا واقعہ پیش آ چکا ہے کہ تقسیم ملک کے بعد مردم شماری کے سلسلہ میں ایک سرکاری کارندہ متعلقہ کاغذات میں اندراج کے لئے آیا تو اس کے پوچھنے پر ایڈیٹر شان ہند نے اپنی مادری زبان اُردو لکھنے کے لئے کہا تو یہ سرکاری کارندہ قلم اور کاغذ الگ رکھ کر کہنے لگا کہ آپ تو پاکستان سے لٹ پٹ کر آئے ہیں۔ پنجابی ہیں۔ آپ کی زبان پنجابی یا ہندی ہو سکتی ہے اُردو کیسے ہو سکتی ہے۔ کافی رد و کد کے بعد اس سرکاری کارندے نے مادری زبان اُردو لکھی۔ اس لئے اب کی مرتبہ ہم اُردو والوں کا یہ فریضہ ہے کہ سرکاری کارندوں کا خاص طور پر دھیان رکھیں۔

ہمیں یہ لکھتے ہوئے بھی ندامت محسوس ہو رہی ہے کہ ہمارے ملک کے ان ہندوؤں اور سکھوں نے ذہنی بددیانتی سے کام لیتے ہوئے اُردو کا بیج کنی کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کر رکھا ہے جو روزانہ بول چال میں اُردو بولتے ہیں۔ خط و کتابت اُردو میں کرتے ہیں۔ اُردو اخبارات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور جنہیں اُردو کے سوا کوئی دوسری زبان لکھنی پڑھنی اور بولنی نہیں آتی وہ بھی پوچھے جانے پر اپنی مادری زبان ہندی ہی کہتے ہیں۔ اگر اُردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے والے ہندو اور سکھ حضرات صحیح طور پر اپنی مادری زبان اُردو لکھائیں تو وہ یقیناً دیانتداری سے کام لیں گے ایک آزاد ملک کے ہر ایسے باشندے کو جو واقعی اپنے آپ کو ایک آزاد

حاصلِ مطالعہ

پیر کی پگڑی

پیری فقیری کا چرچا تو پاکستان کے دونوں ہی حصوں میں ہے مگر مغربی پاکستان میں اس سلسلہ میں ایسی ایسی معلومات حاصل ہوئی ہیں کہ باید و شاید۔ میں آپ کو صرف پگڑی کا قصہ سناتی ہوں۔

مشہور ادیب جناب قدرت اللہ شہاب ڈپٹی کمشنر کی ڈائری میں لکھتے ہیں۔ درگاہ شریف سے کچھ ہٹ کر حویلی کے صحن میں ایک خیمہ نصب ہے اس خیمہ میں مقربین خاص کے علاوہ اور کسی کا گزر ممکن نہیں۔ راہ سلوک میں یہ خیمہ اس مقام پر واقع ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر۔ کیوں کہ اس خیمہ میں لاہور، ملتان اور لائل پور کی نامی گرامی گانے اور مجرا کرنے والی طوائفیں اتری ہوئی ہیں۔ مجرے والے خیمے میں پہنچ کر سجادہ نشین صاحب اپنی زرکار قبہ اتار دیتے ہیں اور لہراتی ہوئے طرے والی پگڑی بھی خادم خاص کے حوالے کر دیتے ہیں۔ خادم اس دستارِ فضیلت کو چاندی کی طشتری میں رکھ کر باہر لے جاتا ہے۔ خدا جانے اب یہ پگڑی کہاں جائے گی؟ شاید یہ پگڑی اب نبی بخش لوہار کے گھر جائے جس کی بیٹی نے ابھی ابھی اپنی عمر کا سولہواں برس پورا کیا ہے۔ شاید یہ پگڑی روشن دین معمار کے گھر پہنچ جائے جس کی جمیلہ پر تازہ شباب کے تازہ تازہ پھول کھلے ہیں۔ شاید یہ پگڑی بڑی عظمت اور وقار والی پگڑی ہے اس پگڑی کا سلوٹوں میں فیض کے چشمے بہتے آئے ہیں یہ بڑی مرادوں والی پگڑی ہے۔ اس پر ایجاب و قبول کے سب مدارج طے ہیں لیکن جب یہی طرے دار پگڑی کسی نبی بخش لوہار یا روشن دین معمار یا چراغ علی کسان کے گھر جا پہنچتی ہے تو پیاری پیاری نازک نازک معصوم جوانیاں سہم کر مرجھا جاتی ہیں۔ خادم خاص پگڑی اٹھائے گھر کا ایک چکر لگاتا ہے اور اس طرح خاموشی سے لوٹ آتا ہے لیکن خاموشی چیخ چیخ کر اعلان کرتی ہے کہ اے گھر والو مبارک ہو تمہاری بہو یا تمہاری بیٹی پر حضرت قبلہ و کعبہ فخر سالکان مرشد عاشقاں، آفتاب طریقت، ماہتاب معرفت کی نظر انتخاب پڑ چکی ہے۔ اب اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے نصیبوں پر رحمت خداوندی کا سایہ قائم رہے تمہاری کھیتیاں لہلہاتی رہیں۔ تمہارے جھونپڑے کو آگ نہ لگے۔ تمہارے مویشی گم نہ ہوں۔ تمہارے والدین نہ جھنجھنائیں اور جیل خانوں کے دروازے تم پر اچانک وا نہ ہوں۔ برضا و رغبت .... ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ کراچی میں مالکان مکان پگڑی لیتے ہیں وہ تو ادنیٰ ہی چیز ہے۔ مگر یہ پیر کی پگڑی کا ہے۔ میں اس کی تفصیل سے آگاہ ہوں۔ شہاب صاحب کی تحریر تو میں نے یہاں نقل کر دی کہ ذکر یہ پیدائش کا اور پھر بیان اپنا پگڑی کا جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے۔ میں نہ کھینچ سکتی۔ یہ پگڑی اس گھر پر جاتی ہے جہاں حضرت قبلہ و کعبہ کی نظر پڑی ہو۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ بدنصیب کس کی بہو ہے یا بیٹی اور کس کے گھر دیگر کی کا چکر ہی ایجاب و قبول کی منازل طے کر جاتا ہے۔ حلال و حرام تو صرف ہم دنیا کے بندوں کے لئے ہے۔ یہ کونسا اسلام ہے یہ کس خدا اور کس رسول نے جاری کیا ہے۔ آپ ان خرافات کو ختم کیوں نہیں کرتے۔ جمہوریہ پاکستان میں لفظ اسلامی بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ لیکن اس لفظ کے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے یہ تو صرف دو چار ہی برائیاں گنوائی ہیں۔ مگر سینکڑوں برائیاں ایسی ہیں جن میں عام مسلمان تو کیا خود مولوی بھی مبتلا ہیں۔ ہر طرف آگ لگی ہوا ہے مگر نیرو اپنی بانسری (ایک ہی راگنی) میں محو ہے آخر کہاں تک سے

> نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
>
> ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

اور اسی لئے یہ

> جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو

مسز الطاف حسین (عصمت کراچی) [illegible] ۱۹۶۳

بقیہ بلبل چہ گفت .....

ملک کا باشندہ سمجھا ہوا ہے نہایت ایمانداری کے ساتھ آزاد ملکوں کے باشندوں کی طرح اعلیٰ اخلاقی اقدار کا مظاہرہ کرنا چاہیے اور اپنے آپ کو اس قسم کی ذہنی بددیانتی سے دور رکھنے چاہیے کہ بعد مردم شماری میں اپنی مادری زبان وہی لکھوانی چاہیے جو کہ دراصل ان کی مادری زبان ہے۔

[illegible]

ایک دن کے وقت بھی اب حوصلہ نہیں کر سکتا۔ اللہ اس کی مدد کرے۔

رات کو اطلاع ملی کہ راستہ صاف ہونے میں ایک دن اور لگے گا۔ سینکڑوں مزدور پتھروں کو توڑ کر سڑک سے ہٹا رہے ہیں۔ اس مزدور بستی میں ایک دن اور رات رہنے سے مجھے ایسا لگا کہ خود بدکشی کی اس زندگی میں بھی ایک جادو ہے۔ دوسرے دن دوپہر کو وہ لڑکی سر پر اناج کی ایک گٹھری لے کر اسی دوکان پر آئی۔ گاؤں میں سودا سلف نقدی سے نہیں بلکہ اناج کے بدلے ہی خریدا جاتا تھا۔ میں پھر کچھ کھانے پینے کے بہانے اسی دوکان پر جا بیٹھا۔ دوکان دار سے لڑکی نے باتوں باتوں میں بتلایا چاچا میں آ رہی تھی کہ ریت پر ایک مگرمچھ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر پانی میں کود گیا مگر میں ابھی تک ڈر رہی ہوں۔ ہے اللہ کیسی کیسی بلائیں دریا میں ہوتی ہیں۔ قریباً ایک گھنٹے تک یہ لڑکی سودا تلوانے کچھ کھانے پینے اور باتیں کرتے ہوئے اس دوکان پر رہی اور پھر سودے کی گٹھری سر پر رکھ کر خراماں خراماں اپنے گاؤں کی طرف چلی گئی تو دوکاندار کہنے لگا کہ عشق بھی کیا چیز ہے کہ دن کو ریت پر مگرمچھ کو دیکھ کر ڈرنے والی لڑکی رات کی تاریکی میں دریا میں اپنے آپ کو انہی مگرمچھوں کے حوالے کرتی ہوئی اپنے سجن کو ملنے جاتی ہے اور اسے یہ گمان تک بھی نہیں ہوتا کہ کوئی بلا اسے نگل جائے گی۔ میں فقیر بابا کے پاس چلا آیا اور اُسے لڑکی کی باتیں سنائیں تو بابا مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ پتر عشق اندھا ہوتا ہے۔ اللہ اس لڑکی پر رحم کرے۔

دن دوکاندار اور فقیر بابا کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتوں میں گزر گیا۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس ڈر سے کہ رات کو بارش ہونے سے ادھر اُدھر جاگنا پڑے گا۔ میں نے سرِ شام ہی اپنا بستر سرکاری دفتر کے برآمدے میں بچھائی اور کھانا کھانے کے بعد فقیر بابا سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد آ کر لیٹ گیا۔

اس زمانے میں آج کل کی طرح ہر کہ ومہ کے پاس گھڑی نہیں ہوتی تھی۔ ہزاروں میں سے کسی ایک کے پاس گھڑی ہوتی تھی اور وہ بھی جیبی۔ اس لئے وقت کا تعین اندازے سے ہی کیا جاتا تھا۔

غالباً رات کو گیارہ بجے ہوں گے کہ چناب کے پل کے پاس دریا سے چیخیں سنائی دینے لگیں۔ اور ایک نسوانی آواز کسی مرد کا نام لے کر چیخ رہی تھی کہ مجھے بچا لو۔

جن مزدوروں۔ دوکانداروں اور فقیر بابا نے یہ چیخ پکار سنی وہ پل کی طرف بھاگے کچھ دیر بعد دلدوز چیخیں بند ہو چکی تھیں اور چیخ و پکار کرنے والی چناب کی بپھری ہوئی لہروں میں نہ معلوم کہاں گم ہو گئی تھی۔ مزدور مرد۔ عورتیں۔ دوکاندار اور فقیر بابا اس بدنصیب لڑکی کی اس حسرت ناک موت پر آنسو بہا رہے تھے۔ دنیا بھی عجیب ہے جب کوئی دو دل ملنے کے لئے تڑپتے ہیں تو یہی دنیا ان کے ملنے کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتی ہے اور جب کوئی اپنے آپ کو عشق کی قربان گاہ پر نثار کر دیتا ہے تو یہی دنیا آنسو بہاتی ہے۔

میرے لئے اب وہاں ایک منٹ بھی گزارنا بھاری ہو رہا تھا۔ پو پھٹتے ہی میں نے سلانوالی جانے کی بجائے سائیکل کا رُخ سمانہ کی طرف کیا اور مردہ دلی سے چناب کے پل سے گزرتے ہوئے۔ اس شہیدِ عشق لڑکی کو خاموشی سے سلام کیا اور عبدالعزیز خالد کے اس شعر کا مفہوم میرے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا ؎

خالد لکھوں سلام میں ان مہ وشوں کے نام
ڈیسیں ہوڑن بلائیاں راتیں ترن ندی

(جو دن کو تو بلاؤں سے ڈریں اور راتوں کو تیر کر ندیاں پار کریں)

قریباً آدھی صدی گزرنے کے بعد بھی جب مجھے اس شہیدِ عشق لڑکی کا خیال آتا ہے تو میری رُوح تک کانپ جاتی ہے۔

رہے نام اللہ کا۔

پی کے بھٹے سے جو اک رند بلا نوش چلا
جب ہوا ہوش سے بیگانہ تو نالی میں گرا
منہ میں کتے نے جو پیشاب کیا تو بولا
ساقیا اور پلا اور پلا اور پلا

نرگس سیہوانی

احمد ندیم قاسمی

"شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کی طرف سے ۲۹ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۲ء "انڈو پاک شارٹ سٹوری سیمینار" منعقد ہو رہا ہے۔ اس میں پاکستان کے دیگر کچھ افسانہ نگاروں کے علاوہ جناب احمد ندیم قاسمی بھی تشریف لا رہے تھے۔ مگر احمد ندیم قاسمی صاحب کا بہت جلد ایک آپریشن ہو رہا ہے جس کی وجہ سے ان کے طبی مشیروں نے انھیں سفرِ ہند سے منع کر دیا ہے جس کے باعث ان ہندوستانی مداحوں کو دلی طور پر مایوسی ہوئی ہو گی جو احمد ندیم قاسمی کی راہ میں آنکھیں بچھائے ہوئے تھے۔ ایڈیٹر شانِ ہند بھی قاسمی صاحب کی متوقع تشریف آوری کے لئے چشم براہ تھا کہ وہیں ۳۶ سال بعد ان سے ملاقات ہو سکے گی۔ اور چاہ بوہڑ والا ملتان چھاؤنی (پاکستان) کے ان روح پرور لمحوں کی یاد تازہ ہو سکے گی جو احمد ندیم قاسمی کے ساتھ اکثر گزرتے تھے۔ جناب احمد ندیم قاسمی ان دنوں محکمہ پولیس میں افسر تھے اور محلہ چاہ بوہڑ والا ملتان چھاؤنی میں رہائش پذیر تھے۔ ایڈیٹر شانِ ہند کا مکان بھی اسی محلہ میں تھا اور آنجناب قاسمی صاحب اور راقم الحروف دونوں جناب ظفر ادیب کے کرایہ دار تھے۔

پاکستانی ادیب جناب رحیم گل نے اپنی ایک تازہ "پورٹریٹ" میں جناب احمد ندیم قاسمی کو بہت اچھے انداز میں "باہر کے رابطے اندر کے رشتے" عنوان سے خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔

رحیم گل صاحب کے اس خاکے کو شکریہ کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے تاکہ سیمینار کے موقع پر جناب احمد ندیم قاسمی کے عدم شرکت کے باوجود ان کی یاد تازہ ہو سکے۔

(دستر ور تونسوی)

"عام طور پر احمد ندیم صاحب سے میرا رابطہ بہت کم رہتا ہے۔ مگر ہمارا ایک ذہنی اور جذباتی رشتہ کا تعلق ہے۔ ان کی عمر ربع صدی سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ ندیم صاحب ساٹھویں سالگرہ منا رہے ہیں اور میں باون سیڑھیوں سے ایک دو منزلیں ادھر کھڑا ہوں۔ مگر ہمارے مابین ناطے کا معصوم بچہ مکمل طور پر جوان ہو چکا ہے۔

ندیم صاحب کو میں ابتدا ماضی سے جانتا ہوں۔ جب اپنے آپ کو نہیں جانتا تھا۔ اپنے آپ کو جانا تو مجھے ندیم صاحب کو بھول جانا چاہئے تھا۔ مگر وہ تو پلٹ کر میرے دل میں بیٹھ گئے۔

جب میں باجرے کے کھیت کے منڈیر پر پاؤں پھیلا کر ندیم صاحب کے افسانے پڑھتا تھا۔ تو ایک چھم چھم کرتی چھوٹی لڑکی ہرے بھرے باجرے کے کھیت سے جھانکتی نظر آتی تھی۔ یہ ندیم صاحب کے افسانوں کا اثر تھا کہ پنجاب کی الھڑ مٹیار میرے ذہن میں بری طرح بیٹھ گئی تھی۔

یہ کریڈٹ بھی ندیم کو جاتا ہے کہ بالآخر میں اس الھڑ مٹیار کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور آج وہ باجرے کے کھیت میں سے جھانکتی ہوئی مٹیار میرے بچوں کی ماں ہے۔

اور یہ ڈس کریڈٹ بھی ندیم صاحب کو ہی جاتا ہے کہ ایک بار ان کے افسانے کے نشے میں اس قدر سرشار ہو گیا تھا کہ منڈیر پر لیٹے ہوئے سانپ پر بے خبری میں ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اور سانپ نے مجھے ڈس لیا تھا۔ اور میں مرتے مرتے بچا تھا۔ مگر اس ڈس کریڈٹ سے ایک کریڈٹ نے بھی جنم لیا تھا۔ سانپ کے زہر نے میرے جسم میں داخل ہو کر میری فطرت کے زہر کو مار ڈالا تھا۔

بعض اوقات ان کے افسانوں کے ایکسپریشن سے متاثر ہو کر میں ورق پلٹ کر ان کی تصویر دیکھتا کہ اس شخص نے کیسے کیسے خوبصورت عشق کئے ہیں۔ لیکن ان کے چہرے پر ایسی شرافت، اور آنکھوں میں ایسی طہارت نظر آتی کہ متزلزل ہو جاتا۔ اور سارے الزامات واپس لے لیتا۔

میری عمر اس وقت سترہ اٹھارہ برس کے قریب ہو گی۔ جب میں نے ندیم صاحب کی تصویر دیکھی تھی۔ یہ سچ ہے کہ میں نے ندیم صاحب کی تصویر دیکھ کر ان کی شخصیت سے قربت محسوس کی تھی جس طرح بعض لوگوں کی شکلیں دیکھ کر ان سے خدا واسطے کا بیر ہو جاتا ہے اسی طرح مجھے ندیم صاحب سے خدا واسطے کی محبت ہو گئی تھی۔

نام یاد نہیں، کئی برس اُدھر کی بات ہے۔ ایک عرب ادیب پاکستان آیا تھا۔ ان کے اعزاز میں کئی تقاریب بھی ہوئی تھیں اگرچہ میں کسی تقریب میں شرکت نہیں کر سکا تھا۔ لیکن اخباروں میں خبریں پڑھتا رہا۔ اس سلسلے میں روزنامہ مشرق میں جناب انتظار حسین کا کالم پڑھا تو مجھے یہ عرب ادیب مسخرہ لگا۔ لیکن دوسرے ہفتے روزنامہ جنگ میں ندیم صاحب کا کالم پڑھا۔ تو یہ عرب ادیب مجھے واقعی دانشور لگا۔

تب معلوم ہوا کہ حقیقتیں کس طرح افسانے بن جاتی ہیں۔ اور تب یہ راز بھی کھلا — کہ جو لوگ دوسروں کو احترام دیتے ہیں دراصل خود ہی محترم ہوتے ہیں۔

ایک بات اور بتاؤں — یہ وہ دَور ہے کہ اگر آپ میری تعریف کریں۔ تو مجھے حیرت کے ساتھ آپ کا آپریشن کرنا پڑے گا۔ تاکہ آپ کا دل گردہ دیکھ کر اندازہ کر سکوں کہ اس کا وزن اور حجم کتنا ہے کیونکہ عام ہوا یہ ہے کہ آج کل دل گردے سکڑ گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی کسی کو نہیں مانتا۔ کسی کی عظمت تسلیم نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی بھولا بھالا شخص کسی کو تسلیم کر لے تو ظاہر ہے آپ اس کا دل گردہ دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔

تو بتاؤں۔ ایک بھولا بھالا شخص اس فریب ہستی میں موجود ہے بلکہ آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ ندیم صاحب ہیں۔

میرا دوسرا ناول "پیاس کا دریا" مکمل ہوا۔ دیباچے کے لئے میں نے دو چار مشہور ادیبوں سے رابطہ پیدا کیا۔ انھوں نے اس کی حامی بھی بھری۔ سال چھ مہینہ مسودہ بھی رکھا۔ لیکن دیباچہ نہ لکھا گیا۔ میں اس قسم کے سلوک کی توقع کم از کم ان سے شرفاء سے نہیں رکھتا تھا۔ اور وہ بھی غالباً مجھ سے یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ ان کے رویے سے میں کسی طرح کا ردِ عمل ظاہر کروں گا۔

اب صرف ندیم صاحب ہی تھے کہ دیباچے کے لئے ان سے رجوع کرتا۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ہمت یوں نہیں پڑتی تھی کہ ندیم صاحب سے مجھے بے پناہ عقیدت تھی۔ بے پناہ محبت تھی۔ میں ڈر رہا تھا کہ اگر انھوں نے بھی دوسرے دوستوں کی طرح ٹال مٹول سے کام لیا تو میرا کیا بنے گا۔ میں اپنی عقیدت کا جنازہ کہاں کہاں اٹھائے پھروں گا۔ ظاہر ہے کہ میں بکھر جاؤں گا۔ ٹوٹ ٹوٹ جاؤں گا۔

لہٰذا یہ ندیم صاحب سے میری انتہائے محبت تھی کہ ان کی طرف نہ گیا۔ لیکن جو عرضِ مصنف کے کھاتے میں جہاں میں نے ان شرفاء کے سلوک کا ذکر کیا۔ وہاں ادیبانہ تعلّی کا شکار ہو کر، یا یوں کہئے کہ انتقاماً اپنے ناول کی خود ہی تعریف کی۔ تعریف بھی یہاں تک کہ جس موضوع پر میں نے ناول لکھا ہے اسے جناب مرزا ادیب نہ لکھ سکتے تھے۔ حتیٰ کہ ندیم صاحب بھی اس موضوع پر مجھ سے اچھا نہ لکھ سکتے — بلکہ ایسا ناول لکھنا میرا ہی مقدر تھا۔

کچھ لوگوں نے اس غلط بینی یا خود بینی پر مجھے آڑے ہاتھوں لیا کہ کم از کم مجھے ندیم صاحب کے خلاف زہر نہیں اگلنا چاہئے تھا۔ لیکن میری ڈھٹائی اور دیدہ دلیری دیکھئے کہ جب اس ناول کی تقریب کا اہتمام ہوا۔ تو میں نے صدارت کے لئے ندیم صاحب کا نام لیا سب لوگ چونکے — مگر میں جانتا تھا — میں ندیم صاحب کی عالی ظرفی کو ان سے زیادہ جانتا تھا —

ندیم صاحب نے اس تقریب کی صدارت قبول کی۔ انھوں نے صدارتی خطبے میں جو کچھ کہا۔ یار لوگ اسے سن کر دنگ رہ گئے — انھوں نے کہا —

یہ ناول پڑھ کر میں ذہنی طور پر پہلے سے زیادہ امیر ہو گیا ہوں۔ یہ رحیم گل کے کہانی کہنے کا کمال ہے کہ چار سو صفحے کے اس طویل ناول کو ایک نشست میں پڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ اور رحیم گل کا یہ دعویٰ سچ ہے کہ ایسا ناول لکھنا کسی اور کا نہیں، رحیم گل کا مقدر تھا —!

تو دوستو — یہ ہیں ندیم صاحب — جو لوگ بڑے لوگوں کو پہچاننے میں بخل سے کام نہیں لیتے ہیں وہ تعصب کی عینک اتار کر اس پٹھان کی آنکھوں سے دیکھیں۔ تاکہ انھیں ندیم صاحب کا بے مثال روپ نظر آئے —!

ان کے دل گردے کی ایک بات اور سن لیجئے — پچھلے دنوں میں نے اپنا ایک ناول مکمل کیا "جنت کی تلاش" اس کا موضوع ایسا تھا کہ مجھے پاکستان کے گوشے گوشے کی سیاحت کرنا پڑی۔ اس ناول کو لکھنے میں چھ سال لگے۔ ظاہر ہے بہت محنت طلب اور صبر آزما کام تھا یہ —

اب کے میں نے طے کر لیا تھا کہ دیباچہ ندیم صاحب سے لکھواؤں گا۔ حالانکہ انہی دنوں ایک اخبار میں ایک خبر چھپی تھی۔ کہ کثرتِ دیباچہ نویسی سے باز آ کر ندیم صاحب انتقال کر گئے ہیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ ندیم صاحب کو ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور پھر سب سے اہم بات یہ تھی کہ میں نے جس ذوق و شوق سے یہ ناول لکھا تھا۔ جتنے بڑے موضوع کو زیرِ بحث لایا تھا۔ اس کی تنقید و تبصرہ کے لئے بھی کسی بڑے دل گردے کے ادیب کی ضرورت تھی۔ کیونکہ کسی کے حق کو تسلیم کرنا کسی کو جائز داد دینا نہایت حوصلے کا کام ہے۔ خصوصاً اس دور میں کسی پہ سچ کہنا یہ اتنا آسمان سے تارے توڑ لانے کے مترادف ہے۔

لیکن میں جانتا تھا کہ اس ملک میں خدا کا ایک بندہ ایسا موجود ہے۔ جس کے منہ میں سچ کی زبان ہے۔ جس کے فراخ سینے میں حوصلے کا پہاڑ کھڑا ہے۔ اور جس کے قلم سے روشنائی کی بجائے موتی ٹپکتے ہیں —

جب میں نے اس ضخیم ناول کا مسودہ ندیم صاحب کے حوالے کیا تو وہ ہنس پڑے۔ ان کی خوبصورت ہنسی سے میری آٹھ سال کی محنت سپھل ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا۔ ندیم صاحب نے کسی سے کہا —

"جنت کی تلاش" ایسا ناول ہے جس کا دیباچہ میں رسمی طور پر نہیں لکھوں گا۔ بلکہ قارئین کو اپنے ایک لطیف تجربے میں شریک کروں گا۔

تقریباً سال سوا سال کے بعد جب ندیم صاحب نے دیباچہ میرے حوالے کیا۔ پڑھ کے دیکھا۔ ندیم صاحب کا کہا ہوا فقرہ دیباچہ میں بھی درج تھا۔ میں سامعین کو اپنی مسرت میں شریک کرتے ہوئے اور ندیم صاحب کی عظمت کا اقرار کرتے ہوئے اس دیباچہ کا شروع اور آخر کا مختصر سا اقتباس سناتا ہوں۔

ندیم صاحب لکھتے ہیں —

"جنت کی تلاش" اردو زبان کا پہلا ناول ہے۔ جس میں وہ گہری اور گمبھیر الجھنیں موضوع بنائی ہیں جنہوں نے صدیوں سے بڑے بڑے حکیموں، فلسفیوں، عالموں اور دانشوروں کو جستجوئے مسلسل میں مبتلا رکھا ہے — اس بہت بڑے اور پھیلے ہوئے موضوع کو رحیم گل نے ایک ماہر کرافٹسمین کی طرح شروع سے آخر تک اپنی پُر اعتماد گرفت میں رکھا ہے۔ اور ایک ایسا ناول تخلیق کیا ہے جو اپنے موضوع اور نوعیت اور ہیئت کے لحاظ سے کم از کم اردو زبان میں تو بے مثال قرار دیا جا سکتا ہے —"

آخر میں وہ لکھتے ہیں۔

"مجھے یقین ہے کہ اگر اہلِ نقد نے دیانت سے کام لیا تو وہ جنت کی تلاش کو ایک ایسا ناول تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جو اپنے موضوع اور ہیئت کے لحاظ سے منفرد حیثیت کا حامل ہے اور جو مستقبل کی اردو ناول نگاری کی ایک مضبوط بنیاد قرار پا سکتا ہے —"

دوستو — یہ ہے وہ حوصلہ مند شخص جسے شاید معلوم نہیں کہ میرے ناول "جنت کی تلاش" کا اہم کردار، سکندر کا ڈاکٹر — درحقیقت ندیم صاحب کا کردار ہے وہ چلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاؤں میں سپرنگ لگے ہوتے ہیں اور وہ دیکھتے دیکھتے آسمان کی طرف پرواز کر جائے گا — زندگی سے اس کا سلوک، انسانوں سے اس کا برتاؤ، اور بیوی سے اس کا تعلق وہ ساری خصوصیتیں میں نے ندیم صاحب سے چرا کر اپنے کردار کو ودیعت کر دی ہیں —

اگرچہ یہ کردار ناول کے آخری باب میں اُبھرتا ہے۔ مگر ناول کے تمام کرداروں کو متاثر کرتا رہتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ندیم صاحب نے اپنے ادبی اور شخصی کردار سے ایک عالم کو متاثر کیا ہے۔

سامعین کرام — مضمون ختم کرنے سے پہلے میں آخری خواہش کا اظہار کر دوں — کہ جب ندیم صاحب کی سو ویں سالگرہ منائی جا رہی ہو تو میں ایک بار پھر مضمون پڑھوں۔ اور جب ندیم صاحب بے مثال زندگی کے ایک سو سال پورے کر لیں تو میرا وہ بیٹا جو ان کی محبتوں سے محروم رہا ہے باپ کی جگہ اسٹیج پر آ کر اس عہد کا ذکر اس انداز میں کرے کہ محبت کا خوف جوان ہو کر کس طرح، محبت کی انتہا میں بدل جاتا ہے۔ اور نسل در نسل کس طرح محبت کا چراغ روشن رہتا ہے۔

●●●

انسانی اور ملکی فرض سمجھتا ہوں کہ اس محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔

اور جب وہی انگریز فرقہ وارانہ مسئلہ کو آڑ بنا کر اپنی لعنت خیز جبر و استبداد کی عمر بڑھانا چاہتا ہے اور مذاکرات کی صورت میں پچکیاں لیتی ہوئی کرسیٔ اقتدار کو سنبھالا دینا چاہتا ہے۔ دنیا گواہ ہے جب کرپس پر اس کے سوالات کی گرفت پڑتی ہے تو وہ چکرا جاتا ہے۔ نہرو جیسا سیاستدان دانتوں تلے انگلیاں داب کے یہ منظر دیکھ رہا ہے اور بالآخر یہ عجیب و غریب ذہانت کا مالک اس مسئلہ کا ایسا حل پیش کرتا ہے جسے کابینہ مشن پلان کے نام سے دنیا یاد کرتی ہے اور جس کے تحت ہندوستان میں پہلی دلیسی حکومت قائم ہوئی۔

اگر اس کی فیصلی ضیاء نگاہ ڈالیں تو شارح قرآن کی حیثیت سے ترجمان القرآن .... ام الکتاب، البصائر، تفسیر سورۂ یوسف، ذوالقرنین، اور دوسرے مضامین اس کی وقت نگاہ کے گواہ ہیں۔ محقق کی حیثیت سے احادیث پر مضامین، سوانح مجددین، فقہی مسائل وغیرہ اور اس قبیل کے بیش بہا خزانہ اس نیرو کن جبلی سورج کی ہلکی سی جھلک دکھاتا ہے۔ ادب میں غبارِ خاطر، تذکرہ، قولِ فیصل، نیرنگ عالم اور تمام دوسرے مضامین اپنی بہار دکھلا رہے ہیں جنہیں دیکھ کر ادب کے بڑے بڑے شششدر ہو کر انگشت بدنداں ہیں۔ سیاسیات میں قولِ فیصل انڈیا ونز فریڈم۔

وہ اُردو ادب و صحافت کی تاریخ کے ماتھے کا جھومر تھے

غلامی ۔۔ خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے سراسر خلاف ہے۔" (جان)

قمر ایوبی

وہ دل نہیں جو اسیرِ غمِ آرزو نہ ہو
وہ آنکھ کیا ہے؟ جس میں تری جستجو نہ ہو

خونِ جگر سے تیرا جو پہلے وضو نہ ہو
قابل نمازِ عشق کے اے شیخ! تو نہ ہو

آؤ چاہتے ہیں سب کو عطا ہو بقدرِ ظرف
ساقی کو ضد ہے کوئی یہاں سرخرو نہ ہو

صحنِ چمن میں ایسا کوئی پھول تو بتا
جس میں شریک اہلِ جنوں کا لہو نہ ہو

خود ذوقِ آگہی ہے مرا انجمن نواز
یوں اپنا بزم ناز پہ مشہور تو نہ ہو

بن جائے ایک خواب تجلیٔ مہر و ماہ
آئینہ آنکھ کے حسن کا روبرو نہ ہو۔

ڈی حیدر بیگ تہ آبان

پڑ جائے گی جبیں پہ شکن آسمان کی
آہیں سمیٹئے نہ کسی بے زبان کی

بستے ہیں کچھ غریب بھی سایۂ مکان کے
دیوار اٹھائیے نہ اب اونچی مکان کی

جب دوزخ و بہشت کا چرچا ہے ہر جگہ
اک اک کڑی ہے وہ تو مری داستان کی

ہو جائے دُور دیر و حرم کا یہ تفرقہ
ناقوس میں ملا دیں صدا گر اذان کی

بربادیوں کا حال مری پوچھتے ہو کیا
ہیں مہربانیاں یہ کسی مہربان کی

کل تک جو بیج بوتے تھے ہر سو نفاق کے
تعلیم اب وہ دیتے ہیں امن و امان کی

بگڑا ہوا نظامِ گلستاں ہے آج بھی
بدلا ہوا کہ ہے اب بھی نظرِ باغبان کی

فراقِ وہ اپنے ہو نہ سکے جن کے واسطے
بازی لگا دی ہم نے محبت میں جان کی

ایم یوسف ثاقب بالی

وہ دور تو کسے ہوا سمجھتے ہیں
گل کھلائیں گے کیا سمجھتے ہیں

دیکھ جو پالے پڑے آکے ذرا
گاؤں کے لوگ کیا سمجھتے ہیں

جام پر کس کا حق تھا، کیا کہئے!
جام کس کو ملا، سمجھتے ہیں!

پیش آئے جو آئنے کی طرح
وہ ہمیں بے وفا سمجھتے ہیں

قتل کر کے ہمیں بھی روئیں گے لوگ
آدمی خوب تھا، سمجھتے ہیں

بے کسی کام کا نہیں لیکن
آپ ثاقب کو کیا سمجھتے ہیں

گوشۂ عقیل صدیقی

ہیڈ کوارٹر

عذرا اصغر

صبح کے اخبار میں خبر پڑھ کر دفعتاً مجھے یاد آگیا۔

بےشک کیسی ہی پالیسی بنا لی جائے کہ سنسنی نہ پھیلے مگر ایک آدھ خبر تو نظر بچا کر منظر عام پر آہی جاتی ہے کہ دل دھک سے رہ جائے تاہم "وہ خبر جو میں نے آج صبح پڑھی۔ بظاہر دل دھڑکانے والی تو نہ تھی پھر بھی میرے لئے وہ خبر اہم ثابت ہوئی۔ سمگلنگ، ڈاکہ، چوری، اغوا اور قتل کی خبریں تو زندگی کا معمول ہیں ایسی خبریں پڑھ کر تو ہم اخبار یوں اچھال دیتے ہیں جیسے وہ ردی کا ٹکڑا ہو۔ بےکار۔ بے مصرف مگر آج صبح کے اخبار کی وہ خبر میرے لئے بہت اہم ہے۔

"مظفر آباد سے آتا ہوا ٹرک پکڑا گیا جس میں سمگلنگ کا سامان بھرا تھا۔ ملزم گرفتار، ڈرائیور فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔"

جب رات کا اندھیرا پھیل جائے گا یا اگلی صبح کی پو پھٹ رہی ہوگی تو میرے دروازے پہ دستک ہوگی پھر کوئی دروازہ کھول دے گا اور وہ منہ اور سر چادر میں چھپائے میرے سامنے کھڑا ہوگا۔

"صادق آگیا۔ صادق آگیا۔" بچے بستر سے منہ نکال نکال کر شور مچائیں گے۔

"میں آپ سے ملنے کے لئے بھاگ کر آیا ہوں۔ پولیس میرے پیچھے ہے۔"

وہ جھک کر میرے پیر چھوتے ہوئے کہے گا۔

"کم بخت پھر کچھ کیا تم نے؟" میں گھبرا کر پوچھوں گی۔

"بی بی جی درخت کاٹے ہیں۔ وہ لکڑی ہم مظفر آباد لا رہے تھے کہ ٹرک پکڑا گیا میں بھاگ آیا ہوں۔ سوچا جیل جانے سے پہلے آپ سے مل لوں۔"

"وہ کہے گا اور کہیں چھپ کر جانے چلنے لگے گا۔

"وہ جب بھی آتا ہے اسی قسم کی ایک [illegible] سناتا ہے۔ [illegible] میرا [illegible] انسان کے لئے [illegible] اس [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

بڑے اہم ہوتے ہیں۔ صادق بھی ایسے ہی عام لوگوں میں سے ایک بے حد معمولی انسان ہے۔ بارہ برس سے پہلے وہ پتلا دبلا سا ایک لڑکا تھا۔ یہی کوئی دس یا بارہ کا سن ہوگا۔ گورا میلا سیلا سا رنگ، ابھرے ابھرے نقش، کتابی چہرہ، پھٹے ہوئے میلے بھورے گندے ہاتھ پاؤں ٹخنوں سے اونچی کالی دھوتی، لمبا سا سیاہ کرتا۔ اور جوتوں سے ناآشنا پیر۔

"اونہہ! اب مجھے اس مٹی کے مادھو کے ساتھ مغز مارنا پڑے گا۔" بے حد کڑھ کر میں نے سوچا تھا۔

"تم کشمیری ہو۔؟" میں اس کا انٹرویو لینے لگی۔

"جی۔" بڑی سستی سے اس کی گردن اثبات میں ہلی۔

"مجھے تو تم جانگلی لگتے ہو۔..." میری رگ ظرافت پھڑکی۔ وہ سہما سہما سا مسکرایا اور میری جان میں جان آئی۔

چلو اللہ کچھ نہ سہی خوش مزاج تو ہے نا۔" میں نے سوچا اور اطمینان کا سانس لیا۔ لے میری تنک مزاجی کہہ لیجئے یا حسن پرستی کہ بدشکل، بدمزاج اور کند ذہن نوکر کبھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ صادق کی خوش مزاجی سے میری ہمت بندھ گئی۔ اسے ہاتھ منہ دھونے کا کہہ کر میں اس کے کپڑے سینے بیٹھ گئی وہ دیر تک نلکے پہ بیٹھا ٹوٹے ہوئے صابن سے ہاتھ پیر مانجھتا رہا۔ اور چند گھنٹوں میں اس نے اپنی کینچلی بدل کر خود کو میرے معیار کے مطابق بنا لیا تھا۔ دن گزرتے گئے اور صادق رفتہ رفتہ نہیں، بڑی تیزی سے پورے گھر پہ چھا گیا۔ ہر کام وہ ایسے کرتا جیسے صدیوں سے جانتا ہو، ہر آدمی کا مزاج شناس، ہر کس کو کیا پسند ہے اور کیا برا لگتا ہے اسے خوب معلوم تھا۔ وہ ہر چیز کا خیال رکھتا۔ بظاہر اناڑی لگتا تھا مگر کام میں مستعد اور چوکس۔ ہاں! صبح اٹھنے میں اسے بڑی دقت پیش آتی۔ میں ناشتہ پکا کر بچوں کو سکول کے لئے تیار کر لیتی تب کہیں وہ جاگتا۔

"صادق صبح پانچ بجے کے قریب گھر سے نکل جاتا ہے کہ صاحب کا حکم تھا [illegible]

[illegible] ... دیر سے لوٹ کر آتا۔

"بابا جی آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"
"کہو۔"
"آپ میری شادی کر دیں جی۔"
"تیرا تو نکاح ہو چکا ہے۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔
"میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔"
"پھر۔"
"ایک لڑکی ہے جی" وہ ذرا شرما کر بولا۔
"پسند ہے وہ تجھے۔"
"ہاں جی۔" اس نے منہ پھیر کر کہا۔
"کرے گی وہ تجھ سے شادی؟"
"ہاں وہ تیار ہے۔ وہ تو کہتی تھی مجھے بھگا کے لے جا۔"
"بھگا لے نا پھر" میں نے اسے شہ دی۔
"نہیں جی ایسے ٹھیک نہیں ہوتا۔" وہ بڑے ناصحانہ انداز میں بولا۔
"تو کیا اس کے گھر والے مان لیں گے؟"
"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں جی۔ آپ اس کے گھر چلیں نا۔"
"اچھا چلیں گے۔" میں نے بے دلی سے گویا وعدہ کر لیا۔

حسب معمول وہ پھر لمبے عرصے تک غائب رہا۔ ہم کسی وقت بھی اس کی آمد کی توقع کر سکتے تھے۔ میرا گھر گویا اس کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ ادھر ادھر پھر کر جب ضرورت ہوتی وہ بے تکلفی سے چلا آتا۔ دس بیس دن یا مہینہ دو مہینہ رہتا اور پھر کسی طرف کو نکل جاتا۔ شاید ایک جگہ رہتے رہتے اس کا دل اوب جاتا تھا۔ کہتا تو وہ یہ تھا کہ پیسے زیادہ چاہئیں۔ تنخواہ بڑی ہو۔ مگر میں نے کبھی اس کے پاس پیسہ دیکھا نہیں۔ [illegible] پیسہ جو اس کے جیب میں ہوتے۔ وہ بچوں کو رنگ برنگی پنیاں، ٹافیاں دلا کر کھلا دیتا اور پھر سارا وقت مجھ سے پیسے مانگ کر سگریٹ پیتا رہتا۔ کپڑے پھٹ جاتے تو گھر میں ہی کسی سے ایک [illegible] مانگ کر پہن لیتا۔ جب تک رہتا بچے کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتا اور جب جی اکتا جاتا تو سب سے واپسی کا اعلان کر دیتا۔ میں اس کی عادت سے اسی طرح واقف تھی جیسے اپنے گھر کے لوگوں کی عادت سے تھی۔ چنانچہ جب وہ چاہتا، میں کبھی نہ روکتی۔ بلکہ اگر روکنا چاہتی بھی تو وہ رک نہیں سکتا تھا۔ یہ میں جانتی تھی۔ پھر کہنے سے کیا فائدہ۔ اس دفعہ وہ کئی سال تک بھی

آیا۔ میں نے گھر بدلا، علاقہ بدلا، اور دوسری جگہ چلی گئی۔ اس کا خیال کبھی کبھی آتا ضرور۔ ہم سب مل کر اکثر اس کا ذکر کرتے مگر یوں لگتا تھا کہ اب وہ حکایتِ پارینہ بن چکا ہے۔ وہ ماضی کی ان تہوں میں چھپ چکا ہے۔ جن کے بہت یادوں میں تو اٹھتے جاتے ہیں۔ انہیں مجسم نہیں کیا جا سکتا۔ گویا وہ ماضی کا ایسا واقعہ بن چکا تھا۔ ایسی یاد تھا جو اور بہت سی یادوں کے ساتھ ذہن کے تہہ خانے میں محفوظ تھا۔ مقفل تھا۔ اس سے ملنے یا اسے دیکھنے کا تصور بھی اب ممکن نہیں تھا۔ مگر ایک دن میں حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ ہانپتا، کانپتا پسینے میں شرابور میرے سامنے کھڑا تھا۔

"ارے تو صادق۔۔ زندہ ہے۔"
"ہاں جی۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرائے جا رہا تھا۔ وفورِ جذبات سے اس کا سانس پھول رہا تھا۔
"گھر کیسے ملا تجھے۔"
"میں جی ادھر گیا تھا۔ پھر انہوں نے کہا تو میں....."
وہ میرا گھر کھوجنے کے حوالے بتا رہا تھا۔
"تو نے شادی کر لی۔" اس کے گھر کی خیریت پوچھنے کے بعد میں نے پوچھا۔
"نہیں جی" وہ لاپرواہی سے بولا
"کیوں؟"
"ملی ہی نہیں نا کوئی۔"
"اور وہ لڑکی جس کے پاس تو مجھے لے جا رہا تھا۔"
"وہ مر گئی۔"
"ارے کیسے۔" مجھے واقعی صدمہ ہوا۔
"سانپ نے ڈس لیا تھا۔"
"تجھے افسوس نہیں ہوا؟"
"کیوں نہیں ہوا جی بہت۔"
"پھر۔۔"
"پھر کیا کرتا۔۔"
"تو اب کیا کر رہا ہے؟" کافی دیر چپ رہنے کے بعد میں نے موضوع بدلا۔
"پتہ ہے بابا جی۔ میں پکڑا گیا تھا۔" اس نے بڑے فخریہ انداز

میں خوش ہو کر ہنس دیا۔

"کیا مطلب" مجھے تعجب ہوا۔ اس جیسا ایماندار آدمی بھی کوئی جرم کر سکتا ہے۔

"پتہ ہے جی کیا ہوا"

"ہوں۔"

"ہم کچھ لڑکوں نے مل کر گورنمنٹ کے درخت کاٹ کر بیچ دیے۔ کئی دفعہ کاٹے پھر انہیں شک پڑ گیا اور ایک دفعہ ہم پکڑے گئے۔ چھ مہینے میں اندر رہا۔"

"پھر —"

"بس پھر انہوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔"

"اب کیا کر رہا ہے۔"

"آج کل بیکار ہوں۔"

اس کی سیلانی طبیعت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اب اس کے معاملے میں مداخلت مناسب نہیں سمجھی۔ میں کوشش کر کے اسے کہیں کام دلوا بھی دیتی مگر بے فائدہ تھا۔ کسی ایک جگہ جم کر کام کرنا اس کے بس سے باہر تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا مگر میں جانتی تھی وہ ایڈونچر کا متلاشی تھا اسے نئے نئے کام کرنے میں، جان جوکھوں میں ڈالنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ وہ فطرت کا برا نہیں تھا۔ مگر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں اسے مزہ ملتا تھا۔ اس کا ذہن تخریبی نہیں تھا مگر تخریب خود بخود اس سے سرزد ہو جاتی تھی۔ اسے تخریب اور تعمیر کا فرق معلوم نہ تھا اور یہ فرق تو بڑے بڑے پڑھے لکھوں کو معلوم نہیں ہوتا۔ وہ تو جاہل، دیہاتی تھا۔

اور آج صبح کے اخبار میں وہ خبر پڑھ کر میں اس کی منتظر ہوں جب رات کی تاریکی پھیل چکی ہوگی یا اگلی صبح پو پھٹ رہی ہوگی تو میرے دروازے پر دستک ہوگی۔ پھر کوئی بڑھ کر دروازہ کھولے گا۔ اور سامنے کھڑا مسکرا رہا ہوگا۔

پتہ ہے بی بی جی میرے پیچھے پولیس لگی ہے"، وہ اپنے مخصوص انداز میں میرے پیر چھو کر بتائے گا۔ مگر میں اسے کچھ کہہ نہ سکوں گی کیونکہ میں جانتی ہوں میرا کچھ کہنا، کوئی نصیحت کرنا بیکار ہوگا۔ قطعی بے فائدہ کہ اس کا دل ایسا گنبد ہے جہاں نصیحت نہیں ٹکا کرتے۔

زندگی

نسیم شاہجہانپوری

زندگی ظلمت بھی ہے تنویر بھی
زندگی تخریب بھی، تعمیر بھی
زندگی کے مختلف مفہوم ہیں
زندگی ہے خواب بھی تعبیر بھی

زندگی ہے صبح بھی اور شام بھی
زندگی آغاز بھی انجام بھی
زندگی سے مطمئن کیوں ہے بشر
زندگی ہے موت کا پیغام بھی

زندگی تقدیر بھی ہے تقصیر بھی
زندگی توقیر بھی، تحقیر بھی
زندگی انعامِ فطرت ہی نہیں
زندگی ہے مستقل تعزیر بھی

زندگی ظالم بھی ہے مظلوم بھی
زندگی حاکم بھی ہے محکوم بھی
زندگی ہر رنگ میں ہے جلوہ گر
زندگی فتنہ بھی ہے معصوم بھی

زندگی ہے لطف بھی بیداد بھی
زندگی پابند بھی، آزاد بھی
زندگی پُرکیف نغمہ ہی نہیں
زندگی ہے بے اثر فریاد بھی

زندگی ہے ظلم بھی احسان بھی
زندگی ساحل بھی ہے طوفان بھی
زندگی ہر قید سے آزاد ہے
زندگی ہے کفر بھی، ایمان بھی

زندگی خوش رنگ بھی بے رنگ بھی
زندگی اک نام بھی ہے ننگ بھی
زندگی کے مختلف ہیں روپ بھی
زندگی آئینہ بھی ہے سنگ بھی

طیب صالح
ترجمہ: اظہر جاوید

مٹھی بھر کھجوریں

مجھے اب ٹھیک سے یاد نہیں کہ تب میری عمر کتنی تھی۔ لیکن اتنا احساس ہے کہ تب میں بہت چھوٹا تھا۔ پھر بھی مجھے یاد ہے کہ جب میں اپنے دادا جان کے ساتھ باہر نکلتا تھا تو لوگ مجھے دیکھ کر سر پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ رخساروں پر چٹکی بھرتے تھے اور میں سوچا کرتا تھا کہ یہ لوگ ایسی حرکتیں میرے دادا جان کے ساتھ کیوں نہیں کرتے۔ اس زمانے کی جو دوسری بات مجھے خاص طور پر یاد ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں اپنے ابا جان کے ساتھ کہیں باہر نہیں جاتا تھا۔ یا تو وہ مجھے خود اپنے ساتھ لے جانا پسند نہیں کرتے تھے یا دادا جان نے مجھے کھانے اور ساتھ لے جانے کی ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی کہ جب صبح کے وقت میں قرآن پاک پڑھنے کے لئے مسجد جاتا تو بھی دادا جان ہی میرے ساتھ ہوتے۔ مسجد، دریا اور کھیت۔ یہ میری اس عمر کی یادوں پر چھائے ہوئے ہیں اور اب بھی ان کے اثرات میری زندگی پر موجود ہیں۔ میری عمر کے لڑکے مسجد میں قرآن پڑھنے کے لئے جانے سے کتراتے تھے۔ میں بڑے شوق سے مسجد جایا کرتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا حافظہ بہت اچھا تھا اور میں قرآنی آیات کو بہت جلد ازبر کر لیتا تھا۔ جب بھی ہماری مسجد میں کوئی مہمان آتا، ہمارا شیخ مجھے حکم دیتا کہ میں کھڑے ہو کر سورۃ رحمان کی تلاوت کروں۔ مہمان میری قراءت کی تعریف کرتے اور شاباش دیتے ہوئے میرے سر اور کندھوں کو تھپتھپاتے تھے۔

ہاں مجھے مسجد سے محبت تھی اور دریا سے بھی۔ صبح کے وقت جونہی قرآن کا سبق ختم ہوتا، میں اپنا سیپارہ رحل میں رکھ کر تیزی سے بھاگ نکلتا۔ اپنی امی کے پاس جا کر جلدی جلدی ناشتہ کرتا اور پھر بھاگتا ہوا دریا کے کنارے پہنچ، کپڑے اتار دریا میں چھلانگ لگا دیتا۔ جب میں تیرتے تیرتے تھک جاتا تو دریا کے کنارے بیٹھ کر گھنے اکیشیا کے درختوں پر نگاہ گاڑ دیتا اور مجھے ایک عجیب خیال سوجھتا کہ ان گھنے درختوں کے پیچھے جسیم اور قدآور لوگوں کا قبیلہ آباد ہے۔ ایسے لوگ جو میرے دادا جان کی طرح لمبے اور پتلے ہیں۔ ان کی ناک پتلی ہے

اور دادا جان کی طرح ان کی داڑھیاں سفید ہیں۔ میں جب بھی اپنے دادا جان سے کوئی بات پوچھتا وہ جواب دینے سے پہلے اپنی چٹکی سے ناک کی پھننگ ضرور رگڑتے۔ یہ ان کی مستقل عادت تھی۔ اور جہاں تک ان کی داڑھی کا تعلق ہے وہ بے حد ملائم اور روئی کی طرح سفید تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی خوبصورت سفید اور بے داغ داڑھی کبھی نہیں دیکھی۔ میرے دادا جان بے حد طویل القامت انسان تھے۔ میں نے اپنے علاقے میں کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو سر اوپر اٹھا کر دادا جان سے مخاطب نہ ہوا ہو۔ اور نہ ہی میں نے کبھی یہ دیکھا کہ دادا جان کسی گھر کے دروازے کے نیچے سے گزرے ہوں، اور انہوں نے اپنا سر نہ جھکا لیا ہو۔ دادا جان سے میں محبت کرتا تھا اور یہ سوچا کرتا تھا کہ جب میں بھی بڑا ہوں گا تو اپنے دادا جان کی طرح وجیہہ طویل القامت مرد بنوں گا۔

میں اپنے دادا جان کا چہیتا پوتا تھا۔ میرے دادا جان کے دوسرے پوتے اور نواسے میرے مقابلے میں نرے احمق تھے۔ بچپن میں ہی میں یہ جانتا تھا کہ دادا جان کب مجھ سے خاموشی کی توقع کرتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ یاد رہتا تھا کہ اب دادا جان کے نماز پڑھنے کا وقت ہو گیا ہے اور میں ان کے کہنے سے پہلے ہی جائے نماز بچھا دیتا اور وضو کے لئے پانی کا لوٹا بھی لا دیتا۔ دادا جان کو مجھ سے قرآن کی تلاوت سننے کا بہت شوق تھا۔ جب بھی انہیں فرصت ہوتی وہ مجھے تلاوت کے لئے کہتے اور میں ان کے چہرے سے بھانپ لیتا کہ وہ میری تلاوت سے متاثر ہو رہے ہیں۔

ایک دن میں نے دادا جان سے اپنے ہمسائے مسعود کے بارے میں پوچھا "دادا جان میرا خیال ہے کہ آپ مسعود کو پسند نہیں کرتے؟"

دادا جان نے حسب عادت چٹکی سے اپنی پتلی ناک کی پھننگ کو رگڑتے ہوئے جواب دیا "مسعود ایک بیہودہ آدمی ہے اور میں ایسے آدمی کو پسند نہیں کرتا۔"

میں نے پوچھا "دادا جان بیہودہ آدمی کیسا ہوتا ہے؟"

دادا جان نے ایک لمبے کے لئے اپنا سر نیچے جھکایا پھر دور دور پھیلے ہوئے کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کیا تم یہ ندی کے کنارے تک پھیلے ہوئے کھیتوں کو دیکھ رہے ہو۔ یہ ایک سو ایکڑ کے لگ بھگ رقبہ ہے اور تم ان کھیتوں میں کھڑے کھجور اور اکیشیا کے بے شمار درختوں کو دیکھ رہے ہو۔ کبھی یہ سب درخت مسعود کے تھے۔ یہ سب اس کے باپ نے اس کے ورثے میں چھوڑے تھے۔ یہ بات کہنے کے بعد دادا جان خاموش ہو گئے جیسے وہ کچھ سوچ رہے ہوں۔ پھر انھوں نے کہا۔ "ہاں۔ یہ تمام درخت بھی مسعود کے تھے۔ اب ان کا دو تہائی میری ملکیت بن چکا ہے۔"

یہ میرے لئے چونکا دینے والی بات تھی کیونکہ میں تو یہ سمجھتا تھا کہ جب سے خدا نے یہ دنیا بنائی ہے، یہ سب کھیت، سب درخت میرے دادا جان کی ملکیت ہیں۔

"جب میں اس گاؤں میں پہلی مرتبہ آیا تو یہاں ایک انچ زمین بھی میری اپنی نہیں تھی۔" دادا جان کہہ رہے تھے۔ "یہ زمین اور یہاں کی ہر چیز کا مالک مسعود تھا۔ اب صورتِ حال بالکل تبدیل ہو چکی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ جب اللہ کی طرف سے مجھے بلاوا آئے گا تو میں اس سے پہلے باقی ماندہ ایک تہائی درختوں اور زمین کا بھی مالک بن جاؤں گا۔"

دادا جان کی یہ بات سن کر نہ جانے کیوں مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ مجھے اپنے پڑوسی مسعود پہ ترس آنے لگا میرے دل میں یہ عجیب خواہش پیدا ہوئی کہ دادا جان جو چاہ رہے ہیں کاش ایسا نہ ہو۔ میرے کانوں میں مسعود کے گانے کی آواز گونجنے لگی۔ اس کی آواز بڑی سریلی تھی۔ اور قہقہہ بھرپور اور بلند بانگ ہوتا تھا۔ جب کہ میں نے اپنے دادا جان کو کبھی کھل کے ہنستے بھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے دادا جان سے پوچھا کہ "آخر مسعود نے اپنی جائداد اور زمین کیوں بیچ دی۔"

"عورت۔" اس لہجے میں میرے دادا جان نے یہ لفظ ادا کیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ عورت کوئی بہت خوفناک اور گھناؤنی چیز ہے۔

"میرے بیٹے۔ مسعود کو شادیاں کرنے کا شوق ہے جب بھی

اس نے کوئی نئی شادی کی۔ ایک یا دو کھیت میرے ہاتھ بیچ دیئے۔"

میں نے اپنے ذہن میں کھیتوں کی نسبت سے حساب لگایا تو نتیجہ یہ نکلا کہ جس طرح دادا جان کہتے ہیں کہ مسعود نے ایک شادی کے لئے ایک دو کھیت ان کے ہاتھ بیچ دیئے تو اس حساب سے اس نے کم از کم نوے عورتوں سے شادی کی ہو گی۔ لیکن اسی وقت مجھے یاد آیا کہ مسعود کی صرف تین بیویاں ہیں۔ اس کی باقی بیویاں کہاں گئیں؟ پھر میری آنکھوں کے سامنے مسعود کا چہرہ آ گیا۔ کمزور سا چہرہ اس کا لنگڑا گدھا۔ جس پر وہ سواری کیا کرتا تھا۔ اس کی آستینیں ہمیشہ پھٹی دکھائی دیتی تھیں۔ میں مسعود کے بارے میں ہی خیالات میں گم تھا کہ ایک آدمی تیز تیز چلتا ہوا دادا جان کے پاس آیا اور سلام کے بعد اس نے دادا جان سے کہا۔ "آج جمعہ ہے۔ کیا آپ وہاں نہیں جائیں گے؟"

یہ آدمی خود مسعود تھا۔

جانے مجھے یہ کیوں محسوس ہوا کہ مسعود یہ نہیں چاہتا کہ دادا جان وہاں جائیں۔ اس کا انداز گویا ایک ناخوشگوار فرض کو ادا کرنا تھا۔ دادا جان تیزی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے انکار سے چمک اٹھی ہیں۔ انھوں نے میرا بازو کھینچا اور کہا۔ "چلو ہم چلتے ہیں۔"

کھیتوں میں کھجور کے درختوں کے پاس کسی شخص نے دادا جان کے بیٹھنے کے لئے ایک سٹول رکھ دیا۔ دادا جان اس پر بیٹھ گئے میں ان کے پاس کھڑا رہا۔ میری طرح اور بھی بہت سے لوگ وہاں کھڑے تھے۔ میں ان سب کو جانتا تھا۔ لیکن میں صرف مسعود کو دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ لوگوں کے ہجوم سے الگ تھلگ وہ یوں اکیلا کھڑا تھا جیسا اس کا کسی چیز سے کوئی واسطہ یا تعلق نہیں حالانکہ جن درختوں سے کھجوریں اتاری جا رہی تھیں، یہ اسی کے تھے بیچ میں کبھی کبھار کھجوروں سے بھرے ہوئے گچھے کٹ کٹ کر زمین پر گرتے تو وہ انہیں ایک نظر دیکھ لیتا اور اس دوران میں ایک بار وہ اس لڑکے پر چلا پڑا جو کھجور کے اوپر چڑھا ہوا تھا درانتی سے کھجور کے ایک گچھے کو کاٹنے والا تھا۔

وہ وہاں سے مت کاٹو۔ اس طرح کھجور کا درخت ...

اس نے کیا کہا کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ حتیٰ کہ کھجور پر چڑھا ہوا وہ لڑکا بھی اسی جگہ سے دلچسپی کے ساتھ کان لگا رہا پھر کھجوریں درخت سے زمین پر گرنے لگیں۔

کھجور کا دل۔ میرے دل میں مسعود کے ان الفاظ کا گہرا اثر ہوا تھا۔ میرے تصور میں کھجور کے درخت کی ایک ایسی تصویر بنی جو زندہ ہو جس کے سینے میں دل دھڑکتا ہو۔ اس وقت مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ میں کھجور کی ایک کٹی ہوئی شاخ کو بار بار زمین پر پٹخ رہا تھا تو مسعود نے مجھے کہا تھا۔

"بیٹے، اس بے دردی سے شاخ کو نہ پٹخو۔ انسانوں کی طرح یہ بھی دکھ اور مسرت محسوس کرتے ہیں۔"

مرد اور میری عمر کے لڑکے چیونٹیوں کی طرح کھجور کے گرے ہوئے خوشوں کے ارد گرد جمع تھے۔ کھجوریں جمع کرتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ کھاتے بھی جا رہے تھے۔ کھجوروں کو اونچی اونچی ڈھیروں کی صورت میں جمع کر دیا گیا۔ لوگ آتے اور کھجوروں کا وزن کرتے اور پھر انہیں بوریوں میں ڈالتے جاتے یوں کل تیس بوریاں کھجوروں سے بھر گئیں۔ پھر ہجوم چھٹ گیا وہاں کھجوروں کے تاجر حسین، چھوٹے زمیندار موسیٰ اور دو اجنبی آدمیوں کے علاوہ سب جا چکے تھے۔

میں نے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز سنی۔ دادا جان سو گئے تھے میں نے دیکھا مسعود اپنی جگہ پر کھڑا ہے۔ اس کا منہ کھجوروں سے بھرا ہوا تھا۔ اور وہ کسی ندیدے کی طرح منہ چلاتا جا رہا تھا۔

دادا جان ہڑبڑا کر نیند سے جاگے۔ اٹھ کر کھڑے ہوئے اور تیزی سے چل کر کھجوروں کی بوریوں کے پاس پہنچ گئے۔ حسین، موسیٰ اور دونوں اجنبی بھی ان کے پاس چلے گئے۔ میں نے دیکھا کہ مسعود بڑی آہستہ روی سے چلتا ہوا اس آدمی کی طرح ہماری طرف بڑھ رہا ہے جو پسپا ہونا چاہتا ہے لیکن آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ سب لوگ کھجوروں کی بوریوں کے ارد گرد کھڑے ہو کر کھجوروں کا معائنہ کر رہے تھے۔ کوئی ایک آدھ کھجور اٹھا کر چکھتا۔ دادا جان نے مٹھی بھر کھجوریں مجھے دیں جنہیں میں کھانے لگا۔ میں نے دیکھا کہ مسعود دونوں ہاتھوں میں کھجوریں اٹھاتا ہے۔ پھر ناک کے قریب لا کر سونگھتا ہے اور بوریوں میں ڈال دیتا ہے۔

پھر میں نے دیکھا کہ وہ آپس میں بوریوں کو تقسیم کر رہے تھے۔ کھجوروں کے تاجر نے دس بوریاں لیں۔ پانچ پانچ دونوں اجنبیوں نے، چھوٹے زمیندار موسیٰ نے پانچ اور پانچ بوریاں دادا جان کے حصے میں آئیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے مسعود کی طرف دیکھا اس کی دونوں آنکھیں دائیں بائیں یوں دیکھ رہی تھیں۔ جیسے دو چوہے ہوں۔ جو اپنی بلوں کا راستہ بھول گئے ہوں۔

"اب بھی تمہاری طرف میرے پچاس پونڈ نکلتے ہیں۔" دادا جان نے مسعود سے کہا۔ "اس رقم کے بارے میں ہم پھر بات کریں گے۔"

حسین نے اپنے آدمیوں کو آواز دی۔ وہ گدھے لے کر آ گئے دونوں اجنبیوں نے اپنے اونٹوں کو آگے بڑھایا۔ کھجوروں کی بوریاں لاد دی گئیں۔ ایک گدھا رینگنے لگا جس سے اونٹ بھی بلبلانے لگے۔ میں مسعود کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی کھجوروں کی فصل اتاری گئی تھی۔ لیکن اس کے حصے میں ایک مٹھی بھر کھجوروں کے علاوہ اور کچھ نہیں آیا تھا۔ وہ کھجوریں جو اس نے بڑے ندیدے پن سے وہیں کھڑے کھڑے کھا لی تھیں۔ میرا جی چاہا کہ میں اسے یا اس کے لباس کو چھو لوں۔ میں اس کے اور قریب ہو گیا۔ اس کے حلق سے عجیب طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ایسی آوازیں جو بھیڑ قربان ہونے سے پہلے حلق سے نکالتی ہے۔ میں نہیں جانتا اس کی کیا وجہ تھی کہ ایک عجیب طرح کا تیز درد میرے سینے میں اٹھنے لگا۔

میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ دادا جان کی آوازیں میرا پیچھا کر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے میں رکا۔ لیکن پھر بھاگنے لگا اس لمحے مجھے محسوس ہوا کہ میں دادا جان سے نفرت کرتا ہوں میری رفتار اور تیز ہو گئی۔ یوں لگتا تھا۔ میرے سینے میں کوئی ایسا راز ہے جس سے میں فوراً نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں دریا کے اس کنارے کے پاس پہنچا جہاں دریا موڑ کھا کر اکیشیا کے درختوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے اور پھر یہ نہ جانتے ہوئے کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں میں نے اپنے حلق میں انگلی گھسیڑ دی اور ان کھجوروں کی قے کرنے لگا جو میں نے ابھی کھائی تھیں۔

●●●

غالب کا اندازِ گل افشانیٔ گفتار

مرزا اسد اللہ خاں غالب کی وفات کی دوسری صدی کے آغاز میں بھی اس کے فن کی تازگی اور اس کی شخصیت کی توانائی میں کوئی کمی پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس اس تازگی اور توانائی میں بے حد و حساب اضافہ ہوا ہے۔ یوں غالب نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ وقت کی دستبرد سے آزاد ہے۔ غالب شاعری کے آسمان کا وہ منفرد آفتاب ہے۔ جس کا غروب، اس کے طلوع سے بھی کہیں زیادہ تابندہ اور درخشندہ ہے۔ وقت غالب کو اپنی کسوٹی پہ پرکھ کر اسے سدا کے لئے کھرا قرار دے چکا ہے۔ وہ فن کی ان لافانی شخصیتوں میں شامل ہو چکا ہے۔ جو قیامت تک زوال سے نا آشنا رہیں گے۔

غالب کے فن کی اس ابدیت کے اسباب متعدد ہیں مگر سب سے اہم سبب یہ ہے کہ وہ خیال و اظہار دونوں میں تازہ کار ہے۔ وہ ایک ایسے دور میں پیدا ہوا جب معاشرے کا فکر جمود اور تعطل کا شکار تھا۔ پرانی ہوئی لکیریں پیٹی جا رہی تھیں لوگ نئی بات سوچنے سے یوں ڈرتے تھے جیسے سوچ بیٹھے تو زمین پھٹ جائے گی اور آسمان ٹوٹ پڑے گا۔ سب نے اپنے دل و دماغ اور بصارت و سماعت پہ چند فرسودہ روایات کے خول چڑھا رکھے تھے۔ اس تاریکی میں غالب روشنی کا اثبات کرنے آیا۔ فطرت نے اسے ایک ایسا [illegible] سونپا تھا جو صرف غیر معمولی ذہنی اور تخلیقی قوتوں کے مالک ہی کو ودیعت کیا جا سکتا ہے۔ اور غالب نے اس منصب کو بڑے حسن و وقار سے نبھایا۔

علامہ اقبال نے کہا تھا۔

آئینِ نو سے ڈرنا، طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

غالب ایسے ہی کٹھن وقت میں پیدا ہوا جب قوم نے طرزِ کہن پہ اڑنے [illegible] نئی فکر کی دھوپ پھیلنے کے باوجود وہ اس کے وجود سے منکر تھی۔ اس عالم میں قوموں کی آئینِ نو کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی تربیت دینے کا کام کسی کیلئے بھی کٹھن ہو سکتا تھا۔ مگر جب یہ منصب کسی شاعر کے سپرد ہو۔ اور پھر اس شرط کے ساتھ سپرد ہو کہ وہ فن کے تمام تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر اسے پورا کرے تو بظاہر یہ کام قطعی ناممکن معلوم ہونے لگتا ہے۔ غالب کو اسی ناممکن صورت حال سے نمٹنا تھا اور وہ اس سے اتنی فنکارانہ عظمت و نزاکت کے ساتھ نمٹا کہ آج اس کے انتقال کے ایک سو دس برس بعد بھی، جب ہم اس کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں تو یہ احساس قدم قدم پہ ہمارے دامن گیر ہوتا ہے کہ ہم اس سے پورا انصاف نہیں کر رہے ہیں۔ کسی شخصیت کی تحسین میں جب الفاظ سپر انداز ہونے لگیں تو یہ اس کی شخصیت کی بے پناہی اور ہمہ گیری کا ثبوت ہے۔

غالب ایک، عظیم تہذیبی ورثے کا آخری امین تھا کسی نے کتنی حق بات کہی ہے کہ مغل تہذیب کا سارا حسن اور قرینہ غالب کے اندازِ گفتار میں سمٹ آیا ہے۔ وہ یقیناً اس تہذیب کا نوحہ خواں بھی ہے مگر وہ ان عظیم الشان ایوانوں کے کھنڈروں پہ وہ سائے بھی پڑتے ہوئے دیکھ لیتا ہے جو نئے عہد کے ہیں۔ یوں غالب مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ کے ایک دوراہے پہ کھڑا ہے مگر تہذیبی سفر کے اس مرحلے سے وہ حیران و سراسیمہ نہیں ہے اگر اس کا سرمایہ صرف جذبہ اور وجدان ہوتے تو ممکن ہے وہ ہتھیار ڈال دیتا۔ مگر وہ اردو اور فارسی کا پہلا شاعر تھا جس نے عقل و دانش کی نفی نہیں کی۔ جب کوئی شاعر یہ کہہ دے۔

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا۔

تو اس کے فن کو شکست نہیں ہو سکتی۔ یہ چشم کا وا ہونا اور پھر ہر رنگ میں وا ہونا اردو شاعری کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ غالب سے پہلے تو ہماری شاعری پر اسی جنون کا پرچم لہراتا تھا جو خواب دیکھنے کی حد تک یقیناً جائز بلکہ مستحسن ہے۔ مگر [illegible] کی صورت اختیار کر لی تھی۔ غالب نے نہ صرف خرد کی [illegible]

جگر مرادآبادی کی داستانِ عشق

آپ جگر کی داستانِ عشق سنئے جو میں نے اپنی ایک بزرگ خاتون (جن کا ابھی حال ہی میں کم و بیش اسّی سال کی عمر میں انتقال ہو گیا ہے) سے سنی۔ انھوں نے کہنا شروع کیا۔ جانتے ہو! ہم عورتیں جب کسی کی خوبصورتی کا ذکر کرتی ہیں تو کہتی ہیں۔ سیکڑوں میں ایک۔ ہزاروں میں ایک۔ لاکھوں میں ایک۔ روشن فاطمہ کے بارے میں کیا بتاؤں ایسی حسین عورت ہم نے کبھی نہیں دیکھی۔ ہاں کہانیوں میں ضرور سنا ہے۔ جگر کی محبوبہ روشن فاطمہ کا حال ایک حور کا سا تھا۔ جگر کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ (چہرہ کو کثرتِ شراب نوشی نے رنگت کو جلا کر کالا کر دیا تھا)

لڑکپن اور طبیعت کا ایک عجیب عالم، وہ اس زمانے میں ایس ایم عاقل اینڈ سنز کا ٹریولنگ ایجنٹ تھا۔ روشن فاطمہ آگرہ کے ایک روشن خیال گھرانے کی صاحب زادی اور ایک اعلیٰ سرکاری افسر کی بیٹی تھی۔ جگر کو دیکھا اور دل ہی دل میں اس کی پوجا کرنے لگی۔ جگر کے شاعرانہ انداز اور جادو بھری آواز کا جتنا بھی اثر ہوتا وہ کم تھا۔ کچھ دنوں میں روشن فاطمہ کے دل میں محبت کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑکنے لگی۔ دنیا کو ہمیشہ ایسے ملاپ سے بیر رہا ہے۔ آخر لوگوں نے دونوں کے درمیان جدائی کی دیواریں کھڑی کرنا شروع کیں۔ لیکن ان دیوانوں کے آگے کسی ایک کی نہ چل سکی۔ جب خاندان والے روشن فاطمہ کو کسی طرح بھی جگر سے وابستہ کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تو جگر کی اس منچلی محبوبہ نے اپنے محبوب کی خاطر ہمیشہ کے لئے گھر کو خیرباد کہہ دیا اور جگر کی ذات میں گم ہو گئی تھی اسے دنیا اور دنیا والوں کی ذرہ بھر پروا نہ تھی بجز اس کے جو تو اس کا ہو، وہ جگر کی ذات اس کی شاعری اس کی آواز اور اس کے انداز پہچان چکی تھی۔ آخر روشن تمام بندھن توڑ کر اور سب کچھ چھوڑ کر جگر کی بانہوں میں آ کر چھپ گئی اور یہ دونوں گھومتے پھرتے مرادآباد جگر صاحب کے گھر پہنچے ابھی مشکل سے چار دن بھی سکون سے نہ گزارے تھے کہ روشن کے والد کو تمام حالات کا علم ہو گیا اور سب سے بڑی بات تو یہ بھی معلوم ہوا کہ معاملہ پولیس تک پہنچ چکا ہے۔ آخر انھوں نے بجائے [illegible] اس جوڑے کو رخصت کر دیا۔ اب ان دونوں نے مرادآباد کو خیرباد کہا اور ایس۔ ایم عاقل کو اپنا راز دار بنا کر ان سے مدد چاہی انھوں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ اپنے گھر کے دروازے ان کے لئے کھول دئیے۔ یہ مکان جس میں اس وقت ایس۔ ایم عاقل رہتے تھے، محلہ رفت پورہ میں روشن صدیقی صاحب کے مکان کے بالکل قریب واقع ہے۔

بزرگ خاتون نے مجھ سے کہا۔ جگر بڑا ہی معصوم تھا اور وہ تو اب بھی اتنا ہی معصوم ہے۔ وہ سمجھ ہی نہ سکتا تھا کہ جس پر اس نے اعتماد کیا ہے وہی شخص غدار بھی ثابت ہوگا۔ یہی حال روشن فاطمہ کا تھا وہ معصوم لڑکی یہی سمجھ رہی تھی کہ ہم اپنے ایک محسن کی پناہ میں ہیں۔ اور یہ شخص میرے محبوب کا مخلص دوست ہے۔ اس نے آنے والے دنوں کے لئے نئے نئے خاکے بنا رکھے تھے۔ زندگی کے حسین ترین خواب دیکھے تھے وہ زندگی جب اس کا محبوب اس کا محبوب کہلائے گا اور سب روٹھے ہوئے عزیز اس کا قصور معاف کر کے اسے گلے لگا لیں گے۔ لیکن اس معصوم لڑکی کو کیا معلوم تھا کہ حالات کیا سازش کرنے والے ہیں۔

عاقل صاحب نے جب روشن فاطمہ کو دیکھا تو اس پر فدا ہونے لگے۔ آدمی تاجر واقع ہوئے تھے، اگرچہ ان کی شادی ہو چکی تھی مگر سوچا کہ اچھی چیز پر قبضہ کیوں نہ جمایا جائے۔ مطلب حاصل کرنے کے لئے ایک منصوبہ بنایا اور اس پر عمل کیا، یعنی یہ کہ روشن فاطمہ کے والدین کو کچھ اس قسم کا خط لکھا کہ آپ کی بیٹی میری حفاظت میں ہے آپ باعزت لوگ ہیں، پولیس تک بات پہنچانا مناسب نہیں اس میں بے وجہ رسوائی ہوگی۔ آپ یہاں تشریف لائیں اور خاموشی سے ساتھ لڑکی کو لے جائیں۔

یہ دونوں بد نصیب دنیا سے بے خبر ایک دوسرے میں گم تھے کہ ایک دن ناگہاں عاقل صاحب کے دروازے کے سامنے ایک تانگہ آ کر رکا۔ کسی نے اندر آ کر بتایا کوئی صاحب آگرہ سے تشریف لائے ہیں یہ روشن فاطمہ کے بڑے بھائی تھے۔ اس کے بعد عاقل صاحب نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت جگر کو جن کے وارنٹ آگرہ سے جاری ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اغوا کے جرم میں پولیس کے سپرد کر دیا۔

عاقل صاحب نے روشن کے بڑے بھائی کو کئی دن اپنے یہاں مہمان رکھا اور انھیں بتایا کہ ان کی بہن کچھ دن بعد ماں بننے والی ہے اور اپنے آپ کو روشن کے لئے پیش کیا تاکہ مزید رسوائی نہ ہو اور اس معاملہ پر پردہ پڑ جائے۔ روشن کے بھائی ظاہر ہے کہ اس بات کو مان [illegible] عاقل صاحب

بچے نہیں اتفاق سے
بلکہ اپنی مرضی سے

غیر متوقع حمل آپ کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا سکتا ہے۔
لوگ اکثر اس کا شکار ہو گئے ہیں۔ آپ ایسی غلطی ہرگز نہ کریں۔

یاد رکھیں علاج سے احتیاط بہتر ہے۔ حالات کو اتفاق پر نہ چھوڑیں۔

نرودھ استعمال کریں مردوں کے لئے آسان اور سادہ طریقہ
آپ کے قریبی کیمسٹ یا نزدیکی فیملی ویلفیئر سنٹر سے مل سکتا ہے۔

نرودھ

پُر مسرت زندگی کے متلاشی شوہر اور بیوی
کے لئے قابل اعتماد مانع حمل تدبیر

ارشاداتِ عالیہ

عالیجناب حضرت صولت مد ظلہ العالی، ٹونکی (مرحوم)

میں کب غمِ تنہائی سے مضطر نہ ہوا تھا
کس دن ترا چاہا بُت کافر نہ ہوا تھا

کیوں تم نے اٹھائی ہے قیامت میں قیامت
شکوہ تو تمہارا سرِ محشر نہ ہوا تھا

کہتا ہے تجھے سنگ دل اب سارا زمانہ
ایسا تو ترا دل کبھی پتھر نہ ہوا تھا

اس دور میں یہ کیسی مصیبت ہے الٰہی
اس طرح تو جینا کبھی دوبھر نہ ہوا تھا

جب تک تری رفتار سے فتنے نہ اٹھے تھے
دنیا میں بپا کوئی بھی محشر نہ ہوا تھا

ظالم تجھے مشہور رقیبوں نے کیا ہے
چرچہ تری بیداد کا گھر گھر نہ ہوا تھا

اک اور بھی چرکا یہ مرے دل پہ لگایا
پہلا ابھی زخم برابر نہ ہوا تھا

محسوس جو ہوتا ہے تجھے ترکِ ستم سے
ایسا تو ستم کوئی بھی مجھ پہ نہ ہوا تھا

گھٹ کر ہی رہا چرخ پہ آخر مہِ کامل
حالانکہ ترے رخ کے برابر نہ ہوا تھا

دریافت کاشی سرور تونسوی ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لیتھو کے صفحات ... پریس ... جامع مسجد دہلی، اور سرورق ... چھپوا کر ... انصاری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ صبا چہ کرد؟

آکاش وانی

ریڈیو سائنسی عہد کا ایک امتیازی نشان ہے جو دورِ جدید میں ہماری قومی زندگی کا اتالیق ہے۔ ہم ریڈیو سے قریباً دن بھر اور رات گئے تک لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اس اتالیق سے کچھ سیکھنے کی بجائے ہمارا شعور روز بروز پست ہوتا جا رہا ہے۔ عوام کا قومی شعور اس حد تک پست ہے کہ ۲۲ سال گزر جانے پر بھی ابھی تک آزادی اور زندگی کی اعلیٰ اقدار سے آشنا نہیں ہیں۔ قومی ذوق کی یہ مثال تو آپ نے بارہا دیکھی ہوگی کہ ریڈیو پر جب موسم کا حال۔ کوئی اصلاحی تقریر۔ کسی بڑے رہنما کا بیان یا عالمی حالات پر تبصرہ ہو رہا ہو حتیٰ کہ روزانہ خبریں سنائی جا رہی ہوں تو زیادہ سے زیادہ پانچ فیصد عوام ریڈیو کی ان آوازوں کو سنتے ہیں۔ اور جب آکاش وانی کے کسی بھی کیندر سے وودھ بھارتی یا ریڈیو سیلون کے بیوپار وبھاگ سے فرمائشی گانوں کے ریکارڈ "تیرا عشق میں کیسے چھوڑ دوں میری عمر بھر کی تلاش ہے" اور "اک سوال میں کروں اک سوال تم کرو" یا "جب پیار کیا تو ڈرنا کیا" ایسے نغمے سنائے جاتے ہیں تو اس وقت قومی ذوق کے ارتقاء کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

قومی ذوق کا یہ "ارتقا" اس امر کا مظہر ہے کہ آج کے جمہوری اور بیداری کے دور میں ذہن اور وجدان ایسی دھنوں کے غلام ہیں جو عقل اور احساس کو نیند سلا دیتی ہیں۔ اور بدقسمتی یہ ہے کہ ریڈیو سننے والوں کی پچانوے فیصد تعداد ایسے ہی مترنم پروگراموں کو پسند کرتی ہے۔ یعنی ایسے گانے جن پر اخلاق و کردار [illegible] آنسو بہاتے رہتے ہیں۔

فلمی گانوں سے جس قسم کے اثرات قوم کے ذہن پر مرتب ہو رہے ہیں وہ نہایت تباہ کن ہیں۔ ان گانوں کے ہوتے ہوئے قومی کردار کی تعمیر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ ان سے جو تخریبی کام ہو رہا ہے اس کے نتائج ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔

کسی برائی کو ختم کرنے کے لئے ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ اسے قانون کے ذریعہ نیست و نابود کیا جائے دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ اس برائی کے مقابلے میں اچھائی کے جوہر و عنصر کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا جائے تاکہ برائی کا عنصر اچھائی کے بڑھتے ہوئے عنصر میں جذب ہو کر رہ جائے۔

ان دونوں صورتوں میں پہلی صورت کچھ زیادہ قابل عمل نہیں ہے۔ اس لئے کہ اب بھی تو ایسے قوانین موجود ہیں جن کا مقصد برائیوں کو ختم کرنا ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ روزانہ لوگ ان قوانین کو توڑتے ہیں۔ ہماری عدالتیں اور تھانوں کے حوالات اسی امر کی دلیل ہیں کہ بعض لوگ قانون سے ٹکرانا بھی اپنے شہری حقوق کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ لہٰذا دوسری صورت کو اپنانا چاہئے یعنی برائی کے مقابل میں اچھائی کے جوہر و عنصر کو پھیلایا جائے۔ [illegible] معاشرے کے لئے یہی مناسب ہے کہ برائی کے مقابل اچھائی کو ایک سمت [illegible] پھیلا دیا جائے تاکہ برائی کا طوفان اس [illegible] روپوش ہو جائے۔ [illegible] کہ آکاش وانی اس برائی کو اور بھی شد و مد سے پھیلانے میں کوشاں ہے۔ ایک مدت تک آکاش وانی نے فلمی ریکارڈ بجانے سے احتراز کیا [illegible] میں آیا تھا کہ ریڈیو اسٹیشنوں کی چار دیواری میں [illegible] یعنی آکاش وانی کے کارندے سمجھ رہے تھے کہ [illegible] وقت میں فلمی گانے سننا کو نہیں [illegible]۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ [illegible] آخر کار شرفاء ہمارے ہی ذوق پست کے تقاضے سے مجبور [illegible] بدعت ہمارے ریڈیو والوں نے بھی قبول کر لی اور اب [illegible] ریڈیو "وودھ بھارتی" کے ذریعہ اور دوسرے طریقوں [illegible] بازی مارنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا ہے کہ [illegible] ریڈیو سیلون کی بجائے وودھ بھارتی کو زیادہ [illegible] اب وہ وودھ بھارتی سے ایسے [illegible] گانے [illegible] کو فرمائش کرکے "مسٹر یا کلام [illegible]" ایسی [illegible]

عزت ہی ملتی رہتی۔ عوام کے ذہن اور وجدان کو دھنوں کا
غلام بنانے کے لئے ادبی پروگراموں میں بھی شعراء کا کلام نسوانی
آوازوں میں فلمی دھنوں سے گوا دیا جاتا ہے۔ مزاحیہ پروگراموں
میں فحاشی اور بداخلاقی کا درس دیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ ایک
مزاحیہ پروگرام میں یہ سننے میں آیا کہ ایک صاحب اپنے دوست سے
پوچھتے ہیں کہ اگر تم نے آج فلاں لڑکی کے ساتھ کہیں گھومنے نہ جانا
ہو تو اپنا کوٹ مجھے دیدو۔ دوست نے پوچھا کہ اگر میں نے اس لڑکی
کے ساتھ گھومنے نہ جانا ہوا تو پھر آپ کو میرے کوٹ سے کیا مطلب
اس پر یہ صاحب فرماتے ہیں کیونکہ آج میں نے ... بات کو اس لڑکی
کے ساتھ تاج محل کی چاندنی دیکھنے جانا ہے۔ اب آپ ہی بتایئے
کہ یہ مزاح ہے یا فحاشی جو ریڈیو کے ذریعہ ہماری بیٹیوں بہنوں اور
بچوں تک پہنچائی جارہی ہے۔

ہماری حکومت کوشاں ہے کہ وہ اچھائیوں سے برائیوں
کا مقابلہ کرکے عوام کو جمہوریت اور بیداری کی اقدار سے روشناس
کرائے۔ کاش کہ آل انڈیا ریڈیو والے بھی حکومت کی پالیسی پر چلتے ہوئے
فحاشی اور بداخلاقی کا زہر عوام میں پھیلانا بند کرسکیں۔

مسلمان سرکاری ملازم اور دیانت داری

تقسیم ملک کے بعد جو مسلمان سرکاری ملازم ہندوستان
میں رہ گئے یا اس کے بعد جو مسلمان سرکاری ملازمتوں میں لئے
گئے انھوں نے اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کردیا کہ وہ حکومت وقت
اور ملک کے وفادار ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ تقسیم ملک
کے ساتھ ہی سرکاری ملازم پاکستان بغیر اطلاع دیئے چلے گئے ایسی
کالی بھیڑوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ غداری کی ہے
کیونکہ ان مٹھی بھر بھاگنے والے سرکاری ملازموں کے فرار کے باعث
یہاں کے مسلمانوں پر شک کیا جانے لگا تھا۔ مگر یہ ایک حقیقت
ہے کہ ایسی چند کالی بھیڑوں کے علاوہ جو یہاں رہ گئے سرکاری
مسلمان ملازمین نے دیگر قوموں کے سرکاری ملازمین کے مقابلہ
میں زیادہ دیانت داری اور ایمانداری کا ثبوت دیا ہے مرکزی
اور صوبائی حکومتوں میں مسلمان نہایت اہم عہدوں پر کئی جگہوں پر
مقرر ہیں انھیں چھوڑیئے کیونکہ وہ بڑے آدمی ہیں اور وہ اونچی کسی
یہی حرکت سے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام نہیں کرنا چاہتے۔
حیرت تو یہ ہے کہ چھوٹی چھوٹی سرکاری ملازمتوں پر بھی جہاں مسلمان
کام کررہے ہیں انہوں نے بھی ایمانداری اور دیانتداری
کی ایسی اچھی مثالیں پیش کی ہیں جن پر دوسری قوموں کے ملازمین کو
شرم آنی چاہئے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ کسی غیر ملک کو اپنے
ملک کے قومی اور دوسرے مفید راز مہیا کرنے میں آج تک ایک
بھی مسلمان ملوث نہ پایا گیا جبکہ دوسری قوموں کے ایسے غدار
افراد کی تعداد خاصی ہے۔ ہندوستان میں سیکڑوں مسلمان
کلکٹر، مجسٹریٹ، جج اور اچھے عہدوں پر تعینات ہیں مگر کوئی
مائی کا لال یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ کسی مسلمان جج یا مجسٹریٹ
نے کسی سفارش یا رشوت لینے پر کسی مقدمہ میں کوئی ہیر پھیر
کیا ہو۔

حال ہی میں جامع مسجد پولیس چوکی پر ایک سب انسپکٹر
موجی خان آیا ہے جس نے ایک ہفتہ میں ہی جامع مسجد ایریا میں
ہر قسم کی بدعنوانیوں کی ناکہ بندی میں جان توڑ کر کام کیا ہے۔ جوئے
اور جرس کے وہ مشہور اڈے جو عین چوکی کے نیچے اپنا کام کررہے
تھے اور کوئی بھی پولیس افسر انہیں بند نہ کرسکا تھا۔ موجی خان نے
سب کو ناکوں چنے چبوا دیئے ہیں۔ بدمعاشوں سے کہہ دیا گیا ہے
کہ یا تو وہ برے دھندے چھوڑ کر نیک پیشے اختیار کریں اور یا پھر
اس علاقہ سے اپنے آپ تڑی پار ہوجائیں۔ موجی خان کے ہوتے کسی
قسم کی بدمعاشی نہیں ہوسکتی۔ موجی خان کی اس کامیابی اور شہرت
کا باعث صرف یہ ہے کہ وہ رشوت خور نہیں ہے۔ اور آج علاقہ جامع مسجد
کا ہر شریف بلا تفریق مذہب یہ چاہتا ہے کہ موجی خان اس علاقہ
میں ہی رہے کئی سال ہوگئے ایڈیٹر شانِ ہند کو فرخ آباد میں
ایک مسلمان کانسٹیبل پولیس نے بتایا کہ جہاں میں کام کرتا ہوں سبھی
کے ہندو ساتھی اور افسر اسے بھی رشوت میں حصہ دینے کی کوشش
کرتے ہیں۔ مگر وہ اس خیال سے رشوت نہیں لیتا کہ ہندوستان میں
اب مسلمانوں کو اپنی وفاداری، ایمانداری اور دیانت داری سے
یہ ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ واقعی ہندوستان کو اپنا
وطن سمجھتے ہیں۔ اس مسلمان ملازم پولیس نے بتایا کہ ... صاحب
ہمارے اکثر ہندو افسران اس تاک میں رہتے ہیں کہ جیسے ...

کوئی مسلمان ملازم کسی شکنجے میں آئے تو اسے ملازمت سے برطرف کرائیں ایسی حالت میں مسلمان سرکاری ملازمین کا رشوت لینا یا بد دیانتی کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ذرا سی چھوٹی سی بات نکل آئی تو انہیں نوکری سے جواب مل جائے گا۔

مسلمان سرکاری ملازمین میں (سوائے عدالتی اہل کاروں کے) ایمانداری اور دیانتداری کا یہ رجحان کسی بھی وجہ سے ہو یقیناً ملک کے لئے نیک فال ہے اور مسلمان ملازمین سرکار (سوائے عدالتی اہل کاروں کے) کی اس دیانت داری اور ایمانداری پر مبارک باد دیتے ہوئے دوسری قوموں کے ان ملازمین سے ہم توقع کرتے ہیں جو بد دیانتی اور رشوت خوری کو اپنا ایمان بنائے ہوئے ہیں کہ وہ بھی دیانت دار ملازمین سرکاری کی پیروی کریں اور دل جمعی سے سرکاری کام کو انجام دیں تاکہ ملک ترقی کرے۔

دلّی دُور درشن

اگر ڈائرکٹر دلّی دُور درشن تک ہماری آواز پہنچ سکے تو ہم ان کی خدمت میں یہ گذارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ آکاش وانی دلی کے کارکنان کی طرح اپنے آپ کو کنویں کا مینڈک نہ بنائیں۔ اس وقت دُور درشن پر جن حضرات سے مباحثے کرائے جاتے ہیں ان سے کہیں بہتر حضرات دلّی میں موجود ہیں جو ایسے مباحثوں میں ان سفارشی اور نام نہاد زندگی کا فور قسم کے لوگوں کی نسبت بہر طور ساجی شہرت اور فنی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ کیا غضب ہے کہ وہ شخص کسی بحث میں حصہ لے رہا ہو جو رشوت خوری کی برائیوں سے متعلق ہو اور وہ خود رشوت خوری کی نئی نئی راہیں اختراع کر چکا ہو۔ انکم ٹیکس سے متعلق بحث میں کوئی ایسا بگ مگنٹ شامل ہو جو خود انکم ٹیکس بچانے کے لئے نئی راہیں اختیار کرتا ہو۔ یا مثال کے طور پر اخلاقی قدروں پر کوئی ایسی "محترمہ" مسز ساوتری بائی کہ اس مسئلہ پر گفتگو کر رہی ہوں جو خود "کال گرل" کا معزز پیشہ اختیار کئے ہوئے ہوں .... یا دُور درشن پر بد قسمتی سے ایسے لوگوں کو عام طور پر پروگرام دیئے جاتے ہیں جن کے ذاتی تعلقات ان افسروں کے ساتھ ہوتے ہیں اور وہ فنکار۔ ادیب شاعر اور مقررین جو اپنے اپنے فن میں مہارت کی منزلیں طے کر چکے

ہوتے ہیں اس بے انصافی اور حق تلفی پر خاموش رہتے ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی باغیرت فنکار اس قسم کے ہتھکنڈے دولت پروگرام لینے کی کوشش نہیں کر سکتا جسے عرف عام میں چمچہ گیری یا مسکہ پالش کہا جاتا ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارا "دُور درشن" چمچہ گیری یا مسکہ پالش کی سیاست سے دُور رہ سکے کیونکہ آکاش وانی تو اس قسم کی سیاست میں اتنی ڈوب چکی ہے کہ اب اس کا اس دلدل سے نکلنا محال نظر آتا ہے۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سوامی پارس ناتھ کے دیوان "دیوارِ قہقہہ" میں شائع شدہ کلماتِ گرامی کی چند جھلکیاں ملاحظہ فرمائیے۔

"عجیب اتفاق ہے اور ہماری بیسویں صدی کا ایک اچھوتا واقعہ ہے جس کی مثال تاریخ میں اب تک نہیں ملتی اور میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ شاید آئندہ بھی نہ مل سکے۔ کسے خبر تھی کہ قصبہ پچھوند (اٹاوہ) کے کسی غیر معروف دیہات میں ایک ایسا شخص پیدا ہوگا جسے ساٹھ سال کی عمر تک کوئی نہ جان سکے گا اور جس وقت دنیا اس سے واقف ہوگی تو صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ یورپ اور امریکہ بھی اس کی قابلیت کے سامنے سپر انداز ہونے پر مجبور ہوں گے۔

لارڈ لارنس لارڈ [illegible] اور لارڈ کرپس نے آپ کو خوشنودیٔ مزاج کے خطوط لکھ کر آپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی آپ نے [illegible] کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا یہ خوب ہونے والے چاند کو جیسا دیکھنا چاہئے۔

حضرت [illegible] بھیچوندوی

[illegible] جائے جب سے پیدا کر دی جائے۔

پنڈت جواہر لال نہرو

للہ میرا [illegible] آپ [illegible] اور اپنا کوئی ایک شعر دیجئے۔

حضرت [illegible]

اگر سوامی جی مجھے اپنا شاگرد بنا لیں تو اپنا سارا کلام قربان کرسکتا ہوں۔

حضرت جگر مرادآبادی

سوامی صاحب اپنے وقت کا پیغمبرِ سخن ہے اور تمام شعرا اس کی اُمت ہیں۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد

آپ نے اپنی کتاب کے جو ۱۱ شعر بطور نمونہ روانہ فرمائے ہیں ان کو دیکھ کر میں یقین کرتی ہوں کہ آپ کی کتاب نوبل پرائز حاصل کرنے کے قابل ہے (بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ مسز سروجنی نائیڈو کی موت کا سبب سوامی جی کے وہ اشعار ہی ہوا تھا جو وہ کہہ نے [illegible] بطور نمونہ روانہ کئے تھے۔ جن پر وہ اتنی گرویدہ ہوئی تھیں کہ [illegible] کو ایک مخصوص نشست میں انہیں سنتی رہیں ایک دن انہیں شعروں پر سر دھنتی ہوئیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوگئیں۔

مسز سروجنی نائیڈو، سابق گورنر یوپی

سبحان اللہ سبحان اللہ شعر کہے تو یوں کہے۔ بلکہ یہ کلام شعر نہیں۔ ان چیزوں کا جواب ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ہے ادب برائے زندگی کہاں ہیں ہندوستان کے شعرائے کرام جن کو اپنے اپنے بلاغت نظام پر ناز ہے۔ وہ دیکھیں سوامی جی کے ان گوہر ہائے آبدار کو جن میں ایک راجہ بیٹھا ہوا ہے۔ دنیا بھر کے شاعر اگر مل کر سوامی جی پارس ناتھ کا مقابلہ شاعری میں کریں تو مجھے یقین ہے کہ وہ سب ہار جائیں گے۔

حضرت جوش ملیح آبادی

سوامی جی نے اپنے ۳۶۵ اشعار میں اپنے حسب ذیل پانچ نکاتی [illegible] پروگرام کے بارے میں تشریح فرمائی ہے۔

۱۔ مکمل شانتی پروگرام۔ (۲) مکمل [illegible] پروگرام (۳) مکمل وظیفہ پروگرام (۴) مکمل تعلیم پروگرام (۵) مکمل شادی پروگرام [illegible] سے حکومت ہند کے تمام وزرائے کرام اور ممبرانِ پارلیمنٹ [illegible] (راجیہ سبھا [illegible]) [illegible] میں تائید کرائے گئے اور سوامی جی کا یہ ایڈیشن یا دیوان "دیوارِ قہقہہ" اور سوامی جی کے پانچ نکاتی صدارتی پروگرام کی تفصیل ان تمام پتوں پر بذریعہ رجسٹری بھجوائے گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدارت کے آئندہ اُمیدوار کا سکریٹریٹ دفتر "ریاست" میں کھل گیا ہے۔ اور اس [illegible] صدر کے خورد و نوش کا انتظام تو سردار صاحب کے ذمے تھا ہی انہیں ہر دو چار دنوں کے بعد سردار صاحب جیب خرچ کے لئے دو چار روپے بھی دیتے تھے۔

پھر ممبرانِ پارلیمنٹ اور وزرائے کرام نے سوامی جی کے اخلاقی طور پر کتاب اور خطوط کی رسید دیتے ہوئے شکریہ ادا کیا تو ہم نے سوامی جی کو [illegible] کا شکریہ ادا کرنے والے وزرا اور ممبرانِ پارلیمنٹ کو ان کے صدر بننے کی حمایت حاصل ہے۔ لہٰذا جن ممبرانِ پارلیمنٹ اور وزرائے کرام کے خطوط نہیں آئے ہیں ان سے سوامی جی خود ملاقات کریں اور

لہ سلسلہ کیلئے دیکھئے شانِ ہند ماہ جنوری [illegible]

مزاحیہ بھی ہیں اور مزاح بھی "

" غالب اسٹیج کا کمال دیکھنا ہو تو یہاں بھی رشید احمد کی عکس نظر نہیں آئے۔

" مارے خوف کے قلب بیٹھے ہیں اور چونی جیب میں لرزنے لگتا ہے "

ان کے تجربات میں وسعت اور ہمہ گیری ہے جو حسب ضرورت صرفی سند کا استعمال بھی با اوقات کراتی رہتی ہے۔

" ایک دن میر، منجو اور موسم دونو متبسم نظر آئے "

انھوں نے انگریزی ادبیات کا بھی غائر مطالعہ کیا ہے۔ جس کی وضاحت ان کی تحریر سے ہوتی ہے۔ اس طرح انگریزی دانشوروں میں برناڈ شا اور ڈکنس سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ اور اردو شعراء میں غالب اور اکبر کے کارناموں سے متاثر ہیں۔

جدید ظرافت نگار مزاحیہ ادب کو خون جگر سے سینچ کر اسے روز بروز اور بھی لالہ زار بناتے جا رہے ہیں۔ لیکن اب تک کوئی ایسی شخصیت ایسی نظر نہیں آتی جسے رشید احمد پہ فوقیت حاصل ہو۔ یوں تو عظیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، ملا رموزی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی، امتیاز مہدی علی خاں وغیرہ نے اس فن کی آبیاری کی ہے۔ لیکن رشید احمد صدیقی کی خدمات سب سے نمایاں ہیں۔ مجھے کہنے دیجئے غالب کے بعد طنزیہ ادب بالخصوص نثری میدان میں اتنا عظیم فنکار پیدا نہیں ہوا۔

بعض حضرات نے ان پہ ادھر ادھر بھٹکنے (موضوع سے) رشید صاحب ... " پینترا بازی " کا الزام ... گفتگو ... ہو جاتا ہے کہ وہ قاری کو ... سے آشنا کرانے سے پہلے اسے ذہنی طور پر تیار کر لیتے ہیں ... ماحول سازگار بنا لیتے ہیں۔ اس ضمن میں غلام احمد فرقت نے بڑی ہی حقیقت پسندانہ بات کہی ہے۔

" جملہ معترضہ جہاں جہاں رشید صاحب نے استعمال کئے ہیں۔ وہاں وہ اپنی بات کہتے کہتے یکدم ہاتھ روک کر دوسری بات اس غرض سے شروع کر دیتے ہیں ... فکری تشنگی اور بڑھ جائے ٹھیک اسی طرح جس طرح ایک گھونٹ پلا کر ہاتھ روک ...

حرکت سے اس کے چٹخے میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے "

ظرافت نگار کی حیثیت سے انھوں نے اپنی ظرافت کے موضوعات انسانی زندگی کے تجربات سے اخذ کئے ہیں۔ ان کے مضامین زیادہ تر علیگڑھ یونیورسٹی کے ماحول اور وہاں کی ادبی روایات کے پس منظر میں لکھے گئے ہیں۔ انھیں ہم کسی حال میں ان سے جدا نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ اسی ماحول میں ان کا فن پروان چڑھا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس سے عام قاری لطف اندوز نہیں ہو سکتے اور اس سے لذت آشنا ہونے کے لئے ادب، سیاست اور تاریخ سے واقفیت ازبس ضروری ہو جاتی ہے۔ فلسفہ کی خشک وادی ہو یا تنقید کا ریگ زار یا ظرافت کا زعفران زار ہر جگہ رشید احمد کی انفرادیت مخصوص انداز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ ان کے مضامین میں ایک انوکھا پن، تازگی، بانکپن اور حسن کا احساس ہوتا ہے۔ " ارہر کا کھیت " جیسے معمولی عنوان کے ذریعہ بہت بڑی حقیقت کا انکشاف کرنا رشید احمد کا ہی حصہ ہے۔

" ارہر کا کھیت دیہاتوں کی اسمبلی ہے جہاں عورتوں اور بچوں کو گاؤں کی انتظامی حکومت میں اتنا ہی دخل ہے جتنا ہندستانی پارلیمنٹ ... دونوں بیٹھتے ہیں، ضد کرتے ہیں، روتے ہیں اور اپنے گھر کا ... ہیں۔

مذکورہ بالا جملوں میں طنز کی تلخی بھی ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی۔ رشید صاحب کا فن صداقت، بصیرت اور خلوص سے مملو ہے ڈاکٹر اعجاز حسین نے ٹھیک ہی کہا ہے۔

" ان کی زبان عربی و فارسی الفاظ سے نقش و نگار حاصل کرتی ہے۔ ان کی عبارت اپنے خیال کی بلندی اور الفاظ کی ترتیب کی وجہ سے عام فہم نہیں ہے لیکن ایک طرح کی روانی ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ شگفتگی ... کے ہر حصہ میں نظر آتی ہے۔ فلسفیانہ مضامین بھی اسی شگفتہ انداز میں بیان ہو جاتے ہیں "

دوسروں پر ہنسنا آسان بات ہے لیکن اپنے اوپر ہنسنے کے لئے وسیع قلب و نظر کی ضرورت ہوتی ہے ... ان کے پاس ہے۔ چنانچہ وہ موقع کے تحت اپنے آپ پر بھی ہنسنے سے باز نہیں آتے اور یہاں ان کی عمل جراحی کا کمال فن کی بلند چوٹی پر نظر آتی ہے۔ ان کے مضامین کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

مکتوباتِ علامہ سحرؔ عشق آبادی

بنام

سحبان الہند حضرت ثروتؔ میرٹھی

حضرت علامہ سحرؔ عشق آبادی (مرحوم) عروض کے سلسلے میں سحبان الہند حضرت ثروتؔ میرٹھی سے اکثر و بیشتر مشورے لیا کرتے تھے۔ علامہ مرحوم کے ایسے کئی مکتوبات ہیں عزیزہ نگار عظیم سے حاصل ہوئے ہیں۔ ان خطوط میں شاعری کے متعدد رموز پر بحث کی گئی ہے اور یہ نعمت اس زمانے میں حاصل ہونا ناممکنات میں سے ہے۔ شانِ ہند میں علامہ کے یہ خطوط شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین شانِ ہند ان سے مستفید ہو سکیں۔ (ادارہ)

دہلی
۹ ستمبر ۵۱ء

محترم! آداب عرض مزاج؟

جواب خط دینا کیا نصیبِ دشمناں ہو گیا۔ نہ رسالوں کی وصولیابی کا کوئی علا نہ خیریت کا کوئی پیغام۔ غزل بھیج رہا ہوں بہ نظرِ اصلاح دیکھ کر واپس فرما دیجئے۔ ساتھ ہی اس کا وزن اور بحر بھی لکھ دیجئے۔ یہ غزل کل کہی تھی۔ معلوم نہیں کس بحر اور کس وزن میں موزوں ہو گئی۔ تعطیے یا امتحان کا خیال اپنے سحر کی طرف کرنا بھی کفر ہے۔ اگر یہ خیال ہو تو بس ہو چکے۔ یہ کانسی کی کٹوریوں کے بجنے کی آوازِ مسلسل سے پیدا ہوئی چیز ہے۔ میرے لئے تو یقین کرنا دشوار ہے کہ یہ عروض کی کون سی بحر ہے اور کیا وزن ہے ممکن ہے میں والا ریبا در شنوں کو حاضر ہوں۔ سحرؔ عشق آبادی

بچوں کو سلام کے عوض محبت بھری دعا چاہتے ہیں۔ بچوں کو دعا۔ محترمہ بھابی صاحبہ کو تسلیمات۔ کل جو شاعرہ ہو چکا ہے اس کی غزل روانہ فرما دیجئے۔ شکریہ قبل از وقت

غنچۂ گیسو سادگی کی باتیں کہیں — پوچھو تو جو چاہیں کبھی وہ کہیں

جذب وہ دامن میں ہی ہو قاری — چشموں سے ندیاں تو بہت نکلی ہیں

کیف فضا میں تھا سکوں ہی سکوں — اے دلِ ناداں اوٹھ تھے یہیں

منتظرِ دید تو مر بھی گیا — حقیقت اُس پردہ ہونے ہی نہیں[1]

پردہ اٹھا کر وہ چھپے تھے وہاں — سو نظریں سو نظر یں تھیں وہیں

نارِ جہنم ہے اسی کی جھلک — گلشنِ فرقت میں جو ہیں نہ سہی

ماہرِ فنِ سحرؔ تمہارا وہی
مجتہدِ وقت فہیم و ذہین

سحرؔ عشق آبادی

[1] متحرک زرا گراں ہے (ثروتؔ میرٹھی) ...

سیاسی غزل

تاؔنک الہ آبادی

گمراہ سے جب قافلۂ قومِ جہاں گرد
رہبر کی جگہ پوری کرے کوئی جواں مرد

ہر شخص جہاں دردِ محبت سے ہو خالی
افسوس وہاں بھی نہیں ملتا کوئی ہمدرد

مایوس نئے دور میں ہے خاطرِ نباض
کیا قوم کی شریانوں میں سارا ہے لہو سرد

جب قوم کی بگڑی فردِ عمل رہ گئی کورے
اس قوم کا سمجھو کہ ہے مرتد ہر اک فرد

پیدل ہو کہ فرزیں ہو شتر اسپ ہو یا فیل
بے سود ہے بازی میں تو مہرہ ہے ہر اک فرد

طوفان کی آمد کی خبر دیتا ہے ماحول
ہیبت ہے فضا رنگِ فلک سرخ زمیں زرد

ہے قوم ہی جب گونگی تو پھر حضرت تاؔنک
بے معنی ہے شاعر کا ہر اک نالۂ پُر درد

"قصایدِ سودا" کا ایک ماخذ

ڈاکٹر محمد انصار اللہ

ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی نے قصایدِ سودا کا جو مجموعہ مرتب کیا ہے، اسی پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند تفویض مرحمت کر دی ہے۔ لیکن اس باب میں کسی شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ مجموعہ تحقیق و تدوین کے ابتدائی ضابطوں کے مطابق بھی نہیں ہے۔ قصایدِ سودا سے براہِ راست اور بالواسطہ طور پر متعلق صدہا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مآخذ میں سے انھوں نے محض چند کے دیکھنے کا دعوا کیا گیا ہے اور ان گنے چنے مآخذ میں بھی کئی ایسے ہیں جن کے صرف بعض اجزا سے استفادہ کرنے کا جامع قصایدِ سودا کو اعتراف ہے اور بس۔

قصیدے کے تحت کس قسم کی منظومات آتی ہیں۔ اس جھگڑے میں بھی قصایدِ سودا کے فاضل جامع نے الجھنا گوارا نہیں کیا نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس مجموعے میں ایسی منظومات بھی شامل ہیں جن کو اصولاً قصیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ ساتھ ہی سودا کے بکثرت قصیدے (مدحیہ اور ہجویہ) ایسے بھی ہیں جن تک اس مجموعے کی جامع کو رسائی حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ بعض قصیدے ناتمام بھی شامل ہیں لیکن اغلب ہے کہ ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکا (ورنہ اس طرف وہ اشارہ کر سکتے تھے) مجموعی اور ان کی مناسبت سے متون کے تعین کا مرحلہ تو اتنا پیچیدہ اور دشوار گذار ہوتا ہے کہ اس کوچے کی طرف رُخ کرنا بھی زمانۂ حال کے اردو کے بیشتر پروفیسروں سے متوقع ہی نہیں ہے۔

ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی کا مرتب کردہ قصایدِ سودا کا مجموعہ علمی اعتبار سے اتنا ناقص ہے کہ اگر اس کے اغلاط قلمبند کئے جائیں تو یقینی طور پر اس مجموعے سے دوچند یا شاید اور زیادہ صفحات درکار ہوں گے۔ آج کی صحبت میں ہم اس مجموعے کے صرف ایک ماخذ کا جائزہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے اندراجات کی روشنی میں پیش کریں گے۔ (اصل قلمی نسخہ فی الوقت ہمارے پیشِ نظر نہیں ہے) زیرِ بحث ماخذ کا تعارف موصوف نے نسخۂ ۱۲ کے تحت کیا ہے۔ اس کے بارے میں اطلاع دی ہے کہ یہ

"مملوکۂ انجمن ترقی اردو، ہند، علی گڑھ"

ہے۔ قصایدِ سودا کا زیرِ نظر مجموعہ ۱۹۶۷ء میں چھپا تھا اور یہ بات یقینی طور پر اس مجموعے کے جامع صاحب کے علم میں تھی کہ انجمن ترقی اردو (ہند) کا کتب خانہ ۱۹۶۷ء میں علی گڑھ میں نہیں دہلی میں تھا اس اطلاع کے بعد کتاب میں مندرجہ بالا اندراج کی تصحیح لازم تھی۔ انگریزی میں مقولہ ہے کہ "پائیوں کی حفاظت کرو، روپے اپنی حفاظت خود کر لیں گے" تحقیق ہی نہیں زندگی کے روزمرّہ معاملوں میں بھی چھوٹے چھوٹے امور پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ جو شخص چھوٹی باتوں کا خیال نہیں کرتا وہ بڑی بے اعتدالیوں کا بھی مرتکب ہو سکتا ہے۔

قصائدِ سودا کے جامع نے اس نسخے کو جن وجوہ سے "بہت اہم" قرار دیا ہے یہ ہیں:

۱۔ "اس میں تمام نسخوں سے زیادہ کلام موجود ہے۔ اور کے علاوہ تمام غیر مطبوعہ قصائد اس میں موجود ہیں۔"

۲۔ "اغلاطِ کتابت بہت کم ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ کتابت میں اہتمام برتا گیا ہے۔"

۳۔ "قصائد کی ترتیب بھی تاریخی ترتیب سے قریب معلوم ہوتی ہے۔"

سودا کے بارے میں انتخابات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے کلام کے ساتھ ایک سے زاید شاعروں کا کلام گڈ مڈ ہو رہا ہے۔ شیخ چاند نے بعض قصاید کی بابت یہ متعین کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ سودا نے لکھے تھے یا قائم نے۔ اسی طرح مہربان خاں رند کے بارے میں بھی شبہہ ہے کہ ان کے دیوان میں سودا کا کلام شامل تھا۔ اس سلسلہ میں ایک دوست عرض کے نام اور بھی تذکروں میں منقول ہیں۔ کرنے کا کام تو یہ تھا کہ ایسے تمام شاعروں کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد سودا کے صرف محقق اور مستند کلام کو چھانٹ کر

ملک کر دیا جاتا۔ لیکن محقق شخص نے سودا کے کلام کے نامعلوم نسخوں میں سے بہت بڑی تعداد (تقریباً اسّی فیصد) کو دیکھنے کی زحمت نہ کی وہ قائم، زندہ اور دوسرے شاعروں کے کلام کی طرف کیوں نظر کرتا

قصاید سودا کے جامع کے تحقیقی شعور کا اندازہ اسی بات سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ کسی مجموعے کی ضخامت کو دیکھ کر اس کی اہمیت (قصاید) کا اندازہ کرتے ہیں۔ وہ شاید یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی ایسا مجموعہ جس میں شعر لکھے ہوں اور جسے سودا کا دیوان یا کلیات کہہ دیا گیا ہو وہ تمام سودا ہی کے کلام پر مشتمل ہوگا۔ اور جو کچھ اس میں لکھا ہوا ہے وہ سب سودا ہی کا کلام ہوگا۔ اسی خیال کے مطابق انھوں نے نسخہ ۳ کو "بہت اہم" قرار دیا ہے۔

قلمی نسخوں میں الحاق کو لازماً جعل سازی یا بدنیتی کا نتیجہ ہی نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ بعض وقت خلوص نیت کے ساتھ بھی ایسا ہوجانا ممکن ہے۔ محقق اسی وجہ سے ہر قلمی نسخے کا بہت احتیاط کے ساتھ جائزہ لیا کرتے ہیں خصوصاً جن نسخوں میں غیر مطبوعہ کلام مندرج ہو ان کی چھان پھٹک کو تو اور بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ عام ہے کہ جب تک کسی نسخے کے من حیث المجموع ثقہ ہونے کے واضح اور قابل قبول شہادتیں نہیں مل جائیں اور اس میں مندرج تمام کلام کے معتبر ہونے کے لئے قرائن حاصل نہ ہوجائیں اس پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ نسخہ نمبر ۳ کا حال تو یہ ہے کہ خود قصاید سودا کے جامع کے قول کے مطابق اس کے شروع کے مندرجات "نستعلیق" میں ہیں اور آخر کے اوراق کا خط "خط شکستہ" ہے۔ ساتھ ہی انھیں یہ بھی اعتراف ہے کہ:

"ابتدا میں جو اہتمام و احتیاط کی گئی تھی وہ اب نہیں رہی"

ایسی صورت میں تو تبدیلی کے اسباب پر اور بھی زیادہ احتیاط سے نظر کی جانی چاہئے تھی اور کم از کم اس حصے کی چھان پھٹک تو اور بھی ضروری تھی جس کی کتابت میں "اہتمام و احتیاط" سے کام نہیں لیا گیا۔

نسخہ ۳ کے بارے میں صفحہ ۵۰ پر کہا گیا ہے کہ "دو کے علاوہ تمام غیر مطبوعہ قصائد اس میں موجود ہیں" لیکن صفحہ ۸۱ پر ایسے تین قصیدوں کے مصرعے درج ہیں جو اس نسخے میں غیر موجود ہیں، یہ بڑی اہم بات ہے۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ

قصاید سودا کے جامع نے خود بھی "احتیاط و اہتمام" کے ساتھ اس مجموعے کو مرتب نہیں کیا ہے اور اپنے ماخذ کے بارے میں بیان دینے میں بھی پوری توجہ صرف نہیں کی ہے۔ اس سے دوسرا اہم نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ قصاید سودا کے جامع کے تمام بیانات (ان کی تحریریں بھی) ایسی نہیں ہیں جنہیں معتبر تسلیم کیا جاسکے۔ اس خیال کی توثیق اکثر دوسرے مقاموں سے بھی ہوتی ہیں مثلاً اسی نسخے کی بابت ایک بیان موصوف کا یہ ہے۔

"اغلاط کتابت بہت کم ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ کتابت میں اہتمام برتا گیا ہے۔"

دوسرا بیان وہ ہے جو اوپر نقل کیا گیا کہ آخر میں اہتمام و احتیاط سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ ایک تیسرا بیان صفحہ ۸۳ پر بھی ہے کہ

"بعض جگہ کتابت کی واضح غلطیاں بھی موجود ہیں"

قصاید سودا کے جامع کے بیان متضاد بیانی کی مثالیں اور بھی کئی ملتی ہیں۔

اغلاط کتابت کی جو مثالیں قصاید سودا کے جامع نے پیش کی ہیں ان سب کو اغلاط کہنا قدیم املا کی خصوصیات ہی نہیں تحقیق و تدوین کے نکات سے بھی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ چنانچہ تفصیل آگے بیان ہوگی۔ قصاید سودا کے اس مجموعے میں بہ کثرت مثالیں ایسی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جامع قصاید سودا خود بھی عملاً اس نسخہ کی کتابت سے مطمئن نہیں ہیں۔ قصیدہ نمبر ۵۲ سے چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

شعر نمبر	غلط جیسا کہ نسخے میں ہے	صحیح بقول جامع قصاید سودا
۱	میں نے کسی نے	میں یہ کسی نے
۶	خا سے	خا کا
۱۵	کر گئے	کر گیا

لیکن ان کے نامطمئن ہونے سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکالا جانا چاہئے کہ انھوں نے مخطوطے کی تحریر کو صحیح طور پر پڑھ ہی لیا ہے۔ قدیم تحریروں کی قرأت کا ملکہ بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ قصائد سودا کے جامع نے تو پہلی بار اس خارزار میں قدم رکھا ہے اور

انھوں نے اس کلام پر جیسی توجہ صرف کی ہے اس کا حال بھی معلوم ہے ۔ جملہ معترضہ کے طور پر قصاید سودا کے ماخذ میں نسخہ ملا کی طرف توجہ دلاتے ہوئے عرض کر دوں کہ اس پر ایک مہر لگی ہوئی ہے جس میں ذیل کا شعر لکھا ہوا تھا۔

خوش ہست مہر کتبخانۂ سلیمانے جاہ
کتاب ..... چوں نقش بسم اللہ
۱۲۴۴

اہل علم کا طریقہ ہے کہ جہاں ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ دوسرے لوگوں سے رجوع کر لیتے ہیں۔ اکثر نہایت کارآمد باتیں طالب علموں سے بھی معلوم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ مذکورہ مہر کے مصرع ثانی کی بابت بھی اگر ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی معلوم کرنا چاہتے تو یقینی طور پر انھیں ان لفظوں کا پتہ چل جاتا جن کی جگہ پر انھوں نے نقطے بنا کر چھوڑ دیئے ہیں۔ اس مہر کی بنیاد پر قصاید سودا کے جامع نے نسخہ ملا کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ بھی غلط ہے ۔

نسخہ ملا کی اہمیت کے سلسلے میں تیسری بات جو کہی گئی ہے اس کی صحت پر اصرار نہیں کیا گیا ہے۔ دراصل تاریخی ترتیب کا صحیح طور پر اندازہ کرنے کے لئے تاریخی واقعات کا علم بھی ضروری ہے جب تک ہر قصیدے کے ممدوح کا تعین نہ ہو جائے اور پھر اس ممدوح کے زمانے کا علم نہ حاصل ہو اس وقت تک کسی قصیدے کے زمانۂ تصنیف کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ تازہ واردانِ بساطِ تحقیق کے فکر و خیال کی حدود سے باہر ہے۔ قصاید سودا کے جامع نے جو بات سوچی ہے وہ بس اتنی ہی ہے کہ ہر قصیدے کے ممدوح کا پتہ چلا کر ممدوحوں کے بطور مجموعی زمانے پر خیال کر کے انھیں یکجا کر دیا جائے لیکن اتنا کرنا بھی علاوہ ان کے لئے ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ وہ ممدوحوں کی ولدیت کے اختلاف کو بھی دور نہیں کر سکے ہیں۔ چنانچہ نسخہ ملا کے بارے میں ان کا یہ دعویٰ محض "براۓ بیت" ہے کہ :

"قصائد کی ترتیب بھی تاریخی ترتیب سے قریب تر معلوم ہوتی ہے"

اور اس دعوے کی تردید خود انھیں کے حسب ذیل بیان سے ہو جاتی ہے کہ:

"کلام کی ترتیب تیر کے کلام پر حسب ذیل (سبیل ہدایت؟) قصاید، مثنویات، واسوخت، شہر آشوب، تضمینات، مخمسات، قطعات، پہیلیاں"

معلوم ہوتا ہے کہ نسخے کے کاتب نے قصائد (مدحیہ) اور ہجویات میں فرق کیا ہے۔ وہ شہر آشوب، اور قطعات کو بھی ممیز کرتا ہے لیکن تعجب کہ قصاید سودا کے جامع نے ان اصناف میں امتیاز نہیں کیا ہے۔ انھوں نے تو اس مجموعہ قصاید میں قطعہ تاریخ کو بھی شامل کر لیا ہے۔ مدح، ہجو، شہر آشوب، اور قطعہ کو گڈمڈ کر کے جو مجموعہ تیار کر دیا گیا ہے تعجب ہے کہ اسی پر مسلم یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کر دی ہے۔ اس سے اس اعلیٰ ترین علمی سند کے معیار اور وقار کا اندازہ کیا جانا چاہئے ۔

زیر بحث نسخہ ملا کے تعارف میں کہا گیا ہے کہ "بہ اعتبار قصائد یہ نسخہ مکمل ترین کہا جا سکتا ہے" اس دعوے کا بھی بے معنی ہونا ظاہر ہے۔ کیونکہ قصائد سودا کے جامع نے کلام سودا کے محض گنے چنے نسخے دیکھے ہیں۔ انھیں کیا معلوم کہ قصائد سودا کا "مکمل ترین" نسخہ کون سا ہے اور کہاں ہے۔ ان کا یہ دعویٰ اس لئے بھی مہمل ہے کہ انھیں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ اس نسخے میں چند قصیدے غیر موجود بھی ہیں۔ اس نسخے کا ناقص ہونا تو اس اعتراف سے ہی مسلم ہو جاتا ہے ۔

بتایا گیا ہے کہ نسخے پر "ایک چوکور مہر لگی ہے۔ نام اور سن ظاہر ہوتا ہے لیکن پڑھا نہیں جا سکا" (اس مقام پر بھی قصاید سودا کے جامع کو کسی اہل علم سے رجوع کرنا گوارا نہیں ہو سکا) باوجود اس کے مہر کا سائز اور روشنائی کا رنگ یقیناً ظاہر تھا۔ نام اور سن کے بعض اجزا بھی اس حد تک تو واضح ہیں ہی کہ انھیں نام اور سن ہی سمجھا گیا ہے۔ اگر ان کی کیفیت بیان کر دی جاتی تو حقیقت تک پہنچنے میں قارئین کو کسی قدر سہولت ہو سکتی تھی لیکن اہلِ تحقیق کے طریقۂ کار اور محض سند کے طالب کے عمل میں تو فرق ہونا ہی چاہئے تھا ۔

املا کی بحث کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ "بعض الفاظ تقلیب حروف کے ساتھ لکھے گئے ہیں" مثلاً پھتر (پتھر) پھرشتہ (پڑھتا) وغیرہ۔ بظاہر یہ تلفظ مغربی یوپی (سہارنپور وغیرہ) کے علاقے کا ہے

بحث طلب مسئلہ یہ تھا کہ کیا یہی مصنف کا اصل تلفظ تو نہیں تھا؟ اگر نہیں تھا تو کیا کاتب نے اپنے تلفظ کے مطابق متن میں ترمیم کر لیا تھا؟؟ اگر تصرف کی بات ثابت ہو جائے تو پھر اس نسخے کے ایک ایک نقطے پر بحث، احتیاط کے ساتھ نظر کرنی لازم تھی لیکن یہ تحقیقی مسائل قصائد سودا کے جامع کے حاشیہ خیال میں بھی نہ آ سکے اور انھوں نے اس نسخے کو "بہت اہم" اور "مکمل ترین" سمجھ کر اس کی اتباع کی ہے البتہ اتنا کیا ہے کہ کاتب کے تلفظ کو اپنے تلفظ کے مطابق ڈھال لیا ہے یعنی پتھر کو پتھر اور پڑتے کو پڑتے چھاپ دیا۔ خود سودا کا تلفظ کیا تھا اس مسئلے سے انھوں نے مطلق سروکار نہیں رکھا۔

حرفوں کی ساخت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ٹ، ڈ، ڑ پر کاتب نسخہ نے چار نقطے بنائے ہیں۔ ان حرفوں پر مختصر "ط" بنانے کا چلن دہلی اور آس پاس کے علاقوں میں بہت بعد میں عام ہوا۔ مرزا غالب تو آخر عمر تک "ٹ" پر چار نقطے ہی بناتے رہے۔ اگر اس نسخے کو اس علاقے کا لکھا ہوا خیال کریں تو اس کا زمانۂ کتابت تیرھویں صدی ہجری کے ربع ثالث بلکہ اور بعد تک کا ہو سکتا ہے۔

بعض لفظ مثلاً اکسیر کو اکثیر لکھنا وغیرہ بھی املا کے اختلاف کی وہ صورت ہے جو تیرھویں صدی ہجری کے وسط تک کے مخطوطوں میں عام ہے۔

قصائد سودا کے جامع نے اس نسخہ ۳ کو محض اس بنا پر قدیم تسلیم کر لیا ہے کہ اس کے ترقیمے میں تکمیل کتابت کی تاریخ ۶ رجب [illegible] بروز پنجشنبہ لکھی ہوئی ہے۔ جو لوگ تحقیقی کام کرتے رہتے ہیں، انھیں اتنی بات معلوم ہے کہ قلمی نسخوں پر تاریخیں بھی غلط لکھی ہوتی ہیں۔ اگر دن، مہینہ اور سال [illegible] قمری تاریخوں کا انحصار رویت ہلال پر ہوتا ہے چنانچہ ایک مقام پر پہلی اور دوسرے پر دوسری تاریخ کا ہونا ہر طرح قرین قیاس ہے۔ ترقیمے میں کاتب نے اپنے نام اور مقام کا اظہار نہیں کیا ہے یہ غیر اہم بات نہیں ہے کہ رویت کے فرق کے سبب ۶ رجب [illegible] کو بھی پنجشنبہ کا دن ہو سکتا تھا چنانچہ نسخہ کی قدامت کو آنکھ بند کر کے تسلیم کر لینا احتیاط کے خلاف بات ہے۔ ہاں نسخے کا کاغذ، روشنائی، املا، حروف کی ساخت، نشان خط وغیرہ کی مدد سے مسئلے کو ایک حد تک حل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی کی بات ہے کہ اردو میں تحقیق و تدوین جیسے وقت طلب عمل کو بس حرف شناسی نقل نویسی کا کام سمجھا جانے لگا ہے۔

متن کی تدوین کا مقصد یہ ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے اس کی صحیح صورت اس طرح آ جائے کہ اس میں اشکال باقی نہ رہے لیکن عام طور سے اس حرف کا حقہ توجہ نہیں کی جاتی مثال کے طور پر جن مقاموں پر اعلان نون کی صورت ہو وہاں نون منقوطہ لکھنا اور جہاں اعلان نہ ہو، ادغام ہو، وہاں پر نون غنہ (غیر منقوطہ) لکھنا از بس ضروری ہے۔ ابتداءً جب زبان و بیان کے قاعدے مرتب نہیں ہوئے تھے قدماء نے اکثر اضافت کی حالت میں بھی اعلان نون کیا ہے اس لئے ان کے کلام کو مدون کرنے والے کے لئے اس حرف کے منقوطہ یا غیر منقوطہ لکھنے پر خصوصی توجہ ضروری ہے تاکہ اس عہد کے زبان و بیان کی حقیقی صورت واضح ہو سکے۔

اسی طرح میرے، تیرے وغیرہ لفظوں میں جہاں پر پہلے حرف 'ی' کا اعلان مطلوب ہو ایک شوشہ اور اس کے نیچے دو نقطے لگانے کا اہتمام کیا جانا چاہئے۔ بصورت دیگر صرف زیر بنا دینا کافی ہے۔ قدماء کا تلفظ جدید دور کے تلفظ سے اکثر مقاموں پر مختلف رہا ہے اس لئے اگر مدون قدیم متون کو ضبط تحریر میں لاتے ہوئے اس عہد کے تلفظ کو صحیح صورت میں پیش کرنے کا اہتمام نہ کرے گا تو قاری کے لئے مختلف النوع مسائل اور الجھنیں پیدا ہو جائیں گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ بعض لفظوں کا استعمال [illegible] بر خلاف لغت بھی رائج تھا۔ مثال کے طور پر شیفتہ نے اپنی مثنوی [illegible] گلزار ارم کا نام [illegible] کے ساتھ "گلزار ارم" لکھا تھا۔ مدون کے لئے لازم ہے کہ وہ بھی مصنف کی اتباع کرے۔ قصائد سودا کا جامع تدوین کے اس اصول سے ناواقف معلوم ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس نے بہت [illegible] نسخہ ۳ میں "اکثیر" کا لفظ اکسیر کی [illegible] صورت [illegible] ہے حالانکہ اس باب میں بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔ اور سیاق و سباق پر نظر رکھ کر [illegible] فیصلہ کرنا چاہئے تھا۔

انیسویں صدی [illegible] کے وسط تک [illegible] کے تلفظ کے [illegible] استعمال کا تعین نہیں ہوا تھا نتیجہ یہ تھا کہ [illegible]

...تھا۔ مثلاً پہنچا کو غالب نے بھی ایک موقع پر "پونچا" لکھا ہے۔ قصائد سودا کے جامع نے پڑھتے اور تڑپتے (تڑپھتے تلپھتے) وغیرہ لفظوں کے سلسلے میں تلفظ کے مسائل پر مطلق تفکر نہیں کیا تاکہ تدوین کی افادیت ہی یہ ہے کہ املا ہی نہیں تلفظ کی بھی اصل صورت متعین ہو جائے۔

عام تھا کہ ضمہ (پیش) کے لئے واو ملفوظ اور کسرہ (زیر) کے مقام پر یائے ملفوظ بناتے تھے۔ قدیم متون کو جدید املا کے مطابق شائع کرتے وقت ان جگہوں پر اعراب بنا دینا کچھ مشکل نہیں ہے لیکن ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی کے شائع کردہ قصائد سودا میں اس کی بھی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ املا اور تحریر کے مذکورہ تمام مسائل سے صرف نظر کرنے کی وجہ سے یہ بات بہت مشتبہ ہے کہ قصائد سودا کے جامع نے ان قصیدوں کے متون کے صحیح قرأت کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہوگی۔ اس کتاب میں ایسے نشان موجود ہیں جن سے یہ شبہ یقین میں بدلنے لگتا ہے مثلاً نسخہ سے ماخوذ ایک پوکے دو شعر اس طرح چھپے ہیں ؎

القصہ میں اس بات کے تئیں عبدالصمد خاں
یکبار نہ کہے عرض بعہد صدق و ارادت

تیار کرتا ہوں میں اب اس کی بہ یائی
دعوت جو قبول ہووے تو ہے اوج سعادت

پہلے مصرع میں "تئیں" چھپا ہے حالانکہ "تیں" ناموزوں ہے۔ اسی طرح عبدالصمد خاں بھی اس بحر میں ناموزوں ہے۔ عبد صمد خاں ہونا چاہئے۔ تیسرے مصرعے میں بر یائی صرف یا کے اظہار کے ساتھ موزوں نہیں ہے۔ اغلب ہے کہ شاعر نے "برائی" نظم کیا ہے۔ قدما اکثر لفظوں میں حرف "ے" کو ظاہر کر کے ادا نہیں کرتے تھے۔ قصائد سودا کے جامع کو اس طرف بھی توجہ نہیں ہوئی چوتھے مصرعے میں "ہووے" (ہوئے) کے مقابلے میں "ہووے" لکھنا غالباً بہتر تھا۔

قصیدہ نمبر ۵ کا دوسرا شعر اس طرح چھپا ہے ؎

مقبول شعر تونے کیا ہے شانہ اس سے
جز زمین تماں تماں گزش توں اندرج

اس کا دوسرا مصرع ناموزوں ہے۔ اسی طرح قصیدہ نمبر ۲ کا دوسرا شعر یہ ہے ؎

یک تخم ہوں میں خاک نشیں زمین شور
نشو و نما دے مجھ کوں گو کرم کا تیرے سحاب

پہلے مصرع میں "نشیں" کے نیچے اضافت ضروری تھی اور دوسرے مصرع میں "گو کرم" ناموزوں ہے۔

قصائد سودا کا غائر مطالعہ اس کے جامع کی سخن فہمی کو بھی مشتبہ بنا دیتا ہے۔ بعض دو ایک مثالیں انھیں کی بھی دی جاتی ہیں۔ پہلے قصیدے کا ایک مصرع ہے ؎

زباں پہ اس کے گزرے حرف جا کہ شفاعت کا

لفظ "گزرے" (ماضی کے معنی میں) اور اسی سلسلے کے مشتقات مثلاً گذرگاہ، رہگذر، گذشتہ وغیرہ کو اردو میں حرف ذال سے لکھنا بہتر خیال کیا گیا ہے۔ یہاں حرف زے سے لکھا ہے، زبان کی تانیث میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس لئے یہاں "اس کے" صحیح نہیں ہے۔ "اس کی" چاہئے۔

پانچویں قصیدے کا ایک مصرع اس طرح چھپا ہے ؎

شکل عنبر کے بنی ہے یہ سپہر ازرق

شکل متفقہ طور پر مونث ہے چنانچہ "شکل عنبر کی" ہونا چاہئے اسی قصیدے کا ایک مصرع یہ ہے ؎

ڈبڈبائیں رہیں گی چشم مری مثل حباب

یہاں "ڈبڈبائے رہیں گی" فصیح ہے۔ اگر قصائد سودا کے جامع کے خیال میں اس مقام پر سودا نے "ڈبڈبائیں" ہی نظم کیا تھا تو اس کی تصریح کی جانی چاہئے تھی۔ ایسی تصریح کے لئے اہل تدوین نے علامتیں اور ضابطے مقرر کر دیئے ہیں، ان پر عمل کرنا چاہئے تھا۔

قصائد سودا کے اس مجموعے میں ایسے شعر بھی ہیں جن میں بعض لفظوں کا بیجا استعمال ہوا ہے مثلاً دوسرے قصیدے کا ایک مصرع ہے ؎

یاد میں اس کی گر عدو دیکھے جو اپنے باپ کو

لفظ "جو" یہاں بھی اگر نظم ہوا ہے اور اس سے پہلے ایک "گر" موجود ہے ظاہر ہے کہ یہ تکرار بے معنی ہے۔ اسی طرح ؎

ہے یہ امیدوار یہی یوں علی سے مجھ کو بھی

اس میں بھی "نہ دیا اور" یعنی "نہ" کی تکرار صحیح نہیں ہے۔ چوتھے قصیدے کا ایک شعر اس طرح چھپا ہے۔ ؎

علاج قتل ہے واشد کا اب مرحا کہ ندمان
کہ سیکھے ہیں بدم تیغ آب دار گرہ

اس میں "کہ" کی تکرار شعر کو بے معنی بنا رہی ہے۔ یہ بات بھی توجہ طلب ہے کہ مرکب لفظ آبدار کے دونوں جز الگ الگ لکھے گئے ہیں۔ اور شعر میں جہاں ضروری تھا ہے۔ اضافتیں بھی نہیں بنائی گئی ہیں۔

یہ چند باتیں جو عرض کی گئیں ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی کی شائع کردہ قصاید سودا کے بارے میں عمومی رائے قائم کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ ساتھ ہی یہ سب مثالیں چونکہ ان قصیدوں سے لی گئی ہیں جو انھوں نے نسخہ نمبر ۳ سے حاصل کئے ہیں۔ ان سے اس نسخے کی صحت کا بھی اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض حواشی ایسے ہیں جو مذکورہ نسخے سے متعلق موصوف کی فراہم کردہ اطلاعات کو بھی شبہ سے بالاتر نہیں رہنے دیتے مثلاً دوسرے قصیدے کا ایک مصرع یہ ہے ؎

کہتی ہے مجھ سے مغفرت ہوگئی خوب یہ غزل

اس سے متعلق حاشیہ نمبر ۷ سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ نمبر ۳ میں "خوب ہوئے گی یہ غزل" ہے۔ لیکن حاشیہ نمبر ۱۰ سے پتہ چلتا ہے کہ اس نسخے میں "دو ہوئے گی" تحریر تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک نسخے میں ایک ہی صورت لکھی ہو سکتی ہے بجز اس کے کہ دوسری صورت اسی نسخے کی حاشیہ پر نسخہ کی گئی ہو۔ اگر ایسا ہو تو بھی اس کی صراحت ضروری تھی۔ ایسا شخص جس نے اردو لسانیات کی ایک سند حاصل کی ہو اور جو شعبۂ اردو سے وابستہ رہ کر ترقی کا بھی طالب ہو، تو توقع کی جاتی ہے کہ وہ دونوں صورتوں کے فرق کو سمجھ سکتا ہے۔ ہر صورت اس میں شبہ نہیں کہ نسخہ نمبر ۳ میں کتابت کی قبیل سے ہر قسم کی غلطیاں موجود ہیں۔ مثلاً پہلے قصیدے کا مصرع ہے ؎

عروج دست جہت کو نہیں ہے قدر جیسی دکھ

نسخہ مذکور میں عروج کی جگہ عروس لکھا ہوا ہے۔ اسی طرح دوسرے قصیدے کا مصرع ہے ؎

میں وہ تنگ شراب اور ساقی کا چشم مست ہے

مذکورہ نسخہ میں ہے "میں اور تنگ شراب" تو ظاہر ہے کہ یہ مصرع ناموزوں ہے۔ قصیدہ نمبر ۹ میں ایک شعر یہ ہے ؎

تو نے نقاب منہ سے اٹھایا چمن میں گل
اے گلبدن ہزار کے دل سے اتر گیا

نسخہ نمبر ۳ میں اس شعر کے دوسرے مصرع کی بجائے نہد و آنہ شعر کا مصرع ثانی لکھا ہوا ہے یعنی

؎ چاروں طرف بہار ہے اور ابر کی ہوا

اور اصل مصرع اس میں بالکل محذوف ہے۔

قصیدہ نمبر ۲۶ خاص طور سے توجہ طلب ہے جس کے بارے میں نسخہ نمبر ۵ کا تعارف کراتے ہوئے ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی نے کہا: "اس نسخے میں محمد شاہ عالم بہادر کی شان میں لکھا ہوا قصیدہ

؎ ہے اشتہار مجھ سے مرا اے فلک خباب

بھی موجود تھا ہے جو یقیناً ۱۱۶۱ھ سے پیشتر لکھا گیا ہوگا۔"

اپنے اس یقین کی بنیاد پر موصوف نے اس قصیدے کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے۔ "قصیدہ در مدح محمد شاہ بادشاہ غازی" ۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ انھوں نے یہ عنوان یہاں سے حاصل کیا۔ اتنی بات یقینی ہے کہ اس کا ماخذ نسخہ نمبر ۳ نہیں ہے۔ مقطع سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصیدہ جشن نوروز کے موقع کا ہے اور ذیل کے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کی تخت نشینی کے کچھ ہی [illegible] بعد کہا گیا ہے ؎

بخشی جبہ تجھ کو حق نے جوانی میں سلطنت
شیب نہ فانہ کو ہے ہوئی خواہش شباب

اس میں شبہ نہیں کہ محمد شاہ جوانی نہیں بلکہ آغاز شباب ۱۱۳۱ھ میں تخت نشین ہوئے تھے لیکن اس وقت خود سودا کی عمر پندرہ سولہ برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس کمسنی میں سودا کا شاہی دربار میں باریاب ہو کر اس قصیدے کا پیش کرنا قرین قیاس نہیں ہے چنانچہ قصائد سودا کے جامع کے یقین اور ان کے قائم کئے عنوان کی غلطی ظاہر ہے۔

نسخہ نمبر ۱۹ میں اس قصیدے کو عالمگیر ثانی سے متعلق بتایا ہے یہ بات بھی قابل قبول نہیں [illegible] قصیدے میں کوئی ایسی [illegible] یا اشارہ موجود نہیں ہے جس سے اس بات کی تائید ہو [illegible]

لفظ آفتاب میں بادشاہ کے تخلص کی رعایت صاف صاف موجود ہے
[illegible] ہیں کہ

ہے مستنیر تجھ سے مرا لطف تک جناب
رخشندگی ذرہ ہے از فیضِ آفتاب

مدح میں جن امور کا بیان ہوا ہے وہ بھی اسی حق میں ہیں کہ یہ قصیدہ شاہ عالم ثانی تخلص بہ آفتاب کی مدح میں لکھا گیا ہے جن کے دامنِ دولت سے سودا مدت تک وابستہ رہے۔ اس خیال کی تائید مجھے انتخاب سے ہوتی ہے جس میں اس قصیدے کے ممدوح کا نام اس طرح لکھا ہے:

"محمد شاہ عالم بہادر متخلص بہ آفتاب"

اس میں لفظ "محمد" کے اضافہ نے قصائد سودا کے جامع کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا جس کا ذکر کیا گیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کسی بعد ذریعے سے انھیں اپنی غلطی کا علم ہو گیا چنانچہ ایک مقام پر انھوں نے لکھا کہ:

"قصیدہ ۔ ہے مستنیر الخ کے بارے میں یہ مانا گیا ہے کہ یہ محمد شاہ کی شان میں نہیں بلکہ شاہ عالم کی شان میں ہے۔ اس لئے عالمگیر ثانی کے قصیدے کے بعد رکھا گیا ہے"۔

لیکن یہاں پھر قصائد سودا کے جامع کے قول اور عمل کا تضاد ظاہر ہے۔ قصیدہ مذکور صفحہ [illegible] سے شروع ہو کر صفحہ ۲۴۲ پر ختم ہوتا ہے اور اس کے بعد [illegible] صفحہ پر جو قصیدہ چھپا ہے وہ عالمگیر ثانی کی مدح میں ہے۔ اتنی بات صحیح ہے کہ اس قصیدہ پر نمبر شمار ([illegible]) اور اس کے بعد والے پر نمبر (۲۲) تحریر ہے۔

نسخہ [illegible] کے کاتب نے اس قصیدے کو نواب آصف الدولہ بہادر کی مدح میں لکھا ہے۔ یہ بڑی فاحش غلطی ہے۔ نواب موصوف نے کبھی بھی زمانے میں بادشاہت کا اعلان نہیں کیا۔ مذکورہ قصیدے میں [illegible] ممدوح کے بادشاہ ہونے کا ذکر واضح لفظوں میں موجود ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کاتب کو نہ صرف اس قصیدے کے ممدوح کے بارے میں اطلاع غلط تھی بلکہ وہ اس حد تک سخن ناشناس بھی تھا کہ اسے ممدوح کی حیثیت سے ایک نواب کا نام لکھنے میں کوئی قباحت معلوم نہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ ایسے کاتب کے لکھے ہوئے نسخے میں ہر قسم کی غلطیاں ہو سکتی ہیں چنانچہ اس نسخے کے شمولات پر بھی بغیر تحقیق کے اعتماد کر لینا سخت غلط ہے۔ اس میں سودا سے منسوب جو بھی نیا کلام ملتا ہے اسے ان کے مستند کلام میں شامل نہیں کیا جانا چاہئے تاوقتیکہ مناسب شہادتوں سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے۔

● ● ●

دوستی

ظہور احمد خاں صاحب (ہرسود)

خیالِ یار بھی ہے۔
تیرے طعنہ کشی بھی ہے
خیالِ زندگی ۔۔ لیکن ۔۔ خیالِ زندگی ہے
کہاں ہوتا ہے رشتہ جسم و جاں کا ہر ایک محفل میں
سکوں ملتا نہیں ہے ذہن کو غیروں کی محفل میں
خریدے صرف بھی تو ذہن کو تسکیں نہیں دیتے۔
رواجوں سے بندھے یہ جسم ۔ اندھے ہیں
یہ گونگے ہیں
یہ بہرے ہیں
یہ لنگڑے ہیں
یہ بے لبے ہیں
مگر پھر بھی یہ اپنے ہیں، پرائے تو نہیں ہیں۔ یہاں
کہاں جائیں سکونِ ذہن کی خاطر
کہاں بھٹکیں ۔۔۔
خداؤں سے تو ہمیں ملتا نہیں ہے
بتوں سے دوستی اپنی نہیں ہے
اور ۔۔۔ تم ۔۔۔
انسانوں کو انسانوں سے ملنے نہیں دیتے۔
مفادوں کو رواجوں کے سہارے تم جتاتے ہو۔
میرے ہمراہ چلا کر "دوستی" ایسے نبھاتے ہو۔

غزلیات

منظر نسیمی شاہجہانپوری ایم۔ اے

آفتاب و ماہتاب و کہکشاں ہو جائیں گے
ہم زمیں والے بھی اک دن آسماں ہو جائیں گے
موت وہ آئینہ ہوگی جس میں ہر نفس
حوصلے جینے کے سب رائگاں ہو جائیں گے
شاہراہِ زندگی میں ہو کے محتاجِ کرم
ہم خود اپنے دوش پر بارِ گراں ہو جائیں گے
دیں گے اپنی ذات کو جب ننگ خوں
لوگ اپنی ذات سے خود بدگماں ہو جائیں گے
اُن پہ وعدوں کی اذیت، اُف یہ لمحوں کی صلیب
آتے آتے آپ کے ہم بے نشاں ہو جائیں گے
ظلمتوں سے ہر قدم ہوگا تعارف آپ کا
حادثوں کے سلسلے کوہِ گراں ہو جائیں گے
جب یہ گم جائیں گے منظر وقت کے گرد و غبار
ہم کتابوں میں لکھی وہ داستاں ہو جائیں گے

جام نسیمی شاہجہانپوری

پہلی نظر بھی میرے لئے اجنبی نہ تھی
انجان تھے وہ مجھ سے مگر بے رخی نہ تھی
تاریک کائنات تھی حدِ نگاہ تک
جب تک کہ دل میں شمعِ تمنا جلی نہ تھی
انساں ہے جب سے راہِ ترقی پہ گامزن
ہے روشنی وہاں بھی جہاں روشنی نہ تھی
جس شاخِ گل پہ میرا نشیمن بنا نہ تھا
اُس شاخِ گل پہ برق ابھی تک گری نہ تھی
ملتے ہیں اب جو دوست تو ملتے ہیں اس طرح
جیسے ہماری ان سے کبھی دوستی نہ تھی
اُن کی نگاہِ مست کا اللہ رے کمال
وہ بھی بہک گیا ہے کبھی جس نے پی نہ تھی
اے جام اب تو سانس بھی لینا محال ہے
دشوار ورنہ ایسی کبھی زندگی نہ تھی

ایم یوسف ثاقی پالی

جو کام تمہیں سونپ دیئے جاتا ہوں
ہو جائیں گی امید لئے جاتا ہوں
ہر سمت سے برسیں گے وہاں پھر پتھر
پھر شہر میں آئینہ لئے جاتا ہوں
ہر جملہ ستاروں کی طرح چمکے گا
اک نور کتابوں کو دیئے جاتا ہوں
جاتا ہوں تہی دست میں لیکن دیکھو
جو لے کے میں آیا تھا، دیئے جاتا ہوں
حالات تو ایسے نہیں لیکن ثاقی
یہ میرا جگر ہے کہ جیئے جاتا ہوں

حکیم بھائی انا ھی لائل پوری (سورت)

میری امیدیں بالآخر یوں پریشاں ہو گئیں
دل کی سب کیفیتیں خود ہی نمایاں ہو گئیں
وہ نگاہیں کر رہی تھیں جو کبھی نشتر زنی
رفتہ رفتہ کیوں میرے دل کی نگہباں ہو گئیں
جن سے تھی آباد میرے دل کی دنیا کیا کہوں
کس طرح وہ آرزوئیں آج ویراں ہو گئیں
گردشِ دوراں کے ہاتھوں صبر افزا صورتیں
دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے پنہاں ہو گئیں
دھجیاں گو دھجیاں ہیں جیب و داماں کی مگر
یہ بھی آخر زینتِ فصلِ بہاراں ہو گئیں
کس سے پوچھوں کون [illegible] سکے اس کا جواب
رنج و غم میں کس لئے تبدیل خوشیاں ہو گئیں

رادھا کرشن سہگل بے [illegible]
[illegible] ۱۱۰۰۲۷

چھینا ہے جس نے مجھ سے مجھے اس کو کیا کہوں
ساقی کہوں، شراب کہوں، میکدہ کہوں
تجھ سے ہے جشنِ عید تری کمسنی کا خیر
اے ماہِ ناتمام بتا تجھ کو کیا کہوں

وہ رات بھر جتا ہوں بتِ سنگدل کو میں
اس پر یہ شرط ہے کہ اسے میں خدا کہوں
تجھ کو ہے دل سے بیر، تو مجھ کو ہے دل عزیز
دل توڑنے کی بات میں اب دل سے کیا کہوں

وعدے میں جس کے رات کی نیندیں ہوئیں حرام
ایسے ستم شعار کو کیا آشنا کہوں
تیری کوئی شراب ہے میری کوئی شراب
میکش کسے کہوں میں کسے پارسا کہوں

سہگل ہر ایک شخص ہے اپنی ہی دھن میں مست
سنتا ہے کون کس سے میں اب مدعا کہوں

مجنی واحدی - قنوج

دل کا وہ اضطراب کیا جانیں
جو ستم گر ہیں پیار کیا جانیں
چارۂ زخمِ دل کریں گے کیا
میرا غم غمگسار کیا جانیں
جن کی قسمت میں ہے خزاں وہ لوگ
حسنِ لطفِ بہار کیا جانیں
جام میں زہر ہے کہ مے ساقی
یہ ترے بادہ خوار کیا جانیں
فخر اس خود غرض جہاں میں لوگ
دوستی کا شعار کیا جانیں

ترقی اردو بورڈ کی چند اہم علمی کتابیں

نمبر	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
۱	ارضیات کے بنیادی تصورات	ڈی۔ او۔ برچیٹ / ناہید حسین	۲۲/۰۰ روپے
۲	انسانی ارتقاء	ایم۔ آر۔ ساہنی / محمد احسان اللہ	۱۳/۷۵ روپے
۳	اجارہ	ای۔ اے۔ جی۔ رابنسن / ایم۔ اے۔ گیلانی	۱۸/۵۰ روپے
۴	تاریخ دستور انگلستان	سید علی محسن	۹/۰۰ روپے
۵	تعلیم میں نفسیات کی اہمیت	ہربرٹ سورینسن / سلامت اللہ	۲۱/۷۵ روپے
۶	توضیحی لسانیات	ایچ۔ اے۔ گلیسن (جونیر) / عتیق احمد صدیقی	۲۳/۰۰ روپے
۷	جدید الجبرا و مثلثات	ایلبرج۔ پی۔ وینس / ایس۔ اے۔ ایل۔ شیروانی	۱۵/۰۰ روپے
۸	دکن کے بہمنی سلاطین	ہارون خاں شیروانی / رحیم علی الہاشمی	۱۵/۵۰ روپے
۹	سکونیات	محمد خواجہ محی الدین	۸/۴۵ روپے
۱۰	سماجیات کے اصول	فاطمہ شجاعت	۸/۰۰ روپے
۱۱	طبیعیات کے بنیادی تصورات	آرتھر بیزر / احمد وکیل جعفری	۲۵/۰۰ روپے
۱۲	علمی جغرافیہ	محمد انعام اللہ	۴/۵۰ روپے
۱۳	علم مثلث مستوی (حصہ اول)	اے۔ کے۔ ویش نو اور مسز نور حلیم	۱۱/۶۰ روپے
	علم مثلث مستوی (حصہ دوم)	ایس۔ ایل۔ لونی / ابرار حسین	۸/۷۵ روپے
۱۴	فلسفہ کے بنیادی مسائل	اے۔ سی۔ ایوئنگ / میر ولی الدین	۱۵/۷۵ روپے
۱۵	کاروباری تنظیم	مرزا صغیر احمد	۸/۲۵ روپے
۱۶	کھاتہ نویسی اور کھاتہ داری	ایم۔ ایچ۔ فاروقی	۱۲/۰۰ روپے
۱۷	مفتاح التقویم	حبیب الرحمٰن خاں صابری	۲۸/۰۰ روپے
۱۸	مغل ہندوستان کا طریق زراعت	عرفان حبیب / جمال محمد صدیقی	۲۴/۵۰ روپے
۱۹	ہندوستان کا صنعتی ارتقاء	ڈی۔ آر۔ گیڈگل / ایم۔ صدیقی	۱۳/۰۰ روپے
۲۰	ہندوستان کی معاشی تاریخ (حصہ اول)	رمیش دت / غلام ربانی تاباں	۱۸/۷۵ روپے
	ہندوستان کی معاشی تاریخ (حصہ دوم)	رمیش دت / غلام ربانی تاباں	۲۹/۰۰ روپے
۲۱	ہندوستانی معیشت	الک گھوش / محمد خلیق	۲۶/۲۵ روپے
۲۲	یونانی ادویہ مفردہ	حکیم سید صفی الدین علی	۱۴/۵۰ روپے

* یہ کتابیں عام اردو پڑھنے والوں، روزگار کے مختلف کاروبار میں مصروف افراد کے ساتھ ساتھ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء، اسکالرز، اساتذہ اور دیگر مصنفین کے لئے بھی مفید اور معلومات آفریں ہیں۔
* یہ کتابیں اردو ذریعۂ تعلیم کے فروغ میں بھی ممد و معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ ان کے اس مقصد میں آپ بھی ہاتھ بٹائیں۔
* اردو اداروں، لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں میں بھی ان کتابوں کا ہونا ضروری ہے۔ مفصل فہرست اور دیگر معلومات کے لئے لکھئے۔

شعبۂ فروخت بیورو فار پروموشن آف اردو (وزارت تعلیم و ثقافت) ویسٹ بلاک۔ ۸، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ ۲۲

دِلّی میں صحتِ عامہ اور طبّی خدمات

شرحِ پیدائش و اموات میں کمی

- پچھلے کچھ برسوں کے دوران باشندگانِ دلّی کی صحت کی دیکھ بھال اور طبی سہولیات کافی بڑھا دینے کے باعث لوگوں کی عمر کافی بڑھ گئی ہے۔
- بچوں میں اموات کی شرح میں کافی کمی ہو گئی ہے۔
- آپ کی اور آپ کے بچوں کی صحت قائم رکھنے اور طویل عمر حاصل کرنے کے لئے آپ اپنا تعاون دیں۔
- اگر آپ کے خاندان میں کوئی بچہ جنم لیتا ہے یا کسی کی موت واقع ہوتی ہے تو اس کی اطلاع پیدائش اور موت کا ریکارڈ رکھنے والے دفتروں میں ضرور دیجئے۔ قانونی طور پر یہ بہت ضروری ہے۔
- آپ کی سہولت کے لئے دلّی کے شہری اور دیہی علاقوں میں بچوں کی پیدائش اور موت کا ریکارڈ رکھنے والے ۱۳۰ دفاتر کھولے گئے ہیں۔
- بچّے کی پیدائش کی اطلاع ۱۴ دن کے اندر اور کسی کی موت کی اطلاع سات دن کے اندر دینا ضروری ہے۔
- پیدائش اور موت درج کرانے کا سرٹیفکیٹ آپ کو مفت دیا جاتا ہے۔ سرٹیفکیٹ لینا نہ بھولئے۔ یہ آپ کے کام آئے گا۔
- دلّی میں کسی بھی سرکاری تسلیم شدہ اسکول میں داخلے کے لئے پیدائش کا سرٹیفکیٹ دینا پڑتا ہے۔
- جو لوگ وقت پر پیدائش اور موت کے بارے میں اطلاع نہیں دیتے ہیں ان پر ۵۰ روپے جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔

اور مزید معلومات کے لئے

اقتصادیات و اعداد و شمار کے دفتر (بیورو آف اکنامکس اینڈ اسٹیٹسٹکس)
اولڈ سیکریٹریٹ، دہلی۔ ۵۴ سے رابطہ قائم کریں۔

محکمۂ اطلاعات و اشاعت، دلی انتظامیہ کی طرف سے فلاحِ عامہ کے لئے جاری کیا گیا۔

"Ma, my banker has come to collect my daily savings".

Teach children the savings habit with PSB's Chhoti Bachat Scheme.

PSB's Chhoti Bachat Scheme.

A scheme that turns daily savings of small change into big savings over the years.

What's more, PSB sends its friendly banking agent to your house to collect your savings.

The Chhoti Bachat Scheme. The easiest way to save.

For details just drop in at your nearest PSB branch.

جناب نذیر احمد جوہری۔ محترمہ پشپا جین سابق ایم۔ ایل۔ اے جشن رونق (شام قہقہہ) کے روح رواں حضرت
جے پوری کو پھولوں سے لدے دیکھ کر پھولے نہیں سما رہے ۔
افسر الشعراء، نباض یکتا۔ ماہر حکمت استاد فتح محمد خاں افسر جے پوری جشن رونق کی صدارت فرماتے ہوئے
سے پکار پکار کر کہہ رہے ہیں۔ ع آج تو خرگوش نے ہاتھی سے بازی مار لی

جناب ثاقب شیدائی
جشن رونق جے پور کے شام قہقہہ

چند اچھی کتابیں

کتاب	مصنف / تفصیل	قیمت
فرہنگ عامرہ	تازہ ایڈیشن	۲۵/-
حیاتِ اقبال	طاہر تونسوی	۳۵/-
واحد متکلم	محمود سعیدی	۱۵/-
آتے جاتے لوگوں کی صدا		۱۲/-
تذکرہ جلیل	سوانح حیات [illegible]	[illegible]
اپنی کہانی	راجندر پرشاد	۱۲/۵۰
کرل	(تامل ادب کا اخلاقی شاہکار)	۴/-
[illegible]	مترجم رفیعہ سجاد ظہیر	۵/-
عورت	" "	۴/-
گنجی کہانی	سید احتشام حسین	۶/۵۰
وویکانند	"	۴/۵۰
سب انسان بھائی بھائی ہیں	(مہاتما گاندھی کی زندگی اور حالات)	۶/-
بھگوان بدھ	مہاتما بدھ کے مکمل حالات۔ تعلیم اور گیان	۷/-
تین ناٹک	رابندر ناتھ ٹیگور	۷/-
ایک سو ایک نظمیں	"	۷/۵۰
بنگلہ دیش	ڈاکٹر سکندر حسین	۲۵/-
[illegible]	شیکسپیئر	۵/-
[illegible]	رابندر ناتھ ٹیگور	۷/۵۰
علم زار	انتخاب شعر فارسی ایران و ہند مع ترجمہ	۱۲/-
ریاست	ڈاکٹر ذاکر حسین	۱۲/۵۰
[illegible]	سید احمد بہزود مہرانی	۱۰/۵۰
الف شاعر	مسعود اختر جمال	۵/۴۰
ادب کے ذریعے انسان شناسی	مرلی سنہا	۶/۶۵
جدید ادب (منظر اور پس منظر)	سید احتشام حسین	۹/۵۰
شیریں بانسری	آرزو لکھنوی	۵/۱۵
جہانِ آرزو	"	۶/۸۰
رباعیاتِ انیس	سید مسعود حسن بلگرامی	۴/۱۰
دھنک	عزیزہ انصاری	۶/-

کتاب	مصنف / تفصیل	قیمت
ترجمان القرآن	مولانا ابوالکلام آزاد جلد مکمل	۸۸/-
خطباتِ آزاد	"	۱۸/-
غبارِ خاطر	"	۱۵/-
ہماری آزادی	"	۳۵/-
کلام آرزو	آرزو لکھنوی	۴/۱۵
بجٹ کہانی	[illegible] مسعود حسین خان	۲/۹۰
مضامینِ سجاد ظہیر	سجاد ظہیر	۴/۲۰
قصیدہ نگارانِ اتر پردیش	سید علی جواد زیدی	۱۸/۷۵
انیسیات	سید مسعود حسن رضوی ادیب	۱۳/۵۰
بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں	مرزا جعفر حسین	۱۸/-
سخندانِ فارس	محمد حسین آزاد	۱۲/۵۰
روحِ نظیر	سید محمد محمود رضوی مخمور اکبرآبادی	۲۰/۷۵
مرأۃ الشعر	شمس اللہ عبدالرحمٰن	۱۳/۷۵
اندازِ نظر	رتن پنڈوری	۱۰/-
بہشتِ نظر	"	۱۵/-
آئینے	ارمان ادیبی	۱۰/-
گیان مارگ کی نظمیں	کرشن موہن	۱۰/-
کوئے ملامت	"	۱۰/-
شیرازۂ مژگاں	"	۱۰/-
کفرستان	"	۲۰/-
منٹو۔ شخصیت اور فن	پریم گوپال متل	۴۰/-
سوکینڈل پارک کا بلب	منٹو	۱۸/-
چند ادبی شخصیتیں	شاہد احمد دہلوی	۳۰/-
افکارِ عبدالحق	آصفہ صدیقی	۳۵/-
مہر و شرار	کالی داس گپتا رضا	۲۵/-
صنم خانۂ عشق	الیاس سیتاپوری	۱۵/-
اندر کا آدمی	"	۱۰/-
کاوش	کاشف ہندی	۱۲/-

دفتر ماہنامہ "شانِ ہند" فلیٹ نمبر ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی — ۱۱۰۰۰۲

ایک ایسے دستے کو کہا جاتا ہے جو مشتبہ ملزمان سے جرائم کا اقبال کرانے کے لئے تشدد کے ایسے ہولناک طریقے استعمال کرتا ہے کہ کسی مشتبہ نے جرم نہ بھی کیا ہو تو وہ بھی ڈر کے مارے اقبال جرم کر لے۔

چنانچہ ہر رات کو اس تھانے سے مشتبہ ملزمان کے رونے، چیخنے اور چلانے کی دل دہلا دینے والی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ ایک رات پنجاب ماتا یہ دلدوز چیخیں سن کر اٹھ بیٹھیں اور مجھے آواز دی کہ آؤ میرے ساتھ اوپر چلو تاکہ تمہیں دکھاؤں کہ پولیس والے کس طرح ملزموں سے اقبال جرم کراتے ہیں۔ اوپر کے کمرے کی کھڑکیوں سے تھانہ کا سارا صحن اور منظر صاف نظر آتے تھے۔ ایک نوجوان پر پولیس کے کارندے اپنے ہتھکنڈے آزما رہے تھے اور نوجوان آہ و زاری سے بار بار کہہ رہا تھا کہ مجھے اس کے بارے میں قطعاً کچھ بھی پتہ نہیں ہے آپ غلط تفتیش کر رہے ہیں۔ مگر وہاں کوئی سننے والا نہ تھا۔ کچھ ہی لمحوں میں یہ نوجوان بے ہوش ہو گیا تو پنجاب ماتا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ خالص پنجابی زبان میں کہہ رہی تھیں کہ یہ تو اپنی سرکار کی پولیس ہے نہ معلوم میرے بیٹے اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ انگریزی پولیس نے کیا کیا مظالم توڑے ہوں گے۔

میں ماتا جی کو سہارا دے کر نیچے لے آیا۔ رات کے دو بجے تک ہم پولیس والوں کی اس سفاکی پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔ ماتا جی فرمانے لگیں کہ مجھے یہاں ہر طرح کا آرام ہے مگر جب رات کو تھانے سے ملزموں کے رونے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آتی ہیں تو میں سو نہیں سکتی اور میری آنکھوں کے سامنے انگریزی پولیس کے وہ مظالم آنے لگتے ہیں جو بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں پر ڈھائے گئے۔ ماتا جی کے ہاں دن بھر فریادیوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ اور وہ ہر ایک کی بات بڑے دھیان اور ہمدردی سے سنتی تھیں۔ اور کبھی کبھی ایسا مذاق بھی کرتی تھیں کہ آنسو بہاتے ہوئے فریادی بھی ہنس پڑتے تھے۔

ان دنوں میں شراب پیتا تھا سر شام ہی دو چار صحافی احباب پینے پلانے کے سلسلے میں جمع ہو جاتے تھے۔ ماتا جی جب کھانے وغیرہ میں مصروف رہتیں ہم لوگ اپنا شغل کر لیتے۔ میں شراب نوشی کے بعد امرود کھاتا یا چھوٹی الائچی کھاتا تاکہ ماتا جی کو شراب کی بو نہ آ جائے۔ مگر میری ہزار کوششوں اور پیش بندیوں کے باوجود ماتا جی کو شک ہو گیا تھا۔ ایک دن فرمانے لگیں پت (بیٹا) کہیں کچھ ہے اور سمجھانے سے شراب کوئی نہیں چھوڑتا تم خود ہی اس کے بارے میں سوچنا اور کوشش کرنا کہ یہ چھوٹ جائے تو اچھا ہے۔ اس کے بعد میں نے یہ احتیاط کی کہ جتنے دن جالندھر رہا یا جب بھی جالندھر اس گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تو شراب نہیں پی۔

ماتا جی سردار بھگت سنگھ کے بارے میں گفتگو کرنے سے احتراز کرتی تھیں کیونکہ ان کا دل بھر آتا تھا مگر جب بھگت سنگھ کے بارے میں بولتی تھیں تو ایسی ایسی باتیں بتاتی تھیں کہ جس سے حب الوطنی کا اصل مطلب سمجھ آتا۔ آزادی کیا ہے اور غلامی کتنی بڑی لعنت ہے اس کا بھی پتہ چلتا تھا۔ غیر کی غلامی کیا ہے اور اپنی حکومت کیا ہے۔ اس کا موازنہ وہ بڑے اچھے انداز میں کرتی تھیں۔

ماتا جی فرماتی تھیں کہ جو قوم اپنے شہیدان آزادی کو بھول جاتی ہے آزادی انہیں بھولنے میں دیر نہیں لگاتی۔

ان کا یہ ایمان تھا کہ جب کسی ماں کا بیٹا آزادی کی راہ میں شہید ہو جاتا ہے تو ملک کا ہر نوجوان اس کو اپنا ہی بیٹا نظر آتا ہے اور اسے قدرتی طور پر یہ حوصلہ ودیعت ہوتا ہے کہ ایک بیٹا ملک پر قربان ہوا تو کیا؟ ملک کے کروڑوں نوجوان اس کے ہی بیٹے ہیں۔

ان کو یہ بھی یقین تھا کہ جب تک کوئی شخص سچائی، ایمانداری، خلوص دلی اور حب الوطنی کے اوصاف نہ رکھتا ہو وطن پر قربان نہیں ہو سکتا اور وہ یہ بھی فرماتی تھیں کہ روپیہ سے محبت کرنے والا وطن کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ ماتا جی کا کہنا تھا کہ جب سے دنیا کا وجود ظہور میں آیا ہے تب سے تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ظالم کا حشر برا ہی ہوا ہے۔ اگر ہماری قومی حکومت بھی ظلم کرے گی تو یہ بھی اس اصول سے بچ نہ سکے گی۔

ایک سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ جب سردار بھگت سنگھ کو پھانسی پر لٹکایا گیا تو ان کے دل پر بھی وہی اثر ہوا جو ایک ماں کے دل پر ہوتا ہے مگر بہت جلد انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ بھگت سنگھ مرا نہیں امر ہو گیا ہے۔ اور اب یہ حالت ہے کہ وہ ملک کے ہر نوجوان میں بھگت سنگھ کا پرتو دیکھتی ہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں فرمانے لگیں کہ بھگت سنگھ نے سر فروشی کا سبق کسی سے سیکھا نہیں بلکہ یہ تو خدا جس پر مہربان ہو اسے ہی شجاعت کا

کمزور طبقوں کو تحفظ اور امداد دیجئے

ہریجنوں اور دیگر کمزور طبقوں پر حملے ہمارے سماج پر دھبہ ہیں۔ یہ ہماری ترقی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

آیئے بھارتی روایات کا احترام کریں

ہم سب ایک ہیں

گوشۂ عقیل صدیقی

(شامِ قہقہہ)
مشاعرۂ جشنِ رونق جے پور

عزیز اندوری

مشاعرے کی ادبی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا نہ اس بات کی تردید کی جا سکتی ہے کہ مشاعرہ اُردو زبان اور اُردو شاعری کی ترویج اور اشاعت کا ایک اہم حصہ رہا۔! مشاعرے کی سابقہ صورتیں یا ان میں موجود لسانی تہذیب کی وہ قدیم شکلیں تو اب اتنی تیزی سے نظر نہیں آتیں لیکن مشاعرہ آج بھی پہلے کی طرح ہی مقبولیت کی منازل طے کر رہا ہے۔ بلکہ یوں کہئے اب اس نے مقبولیت کی انتہائی حدوں کو چھو لیا ہے۔ مشاعرے کی مقبولیت کی اچھی اور بُری ہر طرح کی مثالیں ہندوستان کے ہر چھوٹے اور بڑے مقام پر دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ مقبولیت کے اس تصوّر نے مشاعرے میں اختراعی عمل کو بھی تیزی کے ساتھ فروغ دیا ہے اور اسی اختراعی عمل نے مشاعرے کو مختلف شکلوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

ان شکلوں نے مشاعرے کی لسانی تہذیب کی آبرو کی حفاظت کہاں تک کی۔ بحث اس بات سے نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ ان بدلتی ہوئی شکلوں نے سامعین مشاعرہ کے ذہنی طبیعت کو کس حد تک متاثر کیا۔ یا پھر ان شکلوں میں اختراع کرنے والے منتظمین نے کس حد تک مخلصانہ انداز کو اپنا کر مشاعرے کو شعر و ادب کے غیر مخلصانہ رویّے سے محفوظ رکھا۔

حال ہی میں جے پور کے چند حضرات نے مشاعرے کے انعقاد میں ایک ایسے اختراعی عمل کے باب کا آغاز کیا۔ جو غالباً پہلی بار مشاعرے کو ایک نئی شکل دینے کی مثال بن گیا۔

جے پور کے چند زندہ دلاں نے مل کر ایک مقامی مزاحیہ شاعر رونق جے پوری کا جشن منانے کی ٹھانی۔ جشن منانے کا سلسلہ ان دنوں سارے ہندوستان میں زور پکڑے ہوئے ہے۔ اس لئے شاید یہ غلط فہمی پیدا ہو جائے کہ رونق جے پوری کا جشن منعقد کرنے کا خیال اہل جے پور کو بھی ہوا ہے۔ لیکن اصل میں جو جذبہ اس تقریب (یا مشاعرہ) کے پیچھے کام کر رہا تھا اسے دیکھتے ہوئے اس تقریب کے منتظمین کی نیک نیتی اور معاونت کے جذبے کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ دراصل رونق جے پوری کی مالی اور اقتصادی حالت اس لائق نہیں ہے کہ وہ اپنی صاحب زادی کی شادی پر مناسب رقم خرچ کر سکتے۔ اسی لئے اس فریضہ میں ہاتھ بٹانے کیلئے چند احباب نے رونق صاحب کی شعری خدمات کے ساتھ ہی ان کی صاحب زادی کی شادی کے فریضے کی تکمیل کے لئے ان کے جشن منانے کا فیصلہ کیا۔ اور انھیں نہ صرف انیس سو روپیہ نقد ہی پیش کئے بلکہ اس جشن میں ان کا استقبال بالکل انوکھے انداز میں کیا گیا آئیے اب ذرا مشاعرہ گاہ کی طرف چلیں۔ مشاعرہ گاہ یعنی محلہ ب علیان کے اس شاندار اور جگمگاتے ہوئے پنڈال میں چلئے جہاں ۸ بجے تک کہیں کہیں بساط پر چند حضرات آکر بیٹھ گئے ہیں اور ایک صاحب ہیں غالباً لطیفت فہمی بار بار آج کی تقریب کی اہمیت اور انفرادیت پر مختصر جملوں میں روشنی ڈال رہے ہیں اور بار بار سامعین سے پنڈال میں آنے کی درخواست کر رہے ہیں کہ سامعین اس اناؤنسمنٹ کو سننے کے بعد رونق جے پوری کے انوکھے استقبال کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لئے رفتہ رفتہ پنڈال میں آکر اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ رہے ہیں۔ ادھر اسٹیج پر کچھ شاعر (مقامی اور غیر مقامی) بھی آکر بیٹھ گئے ہیں۔

وہ دیکھئے اب تشریف لا رہے ہیں ایک ایسے شاعر جن کا ذکر جے پور کی گلیوں، کوچوں، کوچوں، چوراہوں، چوراہوں سڑکوں، سڑکوں، گھروں گھروں میں سننے کو ملتا ہے۔ بہت سی گھروں کا ذکر ادبی انجمنوں، شعری محفلوں، یونیورسٹی کے کمروں، ہوٹل یا چائے خانوں، پان کی دکانوں، اخبار کے دفتروں، ریلوے اسٹیشن تک پہلے فنِ مزاح غرض جے پور۔ اور بیرون جے پور۔ جہاں جہاں ان کی شاعری پہنچ پائی ہے۔ وہاں وہاں۔ ان کے نام کے غلغلے گشت ہو گئے

ہے ہیں۔ بے لوث خلوص کی اس سے اچھی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

تجویز صدارت ہو چکی ہے اور اب تائیدِ صدارت ہو رہی ہے۔ لیجئے وہ تشریف لا رہے ہیں صاحب صدر مسندِ صدارت پر۔ اور وہ منتظمین کی جانب سے ان کی گل پوشی کی جا رہی ہے۔ اب انتظار ہے رونقِ محفل۔ رونق جے پوری کا۔ لوگوں کی نگاہیں بار بار اس طرف اٹھ رہی ہیں جس طرف سے رونق جے پوری اسٹیج پر آنے والے ہیں۔ شاید وہاں کھڑے ہوئے کچھ لوگوں کے لبوں پر ماہر القادری مرحوم کا یہ مطلع گنگناتے ہوئے فرشِ راہ ہیں۔

اک دھوم مچی ہے کہ وہ گزریں گے ادھر سے
ایسے میں کہیں چوک نہ ہو جائے نظر سے

ادھر راہی شہابی بار بار رونق جے پوری کو اسٹیج پر پوری دھوم دھام۔ اور معاف کیجئے پورے اہتمام کے ساتھ لانے کا اہتمام فرما رہے ہیں۔

ع دنیا کھڑی ہوئی ہے ترے انتظار میں

مزید فرما رہے ہیں۔۔۔ "حضرات! وہ جناب رونق ابھی ابھی بس جلد آنے والے ہیں بالکل بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہونے والے ہیں۔ اور دیکھئے صاحبان۔ وہ جب اسٹیج کی طرف آئیں تو آپ سب پورے جوش و اہتمام سے ان کا استقبال کریں۔"

راہی شہابی نے بار بار جس طرح رونق جے پوری کو آواز دی ہے اس نے وہاں موجود لوگوں کے اشتیاق کو فزوں کر دیا ہے۔ اشتیاق اضطراب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ جس نے پیشِ نظر منتظمین کو رونق جے پوری کو نمودار ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ رونق صاحب کہاں سے آئے۔ یہ میں نہیں دیکھ پایا ہوں۔ ہاں ان کی آمد کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب اسٹیج پر شیپ کے ذریعے دھوم دھام کی آوازیں آئیں۔ آوازیں۔ نقاروں کی آوازیں۔ توپوں کی آوازیں۔ تالیوں کی آوازیں۔ گھنگھرو کی آوازیں۔ اور پھر کسی کی رعب دار آواز۔ نقیب کی آواز کی شکل میں۔ سنئے۔ با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔ صاحب دہر و ذوسمس ایشیا۔ جانشین راجپوتانہ۔ جلسے میں تولد ہو رہے ہیں۔۔۔" اور اب میں دیکھ رہا ہوں رونق جے پوری جے پور کی راجپوتانہ آن اور آزردہ شاعر کی محبوبانہ شان کے ساتھ اسٹیج کی جانب خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں۔ ان کے ارد گرد لوگوں کا ہجوم ہے۔ پنڈال میں بھی شائقین کھڑے ہو کر ان کا دیدار کر رہے ہیں۔ زربفت شیروانی ان کے جسم کو اس طرح چمکا رہی ہے جس طرح آسمان کو ستارے چمکا دیتے ہیں۔ سر پر پگڑی بندھی ہے۔ خالص راجستھانی پگڑی جو اب شہر کی فیشن پرست سوسائٹی میں کہیں کہیں اور کبھی کبھی کسی کے سر پر نظر آتی ہے۔ پاجامہ بالکل آج کی تقریب کے صدر کے پاجامے سے میل کھاتا ہوا۔ جوتے راجستھانی۔ لباس کی بھڑک اور رونق صاحب کے چہرے کی چمک نے ان کی شخصیت کو ہزاروں آنکھوں کا مرکز بنا دیا ہے۔

تیل۔ شاید سرسوں کا تیل پیا ہوا چہرہ۔ جو شیشم کی طرح چمکدار اور چکنا ہے۔ اس پر سجدہ کرتی ہوئی مونچھیں جن کے سرے قدرے غیر نازک ہونٹوں کے آس پاس اس طرح لٹکے ہوتے ہیں جیسے کسی نے دیوار پر دو جھالریں لٹکا دی ہوں۔ آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی، بالکل روزن نما اور سننے تالیوں کی گڑگڑاہٹ۔ جس میں راہی شہابی کی آواز دب کر رہ گئی ہے۔ راہی صاحب شاید ان شائقین سے کچھ درخواست کر رہے ہیں جنہوں نے آج کے نوشہ کو گھیر لیا ہے۔ ان سے درخواست کی جا رہی ہے کہ وہ انہیں اسٹیج کی طرف رواں دواں ہونے کا موقع دیں اور ان کے راستے میں حائل نہ ہوں۔

دیکھئے رونق صاحب کو راستہ دے دیا گیا ہے اور وہ تالیوں کا جواب ہاتھ اٹھا اٹھا کر دے رہے ہیں اور اسٹیج کی جانب پورے افتخار کے ساتھ چلے آ رہے ہیں۔ اب رونق اسٹیج کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ اسٹیج کے آگے شائقین کا ہجوم ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے رونق صاحب اسٹیج کے دائیں کنارے سے اوپر آنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کا حفاظتی دستہ جو ان کے ساتھ ہے انہیں اسٹیج کے اگلے حصے سے اسٹیج پر پہنچانا چاہتا ہے اس لئے اس طرف سے لوگوں کو ہٹایا جا رہا ہے۔ لوگ ہٹ چکے ہیں راستہ مل چکا ہے۔ ساری رکاوٹیں دور ہو چکی ہیں اور اب رونق صاحب سیدھے اسٹیج پر پہنچ چکے ہیں۔ اسٹیج پر بیٹھے سارے شعرا اور دوسرے حضرات کھڑے ہو گئے ہیں۔ بیشتر لوگوں کے ہاتھوں میں چھوٹے بڑے مختلف پھولوں کے ہار ہیں اور اب ہاروں کی بارش کر دی گئی ہے۔ رونق صاحب پر۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ لگاتار آتے ہوئے ہاروں اور ہار

ڈال کر واپس ہوتے جا رہے ہیں۔ لوگوں کی اس قدر بھیڑ ہے کہ فوٹو گرافر کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ اس بے مثال استقبال کی تصاویر کس طرح لیں۔ اور اب دیکھئے صاحب صدر جناب مسند سعادت سے اٹھتے ہیں ہاتھوں میں ایک لمبا سا ہار لئے رونق صاحب کے پاس پہنچ کر ان کے گلے میں ہار ڈال دیا ہے۔ کیمرے کا بٹن دبا ہے اور بے پور کی ان دو عظیم شخصیتوں کو کیمرہ میں نے بڑی جاں فشانی کے ساتھ کیمرے میں ایک ساتھ قید کر لیا ہے۔

سامعین شہباز اس منظر بے مثال پر بار بار خوشی کا اظہار کر رہے ہیں۔ اسٹیج پر موجود حضرات اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے ہیں۔ ساہی صاحب کے تمہیدیہ اعلان کے بعد نواب شیدائی اسٹیج پر آ گئے ہیں اور رونق جے پوری کو اکیس سو روپے کی رقم نذر کر رہے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں رونق صاحب کے چہرے پر خوشی ہی خوشی بکھری پڑی ہے۔ ایسی خوشی جو ایک حقدار کے حق پانے کے بعد اس کے چہرے پر نکھر جاتی ہے۔ اسی حالت میں موصوف مائیک کے قریب جا رہے ہیں پہلے سب کو سلام کر رہے ہیں۔ اور پھر گویا ہوئے ہیں "حضرات میں اپنے سارے رفیقوں، سارے محسنوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کی مدد فرمائے۔ شکریہ ادا کرنے کے بعد رونق صاحب نے اپنا کلام بھی سنانا شروع کر دیا ہے۔ سنئے آپ قطعہ پڑھ رہے ہیں"

جہاں کی ظلمتوں میں آج بھی تنویر ہے رونق
خدا کے فضل سے جانشین میر ہے رونق
زمانہ بھر کے پیچھے دل نے میرا کیا بگاڑ لیں گے
نہیں معلوم ہے جے پور میں کف گیر ہے رونق

قطعہ پر ہڑبونگ مچ گئی ہے۔ داد نے شور و غل کا انداز اختیار کر لیا ہے یہاں تک کہ صاحب صدر بھی گردن ہلا ہلا کر داد دیتے ہوئے رونق جے پوری کے جانشین میر ہونے کے دعوے کو اعتراف کر رہے ہیں۔ قطعہ کے بعد غزل کا مطلع پڑھا ہے

اندھیری رات میں ہم کھیل کر شکار چلے
لگے لگے نہ لگے ہم تو تیر مار چلے

معلوم ہوتا ہے رونق صاحب کی یہ غزل جے پور والوں نے بے حد سنی ہے اس لئے اکثر حضرات اس غزل کے مصرعے پہلے ہی سے دہرا رہے ہیں۔

مقطع پڑھنے کے بعد رونق صاحب بخیر و عافیت اپنی جگہ پہنچ چکے ہیں اور اب ساہی شہباز تھوڑی سی مزید تمہید کے بعد مشاعرے کا باقاعدہ آغاز کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے حسین کوثری صاحب سے کہا جا رہا ہے کہ وہ آج کی تقریب سے متعلق جو اشعار انہوں نے کہے ہیں وہ آ کر سنائیں۔ لیجئے مائیک پر آنے کے بعد حسین کوثری گویا ہوئے ہیں۔

جشن رونق ہے اور شام قہقہہ + لاؤ پی لیں ہم بھی جام قہقہہ
میں یہ سمجھا ہوں مددگار ہے + ورنہ ہے بے شک مقام قہقہہ
تاک میں رہتے ہیں ملنے کی سعی + اک بہانہ ہے یہ شام قہقہہ

باقی اشعار بھی اسی نوع کے ہیں جن پر داد بھی داد دی گئی ہے اور اب شام قہقہہ کو مزید رنگین بنانے کے لئے مائیک پر آ رہے ہیں مہمان شاعر چاند بدایونی۔ چونکہ آج کی تقریب کا مقصد فضاؤں میں قہقہہ بکھیرنا ہے اس لئے چاند بدایونی مائیک کے سامنے آتے ہی چاروں طرف گھوم گھوم کر آداب کر رہے ہیں۔ کبھی سینہ تان کر، کبھی سینے کو ہلکا سا خم دیکر۔ لوگ قہقہے لگا رہے ہیں۔ قہقہوں کا شور کم ہوا ہے تو چاند بدایونی نے فرمایا ہے "لیجئے حضرات آپ کی طرف چند قطعات پھینک رہا ہوں ہو سکے تو کیچ کر لیجئے گا" ایک آواز آ رہی ہے "آپ آؤٹ ہو جائیں گے" قہقہوں پر قہقہہ پڑا ہے۔ چاند بدایونی نے چاروں مصرعوں کی لگاتار کئی باؤنڈریاں مار کر فیلڈرس کو تھکا دیا ہے۔ چند باؤنڈریاں جو مختلف اسٹائل سے لگائی گئی ہیں۔

روز و شب خلوتوں میں روتا ہے
تخم امید دل میں بوتا ہے
سننی پڑتی ہیں پہلے صلواتیں
تب کہیں جا کے جشن ہوتا ہے

ہنس ہنس کے دل کا غم نہ مٹائیں تو کیا کریں
خالی شکم ہوا بھی نہ کھائیں تو کیا کریں
گیہوں کے بدلے کھیت میں اگنے لگے ہیں غم
ہم شام قہقہہ نہ منائیں تو کیا کریں

ابھی ابھی آپ حضرات نے رونق جے پوری کی آمد پر نقاروں توپوں اور اسی قسم کی دوسری آوازوں [illegible] کے ذریعے سنی

اور اب اسی ... سنئے چاند بدایونی کے اس مطلع پر۔

دھم دھما دھم ہوئی تڑ تڑ تڑ کے بعد
پیار میں گھونسے بھی کھائے چار چھ تھپڑ کے بعد

ان آوازوں پر لوگ ہلکے ہلکے قہقہہ لگا رہے ہیں۔ ہاں ان دو اشعار پر زوردار قہقہہ لگاتے ہیں۔

بول سارا کھل گئی واعظ نے جب ہنس کر کہا
چوتھا شوہر میں ہوں ان کا تیسرے دھکڑ کے بعد
ہو مناسب تو چلے آنا وہیں رہتا ہوں میں
تم جہاں رہتی ہو اس کے آخری ٹکڑ کے بعد
کوچۂ جاناں میں جاکر شیخ جی پائیں گے کیا
آئیں گے تارے نظر بھی ایک ہی ٹھوکر کے بعد

چاند بدایونی قہقہوں کو بکھیر کر واپس اپنی جگہ پر جا رہے ہیں اور وہ سنئے راہی شہابی آسمان کی باتیں کرتے کرتے زمین دھرتی کا ذکر کرنے لگے۔ لیکن ابھی تک وہ آسمانی چاند کو ... زمینی انجن کی دھک دھک اور چھک چھک سنوانے کیلئے فرماتے ہیں۔ حضرات ادبی ریل گاڑی کو کھینچنے کے لئے انجن کی ضرورت ہوتی ہے۔ ریل گاڑی کو چلانے کیلئے ہری اور لال جھنڈی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس انجن کا لقب ... ہری اور لال جھنڈی کا امتزاج ہے اور جو اپنی اداؤں سے اپنے اشعار کی رفتار کی وضاحت بھی کرنے میں ماہر ہے۔ میری مراد ہے انجن بیکانیری سے۔ وہ دیکھئے انجن صاحب سنہری اور لال پگڑی سر پہ باندھے، شیروانی پہنے ایک پر آئے ہیں۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی۔ عمر لگ بھگ ۶۰ سال، مگر ملازمت کی عمر کے لحاظ سے صرف ۴۷ سال کے۔ ہاتھ جوڑ کر سب کو آداب کیا ہے اور پھر۔ جو شروع ہوئے ہیں تو انھیں خود بھی اپنا ہوش نہیں رہا ہے۔ رباعی۔ قطعات اور غزل۔ سنائے چلے جا رہے ہیں۔ سنا کیا رہے ہیں۔ پھر الاپ کر تازہ دم ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے اس ... انداز نے انھیں تھکا دیا ہے اسی لئے مجمع میں سے ایک آواز آتی ہے۔ ارے انجن تو پٹری سے اتر گیا ہے۔ اسے تھوڑی دیر ... میں پہنچا دیجئے۔ اس پر راہی شہابی کہہ رہے ہیں۔ جی ہاں، ابھی پٹری سے اتر گئے ہیں۔ مگر گرنہ پانی مل گیا تو تھوڑی دیر میں تازہ دم ہو کر دوبارہ پٹری پر پوری رفتار سے چھوڑ دینی لگے۔۔۔

انجن بیکانیری اس قہقہہ کا ریل گاڑی کو توقع کی حدوں تک تیز رفتار نہ بنا سکے۔ اس لئے ہنسنے اور زور زور سے ہنسانے کے لئے راہی شہابی کی نظریں ایک سمجھدار اور خوب رو فیروز نامی بابا کا پچھاں پر جم گئی ہیں۔ اسی لئے وہ آواز دے رہے ہیں جمیل افغانی کو۔ جمیل افغانی نے اس تقریب کے لئے چند موضوعاتی اشعار کہے ہیں۔ جمیل اپنے وہ اشعار سنانے کیلئے پہلے تمہید کے طور پر ایک قطعہ سنا رہے ہیں۔ جس میں رونق بجے پوری اور افسر الشعراء کے القاب شاہین ایشیا اور عندلیب ایشیا کا استعمال بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ اور پھر ان دونوں ماہرین کا موازنہ کرتے ہوئے یہ اشعار سنانے شروع کئے ہیں سے

ایک مسند پہ ہیں بڑے استاد — ایک چھوٹے تو ایک بڑے استاد
اپنی اپنی غزل سنانے کو — ایک بیٹھے تو ایک کھڑے استاد
واقعہ سب بیان کرتے ہیں — جانے کس بات پر لڑے استاد
موسم برشگال میں جھڑتے — ایسی سردی میں کیوں جھڑے استاد
پھر جنوں کو رشک ہوتا ہے — آج پھر بام پہ چڑھے استاد
اہل پرواز چشم حیرت ہیں — آج بے بال و پر اڑے استاد
پیش دکھلائیں حضرت رونق — نسخہ لکھ دیں کوڑے کوڑے استاد
جشن رونق ہے جشن افسر کا — کہہ اٹھے یہ بڑے بڑے استاد
اک جگہ دیکھو دو ستاروں کو — جل رہے ہیں بڑے بڑے استاد
چھوٹے استاد بھی ہیں میرے جمیل — اور ہیں جان جاں بڑے استاد

جمیل اپنے داؤں پیچ کا مظاہرہ کرکے بیٹھے ہیں۔ اس سلسلے کو آگے بڑھانے کیلئے قمر منظر ٹونکی مائیک پر آئے ہیں اور دونوں اساتذہ جے پور کا موازنہ کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔

جلنے والے پھر رہے ہیں منہ چھپائے دربدر
آرہی ہے آج رونق دیکھئے رونق کے گھر

اسٹیج پر بیٹھے ایک صاحب فرما رہے ہیں کیا بیگم رونق روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی تھیں۔ خیر اگلا شعر سنئے۔ سے

جشن تو افسر کا ہونا تھا مگر یہ کیا ہوا
یہ بلا افسر کی تھی اور پڑ گئی رونق کے سر

اس کے بعد والے شعر میں ایک خاص استعارہ کیا گیا ہے جسے ...

صدر کے ساتھ ساتھ شعراء اور سامعین نے مجھ کر فضا بنا قہقہوں کی بارش کر دی ہے۔ سنئے۔

آج تو خرگوش نے ہاتھی سے بازی مار لی
کون ہارا، کون جیتا، دیکھ لو اسٹیج پر

اور اب اگلا شعر ـ

جشنِ رونق کی صدارت اور کریں آفت میاں
الاماں والاماں والحفیظ ز الحذر

طنز و مزاح کے اس امتزاج کے بعد جس پر کافی داد ملی۔ سامعین کو تڑپانے، مضطرب کرنے، سیماب صفت بنانے اور بے چین کر دینے کے لئے بے چین دھولپوری کو آواز دی جا رہی ہے۔ بے چین دھولپوری اپنے جسم بالسب سے محفل کو قہقہہ بدوش کرنے نہیں بلکہ اپنے اشعار سے گرویدہ کرنے کے لئے مائک پر آئے ہیں آتے ہی چاند بدایونی کی طرح فرمایا ہے "حضرات میں بھی ایک جھٹکا میدان میں پھینک رہا ہوں" ایک آواز آئی بھلے آپ کے اس جھٹکے سے گھر والے تو محفوظ رہیں گے" بے چین صاحب کے دو ایک جھٹکے آپ بھی ملاحظہ کیجئے۔ جن میں واقعی زور بھی ہے اور انھیں صحیح "اسٹروک" کے ساتھ لگایا گیا ہے۔

پہلے تو تھے ال بندہ اپنے کاندھوں پر سوار
بوجھ سے ٹوٹی کمر گردن پہ ہنسلی چڑھ گئی
پی رہے ہیں خون آزادی سے اب کالے فگور
حضرتِ بے چین کی پسلی پہ پسلی چڑھ گئی

نیرنگیٔ حیات کے قربان جائیے
ہر شے کو جس نے حاصل عبرت بنا دیا
عریانیت کی بخشدی عورت کو نعمتیں
فیشن پرست مرد کو عورت بنا دیا

بے چین دھولپوری نے جو ماحول بنا دیا ہے اسے قائم رکھنے یا اس میں مزید اضافہ کرنے کیلئے راہی شہابی نے "شاعر اعظم" فتنہ بھارتی کو اس ماحول میں فتنے جگانے کی دعوت دی ہے۔ دیکھئے وہ چلے آ رہے ہیں۔ حضرت فتنہ۔ چہرے پر فتنہ برپا کرتی ہوئیں مونچھیں اور فتنے جگاتے ہوئے اشعار۔ مگر اندازِ بیان ... خیر وہ فتنہ پرور مطلع سنئے پیش ہے۔

مجھ میں اور میرے شعروں میں بڑا فرق رہا ہے
سب کو مرا ہر شعر جو ایسا لگا ہے

اے دوست مرا شور زمانے سے جدا ہے
سب مرغ لڑاتے ہیں مرا بوم لڑا ہے

دوسرا مطلع سن کر آواز آئی ہے۔ بھائی نے بھائی کو خوب پہچانا ہے اس فتنے کے اثر کو بے اثر کر دینے کے لئے کسی ایسے وڈرم کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کوٹہ کے ایک ایسے وڈرم۔ ڈم ڈام کوٹوی کو راہی شہابی نے بے پور بلوا لیا ہے۔ ڈم ڈم نے قہقہوں کی آوازوں اور گڑگڑاہٹوں کو اپنے ساتھ ... سے اس محفل میں لاکر چھوڑ دیا ہے۔ ان آوازوں کی ایک صاف ستھری صورت آپ بھی دیکھئے ـ

بے وفا تو جو مجھ کو چھوڑ گیا + خوب جی بھر کے نیند آئی ہے
تو جو ہوتا تو جاگنا پڑتا + تجھ سے اچھی تری جدائی ہے

اور پھر بدرعی پرکاشش آئے ہیں اور اپنی سمجھداری کے مطابق محفل کو روشن کر کے اپنی جگہ واپس چلے گئے ہیں۔

اور اب آج کی محفل کے سب سے زیادہ مقبول شاعر جو سارے ہندوستان میں اپنی قد آور شخصیت کے علم گاڑ چکے ہیں۔ مائک پر آ رہے ہیں۔ ہلال رضوی رام پوری۔ رام پور کے کار آمد چاقو کی طرح اپنے اشعار سے نشتر زنی کر رہے ہیں۔ وہ بھی نشتر آپ بھی جھیل لیجئے ایک وہ نشتر وہ بھی ہیں جو اس محفل میں ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے ہوئے دو اساتذہ کے درمیان جا کر گرے ہیں۔ سنئے ـ

رہتے بھی تو کیا آبلہ پا گھر رہتے
مرعی کے نہ تھے کس لئے انڈے سہتے
یہ میلِ تبسم تھا کہ جشنِ رونق
جے پور میں ہم آ گئے بہتے بہتے

آمنے سامنے جب ہوتے ہیں یہ دو استاد
دیکھ کر ہوتے نہیں شاد، جلا کرتے ہیں
پہلے جلتے تھے زرے یار چراغوں سے چراغ
اب تو استاد سے استاد جلا کرتے ہیں

اور یہ قطعہ ـ

نہ حال و قال ہو جس میں وہ کیسا ہے قوالی
کسی کے عرس میں ہو حق نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہزار شاعرِ عرفاں بھی ہو تو کیا ہوگا ـ
مشاعرے میں جو رونق نہیں تو کچھ بھی نہیں،

ہاں رضوی اس محفل میں قہقہوں کے زعفران کھلا کر واپس چلے گئے ہیں۔ اتنی دیر میں انجن بیکار پڑا۔ تازہ دم ہو چکے ہیں بالکل اسی طرح جیسے لوکو میں کھڑے انجن کو پانی اور کوئلہ مل جائے تو وہ دوبارہ پٹڑیوں پر بھاگنے کیلئے بے چین ہو جاتا ہے ان کے مائیک پر پہنچتے ہی ایک آواز آتی ہے " ارے یہ ریٹائرڈ بلے باز دوبارہ بیٹنگ کرنے آ گئے "۔ لیکن انجن صاحب نے اسپیڈ پکڑ لی ہے۔ بالکل بمبئی کے لوکل ٹرین کے انجن کی طرح اور جھٹکے اور دھکا دینے والے انداز میں ایک بار پھر اشعار سنانے شروع کر دیئے ہیں۔ سنئے ؎

ہنستے ہنستے جان دیدی خندہ پیشانی کے ساتھ
مرنے والے اس طرح مرتے ہیں آسانی کے ساتھ
روتے روتے رات کاٹی رات کی رانی کے ساتھ
رات بھی کاٹی تو ہم نے کس پریشانی کے ساتھ
اپنی عقبیٰ یوں ڈبوئی ہم نے نادانی کے ساتھ
کھیلتے ہیں آپ ہولی خونِ انسانی کے ساتھ

چند اشعار اور سنانے کے بعد ایسا لگا کہ انجن صاحب کے لئے وہ آخری اسٹیشن آ چکا ہے۔ اس لئے وہ ایک جھٹکے کے ساتھ رکے ہیں اپنی دندناتی آواز کو خاموش کر کے اس ادبی اسٹیشن (اسٹیج) کے ایک غیر آباد حصہ میں جا کر بیٹھ گئے ہیں اور جیسے ادب کی اس محفل کو قہقہوں کی رونق سے آباد کرنے کیلئے برباد چوہدری کے لئے بچا ہوا وقت وقف کر گئے ہیں۔ برباد صاحب نے واقعی اس وقت سے فائدہ اٹھا کر محفل کو قہقہوں کا مرکز بنا دیا ہے۔ سنئے ؎

غریبی میں مزاجِ خسروانہ لے کے آیا ہوں
تمہارے واسطے جوتا پرانا لے کے آیا ہوں

اب عبداللہ خبر مائیک پر تشریف لائے ہیں اور بے خبر فرما رہے ہیں۔ " حضرات آپ سب جانتے ہی ہیں کہ افسر الشعراء کے پاس اپنے شاگردوں کے ناموں کی فہرست کا جو رجسٹر ہے اسے وہ اس لئے جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں کہ اس میں دنیائے شاعری کے مشہور و معروف شاعروں کے نام شاگرد کی حیثیت سے درج ہیں۔ یہ بات ہمارے رونق جے پوری صاحب کو قطعی پسند نہیں ہے اسی لئے وہ افسر الشعراء کے رجسٹر کے جانی دشمن بن گئے ہیں جسے افسر الشعراء جان سے عزیز رکھتے ہیں۔ میں جو نظم سنا رہا ہوں اس میں اس رجسٹر کو مرکزی خیال بنا کر دونوں اساتذہ کی کھینچ تان کا نقشہ آپ لوگوں کو نظر آئے گا۔ سنئے ؎

حضرتِ افسر کے گھر رونق مثالِ خر گیا
اور رجسٹر شاعروں کے نام کا وہ چر گیا
لیتے دیکھی جب افسر نے زندگی بھر کی کمائی
یوں کہا واویلا ہائے لٹ گیا میں مر گیا
دوڑو لوگو پکڑو اس کمبخت کے ڈالو لگام
بچ کے نظروں سے مری یہ کام اپنا کر گیا
جان سے ماروں گا میں تو آج اس مردود کو
میری استادی کا دفتر یہ ہڑپ کیوں کر گیا
سنتے ہی نواب، راہی اور نذیر امجد میاں
آئے سمجھانے تو پھر استاد کا دل بھر گیا
ہڈی پسلی ایک کر دیتا ابھی اس کی تو میں
آپ کے کہنے سے سننے سے رعایت کر گیا
اے خبر یہ قصہ جھگڑا ختم آخر یوں ہوا
جان کو اپنی بچا کر پھر تو رونق گھر گیا
چلتے چلتے پھر بھی رونق کہہ گیا استاد سے
کر گیا ہو کر گیا ہاں، کر گیا ہاں کر گیا

عبداللہ خبر کے اس واقعاتی نظم کو سن کر لوگوں کا برا حال ہے اور معلوم ہو رہا ہے کہ جشنِ قہقہہ کا اصل لطف اب آیا ہے۔

بہر حال خبر صاحب کے بعد اب داماد جے پوری کو آواز دی گئی ہے۔ راہی شہابی ان کا تعارف کراتے ہوئے فرما رہے ہیں کہ " یہ حضرت جن کے داماد ہیں ان کے ہیں ہمارے نہیں ہیں " داماد کا مذاق نہ اڑایئے۔ آخر میں داماد ہوں۔ جس کی عزت کرنا سب کا فرض ہے۔ اس نوجوان سے شاعر نے غزل کا مطلع پڑھا ہے۔

پڑوسن سے محبت آپ کی دیکھی نہیں جاتی
رقابت میں کسی کی دوستی دیکھی نہیں جاتی

مطلع پر واجبی قہقہہ نما داد ملی ہے لوگ ہنسنے کے موڈ میں ہیں احمد اللہ صاحب یوں گویا ہیں۔

سنا ہے ہر سنیچر کو دیا کرتے ہیں وہ درشن

کسی سے روز صورت بھونڈی سی دیکھی نہیں جاتی
قصائی کا پڑوسی ہوں مگر کمزور دل بھی ہوں
کہ مجھ سے کوئی شے کٹتی ہوئی دیکھی نہیں جاتی
اُچک لیتا ہوں گٹھری سے میں اکثر چار چھ بینگن
کسی مالن کے سر پر ٹوکری دیکھی نہیں جاتی

داماد صاحب نے چند قہقہوں کو گرفت میں لانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مگر عبداللہ فخری کی واقعاتی نظم کے اثرات اب تک سامعین کے دل و دماغ پر ہیں اس لئے داماد بجنوری کی غزل کے اشعار پر قہقہوں کے دھماکے اس انداز سے نہیں ہوئے جس طرح عبداللہ فخری کی نظم نے قہقہوں کی بمباری کر دی تھی۔ پھر بھی داماد پسند کئے گئے ہیں۔ اور ان کی انتہا پر سامعین نے داماد ہونے کے ناطے ان کی عزت رکھ لی ہے۔

ادھر سامعین کا مجمع بھی اکھڑتا جا رہا ہے۔ شعرا بھی اسٹیج سے غائب ہو رہے ہیں۔ اس لئے راہی شہابی نے صدر مشاعرہ کے کلام بلاغت نظام سے زیادہ سے زیادہ سامعین کو مستفید کرنے کے لئے افسر الشعراء شیخ محمد خاں نشتر بجنوری کو آواز دی ہے۔ افسر صاحب خاقانیٔ ہند کے جانشین کی شکل میں پوری سج دھج کے ساتھ مائک پر آئے ہیں اور گویا ہوئے ہیں۔

دنیا کا عجب طرفہ تماشا دیکھا
اک حال پہ قائم نہیں ماشا دیکھا
جب نظروں میں جا کے انھیں ہم نے اثر
تولا کبھی پایا تو کبھی ماشا دیکھا

اور اس طرح یہ قہقہہ بردوش محفل کا اختتام ہوا۔ اور اب وہ سامعین جو تھوڑی بہت سنجیدہ شاعری سننے آئے بھی ہیں پنڈال میں بیٹھے رہ گئے ہیں اور راہی شہابی انتہائی سنجیدگی کے ساتھ یکے بعد دیگرے چند سنجیدہ شعرا سے کلام سنوا رہے ہیں۔

اس وقت رات کے ۲½ بج چکے ہیں۔ میں بھی آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

ع زندگی ہے تو پھر ملیں گے کبھی۔

خدا حافظ ●●●

غزل

اختر شاہجہانپوری

اپنا بھی اس گھڑی تو پرایا دکھائی دے
جب زندگی پہ موت کا سایہ دکھائی دے

گو بھیڑ میں کھڑا ہے ہر اک شخص آج کل
لیکن خود اپنے آپ کو تنہا دکھائی دے

یہ دور وہ ہے رام نے کلجگ جسے کہا
اس دور میں تو ہنس بھی کوا دکھائی دے

دل کا بھی آئینہ ہے عجب آئینہ کہ جو
دھندلا دکھائی دے کبھی اُجلا دکھائی دے

اے کاش زندگی میں اک ایسا بھی وقت آئے
ہر رہگزر پہ مجھ کو اُجالا دکھائی دے

کس سے کریں شکایتِ تشنہ لبی کہ آج
ساقی کا میکدہ بھی پیاسا دکھائی دے

ناواقفِ نشیب و فرازِ حیات بھی
کیا کیجئے جو آج مسیحا دکھائی دے

اختر مشاعرے میں پڑھو آج وہ غزل
فنکر کہن کا رنگ بدلتا دکھائی دے

احترامِ محبت

نائیڈو اے ہلال (سناود)

زمانے کے لب پہ ہے نام محبت
ہر اک بن رہا ہے امام محبت

محبت یہی ہے تو پھر اہلِ دنیا
سمجھ لیں کہ کیا ہے مقام محبت

زمانے کی ہنگامہ آرائیوں سے
نہ برباد ہوگا نظام محبت

بشر کو بچا لیگا گمراہیوں سے
خضرِ وقت کا ہے پیام محبت

زمانے کی گردش تو کیا تا ابد تک
نہ ہوگا کبھی اختتام محبت

حقیقی محبت پہ گر حرف آیا
نہ لاؤں گا لب پہ کلام محبت

قدم راہِ اُلفت میں رکھنے سے پہلے
سمجھ لو ہلالؔ احترام محبت

غزل پہ داد و تحسین کی بارش کر رہے ہیں۔ جن کا ایک شعر یہ ہے۔ سہ

کیا ناز محبت تجدید تعلق کر کے
کل جو بیگانے تھے وہ آج بھی بیگانے ہیں

اب جناب تنویر باقری سنبھلی مائک پہ تشریف لائے ہیں
انہوں نے مختلف اشعار سنائے ایک شعر آپ بھی سنئے سہ

برس رہے ہیں جو پتھر مری حویلی پہ
یہ سب لکھے تھے مری ہاتھ کی ہتھیلی پہ

پھر ایک دلچسپ لطیفہ سنانے کے بعد اناؤنسر نے جناب حسن فتحپوری کو مائک پر آنے کی زحمت دی ہے۔ حسن فتحپوری فرما رہے ہیں سہ

جو پچھلی رات کی تنہائیوں میں روتا ہے
وہ ایک شخص مرا راز داں لگے ہے مجھے
خدا ہی جانے گلستاں کا حال کیا ہوگا
کہ خوشہ چین بھی یہاں باغباں لگے ہیں مجھے

حسن فتح پوری کو سکون سے سنا گیا ہے۔ اناؤنسر صاحب نے پھر ایک لطیفہ سنانے کے بعد بیتاب صاحب سے درخواست کی ہے۔ جناب ایس۔ ایم۔ سعید بیتاب کا ایک شعر پیش ہے۔

آئینہ دیکھتے ہی محبت کے جوش میں
اپنی ادا ادا سے وہ خود ہی لپٹ گئے

اس شعر پہ سامعین نے موزوں داد دی ہے اور پھر لطیفہ سنانے کے بعد جناب ثقلین نے جناب اقبال دانش کو مائک پر آنے کی دعوت دی ہے۔ دانش فرما رہے ہیں سہ

کوئی سنی نہیں سکتا سوالوں کے شہر میں
خالی تھے ہاتھ مانگنے والوں کے شہر میں
تاریکیوں نے بڑھ کے سہارا دیا مجھے
جس وقت لٹ رہا تھا اُجالوں کے شہر میں

غزل پر دانش صاحب نے خوب خوب داد پانے کے بعد سامعین کی فرمائش پر ایک گیت سنایا۔ گیت کے ایک ایک بند پر پھر پور داد ملی ہے۔

ایک اور دلچسپ لطیفے کے بعد اناؤنسر صاحب نے جناب خان رزیوانی کو مائیک پر آنے کی دعوت دی ہے۔ خان نغمہ سرا ہیں سہ

جب مرے شہر میں آتے ہیں ترے شہر کے لوگ
یاد تیری ہی دلاتے ہیں ترے شہر کے لوگ
ایک میں ہوں مجھے پانی نہیں دیتا کوئی
سانپ کو دودھ پلاتے ہیں ترے شہر کے لوگ

نہایت مناسب داد پانے کے بعد جناب خان رزیوانی اپنی جگہ تشریف لے گئے ہیں۔ اور ایک پنجابی لطیفہ سنانے کے بعد جناب ثقلین حیدر نے دہلی سے آئے ہوئے شاعر جناب نظر ایٹوی کو کلام سنانے کی گزارش کی ہے۔ نظر صاحب غزل سرا ہیں سہ

جگنو کی طرح آنسو دامن پہ چمکتے ہیں
ہوتی ہے جب آنکھوں سے برسات اندھیرے میں
اظہار تمنا پر چپ کیوں ہو زباں کھولو
ابھی نہیں کٹتی ہے یہ رات اندھیرے میں
برباد اچانک یوں امیدیں ہوئیں اپنی
جیسے کوئی لٹ جائے بارات اندھیرے میں

جناب نظر ایٹوی کو بھرپور داد سے نوازا گیا ہے۔ ترنم کی نغمگیت سامعین کے دلوں میں چٹکیاں لے رہی ہے۔ اختتام غزل کے بعد مزید غزل سننے کی فرمائش کی جا رہی ہے۔ مگر ثقلین حیدر نے فرمایا کہ نظر صاحب نے اندھیرے میں مزے لوٹے ہیں۔ اُن سے آپ بھی لطف اندوز ہوئے۔ اب ابرار الہ آبادی سے کلام سنئے ابرار صاحب فرما رہے ہیں سہ

یہ دیکھا اس شہر پہ آنچ نہ آنے پائے
تم ہنس کے جلا دو مرا گھر کچھ نہ کہوں گا

اس وقت پورا پنڈال تاریکیوں کے آغوش میں چلا گیا ہے کیونکہ بجلی فیل ہو گئی ہے۔ مگر منتظمین نے جنریٹر کا بھی انتظام کر رکھا ہے لہٰذا چند ہی منٹ میں اسٹیج پہ پھر روشنی جگمگانے لگی ہے۔ اب حنیف پرواز اپنی غزل پیش کر رہے ہیں سہ

ہماری زیست کا کیا ہے رہی رہی نہ رہی
تمہارا حسن رہے تم رہو دلدار رہے
خدا کرے کہ کبھی زندگی کے گلشن میں
خزاں نہ آئے سدا موسم بہار رہے

ترنم پر دلکش آواز اور اچھے اشعار کے باعث خوب خوب داد پاتے ہوئے قاتلانہ انداز میں اپنی جگہ تشریف لے گئے ہیں۔

[illegible]

پر وجد طاری ہوگیا ہے کہ حیرت سامعین ایسی محویت سے گیت سن رہے ہیں کہ پتہ نہیں چلا کب گیت ختم کر کے راہی اپنی جگہ جاکر واپس چلے گئے مگر سامعین کی طرف سے ایک اور ایک اور کا نعرہ بلند ہو رہے ہیں اور جب تک اناؤنسر صاحب نے راہی بستوی کو دوبارہ مائیک پر نہ بلایا یہ شور و شغب کم نہ ہوا۔ راہی صاحب اسی مدھو بھری آواز میں دوسرا گیت شروع کر رہے ہیں۔ سامعین نے بڑے انہماک سے راہی صاحب کو سنا اور کافی داد دی۔ راہی صاحب نے [illegible] آواز میں خوب خوب داد وصول کی ہے۔ لیجئے اب ادا کانپوری کو اناؤنسر صاحب نے دعوتِ سخن دی ہے اور محترمہ ادا کانپوری مائک پر فرما رہی ہیں ؎

وہ مجھ کو بھول گئے غیر کوئی بات نہیں
کہاں [illegible] دل ان کے بھول جانے کو

داد کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا ہے اور نہایت ہی سحر آفریں آواز میں ادا صاحبہ نے دوسرا شعر پیش کیا ہے۔ ؎

بہت دنوں سے تمنا ہے اے بہارِ چمن
نواز دے کبھی میرے غریب خانے کو

غزل مکمل کر کے ادا صاحبہ اپنی جگہ تشریف لے جانے لگیں مگر سامعین کی پُر زور فرمائش اور بانیٔ مشاعرہ کی فرمائش پر ادا صاحبہ دوبارہ مائک پر تشریف لائیں اور دوسری غزل مترنم آواز میں پڑھنا شروع کی ہے ؎

آج کہہ دیا خود ہی ساقیٔ بہاماں نے
میکدہ محبت کا میکشوں سے خالی ہے
ہر گناہِ غم سے اب دل نجات پائے گا
مستیوں کی اک جنت ہم نے بھی بنائی ہے

بھرپور داد پانے کے بعد ادا کانپوری اپنی جگہ چلی گئی ہیں اور جناب ثقلین حیدر نے ایک عجیب و غریب لطیفے کے بعد [illegible] آئے ہوئے جناب نور اندوری کو مائک پر آنے کی دعوت دی ہے اور نور صاحب فرماتے ہیں ؎

راہ میں تھک کے جو چور ہو جائے گا
منزلوں سے بہت دور ہو جائے گا
اس قدر غور سے دیکھئے گا تو پھر
آئینہ اور مغرور ہو جائے گا

نور صاحب سے متواتر کئی غزلیں سنی گئی ہیں۔ اور سامعین جی بھر کر داد دی گئی ہے۔ اب جناب مولانا قمر شاہجہانپوری سے کلام عنایت فرمانے کی استدعا کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کسی کی یاد میں جب ہم قلم اٹھاتے ہیں
تمام رات ستارے غزل سناتے ہیں
سمندروں کا بھی احسان اب نہیں پائند
غبار اٹھتا ہے اور شہر ڈوب جاتے ہیں

اچھی خاصی داد پانے کے بعد مولانا قمر شاہجہانپوری اپنی جگہ واپس تشریف لے گئے ہیں۔ چونکہ حاجت ضروری سے فارغ ہو کر جناب طاہر فراز ڈائس پر آگئے ہیں اس لئے اناؤنسر نے انہیں مائک پر آنے کی دعوت دی ہے۔ جناب طاہر فراز غزل سرا ہیں۔ مطلع پر ہی اکتفا فرمایئے ؎

گھر کے سناٹے سے آواز کی خوشبو نکلے
در و دیوار کے پردوں سے اگر تو نکلے

جناب طاہر فراز کو مناسب داد سے نوازا گیا۔ اناؤنسر صاحب فرما رہے ہیں کہ اب مشاعروں کے بادشاہ کو پیش کیا جا رہا ہے جسے تمنا جمالی کہتے ہیں۔ تمنا صاحب فرما رہے ہیں۔ چار مصرعے ملاحظہ ہوں ؎

اس حسنِ مکمل کی اللہ رے انگڑائیاں
ہے پیشِ نظر اب تک وہ عالمِ رعنائی
یادوں کے دریچوں سے میں دیکھتا رہتا ہوں
کب سو کے وہ اٹھتے ہیں کب لیتے ہیں انگڑائی

اس قطعہ پر داد کے شور سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی ہے۔ تمنا صاحب نے غزل شروع کی ہے ارشاد ہوا ہے۔

---

[1] پروفیسر امیر اللہ خاں صاحب راہی صاحب کا ڈاکٹری معاینہ کرایئے کیونکہ ان کے منہ سے [illegible] کے انداز میں مختلف قسم کے گیت [illegible] (اڈیٹر) [2] [illegible] شاعرہ [illegible] باذوق حلقوں [illegible] [3] [illegible] اناؤنسر صاحب [illegible] بادشاہ [illegible] (اڈیٹر)

چوہری صاحب ارشاد فرما رہے ہیں سے

دنیا میں بس خوشی کی ہمیں جستجو رہی
جب وہ ملی تو ہوش نے انکار کر دیا

غزل کا مناسب داد پانے کے بعد ایک نظم سنائی ہے۔ جو پسند کی گئی ... مشاعرے کے سرپرست علامہ حسن ریوانی کو زحمت غزل سرائی دی جا رہی ہے حسن صاحب نے پہلے یہ رباعی عطا فرمائی ہے سے

مانا کہ رئیسوں میں امیروں میں نہیں
... کے چلائے ہوئے تیروں میں نہیں
... راہ الگ اپنی بنا لیتے ہیں
ہم لوگ لکیروں کے فقیروں میں نہیں

رباعی پر سامعین نے کافی داد دی ہے اس کے بعد حسن صاحب نے اردو پر ایک نظم پیش کی جو بہ ... پسند کیا گیا اور ایک ایک بند کو کئی کئی مرتبہ پڑھوایا گیا۔ اب ... قیوم ناشاد فیض آبادی مائک پہ تشریف لائے ہیں اور ناشاد صاحب فرما رہے ہیں سے

مسئلہ یہ نہیں تم کتنا بدل سکتے ہو
پوچھنا یہ ہے مرے دل سے نکل سکتے ہو
یاد کرتے ہیں ابھی تک تمہیں ٹوٹے رشتے
تم پلٹ آنا اگر لوٹ کے چل سکتے ہو

ناشاد صاحب کو بھی داد اچھی ملی ہے۔ اب ناشاد صاحب ہندی کے دوہے سنا رہے ہیں۔ ہر مکتب خیال کے لوگوں نے ناشاد صاحب کو کافی سراہا اور وہ شاد کام اپنی جگہ تشریف لے گئے ہیں۔ جناب ناشاد فیض آبادی کے بعد اناؤنسر صاحب نے حضرت علامہ اسیر مچھلی شہری کو جو جناب حق کانپوری کے استاد محترم ہیں۔ انتہائی ادب کے ساتھ مائک پر آنے کی دعوت دی ہے۔ اسیر صاحب فرما رہے ہیں سے

زندہ ہوں مگر زیست گوارا تو نہیں ہے
پینے کے علاوہ کوئی چارا تو نہیں ہے
ساغر سے عطا ہو کہ نگاہوں سے پلاؤ
میخانہ تمہارا ہے ہمارا تو نہیں ہے

داد کا وہ شور بلند ہوا ہے کہ الامان والحفیظ۔ اسیر صاحب کو انتہائی ادب و احترام سے سنا اور داد سے نوازا گیا ہے۔ اسیر صاحب سے غزل کی فرمائش کی گئی ہے لیکن اسیر صاحب نے متعدد قطعات پڑھنے کے بعد سفر کی تھکان کے پیش نظر معذرت طلب کر لی۔

اب جناب ثقلین حیدر صدر محترم جناب ڈی مائین۔ آپ بہت ملنسار ہیں کر کلام عنایت فرماتیں۔ صدر محترم نے مختلف اشعار سنائے ہیں ایک شعر آپ بھی سن لیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے سے

بات ہے صاف دلیلوں کی ضرورت کیا ہے
دو قدم چل کے بتا دو کہ قیامت کیا ہے

اس وقت رات کے ساڑھے چار بج رہے ہیں اور مشاعرے کا پہلا دور ختم ہوا ہے۔ پچیس تیس ہزار کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا مجمع دوسرے دور کے لئے بضد ہے اس لئے اناؤنسر صاحب نے چیدہ چیدہ شعراء دوبارہ سنوایا ہے۔ صبح کاذب کی سپیدی کرن کے ساتھ ساتھ فجر کی اذان ہو رہی ہے۔ اس لئے صدر محترم کی اجازت سے اناؤنسر صاحب نے مشاعرہ ختم ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔

سرزمین ریوا پہ ایسے مشہور شعرا کرام کا اجتماع آج تک نہیں ہوا تھا اس لئے جشن حق کے اس تاریخی مشاعرے کو فوقیت حاصل رہی۔

پروفیسر امیر اللہ خان (صدر بزم حسن ریوا مدھیہ پردیش)

غزل
کریم بیاوری

نئی امنگیں نئی ترنگیں نئے زمانے وہ ساتھ لائے
بہاریں آئیں ہیں گل کھلے ہیں اور فلک پہ تارے بھی مسکرائے

غضب ہے میرے ہی آشیاں کو تکے ہی جاتا ہے چرخ ظالم
ابھی تو گذرے ہیں چار دن ہی چمن میں برق ستم گرائے

یہ ہم نے مانا کہ غم کا کھانا ہے ریت ہم عاشقوں کی لیکن
برس ہی پڑتے ہیں اشک اپنے کہاں تلک انکو کوئی چھپائے

کریم کیف و سرور چھایا فضا معطر زمانہ ہے خود
یہ دامن ضبط چھٹ رہا ہے وہ کس بہانے نظر میں آئے

انکشافات ہی انکشافات

وجے لکشمی پنڈت کی سوانح حیات کی چند جھلکیاں

مہاتما گاندھی کی پہلی کارکن۔ پنڈت موتی لعل نہرو کی بیٹی۔ جواہر لعل نہرو کی بہن اور مسز اندرا گاندھی کی پھوپھی سروپ کماری (وجے لکشمی پنڈت) نے اپنی یادداشتیں اور احوال زندگی "دی سکوپ آف ہیپی نس" کے عنوان سے قلم بند کی ہیں۔ اس داستان کے کئی کردار برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کے کردار ہیں۔ مسز وجے لکشمی پنڈت نے مختلف کرداروں اور واقعات کو قریب سے دیکھا۔ ان کے بارے میں ایک تاثر قائم کیا اور اسے الفاظ کا روپ دیدیا۔

اس داستان کے بعض اقتباسات قارئین شانِ ہند کی معلومات کیلئے اختصار کے ساتھ درج کئے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

نہرو خاندان ایک برہمن خاندان ہے جس کا تعلق کشمیر سے ہے اس خاندان کے افراد کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خود کو نئے حالات کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ مگر اپنے بعض رسم و رواج کبھی ترک نہیں کرتے

میرا دادا پنڈت گنگا دھر نہرو آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے دربار میں محکمہ پولیس کا سربراہ تھا۔ میری دادی فارسی میں خاصی شدبد رکھتی تھیں اور گفتگو میں فارسی اشعار استعمال کرتی تھیں۔ میرے دادا جوانی میں فوت ہوگئے۔ اس وقت میرے والد موتی لعل نہرو ابھی کمسن تھے چنانچہ ان کی پرورش ان کے بڑے بھائی نند لعل نہرو نے کی۔ والد نے ابتدائی تعلیم مدرسہ میں حاصل کی۔ بعد ازاں وہ ایک مشن سکول میں زیر تعلیم رہے۔ اور پھر الٰہ آباد یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی لیکن انہوں نے بی اے کی ڈگری حاصل کئے بغیر ہی یونیورسٹی چھوڑ دی۔ وہ کرکٹ اور ٹینس کے شوقین تھے۔ اگرچہ ان کی مادری زبان تھی فارسی ان کی پسندیدہ زبان تھی۔

نہرو خاندان کے افراد کی افتادِ طبع یہ ہے کہ وہ جلد ناراض ہوتے اور جلد مان جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے آبا و اجداد میں سے ایک بزرگ مانسا رام نہرو کو اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی اور وہ اسے میکے جانے کی اجازت نہیں دیتے تھے ایک بار انہیں کسی کام کے سلسلے میں باہر جانا پڑا تو ان کی بیوی نے والدین سے ملنے کے لئے یہ غنیمت جانا مگر شوہر توقع سے پہلے گھر آگیا۔ بیوی کو گھر میں موجود نہ پاکر سیخ پا ہوگیا۔ سسرال میں بیوی کو پیغام بھیجا کہ جلد واپس نہ آئی تو دوسری شادی کر لوں گا۔ بیوی نے بھی نخرہ دکھایا۔ شوہر نے کشمیر جاکر ایک عورت سے شادی کرلی جب نئی بیوی کے ساتھ گھر آیا تو پہلی بیوی بھی پہنچ چکی تھی اسے دیکھتے ہی سارا غصہ جاتا رہا اور صلح ہوگئی۔ نئی بیوی کے انجام کے بارے میں خاندانی ریکارڈ خاموش ہے۔

میری ماں پنجاب میں آباد ایک گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ والد ایک روشن خیال انسان اور مغربی اطوار کے دلدادہ اور ممتاز وکیل تھے۔ وہ بہترین لباس پہنتے، بہترین گھر میں رہتے۔ ہر معاملہ میں ان کو بہترین چیزوں سے لگاؤ تھا۔ مگر ماں قدامت پسند برہمن تھیں۔ ان کی شادی چودہ سال کی عمر میں ہوگئی تھی۔ وہ باقاعدگی سے پوجا پاٹ کرتیں، برہمنوں کو کھانا کھلاتیں مختلف مواقع پر گنگا میں اشنان کرتیں، وہ انگریزی سمجھ لیتی تھیں۔ لیکن بولتی نہیں تھیں وہ اپنے شوہر کی پوجا کرتیں اور ان کی تمام تر توجہ گھر پر مرکوز رہتی میرے والدین مکمل طور پر ایک دوسرے کی ضد تھے۔ البتہ ان کے بچے مشترک تھے۔ لیکن میں ہمیشہ باپ کی بیٹی کہلاتی تھی۔

الٰہ آباد میں ہمارا گھر عملاً دو حصوں میں تقسیم تھا۔ ایک حصہ ہندوستانی تھا، دوسرا یورپی، کمرہ استقبالیہ، کھانے کا کمرہ اور والد کا دفتر مغربی طرز کا تھا۔ مغربی طرز کی تمام دعوتیں اسی حصے میں ہوتی تھیں۔

دوسرا حصہ خالص ہندوستانی تھا اس حصہ میں ماں کی حکمرانی تھی۔ ہمارے گھر کا تمام انتظام منشی مبارک علی کے سپرد تھا، ان کا خاندان غدر میں تباہ ہوکر الٰہ آباد آیا تھا۔ منشی مبارک علی گویا عمومی نگران اور منتظم تھا۔ گھر کا مغربی طرز کا حصہ اس سمتہ کے چارج میں تھا اور اس کے تحت

سلہ بشکریہ "چٹان"

ہندو، عیسائی اور مسلمان نوکروں کی ایک فوج تھی جو جاری کیا جیتی" اس محلہ میں خصوصیت اہمیت رکھتی تھی۔

انگریزوں کے ساتھ میرے والد کے مراسم بہت اچھے تھے انگریز ان کے گہرے دوست تھے۔ صوبہ کے کئی گورنروں کے ساتھ ان کا یارانہ رہا انگریز ہمارے یہاں دعوتوں میں اکثر شریک ہوتے انگریز بچے تو آئے روز ہمارے یہاں موجود ہوتے تھے۔

۱۹۱۶ء میں بھائی (جواہر لعل نہرو) کی شادی کا منظر ابھی تک میرے ذہن میں موجود ہے۔ والد صاحب نے تجوریوں کے منہ کھول دیئے تھے سنار کی دوکان آنند بھون کے اندر کھولی گئی تاکہ تمام زیورات والد صاحب کی نگرانی میں ان کی مرضی کے مطابق تیار ہوں دنیا جہان سے بڑھیا سے بڑھیا چیزیں خریدی گئیں۔ شادی کے بعد ہفتوں پُرتکلف اور شاندار دعوتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پورے صوبہ میں ایک بھی ایسا شخص باقی نہیں جس نے دعوت میں شرکت نہ کی ہو۔ خاص مہمانوں کی تفریح کیلئے الہ آباد سے دہلی اور دہلی سے واپس الہ آباد تک ایک ریل گاڑی ریزرو کرائی گئی۔

میں نے ۱۹۱۶ء میں کانگریس کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں بھی شرکت کی، اس سال مسلم لیگ کا اجلاس بھی انہی دنوں میں وہیں منعقد ہو رہا تھا۔ اور حکومت خود اختیاری کے سلسلے میں ایک معاہدہ ہوا تھا۔ پرتمکنت اور روشن طبع، دور اندیش محمد علی جناح مسلم ہندو اتحاد کے سفیر قرار پائے۔

اسی دور میں ایک نوجوان سید حسین میرے دل کو بھانے لگے تھے۔ میرے والد نے اپنے اخبار "انڈی پنڈنٹ" کا ایڈیٹر مقرر کیا تھا۔ اس زمانے میں ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں جاری تھیں، ہمارے مسلمانوں کے ساتھ بھی تعلقات تھے۔ خیال یہ تھا کہ مجھے دوسرے مذہب کے نوجوان کے ساتھ شادی کرنے میں دقت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن یہ بات صحیح نہ تھی۔ شادی بیاہ کے معاملات میں ہمارے گھرانے کی روایت پسندی آڑے آئی۔ میری ماں کا خیال تھا کہ ایک مسلمان کے ساتھ شادی کا ارادہ میری آزاد خیالی کا نتیجہ ہے اور اس آزاد خیالی کا سبب مغربی تعلیم ہے چنانچہ میری اصلاح کے لئے کچھ روز کے لئے مجھے گاندھی جی آشرم میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ آشرم میں رہنے والے لوگ سارا کام خود کرتے تھے اور سادہ زندگی گزارتے تھے۔

مہاتما گاندھی جنوبی افریقہ سے واپس آنے کے بعد بہار اور گجرات میں زراعت سے متعلق تحریکوں میں حصہ لے رہے تھے۔ رولٹ ایکٹ منظور ہوا تو انہوں نے ستیہ گرہ کا فیصلہ کیا۔ مجھے یاد ہے جب مہاتما گاندھی پہلی بار آنند بھون میں مہمان ہو کر آئے تو گھر کا عجیب منظر تھا پورے گھر میں کوئی کمرہ ایسا نہ تھا جس میں شاندار اور قیمتی فرنیچر نہ ہو جو گراں بہا قالینوں اور ساز و سامان سے آراستہ نہ ہو گاندھی جی کو ٹھہرانے کے لئے والدہ کا کمرہ منتخب کیا گیا اس کمرے میں تخت بچھا کر ہندوستانی ماحول پیدا کیا گیا۔

گاندھی آشرم میں قیام کے دوران کے کئی واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں، ان میں سے ایک واقعہ بطور خاص قابل ذکر ہے۔ آشرم میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے ہی رہتے تھے ایک خوبصورت نوجوان لڑکی اور لڑکے میں محبت ہو گئی اور وہ دونوں وہ سب کچھ کر گزرے جو جوش جوانی میں کیا جاتا ہے مجھے یہ تو یاد نہیں رہا کہ لڑکے کے ساتھ کیا سلوک ہوا لیکن مہاتما جی نے خوبصورت لڑکی کے لمبے اور دلکش بال کاٹ دینے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ گویا یہ اس کے گناہ کی سزا تھی۔ مہاتما نے اس گناہ کے کفارہ کے طور پر کئی دن کا برت رکھا۔

مہاتما ایک لحاظ سے مجموعہ تضادات تھے۔ وہ مہربان اور شفیق لیکن دوسری طرف انتہا پسند تھے اور بعض امور کو اخلاقی امور قرار دے کر ایسا رویہ اختیار کرتے جس میں کوئی لچک نہیں ہوتی تھی، وہ نوجوان بیاہے جوڑوں کو یہ تلقین کرتے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب نہ جائیں اس لئے ان کے پیروکاروں میں مایوسی پھیلتی۔ ان کا یہ فلسفہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

صرف ایک شخصیت ایسی تھی جو مہاتما کے ساتھ بے تکلفی سے بات کر سکتی تھی بلکہ ٹھٹھا مخول بھی کر لیتی تھی یہ تھیں مسز سروجنی نائیڈو ایک دلکش شخصیت انہوں نے گاندھی جی کا نام "مکی ماؤس" رکھا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ گاندھی جی نے برا نہیں منایا تھا۔ انہی دنوں گاندھی جی کے اخبار "ینگ انڈیا" میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ جس میں نسوانی کشش سے محفوظ رہنے کے طریقے بیان کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ تھا کہ گہرے کالے رنگ کا چشمہ بنایا جائے۔ راج گوپال آچاری المعروف بہ راجہ جی اتفاقاً اسی نوعیت کا چشمہ پہنتے تھے سروجنی نائیڈو نے ینگ انڈیا میں شائع ہونے والے مضمون کی آڑ میں راجہ جی کو خوب تنگ کیا اس دور کے راہنما ایک دوسرے سے مذاق کرتے تھے یہاں تک کہ .....

خود کو [illegible] تحفظ بناکر خوش ہوتے تھے۔ مگر افسوس کہ اب یہ صورت
[illegible] لیڈروں کا معاملہ نازک مزاج شاہاں کا سا ہو چکا ہے۔
[illegible] ایکٹ کے خلاف پورے ہندوستان میں مظاہرے ہوئے۔
شہروں میں بڑے بڑے جلوس نکلنے لگے۔ کاروبار ٹھپ ہوگیا۔ کئی مقامات پر پولیس
نے فائرنگ کی اور بہت سے لوگ گرفتار کر لئے گئے۔ حکومت نے پنجاب میں
مارشل لا نافذ کر دیا اور سنسر شپ سخت کر دیا۔ ۱۳ر اپریل کو امرتسر میں جلیانوالہ
باغ میں ایک پُر امن جلسہ ہوا جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی جنرل ڈائر
کے حکم پر فوج نے باغ میں جمع شدہ لوگوں پر گولی چلادی۔ ایک ہزار سے
زائد افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ ہاؤس آف لارڈز میں جنرل ڈائر کو تالیاں
بجاکر داد دی گئی۔ جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کے نتائج میں سے ایک نتیجہ
یہ تھا ایک مشنری خاتون کو مشتعل ہجوم نے ہلاک کر دیا حکومت نے حکم
دیا کہ جہاں مشنری خاتون کو ہلاک کیا گیا ہے وہاں سے گزرنے والے
ہر شخص کو پیٹ کے بل رینگ کر آگے جانا ہوگا یہ انتہائی ذلت آمیز حکم تھا
اور بہت سے لوگوں نے اسے ماننے سے انکار کر دیا۔

۱۹۲۰ء میں ماڈرن ریویو میں ایک مضمون شائع ہوا۔ جس کا عنوان
تھا "گرو کے قدموں میں" اس مضمون میں جس گرو کا ذکر ہوا تھا وہ جواہر
لعل نہرو تھے میرے بھائی۔ اور مضمون نگار تھے رنجیت پنڈت اس
وقت لوگوں کی توجہ کا مرکز گاندھی جی تھے لیکن اس مضمون میں
یہ بتایا گیا تھا کہ سیاسی اُفق پر ایک اور ستارہ اُبھر رہا ہے۔ جواہر لعل نہرو،
ایک روز ہم ناشتہ کرنے کے لئے بیٹھے تو ایک خوبرو نوجوان وارد ہوا۔ پتاجی
نے ان کو ڈرائنگ روم ہی میں بلایا، اور ناشتہ میں شریک کیا۔ وہ ایک وکیل
تھا۔ خوبرو۔ خوش لباس۔ ذات کا براہمن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ
وہ ہمارے مہمان ہیں اور تین چار روز ہمارے گھر میں ٹھہریں گے۔ مجھے یہ
کہنے میں کوئی باک نہیں کہ وہ بہت جلد میری چاہت کا مرکز بن گیا اور اس
نے شادی کے بارے میں استفسار کیا تو میں نے سوال کا جواب ان کے ہاتھ
تھام کر دیا۔ تیسرے دن پتاجی نے۔ باتوں ہی باتوں میں کہہ دیا کہ "سروپ
کماری اور رنجیت پنڈت" کی منگنی کر دی گئی ہے۔ روایت کے مطابق منگنی
کا باقاعدہ اعلان نہ کیا گیا۔ اسکی وجہ ماتاجی تھیں۔ ان کی ضد تھی کہ جب
تک اس سنجوگ کے بارے میں کسی جوتشی سے رائے نہ لی جائے منگنی کا اعلان
نہیں ہونا چاہئے۔ پتاجی جوتشی وغیرہ پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ماتاجی
پنڈت مدن موہن مالویہ کو لے کر ایک مشہور جوتشی کے پاس گئیں اور جوتشی
نے جب یہ بتایا کہ ان کے ستارے ملتے ہیں۔ تو پتاجی خوشی سے پھولے
نہ سمائے انھوں نے بڑے فخر سے کہا میں نے ایک ہی نظر میں وہ چیز دیکھ
لی تھی جو پنڈت جی نے لمبے چوڑے زائچے بنانے کے بعد بتائی ہے۔

کشمیر سے تعلق رکھنے والے بہت سے رشتہ داروں نے میری
شادی کا بائیکاٹ کر دیا۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ سروپ کماری کی شادی خاندان
سے باہر ہو رہی ہے اور یہ خاندانی روایات کے خلاف ہے۔ دوسرا مسئلہ گاندھی
جی نے پیدا کیا۔ ہمارے یہاں کے دستور کے مطابق لڑکی شادی کے
موقع پر پیلے رنگ کی ساڑھی اور والدین کے دیئے ہوئے زیور پہنتی ہیں
مہاتما گاندھی نے خط لکھا کہ شادی کے موقع پر کھدر کا کپڑا پہنا جائے۔
اور کوئی زیور نہ پہنا جائے۔ ماتاجی نے سر پیٹ لیا۔ ان کے خیال میں شادی
کے موقع پر کھدر کا سفید کپڑا پہننا بدشگونی تھی بالآخر گاندھی جی کی رفیقۂ
حیات نے اپنے ہاتھ سے بنا ہوا سفید کپڑا بھیجا جسے زرد رنگ میں رنگا گیا اور زیورات
کی جگہ پھول استعمال کئے گئے۔

شادی ہونے کے بعد ہم میاں بیوی مہاتما کا آشیرواد لینے کے لئے
گئے۔ وہ ہمارے گھر میں قیام پذیر تھے انھوں نے ملک کی خدمت کی ضرورت
پر زور دیا۔ میں سمجھی وہ ہمیں یہ کہیں گے کہ شوہر اور بیوی کی زندگی ملکر گزاریں
چنانچہ میں نے بلا جھجک کہہ دیا۔
اگر آپ کے خیال میں ہمارا شوہر اور بیوی کی حیثیت سے رہنا غلط تھا تو آپ
نے شادی کی اجازت ہی کیوں دی۔

برہمنوں میں یہ رواج ہے کہ شادی کے بعد لڑکی سسرال جاتی ہے
تو سسرال والے اس کا نیا نام رکھتے ہیں۔ سسرال والوں نے میرا نام وجے لکشمی
تجویز کیا۔ چنانچہ میں سروپ کماری سے وجے لکشمی پنڈت بن گئی۔

نومبر ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز ہندوستان پہنچ رہے تھے۔
کانگریس نے ان کی آمد پر بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ گاندھی جی بالآخر
پتاجی کو عملی سیاست میں لے آئے تھے اور بعد از سیاست پتا بہت آگے جا چکے
تھے [illegible] ہڑتالیں اور احتجاجی مظاہرے ہونے۔ مظاہرین میں پتاجی اور
بھائی بھی شامل تھے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ ان کو بھی گرفتار
کر لیا گیا دونوں کو چھ چھ ماہ قید کے علاوہ ایک ایک ہزار جرمانہ کی سزا دی
گئی۔ گاندھی جی کا حکم تھا حکومت کو جرمانہ ادا نہ کیا جائے۔ چنانچہ حکومت
سزا یافتگان کا سامان ضبط کرکے نیلام کرتی اور جرمانہ وصول کرتی۔
آخر وہ دن آگیا جب ایک پولیس انسپکٹر پولیس کی بھاری جمعیت کے

(باقی صفحہ ۳۱ پر)

بابِ انتقاد

ضیاءِ عرفان ، جناب ذکر راؤ دیش مکھ حیدر آبادی آندھرا پردیش کے ہی نہیں بلکہ ملک کے صفِ اوّل کے شعراء میں مقام رکھتے ہیں۔ ذکر صاحب کا پہلا شعری مجموعہ "انوارِ سحر" دو سال ہوئے شائع ہو چکا ہے جسے پسند کیا گیا تھا۔ اب ذکر صاحب کا دوسرا انکا مجموعہ "ضیاءِ عرفان" اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مجموعہ کے شروع میں گزارش احوالِ واقعی کے تحت ذکر صاحب اپنے حالاتِ زندگی مختصراً تحریر فرمائے ہیں اس کے بعد "حرفِ آغاز"، سید محمد معز الدین قادری الملتانی کے زورِ قلم کا ایک اچھی تحریر ہے جس کے مطالعہ سے ذکر صاحب اور ان کے کلام پر کما حقہٗ طور پر روشنی پڑتی ہے۔ جناب ابو زاہد سید یحییٰ حسینی قدر عریضی نے "تعارف" کا حق ادا فرمایا ہے اور جناب خورشید عسکری نے "جائزہ" کے تحت ذکر صاحب کے کلام کے حسن و قبح پر جس ناقدانہ انداز میں جائزہ لیا ہے اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ نعت اور سلام کے بعد ایک صد غزلیات کا یہ بہترین مجموعہ ہر طور سے قابلِ ستائش ہے۔ باذوق حضرات کے لئے "ضیاءِ عرفان" ایک ایسا مجموعہ کلام ہے جس سے وہ یقیناً لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ڈمائی سائز کے ۱۲۸ صفحات، کاغذ بہترین۔ چھپائی روشن۔ کتابت دیدہ زیب۔ قیمت مجلد دس روپیہ۔ ضیاءِ عرفان دستیاب ہونے کے کئی پتوں میں ایک پتہ "دفتر ماہنامہ شانِ ہند نئی دہلی ۵۵ بھی مندرج ہے۔

رنگ برنگے پھول (بچوں کی نظمیں) وزارتِ اطلاعات و نشریات حکومت ہند کے محکمہ پبلی کیشنز ڈویژن نے یہ کتاب شائع کر کے بچوں کی بہترین نظموں کو یکجا کر دیا ہے۔ اسی مجموعہ میں پچیس مشہور و معروف شعرائے کرام کی ایسی اچھی نظمیں جمع کی گئی ہیں جو مختلف عمر کے بچوں کو یقیناً پسند آئیں گی۔ اور ان نظموں کے پڑھنے سے ہمارے بچوں کو ملک کی مختلف رسموں، تہواروں اور شخصیتوں کے بارے میں واقفیت حاصل ہوگی۔ جناب شہباز حسین صاحب اور نند کشور وکرم صاحب اس کتاب کے مرتبین یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں جنہوں نے بچوں کے لئے یہ بیش بہا مجموعہ ترتیب دیا۔ قیمت دس روپیہ۔ پبلی کیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱ سے یا دفتر شانِ ہند، نئی دہلی ۵۵ سے یہ کتاب دستیاب ہے۔

صفدر آہ بحیثیت شاعر

ڈاکٹر زرینہ ثانی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی، جو ناگپور میں فارسی اور اُردو کی سینیئر لیکچرار ہیں۔ علمی ادبی دنیا میں بھی اپنا ایک مقام رکھتی ہیں زیرِ نظر کتاب ان کی ایک اچھی اور مفید کوشش ہے جو حضرت صفدر آہ کی شاعری کا انتخاب ہے۔ حضرت صفدر آہ ایک محقق اور باغیانہ سرشت رکھنے والے شاعر ہیں۔ اور ان کا اپنا ایک رنگ ہے جسے کوئی دوسرا شاعر اگر اختیار کرنا چاہے تو شاید نہ کر سکے کیونکہ شاعری کا یہ رنگ صرف اُنہی شعرا کو قدرت ودیعت کر سکتی ہے جن کی سرشت میں باغیانہ پن ہو۔

حضرت صفدر آہ کے دو مجموعہ ہائے رُباعیات زمزمہ اور نقش نظموں کے دو مجموعوں گلبن اور بیاض۔ غزلوں کے مجموعے غزلیات ساز اور مثنوی موزِ بہ نو کا انتخاب زیرِ نظر مجموعہ میں جمع کیا گیا ہے۔ کلام کیا ہے ایک شعلۂ جوالا ہے جو قاری کے دل و دماغ میں سیاست۔ مذہب۔ معاشرہ۔ اعتقادات، اندازِ فکر، غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی کے بارے میں ایک بنیادی انقلاب کی تخم ریزی کرتا ہے۔ وہ حضرات جو واقعی اچھی شاعری کے دلدادہ ہیں۔ ان کے لئے یہ کتاب ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ ڈاکٹر زرینہ ثانی کا ۲۳ صفحات پر مشتمل آہ کی شاعری عنوان سے چھپنے والا مقالہ بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ جو کتاب کے شروع میں دیا گیا ہے۔ قیمت سولہ روپیہ۔ انجمن ترقی اُردو ہند، اُردو گھر نئی دہلی ۲ کے علاوہ دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۵۵ سے بھی دستیاب ہے۔

بقیہ: انکشافات ہی انکشافات

ساتھ آنند بھون میں داخل ہوا۔ اس مقصد میں پولیس کا مطلب دہشت تھا پولیس فرنگی حکمرانوں کے اقتدار اور طاقت کی علامت تھی پولیس کے اہلکار بہیمیت اور جبر و تشدد کی ہر حد سے گزر جاتے تھے۔ انسپکٹر گھر میں آتے ہی اول فول بکنے لگا ملازمین طیش میں آکر انسپکٹر کو سبق سکھانا چاہتے تھے مگر گاندھی جی کی ہدایات مانع تھیں۔ پولیس والے بہت سامان۔ صوفے۔ قالین، زیورات اور دوسری

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

- اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف تو کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گردو پیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
- ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف ستھرا کیوں نہ رکھیں جنہیں ہم استعمال کرتے ہیں۔
- ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ہالوں، در حقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں۔ گردو پیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ہی ضروری ہے۔ ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔ اور ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔

آپ بھی اس سلسلہ میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے اور یہاں آپ ریلوے صفائی محکمے کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور وہ صرف آپ کی خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے ادھر ادھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے

اسے صاف شفاف رکھئے

ناردرن ریلوے

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ — رجسٹرڈ کٹ بذریعہ پیرآف انڈیا کار سپرنٹنڈنٹ نمبر ۶۴/۱۴۴ — رجسٹرڈ نمبر ۲۰۰۵۶/۰۵

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر لحظہ دل میں ہے یہ فیکٹس جمر کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انسان پرست ہوں
دیکھا کیا

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

زر سالانہ ۱۵/- روپے
فی پرچہ ۱/۵۰ روپے

ایڈیٹر:-
سرور تونسوی

جلد نمبر ۴۳ — مئی ۱۹۸۰ء — شمارہ نمبر ۵

حضرت رتن پنڈوری مدظلہ العالی

نے

اپنی زندگی کے عزیز ترین پچاس سال جس کتاب کی تالیف پر صرف کئے اور اپنی زندگی بھر کا سرمایہ جس کتاب کیلئے مواد فراہم کرنے پر لگا دیا۔ جس کتاب کے لئے بھاری بھرکم معاوضے پر انڈیا لائبریری لندن سے دوسری زبانوں کی کتابوں سے مطلوبہ مواد ترجمہ کرایا گیا۔ اور

جس کتاب کو ہر پہلو سے مستند بنانے کے لئے فاضل مؤلف نے ہزاروں کتابوں کا مطالعہ کرنے میں اپنی آنکھوں تک کو قربان کر دیا وہ نادر اور بے مثال کتاب

ہندی کے مسلمان شعراء

طباعت کے مراحل سے گزر رہی ہے اور ہر ممکنہ طور پر بہتر سے بہتر انداز میں چھپ رہی ہے۔

"ہندی کے مسلمان شعراء" اپنی جداگانہ نوعیت اور اہمیت کی حامل ایک ایسی کتاب ہے جسے آئندہ نسلیں تحقیقی معاملات میں ایک بہترین رہبر پائیں گی۔ اسلام کی ابتداء سے موجودہ دور تک کے ان مسلمان شعراء کا تذکرہ ہے جنہوں نے ہندی شاعری میں شہرت حاصل کی۔ ضخامت پانچ صد صفحات سے زائد۔ چالیس تصاویر۔ قیمت اکاون روپیہ ۵۱/-

مزید معلومات کے لئے لکھئے:- دفتر شانِ ہند۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

مولانا محمد کاشف سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے نیتو کے صفحات خواجہ پریس، چھتہ شیخ منگلو، جامع مسجد دہلی اور سرورق پائنیٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند، فلیٹ نمبر ۲، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

سربراہوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے کی اشد ضرورت ہے۔ ہم صدقِ دل سے یہ جانتے ہیں کہ قوم کے وہ افراد جو بے راہ روی کو گلے لگا کر تھام دینے کو تیار نہیں ہیں میدان میں آئیں اور گھر کے خوشنما لفافے پردے میں پڑھنے چھپنے کے بجائے اس کو روکنے کے ذرائع سوچیں۔

اُردو اکادمی راجستھان

اُردو اکادمی راجستھان کے ارکان اگر دیانت داری ایمانداری اور سچائی میں ایمان رکھتے ہیں تو انہیں فخرِ راجستھان مرحوم حضرت صولت ٹونکی کو نہیں بھولنا چاہئے۔ اور اُردو اکادمی والوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جو عظیم شاعر ایک ایک رات میں دیوان کا دیوان غزل بہ غزل اور قافیہ بہ قافیہ کہہ سکتا ہے اس کے مطبوعہ دیوان کا نہ ہونا اس کے عظیم شاعر ہونے میں سدِ راہ نہیں ہے۔

آج اس عظیم شاعر کا مزار کس مپرسی کی حالت میں شکستہ ہو چکا ہے اور ان کی بیوہ ہر طرح سے مالی امداد کی مستحق ہیں۔ اُردو اکادمی کا اولین فرض ہے کہ وہ مرحوم صولت صاحب کی آخری آرام گاہ کو ایسی حالت میں بنوائے کہ اس عظیم شاعر کی یاد باقی رہ سکے نیز مرحوم کی بیوہ کا وظیفہ مقرر کرنا اکادمی کا فرض ہے۔ اُمید ہے کہ اُردو اکادمی راجستھان کے ارکان کے بہرے کانوں تک ہماری یہ آواز پہنچ سکے گی۔

مسرت

ایک بادشاہ ہمیشہ مغموم و افسردہ رہتا۔ رقص و سرود، شراب و عورت، عیشِ شہنشاہی سے اسے ہنگامی سکون تو حاصل ہو جاتا لیکن تنہائی میں بے چین اور مضطرب رہتا۔ اس کے وزراء اور مشیر فکرمند رہتے اور بادشاہ کو ہر طرح خوش رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ لا سکے جو روحانی مسرت پیدا کرتی ہے، وہ ذہنی طور پر مسرور نہ ہو سکا۔ ایک ملنگ درویش نے مشورہ دیا کہ ملک کی آبادی میں کوئی ایسا آدمی تلاش کیا جائے جو ہر لحاظ سے مطمئن اور روحانی مسرت سے سرشار ہو جس کے چہرے پر جاوداں شگفتگی ہو ایسے آدمی کی قمیص بادشاہ کو پہنائی جائے۔

ہر طرف آدمی دوڑائے گئے اور دو چار دنوں کی بھاگ دوڑ اور تلاش کے بعد ایک ایسا آدمی مل گیا جس کے خد و خال سے مسکراہٹیں ٹپک رہی تھیں چہرے پر رونق اور آنکھوں میں نورانی چمک تھی۔ بادشاہ کے آدمیوں نے اسے کہا کہ بادشاہ کے لئے تمہاری قمیص چاہئے۔ وہ خوش بخت انسان مسکرا کر بولا یہی ایک لنگوٹی میری کل کائنات ہے۔ قمیص نہ آج تک نصیب ہوئی ہے اور نہ کبھی ضرورت ہی محسوس کی۔ ایک لنگوٹی پر قانع ہوں اور اللہ کا شکر گزار۔

مندرجہ بالا کہانی ان حضرات کے لئے یقیناً دلی مسرت کا شافی علاج ثابت ہو سکتی ہے جو کانگریس راج میں ہر طرح کی سہولیات پاتے رہے اور جنتا پارٹی حکومت کے آتے ہی کانگریس حکومت میں سو سو کیڑے نکالنے لگے اور اب جب پھر کانگریس (آئی) کی حکومت آگئی ہے تو یہ لوگ ذاتی مفاد کو بدستور سابق جاری رکھنا چاہتے ہیں مگر اس بار حکومت کے ارکان اس قسم کے موسمی مفاد پرستوں کی وفاداری سے بخوبی واقف ہیں اور یہ خود غرض حضرات غم و اندوہ میں ڈوبے دلی مسرت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اور اس بات سے اور بھی پریشان ہیں کہ جنتا حکومت میں ہزار ہزار تیر چلانے پر بھی کانگریس آئی کے ذمہ دار حضرات ان ریزہ چینوں کی بات سننے کو تیار نہیں ہیں اگر یہ سطور ایسے حضرات کی نظروں سے گزریں تو انہیں اس بغیر قمیص والے آدمی کی طرح اپنے مقدّر پر صابر رہنا چاہئے۔ اور ایمانداری و سچائی نیز محنت سے اپنا کام کرنا چاہئے۔ تو یقیناً انہیں دلی مسرت ملیگی۔ چمچہ گیری ویسے بھی ایک غیر شریفانہ دھندا ہے اور آج تک کسی چمچے تو کیا کفگیر کو بھی دلی سکون حاصل نہیں ہو سکا۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ مجرمانہ گزر

سرور تونسوی

حضرت سید محمود الحسن صولتؒ نجیب الطرفین عرب تھے ان کے والد عرب سے ٹونک تشریف لائے اور شاہی سندات جن میں یہ تحریر تھا کہ یہ جہاں بھی جائیں ان کا احترام کیا جائے۔ چنانچہ ریاست ٹونک کے حکمرانوں نے انھیں ٹونک میں قیام فرمانے کے لئے گزارش کی اور ان کے گزر اوقات کے لئے عرب جاگیر عنوان سے اس زمانے کے مطابق سرکاری طور پر جاگیر عطا فرمائی۔ حضرت صولت رح ابھی شکم مادر میں ہی تھے کہ ان کے والد صاحب کا انتقال ہوگیا اور جب یہ پیدا ہوئے تو ان کی پرورش کی تمام ذمہ داری ان کی والدہ محترمہ پر تھی لہٰذا یہ کو میاں عربن والے مشہور ہوئے۔ کیونکہ رنگت سیاہی مائل تھی۔ اس لئے ریاست ٹونک کی روایات کے مطابق عربی نام کوریا مشہور ہوگیا۔ داغ کے شاگرد عاشق ٹونکی فرماتے تھے کہ عرب صاحب روحانی طور پر اپنا جواب آپ تھے۔ عرب صاحب کا فرمان تھا کہ دنیا اڑھائی آدمیوں کے سہارے باقی ہے اور ان اڑھائی آدمیوں میں سے ایک میں ہوں۔ مگر قبلہ صولتؒ ابھی شکم مادر میں ہی تھے کہ ان کے والد صاحب کو قدرت نے اس جہانِ فانی سے اٹھا لیا کیونکہ پیدا ہونے والا بیٹا روحانیت میں اپنے والد سے بھی زیادہ جلالی تھا۔ قبلہ صولت صاحب نے ایک کتاب میں جناب عاشق ٹونکی کا نوشتہ یہ واقعہ پڑھایا جس میں عاشق ٹونکی فرماتے ہیں کہ میں لگاتار ایک ہفتہ تک شام کو عرب صاحب (صولت صاحب کے والد صاحب) کے ہاں جاتا اور ان کے پاؤں دباتا اگر وہ چارپائی پہ لیٹے ہوتے تو ٹانگیں دباتا۔ آٹھویں دن عرب صاحب نے پوچھا عاشق میاں کیا بات ہے کچھ کہنا ہو تو کہو۔ عاشق ٹونکی فرماتے ہیں کہ پہلے تو میں نے یہی کہا کہ حضور کوئی بات نہیں ہے مگر عرب صاحب کا کہنا تھا کہ نہیں کوئی بات ضرور ہے۔ جیسے تم کہتے ہوئے شرما رہے ہو۔ تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کھل کر کہو۔ عاشق صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے جلسہ ہونے کے بعد گزارش کی کہ حضور سرکار (نواب ٹونک) کے ہمراہ کلکتہ گیا تھا وہاں گوہر جان [illegible] گوہر جان ہیں جن کے بارے میں اکبر الہ آبادی نے فرمایا تھا کہ "سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے شوہر کے سوا) کا گانا سنا تھا۔ بس یہ خواہش ہے کہ ایک بار گوہر جان کا گانا پھر سنوں لہٰذا دعا فرما دیجئے کہ سرکار پھر کلکتہ جائیں اور مجھے ہمراہ لے جائیں تاکہ گوہر جان کا گانا سن سکوں۔ اس کے بعد عاشق صاحب رقمطراز ہیں کہ عرب صاحب نے بڑی لمبی ہوں کی اور دو چار منٹ میں ہی ان پر غنودگی چھا گئی میں سمجھا کہ وہ سو گئے ہیں مگر میں ان کی ٹانگیں دباتا رہا تقریباً ایک گھنٹہ بعد عرب صاحب فرمانے لگے عاشق میاں اندر جاکر شیروانی کی جیب سے بٹوا تو نکال لاؤ۔ پان کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ عاشق صاحب لکھتے ہیں کہ میں تعمیلِ حکم کے لئے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کمرے میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے کلکتہ والی گوہر جان بیٹھی ہیں۔ وہی سازندے۔ وہی گاؤ تکئے وہی جگ مگ جگ مگ کرتی روشنی۔ وہی کمرہ۔ اور مجھے دیکھتے ہی گوہر جان نے وہی غزل شروع کی جو سرکار کے ساتھ سنی تھی۔ عاشق صاحب لکھتے ہیں کہ میں مبہوت بیٹھا گانا سنتا رہا۔ نصف گھنٹے کے بعد عرب صاحب کی آواز سنائی دی۔ عاشق میاں بڑی دیر لگا دی بھئی پان کھانے کو دل بہت چاہ رہا ہے بٹوا جلدی لاؤ۔ عاشق صاحب کا بیان ہے کہ وہ فوراً شیروانی سے بٹوا نکال کر باہر گئے اور عرب صاحب کو دے کر الٹے پاؤں واپس کمرے میں گئے تو وہاں سوائے ویرانی کے کچھ نہ تھا۔

عاشق صاحب کی یہ تحریر پڑھنے کے بعد میں نے صولت صاحب سے گزارش کی کہ آپ کے والد محترم تو اڑھائی ہستیوں میں سے ایک تھے آپ اس سلسلے میں اپنے بارے میں کیا فرماتے ہیں جواب میں ہنستے ہوئے کہنے لگے کہ وہ تو اڑھائی میں سے ایک تھے میں تو پہلا شخص کا آدھا ہوں۔

۱۹۵۲ء میں [illegible] کانفرنس مسلم مسافر خانہ [illegible] ہوئی تھی اس سلسلہ میں ایک طرحی مشاعرہ بھی تھا۔ [illegible] نے یہ شعر سنایا ہے

دُور رہتے ہیں تو رہتے ہیں خیالوں سے بھی دُور
پاس رہتے ہیں تو رہتے ہیں رگِ جاں ہو کر

دوسرے مصرعہ پر آہ و واہ کی ایک ایسی عجیب و غریب آواز بلند ہوئی جس نے بڑا سب سامعین کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ دیکھا تو ایک منحنی سے بزرگ اس مصرع پر بے حال ہو رہے تھے۔ میں نے مذاقاً کہا بڑے میاں بشارت صاحب کے شاگرد معلوم ہوتے ہیں۔ بڑی بے اعتنائی سے فرمانے لگے صفت اس پر اور اس کے استاد پر میں تو شعر کی داد دے رہا ہوں۔ اس نے کہا ہو یا اس کے استاد نے۔ میرے پاس ہی مرحوم حضرت امیر بھی تشریف فرما تھے میں نے ان سے پوچھا یہ بزرگ کون ہیں۔ بس فرمانے لگے کیا آپ انھیں نہیں جانتے یہ استاد صولت ہیں۔ بڑے میاں نے بڑے معیان سے مجھے دیکھا اور ان کا یہ دیکھنا ہی قیامت ہو گیا اس کے بعد ان کا اور میرا ایک جان و دو قالب والا معاملہ ہو گیا اور ان کے انتقال فرمانے تک وہ مجھے اپنا بیٹا ہی سمجھتے رہے جو ٹونک سے باہر جانا کسی حالت میں بھی پسند نہ فرماتے تھے۔ میرے ساتھ کلکتہ۔ بمبئی اور دوسرے کئی مقامات پر تشریف لے گئے۔

گو صولت صاحب اپنی روحانی صلاحیتوں کو چھپائے رکھتے تھے۔ مگر تحصیلدار میاں ریاض الدین صاحب ان کی ولی صفت روحانیت سے کسی قدر واقف ہو چکے تھے۔ مرحوم نواب اسماعیل علی خان تاج تخت کے وارث نہ بن سکتے تھے مگر تاج صاحب کی والدہ محترمہ اور ہمشیرہ (موجودہ بیگم نواب مالیر کوٹلہ) نے صولت صاحب سے منت سماجت کر کے گزارش کی کہ تاج صاحب کو گدی مل جائے۔ اس معاملہ کی تفصیل میں جانا اس وقت مناسب نہ ہوگا۔ مگر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ تاج صاحب نے میاں ریاض الدین صاحب تحصیلدار کو سورۂ یٰسین پر لکھ کر دیا کہ اگر میں رئیس ٹونک ہو گیا تو چار لاکھ روپیہ دوں گا۔ قرآن اور پھر سورۂ یٰسین پر تاج صاحب کا لکھا ہوا دیکھ کر صولت ایسا ایماندار اور نیز قرآن اور رسول کے نام پر زندگی قربان کر دینے والا فقیر منش انسان کیسے یقین نہ کرتا لہٰذا اسی وقت صولت صاحب نے حکم لگا دیا کہ خدا کے فضل سے خان تاج کی لڑکا نواب بن جائے گا۔ اس مقررہ تاریخ سے چند روز پیشتر سردار شیل نے نواب ٹونک صاحب غالباً فاروق علی خاں یا ان کے بعد والے نواب صاحب کو شملہ ہی بلایا اور نواب صاحب سوائی مادھو پور سے اپنے سپیشل ڈبے میں سوار ہو گئے۔ جب گاڑی ریواڑی پہنچی تو نواب صاحب کا ڈبے میں ہی ہارٹ فیل ہو گیا۔ اور ڈبہ کٹ کر واپس سوائی مادھو پور لے جایا گیا۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ تاج صاحب جائز وارث قرار دیئے جائیں گے۔ مگر جب ریذیڈنٹ بہ اچھوتا مستقبل دربار میں اعلان کیا تو وہ نواب اسماعیل خان تاج کے نام کا ہی تھا۔ نواب اسماعیل خان کو صولت صاحب نے اپنے ہاتھوں سے تخت نشین کیا۔ مگر بدقسمتی سے نواب صاحب نے نہ وعدہ ایفا کیا بلکہ ایسے مواقع بھی آئے کہ صولت صاحب کو تنازع لا یعنی کے لئے ٹونک سے باہر جانا پڑا۔ نواب صاحب نے کبھی تین صد اور کبھی ایک صد پنشن مقرر کر کے بار بار یہ مد بھی بند کر دی اور یہ وعدہ خلافی نواب اسماعیل خان کو کتنی گراں رہی اس کا اندازہ افسوس سے کبھی لگایا ہی نہ تھا۔ کیونکہ شراب نوشی اور درباریوں کے بے جا خوشامد نے انھیں اس کا خیال کبھی آنے ہی نہ دیا کہ وہ ایک ولی صفت فقیر منش سے سورۂ یٰسین پر لکھا ہوا وعدہ یاد بھی رکھتے..... نواب صاحب مرحوم سے صولت صاحب کے طفیل ہی میرے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ میں جب بھی ٹونک جاتا نواب صاحب اپنے محل میں مجھے نوازتے میرے اعزاز میں شعر کی نشستیں رکھتے۔ دعوتیں دیتے۔ شراب نوشی میں مجھے شریک رکھتے۔ میں اُن کی توجہ اس طرف بار بار مبذول کراتا رہتا کہ وہ صولت صاحب کا خیال فرمائیں۔ وہ وعدہ بھی فرماتے مگر کثرتِ شراب نوشی اور بایمانی طبیعت نے انھیں ہر طرح غارِ جہنم میں جھونکے رکھا۔ (سورۂ یٰسین پر نواب صاحب کا لکھا ہوا فوٹو سٹیٹ چربہ میرے پاس موجود ہے)

لالہ بھاگ مل کا تھرڈ مرچنٹ (چاندنی چوک کٹڑہ نواب) کی نوجوان بیوی کا دماغی توازن خراب ہو گیا اور وہ اپنے لباس کو تار تار کر کے بالکل برہنہ گلیوں میں بھاگتی پھرتی ایک نوجوان حسین عورت کا اس طرح برہنہ گلیوں میں بھاگتے پھرنا گھر والوں کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ ہر ممکن علاج کرایا گیا۔ آخر کار جب بھی اس عورت کو پاگل پن کا دورہ پڑتا تو اسے رسے سے باندھ کر کمرہ میں بند کر دیا جاتا اور کئی کئی دن تک یہ صورت حال رہتی۔ حکیم جی پچھلے سال سے بھی علاج .... ایک دن بھاگ مل کو کسی نے ... قصہ بیان کر کے

ڈاکٹر کو کیا معلوم کہ بیچاری پھولاں کو کس طرح آرام آیا ہے۔

ایک دن قبل صولت صاحب ان کے صاحبزادے پیارے میاں" بھاگ مل اور میں دریا گنج گولچہ سینما کے پاس کھڑے تھے کہ ایک سکوٹر سے ایک مرد اور ایک عورت اُترے اور انھوں نے بھاگ مل سے نمسکار کیا اور سینما دیکھنے ہال میں چلے گئے۔ پیارے میاں آنکھیں شروع کرتے ہوئے کہنے لگے۔ سرور بھائی یہ عورت تو کاتک کی کتیا تھی۔ چونکہ میں اس اصطلاح سے ناواقف تھا اس وقت تو میں خاموش رہا۔ رات کو میں نے صولت صاحب سے پوچھا قبلہ شام کو پیارے میاں نے اس عورت کے بارے میں کہا تھا کہ یہ تو "کاتک کی کتیا" ہے۔ یہ کاتک کی کتیا کیا ہوتی ہے —

صولت صاحب پہلے تو ہنسے پھر فرمانے لگے کیا تمہیں واقعی یہ معلوم نہیں کہ کاتک کی کتیا کیا ہوتی ہے —؟ عرض کیا کہ واقعی معلوم نہیں تو فرمانے لگے کہ کاتک کے ماہ میں کتیا میں قدرتی طور پر افزائش نسل کی خواہش پیدا ہوتی ہے اور اس خواہش کی خوشبو پاکر کئی کئی کتے ایک ایک کتیا کے پیچھے گھومنے لگتے ہیں۔ اس تشریح کی روشنی میں بھاگ مل سے دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ وہ عورت اپنے دلال کے ساتھ تھی اور بھاگ مل بھی اس کی زلفوں کے اسیر تھے۔ میں نے صولت صاحب سے بعد میں دریافت کیا کہ قبلہ وہ عورت شکل سے سادہ گھریلو لباس میں تھی اس کی حرکات بھی ایسی نہ تھیں جن سے کسی قسم کا شک ہو سکتا تو پھر پیارے میاں صاحب نے پہلی نظر میں ہی یہ کیسے کہہ دیا کہ یہ کاتک کی کتیا ہے۔ فرمانے لگے سرور بیٹا ہماری تو تاب ہمارا باپ بھی نہ لا سکا اور ہمارے کہنے سے پہلے ہی چل بسا اب یہ ہمارے صاحبزادے ہم سے بھی آگے نکل جانے کی کوشش میں ہیں ان کو سمجھاتا ہوں کہ وہ ایسے حکم نہ لگایا کریں مگر نادانستہ طور پر اس کی زبان سے ایسی باتیں نکل جاتی ہیں۔

(جاری ہے)

بقیہ: باب الانتقاد

شائع کر رہا ہے۔

اس بار تازہ انتخاب کی اشاعت کے بارے میں رضا صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ "اب جبکہ میں نے چکبست پر تا حدِ امکان کام مکمل کرنے ...... سے کہا ہے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ چکبست کا انتخاب ہم آہنگ مختصر جتنا بھی میسر آسکا شائع کر دیا جائے۔"

یہ قابلِ ذکر انتخاب بہت ہی اچھے ڈھنگ سے اعلیٰ قسم کے کاغذ پر بہترین چھپائی اور طباعت کے ساتھ نہایت خوبصورت مجلد شائع ہوا ہے۔ قیمت تیس روپیہ۔ ناشر: ساکار پبلیشرز پرائیویٹ لمیٹڈ آفس نمبر ۲۳۲ پنچ رتنا اوپیرا ہاؤس۔ بمبئی - ۴۰۰۰۰۴۔ ناشر یا دفتر شانِ ہند، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲ سے دستیاب ہے۔

انکشافات ہی انکشافات

وجے لکشمی پنڈت کی سوانح حیات کی چند جھلکیاں

دوسری قسط

۱۹۳۰ء ہنگاموں اور واقعات سے پُر سال تھا اس سال ۴ اپریل کو گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی جو رفتہ رفتہ زور پکڑتی گئی چنانچہ تمام لیڈروں کی گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں۔ بھائی (جواہر لال نہرو) گرفتار ہوگئے۔ صوبہ سرحد میں نہتے مظاہرین پر فائرنگ کی خبر نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

انہی دنوں پتا جی اور بھائی نے یہ فیصلہ کیا کہ الہ آباد میں ہماری رہائش گاہ آنند بھون قوم کو بطور عطیہ دیدی جائے ایک سادہ سی تقریب میں آنند بھون کانگریس کے صدر کے سپرد کر دی گئی اور اس کا نام سوراج بھون (آزادی کا گھر) رکھا گیا۔ کئی سال تک یہ عمارت کانگریس کے صدر دفتر اور ہسپتال کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ کئی تحریکوں کے دوران اس پر پولیس نے چھاپے مارے۔ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑو تحریک کے دوران فوج نے عمارت پر قبضہ کر لیا آزادی کے بعد اسے ہسپتال اور لاوارث بچوں کے گھر میں تبدیل کر دیا گیا آنند بھون کے وسیع احاطہ ہی میں ایک اور عمارت تعمیر کی گئی۔ یہ ہمارا اپنا گھر تھا۔ ۱۹۷۰ء میں اندرا گاندھی نے یہ گھر نہرو میموریل کو دیدیا

مئی ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی گرفتار ہوگئے۔ پتا جی جون میں دھر لئے گئے ان کی صحت بھی اچھی نہیں تھی۔ پتا جی جس ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔ اور جس کے سیکریٹری سید محمود تھے اسے غیر قانونی قرار دیا گیا۔ پتا جی اور سید محمود کو نینی جیل میں رکھا گیا۔

پتا جی جیل کی زندگی کے عادی نہیں تھے۔ ان کی صحت تیزی سے گرنے لگی۔ پتا جی مشروط رہائی کے لئے تیار نہیں تھے۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ ایک انگریز تھے اور پتا جی کی بڑی عزت کرتے تھے انھوں نے پتا جی سے کہا آپ اپنی پسند کی اشیاء کی فہرست مجھے دیدیں میں آپ کے لئے ان کی فراہمی کا انتظام کر دوں گا۔ پتا جی نے کہا۔ "میری خوراک بہت سادہ ہے اور جیل میں تو میری خوراک اور بھی مختصر ہوگئی ہے

جب پتا جی نے سپرنٹنڈنٹ کو فہرست دی تو وہ بھونچکا رہ گیا اور بالآخر اسے کہنا پڑا۔ اتنی چیزیں فراہم کرنا میرے لئے ممکن ہی نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ یہ چیزیں یہاں مل ہی نہیں سکتیں میں تو سمجھا تھا کہ آپ بھی گاندھی جی کی طرح بکری کے دودھ اور پھلوں کے رس پر گذارہ کرتے ہوں گے پتا جی اب عمر کی اس منزل میں تھے کہ اچھی سے اچھی خوراک بھی ان کی صحت کو سنبھالا نہیں دے سکتی تھی آخر وہ پرلوک سدھار گئے۔ ان کی آخری رسوم روایتی ہندو رسوم کے مطابق ادا کی گئیں۔ گاندھی جی نے ان کی چتا کے پاس جمع لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے ایک پُرسوز تقریر کی۔

تحریک جاری رہی ۱۹۳۳ء میں دوسرے لیڈروں کی گرفتاری کے بعد مجھے الہ آباد کانگریس کمیٹی کی صدارت سنبھالنا پڑی۔ پروگرام کے مطابق ہم نے پرشوتم داس اسٹیڈیم میں عظیم الشان جلسہ کیا جلسہ کے بعد مجھے اور چند اور افراد کو گرفتار کرا لیا گیا مجھے ایک سال قید اور پندرہ سو روپیہ جرمانہ یا چھ ماہ مزید قید کی سزا ہوئی۔ کانگریس کے فیصلہ کے مطابق جرمانہ ادا نہیں کیا جاتا تھا گویا عملاً سزا کی قید ڈیڑھ سال تھی مجسٹریٹ نے میرے لئے اے کلاس کی سفارش کی تھی۔

فروری ۱۹۳۶ء میں میری بھابھی کملا (جواہر لال نہرو کی بیوی) فوت ہوگئیں۔ ان کی یاد میں الہ آباد میں ایک میٹرنٹی ہسپتال قائم کیا گیا اس کا افتتاح گاندھی جی نے کیا یہ ایک خوبصورت عمارت تھی جس میں جدید طبی کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ ہسپتال ہر طرح کے جدید ساز و سامان سے لیس تھا اس میں غریبوں کا علاج مفت ہوتا تھا تھوڑے ہی عرصہ میں کملا نہرو میموریل ہسپتال کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت انتخابات میں کانگریس کی طرف سے میں بھی امیدوار تھی میرا انتخابی حلقہ الہ آباد تھا۔ بھائی (جواہر لال نہرو) نے انتخابات کے موقع پر لوگوں سے کہا تھا، کانگریس کے پاس کاریں اور بسیں نہیں ہیں آپ لوگ ووٹ ڈالنے کے لئے پیدل جائیں آپ

چلیں کہ یا تنا کے لئے پیدل جاتا ہے۔ چنانچہ انتخابات کے روز کا منظر میں آج تک نہیں بھولی ـ ہر گاؤں ہر بستی سے لوگ جوق در جوق پولنگ سٹیشنوں کی طرف آ رہے تھے۔ اکثر پیدل تھے۔ کچھ لوگ بیل گاڑیوں پر سوار تھے۔ کسی کسی کے پاس سائیکل تھی۔ ہمارے مخالف امیدواروں نے کاروں اور بسوں کا انتظام کر رکھا تھا ووٹروں کے لئے علاوہ لاری کا انتظام کیا تھا۔ لیکن ان کی بسیں خالی آ جا رہی تھیں جو لوگ ووٹ ڈالنے آ رہے تھے ان میں سے کسی کسی کے پلو میں خشک روٹی بندھی تھی کسی کے پاس اُبلے ہوئے چاول تھے اور کسی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ تھے ہندوستان کے اصل باشندے (باپو گاندھی جی) یہی کہتے تھے کہ ان لوگوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہئے لیکن ہم کو یہ لوگ اسی وقت یاد آتے ہیں جب ہمیں ان کے ووٹوں کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت ہم ان کے پاس جاتے ہیں۔ ان کے دکھ درد دور کرنے کے وعدے کرتے ہیں لیکن جب انتخابات ہو جاتے ہیں تو ہم ان کو فراموش کر دیتے ہیں ان کے مسائل کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔

کانگریس نے ۱۱ صوبوں میں سے آٹھ میں اکثریتی نشستیں حاصل کر لیں۔ چنانچہ ان صوبوں کے گورنروں نے کانگریس پارٹیوں کے سربراہوں کو حکومت بنانے کی دعوت دی۔ اس وقت ہندوستان دو حصوں میں تقسیم تھا صوبے اور ریاستیں۔ صوبے براہِ راست وائسرائے کے تحت تھے۔ جب کہ ریاستیں جو کل ہندوستان کے ⅖ رقبہ پر مشتمل تھیں ــ حکمرانانِ ریاست کے زیرِ نگیں تھیں۔ ہر ریاست میں ایک برطانوی ریذیڈنٹ ہوتا تھا جو کہ اصل حاکم تھا اور ہر والی ریذیڈنٹ کے مشورہ پر عمل کرنے کا پابند تھا۔

مجھے اتر پردیش کی کابینہ میں شامل کر لیا گیا حلف وفاداری کے موقع پر ہماری حالت اور ہی تھی۔ ہم انگریز سے نجات حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ لیکن حلف کے الفاظ میں بادشاہ کے ساتھ وفاداری کا عہد بھی شامل تھا۔ یہ کڑوی گولی سب نے بڑی مشکل سے نگلی۔ تقریب کے بعد مشروبات سے تواضع کی گئی۔ ایک انگریز افسر نے پوچھا۔

آپ ٹھیک تو ہیں۔

میں نے کہا "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بادشاہ گلے میں اٹک گیا تھا"

اس پر اس نے مسکراتے ہوئے کہا ـــ "تو اسے حلق سے نیچے اتار لو"

میرے وزیر بننے پر بھائی جواہر لال نہرو نے مجھے جو تار بھیجا اس کا متن یہ تھا۔ "چار بچوں کے باپ چینی فلسفی کا واقعہ تمہیں یاد ہو گا اس کا ایک بیٹا بہت ہوشیار تھا اسے شاعر بنا لیا گیا۔ دوسرا ذہین تھا۔ اس نے فنون سیکھے۔ تیسرا فوج میں چلا گیا۔ چوتھا اپنے باپ کے لئے مایوس کن تھا۔ باپ نے کئی دوستوں سے مشورہ کیا۔ اور اسے کابینہ میں وزیر بنا دیا۔ پیار اور نیک تمناؤں کے ساتھ تمہارا بھائی" ــ دورِ وزارت میں محکمہ کے حکام اور میرے درمیان اکثر و بیشتر اختلافات پیدا ہوتا رہا۔ افسر اپنے ڈھب سے کام کرتے تھے۔ میں عوام کی منتخب تھی۔ اور میری کوشش یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ کام کروں ایک بار چند عورتوں کی طرف سے درخواست ملی کہ "ہمیں اپنے گھروں سے بیدخل کیا جا رہا ہے ہماری مدد کیجئے۔" لکھنؤ میونسپل بورڈ کے چیرمین چودھری خلیق الزمان تھے ان کے ساتھ رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ میں نے محکمہ کے سکریٹری اور دوسرے حکام سے کہا کہ "میں درخواست دہندگان کے پاس جا کر ان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس پر سب نے کہا کہ آپ کو وہاں نہیں جانا چاہئے۔ افسروں کے پاس اس امر کی کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی کہ مجھے درخواست دہندگان کے پاس کیوں نہیں جانا چاہئے۔ چنانچہ میں نے حتمی انداز میں کہا "میں صبح وہاں جاؤں گی۔"

اگلی صبح میرے شوفر نے آنکھیں نیچی کئے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "میڈم سیکریٹری صاحب نے جو پتہ دیا ہے میں آپ کو وہاں نہیں لے جا سکتا" میں نے پوچھا تم کیوں نہیں لے جا سکتے؟ اس پر اس نے خاموشی سادھ لی۔ میں نے خود کار چلانے کا فیصلہ کر لیا اور گاڑی میں بیٹھ گئی میں اس وقت محکمہ کا سیکریٹری بھی غصے کے عالم میں آ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ شوفر پچھلی نشست پر چلا گیا۔ گاڑی چلنے لگی تو سیکریٹری نے بتایا "آپ کو جن عورتوں کی طرف سے درخواست ملی ہے وہ طوائفیں ہیں۔ ان کو میونسپل بورڈ نے شہر سے نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ ریڈ لائٹ ایریا ہے۔ آپ کا وہاں جانا مناسب نہیں۔ مگر کوئی بھی کھل کر آپ سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا" اس وقت میں بھی غصہ میں تھی تاہم میں نے کہا "یہ بات تمہیں کل مجھے بتانی چاہئے تھی۔ اب میں واپس نہیں جا سکتی۔" چنانچہ میں نے دیئے ہوئے پتہ پر جا کر عورتوں کی بات سنی۔ یہ وعدہ کیا کہ میں میونسپل بورڈ کے حکام سے بات کروں گی۔ درخواست دہندہ بیمار عورت تھی۔ میں نے اسے ہسپتال میں داخل کرنے کا حکم دیا لیکن دو، تین ہسپتالوں میں اسے اس لئے داخلہ نہ ملا کہ وہ طوائف تھی۔ آخر میرے تحریری احکام

صدق جائسی

کچھ تہفتہ داستانیں کچھ شگفتہ تذکرے

فانی حیدرآباد دکن میں

اُردو کے سب سے بڑے ادیب رشید احمد صدیقی نے غالباً "شگفتہ بیانی میری" میں لکھا ہے کہ انگریزی واقعہ نگاری اس طرح ہوتی ہے جیسے مصنف کچھ کہہ رہا ہے اور قاری کا ہم نوا ہے۔ اس کے برعکس اُردو عبارت کا اثر یہ ہوتا ہے جیسے مصنف اپنی بات نہیں کہہ رہا بلکہ جھنجھنا بجا رہا ہے۔ یا کوئی کرتب دکھا رہا ہے جس کا مقصد اپنا کمال دکھانا ہے۔

"دربارِ دُربار" حیدرآباد دکن کے عہدِ حیات کی بہت سی کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے۔ اولین کہانی حضرت صدق جائسی (اُردو کے نامور ادیب و شاعر) نے قلمبند کی ـــ اور کئی ایک رسالوں میں نقل ہوتی رہی۔ لیکن یہ سلسلہ پیوستہ نہ رہا۔ بلکہ اس کے بعض اجزا اپنی ناتمام صورتوں میں اِدھر اُدھر چھپتے رہے ہیں چونکہ اس دل آویز کہانی میں بعض ایسی روایتیں اور حکایتیں جمع ہو گئی ہیں جن سے مطالعہ شگفتہ نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض ایسے پہلو بھی سامنے آتے ہیں جو ہمارے لئے اجنبی یا مخفی ہیں۔ لہٰذا یہ ایک ایسے دربار کی رُوداد ہے جو اب تاریخ کے صفحوں میں منتقل ہو چکا ہے۔

آپ محسوس کریں گے کہ مصنف آپ سے جو کچھ کہہ رہا ہے سچ کہہ رہا ہے۔ وہ کوئی کرتب نہیں دکھا رہا۔ اور نہ اس کا مقصد اپنے کلام کی نمائش ہے۔ بس ایک واقعہ بیان کر رہا ہے جس میں نسخۂ اطبا کی طرح ایک ایک لفظ نپا تلا ہے ـــ غرض اس کہانی میں کچھ عبرتیں ہیں۔ کچھ اسباق اور کچھ تصویریں۔
ایسی تصویریں جن کا رنگ و روغن امتدادِ زمانہ سے مدھم ہوتا جا رہا ہے۔　　　(ادارہ)

جوشؔ کی عادت

جوشؔ کی عادت تھی کہ گفتگو کی ابتدا ہمیشہ ایک نئی بات سے کرتے۔

چنانچہ اپنی اسی عادت کے مطابق ایک دن کہنے لگے کہ فانیؔ آج کل بہت پریشان ہیں۔ (اس سے میں اب ان کا نام مطلق نہیں جانتا (کام سے واقفیت مراد تھی) میرے پاس اُن کے کئی خطوط آئے ہیں بیچارے بہت سخت مصیبت میں مبتلا ہیں۔ سوچتا ہوں کسی موقع سے مہاراج سے عرض کروں اور انھیں یہیں بلواؤں۔ (مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کی طرف اشارہ تھا) میں نے جواب دیا۔ ضرور کہیئے۔ بات یہیں ختم ہو گئی۔ ارادہ جوشؔ کا تھا۔ ہفتوں پر ہفتے اور مہینوں پر مہینے گزرتے رہے۔ پھر کبھی فانیؔ کا ذکر نہ آیا۔ چھ سات مہینے کے بعد کیا دیکھتا ہوں کہ جوشؔ شام کے وقت اپنے گھر پر بیٹھے ہیں۔ سامنے لکڑی کا خوبصورت سا کٹا ہوا ایک ٹکڑا رکھا تھا جس پر گولائی میں باریک باریک خطوط بڑی [illegible] سے کھینچے ہوئے ہیں مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ فرمایا بڑے موقع سے آئے ہو یہ پلینچٹ ہے اس پر ہاتھ سے رُوحیں آتی ہیں جن رُوحوں سے چاہو باتیں کر سکتے ہو۔

اب میں نے لکڑی کے اس ٹکڑے کو غور سے دیکھا۔ جس میں بیچ سے ایک ڈورے کے ساتھ پنسل کا ایک ٹکڑا بھی بندھا ہوا تھا۔ پنسل کا ٹکڑا جوشؔ نے ایک نوعمر لڑکے کو پکڑا دیا اور سادے کاغذ کا ایک ورق اس کے سامنے رکھ کر لکڑی کے ٹکڑے سے یوں مخاطب ہوئے۔

"میں حافظ شیرازی کی رُوح سے باتیں کرنا چاہتا ہوں" دو تین بار اس فقرے کی تکرار کی۔ آخر کار لڑکے نے پنسل سے کاغذ پر لکھنا شروع کر دیا۔ پہلے حافظ شیرازی لکھا۔ جوشؔ کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا مجھ سے کہنے لگے روح آگئی۔ رسمی صاحب سلامت اور مزاج پرسی کے بعد پوچھا "آپ کس حال میں ہیں۔" جواب ملا "اچھے حال پر ہوں۔" "آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" "بالکل نہیں" دس بیس پچا

سوال [illegible] نہیں لے کر کے جوش نے کہا۔ حضرت! میرے دوست فانی آج کل [illegible] تکلیف میں ہیں۔ میں انھیں حیدرآباد بلوا لوں؟ جواب ملا بلوا لو [illegible] انھیں ملازمت مل جائے گی۔ مگر چند روز انتظار کرنا ہوگا۔

میں نے دیکھا کہ اس کھیل سے جوش میں تازہ جوش پیدا ہو گیا اور وہ [illegible] جو بیشتر فانی کے بلوانے میں اٹھیں تھا۔ باقی نہیں رہا یہ دوسرا [illegible] تھا کہ فانی انھیں یاد آئے۔ اس کے بعد خاقانی، انوری، [illegible]، ظہوری، سعدی، امیر خسرو، فردوسی، اور نہ جانے کن کن کی روحوں کو جوش عالم بالا سے گھسیٹ گھسیٹ کر بلاتے اور اس لڑکے کے جواب سے مطمئن نظر آتے رہے۔

کبھی کبھی بیچ میں ایسا اتفاق بھی پیش آ جاتا کہ جوش نے عمر خیام کو یاد کیا اور لڑکے نے کاغذ پر شیطان لکھ دیا۔ جوش برہمی سے پوچھتے۔

"شیطان صاحب آپ [illegible] زحمت فرمائی" [illegible] شیطان لکھتا، زحمت کیسی میں تو ہر وقت تمہارے ساتھ رہتا ہوں۔ اس پر قہقہہ پڑتا۔ احباب کہتے اچھی کہی۔ جوش ہنس کر اثبات میں سر ہلاتے یعنی بیشک اچھی کہی

یہ کھیل بھی مہینوں جاری رہا اور فانی آگرہ میں سختیاں جھیلتے رہے خدا خدا کر کے جوش نے مہاراجہ بہادر سے عرض کر کے فانی کی طلبی کی منظوری حاصل کر لی اور انھیں لکھ بھیجا کہ تم حیدرآباد آ جاؤ۔

فانی کی آمد

فانی آئے اور عزیز کمپنی میں مہاراجہ کے حکم سے ٹھہرا دیئے گئے مہاراجہ نے ان کی زبان سے ان کا کلام سنا تو بیحد مسرور ہوئے۔ اور تادیر خوشنودی کا اظہار کرتے رہے

اب فانی عزیز کمپنی کے بالاخانے پر مقیم تھے دونوں وقت کی چائے اور کھانا جس وقت چاہیں منگوالیں مگر سوال عیال کا تھا جو ہنوز بے سر و سامانی کے عالم میں آگرہ میں قیام پذیر تھے جن کا خیال فانی کے لئے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ دوسری مشکل اس سے زیادہ سخت یہ پیش نظر تھی کہ حیدرآباد کے بے فکرے امیرزادے جن کو ہواخوری، برج اور گپ شپ کے علاوہ کوئی کام ہی نہ تھا۔ ان کے لئے ایک کام نکل آیا وہ صبح شام فانی کی ملاقات کو آنے لگے ان ایک جنگ اور ڈھنگ [illegible] ورود مسعود سے فانی بہت دل تنگ تھے۔ کیونکہ ان کی رسمی خاطر و تواضع ایک مرد شریف کی حیثیت سے فانی پر فرض تھی اور ان کی جیب اس کی متحمل نہ تھی۔ یہ مشکل کیونکر کیسے اور کس نے حل کی۔ اسے جوش مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ مگر دو ہفتے کے اندر ہی آرائش بلدہ کا ایک مختصر در ہوادار مکان دس روپے ماہانہ کرائے کا ان کو دلوا دیا گیا۔ اور وہ عزیز کمپنی سے محلہ [illegible] میں منتقل ہو گئے۔

مہاراجہ کشن پرشاد نے دو سو روپیہ ماہانہ اپنی جیب سے مقرر فرما دیا اور فانی کو کسی قدر سکون میسر آیا۔ اس کے بعد ہی پہلی فرصت میں وہ اپنے اہل و عیال کو بھی لے آئے جن میں بیگم فانی کے علاوہ فیروز علی خان اور وجاہت علی خان دو صاحبزادے بھی تھے۔ یہی فانی کا مختصر کنبہ تھا لڑکے دونوں جوان تھے مگر ان کا محبوب مشغلہ صرف ناول دیکھنا، کیرم کھیلنا یا گھومنا پھرنا تھا۔ انھوں نے دنیا کے کسی کام کو کبھی التفات کی نظر سے نہ دیکھا اور اسی طرح ہنستے کھیلتے اپنی جانیں جان آفریں کے حوالے کر دیں۔

ان صاحبزادوں میں وجاہت علی خان نے شاید دو چار کتابیں طب کی پڑھی تھیں۔ فیروز علی خان کبھی کسی علم و فن کے قریب نہ گئے تھے۔

اب فانی روزانہ مہاراجہ بہادر کے دربار میں حاضر ہونے لگے اور شاید جوش ہی کی تحریک پر مہاراجہ بہادر نے ان کے لئے منصفی کا عہدہ تجویز کیا فانی بی اے ایل ایل بی تھے۔ اس لحاظ سے یہ تجویز نہایت معقول تجویز تھی۔ اگر وہ منصفی منظور کر لیتے تو یقیناً جج سے ریٹائرڈ ہوتے اور ساری عمر عزت اور چین سے بسر کرتے مگر نوشتۂ تقدیر تو یہ تھا کہ مرتے وقت دوا اور غذا دونوں سے محروم رہیں۔

فانی نے منصفی کو اس بنا پر منظور نہ کیا کہ انھیں حیدرآباد سے باہر جانا پڑے گا۔ اور وہاں شہر کی سوسائٹی اور شہر کا ماحول انھیں نصیب نہ ہوگا وہ سوسائٹی کے عاشق تھے۔ اور اسی سوسائٹی نے ان کے ساتھ وہ تغافل برتا جو تغافل مجرمانہ کی حد تک پہنچ گیا۔ یہ فانی کی رائے کی غلطی تھی۔ سوسائٹی دولت اور اطمینان چاہتی ہے۔ اور اس وقت وہ ان دونوں سے محروم تھے۔

مہاراجہ سے عرض کر دیا گیا کہ فانی بیرون بلدہ جانے کے لئے راضی نہیں ہیں۔ اس حالت میں تعلیمات کے محکمے کے سوا دوسرا محکمہ نہ تھا۔ جس میں بآسانی ان کا تقرر ممکن ہوتا۔ چنانچہ دارالشفا ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر کے عہدے پر مامور کر دیئے گئے۔ جسے انھوں نے بخوشی منظور کر لیا۔

حیدرآباد میں ایک کہاوت لوگوں کی زبان پر ہے جس گھر میں
سے جو شتی ہے چھلکے میں جوتا جاتا ہے (ایک سے بدتر ایک سواری
ہوتی ہے) اور جس مرد کی قسمت پھوٹتی ہے تعلیمات میں ملازم ہوتا ہے
یہیں سے فانی کی قسمت کا آغاز ہوتا ہے۔ ملازمت کے بعد ہی ان کو ملکی
سرٹیفکیٹ پیش کرنا ضروری تھا بغیر اس کے محاسبی سے تنخواہ جاری
نہ ہوتی۔ دوسرا سوال عمر کا تھا۔ کیونکہ سرکاری ملازمت [illegible] ۴۰ سال
عمر کی قید تھی اور فانی ۵۰ برس کے ہو چکے تھے [illegible]
استثنا کی درخواست فانی کی طرف سے [illegible] پیش ہوئی
فانی کی بدبختی ہر منزل پر ساتھ تھی۔ بارگاہ خسروی سے ان کی درخواست
پر اعتراض ہوا۔ کہ جب معمولی معمولی خدمتوں پر غیر ملکیوں کا تقرر کیا جائے
گا تو ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان حصول ملازمت کے لئے کہاں جائیں گے۔؟
اس نوٹ کا پیشی سے واپس آنا تھا کہ حیدرآباد کے اخباروں
نے بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا دیا۔ ہفتوں بلکہ مہینوں ان اخباروں
میں اہل ملک کی موافقت اور غیر ملکیوں کی مخالفت میں مضامین نکلتے رہے۔
تعصب کے ان شیدائیوں کو اس وقت کی کیا خبر تھی کہ ہم یہ کلہاڑی اپنے
ہی پاؤں پر مار رہے ہیں۔ اور فانی کی مخالفت نہیں۔ حقیقت میں اپنی ہی
مخالفت کر رہے ہیں۔

خدا خدا کر کے اس طوفان کا زور گھٹا اور مہاراجہ بہادر کی خاص
سفارش پر فانی کی دونوں درخواستیں منظور ہو گئیں۔

اس زمانے کو فانی کے اطمینان کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ
ڈھائی سو اسکول سے اور دو سو مہاراجہ کی سرکار سے ان کو ماہوار ملنے لگے
لیکن اس سکون کو بھی فانی نے خود اضطراب سے اس طرح
بدل ڈالا کہ اپنے اسکول کی انجمن سے سودی قرض لے کر موٹر خرید لی۔
اس قرض کے بعد ان کی تنخواہ سے کم و بیش سو روپے ماہانہ کی قسط قرض
میں وضع ہونے لگی۔ دوسرا سینکڑہ پیٹرول کے اخراجات اور ڈرائیور کی
تنخواہ کی نذر ہونے لگا۔ اس طرح اب اسکول سے جو کچھ فانی کے ہاتھ
آتا وہ صرف پچاس ساٹھ روپے کی حقیر رقم تھی۔

لے دے کے اب مہاراجہ کے اسی عطیے پر جو فانی کو ان کی سرکار
سے ملتا تھا۔ فانی کی بسر اوقات تھی۔ اس آمدنی میں فانی آرام و اطمینان
کے ساتھ کھانا ضرور کھا سکتے تھے۔ لیکن اطمینان و آرام کی زندگی
ان کی قسمت ہی میں نہ تھی۔ جوش نے ان کو جونیئر پرنس کے دربار میں
پہنچا دیا۔ اپنے نزدیک تو جوش صاحب نے عنایت پر عنایت فرمائی
مگر ان کی یہی عنایت بالآخر فانی کے حق میں زہر ہلاہل ثابت ہوئی
پرنس کا دربار رات کو ہوا کرتا تھا۔ جس کی شرکت ظاہری اعزاز
کے علاوہ شب بیداری کا [illegible] ل درباریوں کے نامۂ اعمال میں علیحدہ
لکھواتی تھی اور یہی اجر پندرہ برس کی مسلسل حاضر باشی میں فانی
کے ہاتھ آیا۔

پچاس سے اوپر عمر، اس پر رات رات بھر کی دربار داری
عموماً تین چار بجے شب کو مصاحبت سے چھوٹتے تو بہ مشکل ۸ بجے دن کو
بستر سے اٹھتے اور جلدی جلدی تیار ہو کر کسی نہ کسی طرح ۱۱ بجے دن تک
اپنے کو اسکول میں پہنچاتے۔ اسکول کا کام روز روز ابتر ہونے لگا
انسپکٹر آف اسکول کے پاس خفیہ رپورٹیں پہنچنے لگیں کہ فانی صاحب
گیارہ بجے دن سے پہلے اسکول نہیں آتے اور آنے کے بعد دفتر میں
آرام سے کرسی پر پڑے سویا کرتے ہیں۔

فانی اپنی شرافت نفس سے ہر شخص کو شریف سمجھتے تھے جن کو
اپنا ہوا خواہ جانتے تھے، ان سے دربار کی رنگ رلیاں مزے لے لے کر
سناتے۔ اس سے قطعی بے خبر کہ آدمیوں ہی میں اہل نفاق بھی ہوتے
ہیں۔ وہی لوگ جو دربار کی داستانیں فانی کی زبانی سنتے۔ شام
کو جا کر من و عن انسپکٹر آف اسکولس سے دہرا آتے تھے۔

ان شکایتوں کا جو اثر ہونا چاہئے تھا وہ ہوا۔ مگر مہاراجہ بہادر
کے خیال سے انسپکٹر صاحب فانی سے خوش اخلاقی سے پیش آنے پر
مجبور تھے۔ وقت گزرتا گیا۔ فانی رات کو شاہزادے کی مصاحبت
اور دن کو لولی لنگڑی ہیڈ ماسٹری کرتے رہے۔ مسلسل شب بیداریوں
کی بدولت ان کی صحت بگڑتی رہی۔ جس کی بدولت مہاراجہ بہادر کے
دربار سے اکثر غیر حاضر رہنے لگے۔ مگر بدبختی سے فانی شاہزادے کی مصاحبت
کو جس کا صلہ زبانی قدردانی کے علاوہ چار سال کی حاضر باشی میں کچھ نہ
ملا تھا۔ اپنے حق میں کیمیا ہی سمجھا کئے۔

پانچ برس اور اسی مشقت میں گزر گئے اور اسی عرصہ میں
فانی کی عمر عزیز کے پچپن سال بھی پورے ہو گئے۔ جو ملازمت سے
سبکدوشی کی عمر تسلیم کی گئی ہے۔ سررشتے سے فانی کی سبکدوشی
کی تحریک کی گئی۔ مگر مہاراجہ بہادر ہنوز صدارت عظمیٰ کے منصب جلیل
پر فائز تھے۔ انھوں نے فانی کی ملازمت میں پانچ سال کی مزید توسیع

فرمادی۔

تقدیر کا تماشہ

دو برس کے بعد مہاراجہ بہادر اپنی خدمت سے خود ریٹائر ہو کر خانہ نشین ہو گئے۔ مہاراجہ کا ہٹنا تھا کہ فانی کو حیدر آباد کے زمین و آسمان بدلے ہوئے معلوم ہونے لگے۔ اب تعلیمات کے جس عہدیدار سے ملنا چاہتے ہیں وہی عدیم الفرصتی کا عذر کر کے ملاقات سے انکار کرتا ہے۔ انسپکٹر آف اسکولس جو پیشتر اخلاقِ مجسم نظر آتے تھے، اب خشکی سے پیش آنے لگے۔ اور ایک مہینہ کے اندر فانی کو تبادلے کے احکام مل گئے۔

یہ تبادلہ ضلع ناندیڑ کے کسی تحصیل کے ہائی اسکول میں کیا گیا تھا جہاں تحصیلدار اور منصف کے علاوہ تعلیم یافتہ آدمی ڈھونڈے نہ ملتا۔ احباب کے سمجھانے بجھانے سے فانی نے جا کر اپنے عہدہ کا چارج ضرور لیا مگر جس ماحول کے عادی تھے اس کا فقدان دیکھ کر ایک ہفتہ کے اندر واپس آ گئے۔ رخصت بیماری جس کی درخواست دیکر فانی واپس آئے تھے مہینوں میں منظور ہوتی ہے اور منظوری کے بعد رخصت یاب کو کہیں نصف تنخواہ سر رشتے سے ایصال ہوتی ہے۔ اب تنخواہ کے ملنے کا تو کوئی سوال ہی نہ رہ گیا تھا۔ لے دے کے وہی دو سو روپے فانی کے وظیفہ کے تھے جو مہاراجہ بہادر کی سرکار سے ہنوز ملے جاتے تھے۔

اس زمانے میں فانی کا محض توکل پر بھروسہ تھا۔ مصاحبت شباب پر تھی کیونکہ دوسرا کوئی کام نہ تھا۔ ان شب بیداریوں کا جو اجر فانی کو آخرت میں ملا ہو، اسے وہ جانے۔ دنیا میں جو صلہ ہاتھ آیا وہ طرح طرح کی شکایات تھیں۔ خوشطبعیت سے اس مسلسل جنگ کی بدولت آئے دن ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑی رہتی تھیں۔ اور بیماریاں جب کبھی کو گھیرتی ہیں تو دوا دارو کے بغیر پیچھا نہیں چھوڑتیں اور مفت دوا اسپتال کے سوا کہیں میسر نہیں آتی۔ مصاحبت کی شان اس خیراتی علاج کی روادار نہ تھی۔ دن بھر فانی جاگنے سے اپنے ناتواں جسم میں چستی پیدا کرنے کی ناکام سعی میں مصروف رہتے۔ رات کو شاہزادے کے ساتھ ڈنر کھا کر تھوڑی توانائی پیدا کرتے۔ اور پھر صبح تک وہی دربار داری جس کے لئے وہ وقف ہو چکے تھے۔ یہ محفلیں جن میں فانی اپنی اوقات ضائع کرتے تھے وہاں کی اصطلاح میں مشاعرہ کہی جاتی تھیں جن کا تفصیلی ذکر دربار کے سلسلے میں میں علیحدہ کروں گا۔

تنگ دستی

فانی کی آمدنی گھٹ کر بہت کم رہ گئی تھی مگر خرچ کی کسی مد میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ ڈرائیور کی تنخواہ اور پٹرول کا خرچ اب بھی پہلے کی طرح موجود تھا۔ مگر یہ اخراجات پورے کس طرح ہوں۔ ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے فانی نے یہ ترکیب سوچی کہ مہاجنوں سے سودی قرضہ لینا شروع کر دیا۔

شام کے وقت فانی اب بھی موٹر پر ہوا خوری کے لئے نکلتے۔ کبھی کسی دوست کے گھر جاتے۔ کبھی باغ عام کی فرحت بخش ہوا سے اپنا غم غلط کرنے کی ناکام کوشش کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک نہ ایک دن شاہزادہ والا تبار ان کا سب قرض ادا کر کے ان کو ان مشکلات سے نجات دلا دیں گے۔ یہی خیال ان کے بعض احباب کا تھا۔

چوتھے پانچویں مہینے بیماری کی آدھی تنخواہ ہاتھ آتی وہ بھی مہاجن تک نہ پہنچنے پاتی۔ گوشت۔ دودھ۔ ترکاری۔ غلہ اور اسی طرح کے دوسرے متفرقات میں تقسیم ہو جاتی۔ مہاجنوں کا روپیہ سوایا اور سوایا سے ڈیوڑھا ہوتا رہا۔ جب فانی کو اپنے ڈوبنے کا یقین ہو گیا تو انھوں نے سوچا کہ تنہا ڈوب جانے سے بہتر ہے۔ مصیبت میں کبھی ایک رفیق ساتھ ہے تو مصیبت کی صورت [illegible] اتنی محسوس نہیں ہوتیں جتنی تنہا معلوم ہوتی ہیں۔ اس رفاقت کے لئے انھوں نے میرا انتخاب فرمایا۔

یہ اتفاق اس طرح پیش آیا کہ ایک رات کو پرنس کے سامنے انھوں نے اپنی ایک غزل، دل نہیں، قاتل نہیں کی ردیف و قافیہ میں سنائی۔ پرنس نے بہت کچھ اظہار پسندیدگی فرمایا۔ فانی آداب دربار کے مطابق اپنی جگہ سے اٹھ اٹھ کر شکر گزاری کے سلام کرتے رہے۔ پھر سنجیدگی اور متانت سے پوچھا۔ شعر تو سرکار یہ اسی زمین میں میرے دوست صدق جائسی نے نکالا ہے۔ جسے میں اپنی ناچیز غزل میں حاصلِ زمین سمجھتا ہوں۔ اور میرا یہ شعر پڑھ کر سنایا ؎

"اس کے لطفِ عام کو غیرت نہیں کرتی قبول
اور میں کمبخت لطفِ خاص کے قابل نہیں"

شعر اچھا تھا ہی، پرنس بے چین ہو گئے۔ اور اسی وقت نجم آفندی کو حکم دیا کہ کل سرِ شام زحمت فرما کر صدق کے گھر جائیے اور ان کو اپنے ساتھ ہل فورٹ میں لے آئیے (ہل فورٹ پرنس کے محل کا نام تھا۔

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

بی پی کیوئرالہ
ترجمہ ناظر جاوید

سوال

کنک بہادر نے ایک چودہ سالہ لڑکی سے شادی کی اور اسے اپنے گھر لے آیا۔

جو لوگ کنک بہادر سے واقف نہیں، میں انہیں بس یہ بتاتا ہوں۔ یہ شادی میرے لئے ایک دھچکا ہے اور میں خود اس کے بارے میں اور بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں۔

صوبے دار کنک بہادر ایک معمر آدمی ہے۔ میں نے کسی صوبیدار کو کم عمر نہیں دیکھا۔ یہ شاید اس کی دوسری شادی ہے۔ یونہی میرا خیال ہے پہلی بیوی سے اس کے دو بچے ہوں گے اور اس بیوی کی وفات کے بعد ہی اس نے اس چودہ سالہ لڑکی کو اپنی دوسری بیوی بنانے کا سوچا ہوگا۔

صوبے دار کے سرکاری مسائل اتنے ہوں گے کہ ان کی اہمیت ختم کرنے کیلئے چودہ سالہ لڑکی سے شادی کر لینا کوئی اچنبھا نہیں مگر اس بھولی بھالی لڑکی کے لئے جو ابھی شادی کا مطلب بھی نہیں سمجھتی ہو گی۔ یہ سب کچھ ضرور نیا ہوگا۔

میں نے پہلے بھی ایک شادی دیکھی ہے۔ میں دولہا کی طرف سے آیا تھا۔ بارات کی روانگی کا وقت چار بجے تھا۔ مگر آٹھ بجے تک برات دلہن کے گھر پہنچ نہیں پائی تھی۔ ہم سب بہت شور مچاتے رہے۔ لیکن دولہا میاں پر جا تری غسل خانہ ہی سے نہ نکلا۔ اس کا میک اپ مکمل نہیں ہو رہا تھا۔ آخر انسان ایک ہی مرتبہ تو اپنے آپ کو جی بھر کے سجاتا ہے بیاہ والے دن ــــ!

میں نے دولہا کو نہیں دیکھا تھا۔ گاؤں کی سینکڑوں عورتیں دولہا میاں کو ایک نظر دیکھنے کیلئے جمع تھیں۔ نہ جانے ان کے من میں کیسے خیالات ہوں گے۔۔۔؟ دولہا کے ذکر کے ساتھ ہی ذہن میں ایک بیس بائیس سالہ جوان کا چہرہ ابھر آتا ہے۔ شاید سب گاؤں والیاں بھی یہی سمجھ رہی تھیں۔ کافی دیر بعد شور مچا ــــ "دولہا آرہا ہے" ــــ "دولہا آرہا ہے ــــ!" سب دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔

آنے والے سبھی عمر رسیدہ تھے میں اندازہ نہ کر سکا کہ ان سب میں دولہا کون ہو سکتا ہے؟ کالا کوٹ پہنے ہوئے ایک صاحب سب سے الگ معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے سوچا یہی دولہا ہوگا اور واقعی وہ دولہا ہی تھا۔ وہ اپنی حرکات و سکنات سے بظاہر اپنے جذبات کو چھپانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کا چہرہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ آج دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی ہے۔

آٹھ بجے دولہا اپنی برات لے کر چلا۔ وہ تو ہاتھی پر سوار تھا اور براتی پیدل تھے۔ دولہا کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں دولہن کا ایک روایتی سا تصور ابھرا۔ میں نے ساتھ والے سے پوچھا "یہ ان کی پہلی شادی ہے"

"نہیں" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اس کی پہلی بیوی کہاں ہے" میں نے پھر سوال کیا۔

"وہ مر گئی ــــ اس سے اس کے دو بچے ہیں۔" وہ شخص بتا رہا تھا ــــ "مجبوراً اس کو دوسری شادی کرنا پڑتی ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کوئی بھی مرد نہ گھر کی دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ نہ بچوں کی پرورش ہو سکتی ہے!"

اس شخص کی باتیں سنتے سنتے میں نے سوچا یقیناً نئی دولہن بھی عمر رسیدہ ہوگی۔ تبھی تو وہ گھر گرہستی بھی کرے گی اور بچوں کو بھی سنبھال سکے گی۔

برات پہنچی تو میں جلدی سے منڈپ میں داخل ہوا۔ صرف دولہن آگئی ہے۔ بچے اور عورتیں دولہن کو دیکھنے کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے۔ میرا خیال ہے وہ بھی یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ آج کی دولہن کم سے کم پچیس تیس برس کی ہوگی جو امور خانہ داری کی ماہر اور بچوں کی پرورش میں طاق ہو گی۔ جلد ہی دو عورتیں سرخ ریشمی چادر میں لپٹی چھوٹی سی کم عمر سی لڑکی کو منڈپ میں لائیں۔ یہ مشکل چودہ سال کی تھی جسے چالیس برس کے مرد کے ساتھ بیاہا جا رہا تھا۔ اور جس کے پہلے ہی سے دو بچے بھی تھے۔

صوبے دار کنک بہادر کے بارے میں بھی جب میں نے سنا کہ اس نے چودہ سالہ لڑکی کو بیوی بنا لیا ہے تو اس پرانی شادی

کیا وہ ناراض ہو گئی۔ اس لڑکی ہیرا منی کے لئے میرا دل دکھی ہوا۔ نہ جانے وہ خوش ہو گی یا پریشان اور حیران ——— میں نے خواہ مخواہ اس سے ہمدردی محسوس کرنے لگا اور یونہی اس کے بارے میں سوچتا چلا گیا۔ اس چھوٹی سی لڑکی نے جب اپنی شادی کے بارے میں سوچا ہو گا تو کیسے اس کے دل وجان میں پھلجھڑیاں سی چھوٹی ہوں گی۔ سکھیاں سہیلیاں اسے چھیڑتی ہوں گی تو وہ شرما کر، لجا کر دوہری ہو جاتی ہو گی۔ اس نے ذہن میں شوہر کا تصور کیا ہو گا۔ ایک نوجوان بانکا سجیلا سا شہزادہ یا پھر کا سن خوردہ انسان ——— یقیناً اس کے خواب کچھ اور ہوں گے۔ اس نے مجنوں کے، زندگی کی تازگی اور تابندگی کے خواب دیکھے ہوں گے۔

میں نے ہیرا منی کے بارے میں سوچا۔ وہ اپنے حجلۂ عروسی میں جب اپنے دولہا کو دیکھے گی تو اس پر کیا کچھ گزرے گی۔؟ میں نے اپنے آپ ہی ہیرا منی کے سپنوں کی تعبیر ڈھونڈنا شروع کی۔ اپنے دولہا کو دیکھ کر اس نے کیا تاثر لیا ہو گا۔ یہ جاننا بہت مشکل ہے۔ تصور میں ہی میں نے صوبے دار کنگ بہادر کو اپنی دولہن سے باتیں کرتے سنا۔

کنگ بہادر نے کتنے رسان سے کہا۔ "میری رانی"۔

اور ہیرا منی کے من میں بچپن کی یادیں کوند گئیں۔ ریت کے گھروندے بنانے اور بچپن کے کھیل کھیلتے کھیلتے اسے پڑوسی کے لڑکے نے رانی کہا تھا اور وہ خود راجہ بنا تھا۔ وہ کتنا سندر کھیل اور کتنا کومل لمحہ تھا مگر اس وقت ایک بوڑھے کا یوں بچپن کا کھیل کھیلنا اسے قطعی اچھا نہ لگا۔

کنگ بہادر نے ہیرا منی کو اور قریب کھینچتے ہوئے پوچھا۔

"میری رانی۔ کیا تم بھی مجھے چاہتی ہو؟"

"ہاں میں تم سے پیار کرتی ہوں ——" ہیرا منی نے یوں مشینی انداز میں جواب دیا، جیسے شاید وہ یہ سن کر خوش ہو جائے۔

"مجھے پیار کرنے دو ——" صوبے دار نے منت کرنے کے انداز میں کہا۔ ہیرا منی حیران رہ گئی (اور میں تصور ہی تصور میں اس سے زیادہ حیرت ہوا کہ اس نے پیار کرنے کی خواہش کی ہے۔ یہ ایک بچے کے سلسلے ہے یا لئے۔ یوں سمجھ کر!!)

ہیرا منی نے بازوؤں کے حصار کو توڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے نیند آرہی ہے۔ سونے دو۔"

"اتنی جلدی ——" کنگ بہادر نے بڑی محبت سے کہا اور اس کے چہرے پر سایہ سا ہوا اور کرب کے سائے تھرک گئے۔ مگر اس نے پھر کوشش کر کے کہا۔

"آؤ باتیں کریں۔ سونے کیلئے تو عمر پڑی ہے۔"

ہیرا منی پہ نیند کا غلبہ تھا۔ مگر وہ سو نہ سکی۔ وہ کچھ بھی بولے بغیر ایک ٹک اپنے شوہر کا منہ تکتی رہی۔ اس طرح جیسے یہ جاننا چاہتی ہو کہ کنگ بہادر کہنا کیا چاہتا ہے اور پھر جو کچھ وہ سمجھ بھی سکی ہے، اس سے اسے کیا دلچسپی ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ساری تصویریں کیوں میری آنکھوں میں پھر گئیں۔ ہو سکتا ہے ہیرا منی اور کنگ بہادر میں ان میں سے کوئی بات بھی نہ ہوئی ہو۔ جن کے بارے میں میں نے تصورات کے اتنے محل تعمیر کر لئے ہیں۔ ممکن ہے اس نے صرف اتنا پوچھا ہو۔

"میری بچی۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

اتنی شفیق اور محبت بھری آواز سن کر اس نے جواب دیا ہو۔

"ہیرا منی۔"

"تم نے کہاں تک پڑھا ہے؟"

"کا۔ کھا۔ ختم کر کے میں نے ابھی پہلی کتاب ہی شروع کی تھی۔"

"اچھا، اب میں تمہیں مزید پڑھاؤں گا۔ تمہیں نیند آ رہی ہے۔ شاباش جاؤ سو جاؤ۔"

ایک باپ جس طرح اپنی بیٹی کا خیال رکھتا ہے، شاید اس نے ایسا ہی کیا ہو اور پھر اپنے گھر کے اور حکومت کے کام کاج میں لگ گیا ہو۔ صبح اسے جگایا ہو.... ناشتہ کرایا ہو۔ اور تیار کرا کر سکول بھیجا ہو۔

مگر ایک سوال مجھے پریشان کئے ہوئے ہے کہ اگر ایسا ہی ہونا تھا تو صوبے دار کنگ بہادر کو اس کے ساتھ دوسری شادی کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیا اس لئے اس کے ساتھ شادی کی تھی کہ اس کی کوئی بیٹی نہیں تھی اور وہ دو بیٹوں کے ساتھ ایک بیٹی کو بھی پالنا چاہتا تھا اور اگر ایسا ہی ہو گا تو پھر اسے اپنی اس بیٹی کی شادی کرنا ہو گی اور اسے کسی اور کے گھر بھیجنا ہو گا۔

نہ جانے کیوں ایسے سب سوال مجھے پریشان کئے ہوئے ہیں؟۔

مشاعرہ دیوبند

کریمی الاحسانی

دیوبند (یوپی) میں ہر سال ایک میلہ چودس پر لگتا ہے اسی میلہ کی تقریبات کے سلسلے میں آج ۸ راپریل ۱۹ء شب میں ایک محفلِ شعر و سخن منعقد ہو رہی ہے پنڈال میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہے نہ اسٹیج پر بیٹھنے کی گنجائش۔ پونے گیارہ بجا چاہتے ہیں۔ لیجئے اس مشاعرہ کے کنوینر جناب توصیف صاحب نے صدارت کے لئے مسٹری خوب سنگھ ساہنی ـــــ کا اسم گرامی پیش کر رہے ہیں۔ جناب ڈاکٹر بشیر بدر تائید فرما رہے ہیں اور پھر جناب اللہ جلالپوری سے نظامت کیلئے درخواست کر رہے ہیں جس کا تالیوں سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے اللہ صاحب سرزمینِ دیوبند کو نذرانۂ عقیدت پیش کر کے دعوتِ غزل دے رہے ہیں۔ سر قد بارہ بنکوی کو۔ سرور صاحب خمارِ ثانی بنے دیر سے بیٹھے ہوئے سامعین اور اہلِ ذوق کو یوں گرما چلے ہیں ؎

زلفِ دراز شانوں پہ کچھ یوں بکھر گئی
بس اک نظر اٹھی تھی کہ تابِ نظر گئی
وہ تھے رقیب کے گھر اور ہم پہنچ گئے
افسوس کس کے سر کی بلا کس کے سر گئی

داد کا عالم نہ پوچھئے اور آپ اسی بانکپن سے گلوکاری کا مظاہرہ کر رہے ہیں ؎

اتنا غرورِ ناز بھی فرمایئے نہیں
صورت خدا نے دی ہے تو اترایئے نہیں
وعدہ جو کیجئے تو خیالِ وفا رہے
جھوٹی کسی کے سر کی قسم کھایئے نہیں

سرور صاحب مشاعرہ کا خوب خوب شاندار اور لاجواب آغاز کر کے تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں لہٰذا اس عالمِ نغمگی میں سلیم گھتولی اکھا اسی دلکشی سے فرما رہے ہیں ؎

وہ اور تھا اک ستم ایجاد کر رہا ہے جو پہ نوچ کے صیاد جو آباد کر رہے ہے
جو دل میں غم عشق کو آباد کر رہے ہے + وہ اپنا سکون آپ ہی برباد کر رہے ہے

لو اور واہ کا شور کم ہوا تو مسکرا کر فرما رہے ہیں تھیں وہ صور تقدیر [illegible] ہوں راحت اندوری اور بابو جگجیون رام بنا ہوں ـــــ ایک تعجب میں سوچ رہا ہوں اوّل تو یہ کہ سلیم صاحب نابینا ہیں دوسرے یہ کہ عجیب بدذوقی کا مظاہرہ کر رہے ہیں دیکھا تو تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں اور انور صاحب اسی رنگ کو دو آتشہ کرنے کے لئے حق کانپوری کو دعوتِ نغمگی دے رہے ہیں۔ حق صاحب غزل سرا ہیں ؎

پہلے کبھی پوچھا تھا جواب پوچھ رہی ہے

اور چاند بدایونی فرما رہے ہیں۔ ع۔

بیوی مرے پینے کا سبب پوچھ رہی ہے

ایک غل غپاڑہ ہے کہ نئی غزل سنایئے۔ حق صاحب فرما رہے ہیں کہ ایک تازہ غزل سماعت فرمایئے داد اور حق صاحب لازم و ملزوم لہٰذا داد وداد چھوڑیئے غزل سنئے ؎

تمنا دم بخود ہے نیم بسمل حسرتِ دل ہے
الٰہی خیر ہو آج آئینہ ان کے مقابل ہے
تمیزِ نیک و بد زاہد یہاں پر سخت مشکل ہے
یہ دل والوں کا مجمع ہے جگر والوں کی محفل ہے
محبت میں وفا کی آخری منزل یہ منزل ہے
جہاں جینا بھی مشکل ہے جہاں مرنا بھی مشکل ہے
ہجومِ بیخودی میں یہ سمجھنا کتنا مشکل ہے
یہ جلوہ کس کا جلوہ ہے یہ محفل کس کی محفل ہے

خمار صاحب آج داد دینے میں سب سے آگے نظر آ رہے ہیں مسرت [illegible] سنگھ فرما رہے ہیں حق صاحب درباری میں پڑھتے ہیں ـــــ ایک [illegible] ڈاکٹر بشیر بدر صاحب فرما رہے ہیں یہ ایک راگ کا نام ہے [illegible] میں حق صاحب محفل کو گرما کر تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں [illegible] جھنکار میں ڈاکٹر ساغر اعظمی مائک پر آ کر غزل سرا ہیں ؎

وہ جس کے ساتھ بہت دور تک کو جانا تھا

سلوک اس کا مرے ساتھ تاجرانہ تھا۔

حاد نے ہنگامے کا رُخ پھر دیا ہے اس سج دھج سے فرمارہے ہیں ؎

ذرا میں راکھ سمیٹوں تو کچھ سراغ لگے
یہیں کہیں پہ مرا بھی غریب خانہ تھا
اسی لئے کوئی بادل ادھر نہیں برسا
کہ اب کے اپنے لہو میں ہمیں نہانا تھا

یہ گہوارۂ علم و ادب دیو بند ہے لہٰذا داد کا عالم نہ پوچھئے اور ساغر صاحب تشنگی بڑھا رہے ہیں ؎

بس ایک تیرا مجھے انتظار تھا ورنہ
کسی درخت کا سایہ تو اک بہانہ تھا

پھر حاد نے پنڈال اُڑانے کی کوشش کی ہے اور آپ ایک گیت سنا کر محفل میں ہنگامہ بپا کرکے تالیوں کے بے ہنگم شور میں خراماں خراماں جارہے ہیں لیجئے اب آپ الحاج شمسی مینائی سے بھی یہ قطعات سنئے ؎

خود اپنے شوق سے ہارے ہوئے کہاں جائیں
فریب وقت کے مارے ہوئے کہاں جائیں
جو پستیوں میں ہیں ان کے لئے سب کچھ ہے
بلندیوں سے اتارے ہوئے کہاں جائیں

آیا عجب دَور ہے اب کچھ نہ پوچھئے
غلہ بھی اب تو بٹنے لگا شکر کی طرح
اس حسنِ انتظام کے قربان جایئے
مٹی کا تیل بکنے لگا عطر کی طرح

داد کا ایک دھماکہ ہوا ہے کئی بار دُہرا کر عطا کر رہے ہیں ؎

بے عمل چشم تر سے کیا ہوگا
صرف دردِ جگر سے کیا ہوگا
دل کی حالت اگر نہیں بدلی
احتیاطِ نظر سے کیا ہوگا

شمسی صاحب خوب خوب گرج اور برس کر تالیوں کے شور میں پلٹ رہے ہیں انتخاب رنگ محفل بدلنے کے لئے چاند بدایونی مائک پر قبضہ کرکے محفل کی صحت میں اضافہ کر رہے ہیں ؎

عشق نے وہ فسوں کیا راہِ خرد سے ہٹ گئے
حسن پہ جب نظر پڑی حضرتِ دل رپٹ گئے
چہرے پہ غازہ الاماں ہونٹ پہ سرخی الحفیظ
اہلِ زمیں سے عشق میں اہلِ فلک بھی گھٹ گئے

ایک غل سا غل اور شور سا شور ہے اور چاند صاحب چاروں طرف جھک جھک سلام کرکے اسی سنجیدگی سے فرمارہے ہیں ؎

وہ اسٹیشن پہ آئے گی مجھے سی آف کرنے کو
کہا میں نے یہ گاڑی کر کے اس کا دیٹ جائیگی
اکڑ کر گارڈ بولا اب مجھے جھنڈی ہلانے دو
اگر تھوڑا بھی اکڑو گے تو گاڑی لیٹ جائیگی

اس ہلڑ بازی میں مسکرا کر فرمارہے ہیں باہر والوں کی نذر ہے اس پہ توصیف صاحب نے فرمایا کچھ دیوبند والوں کے نام بھی ــ جواباً چاند صاحب نے فرمایا ــ آپ کی نذر ہے اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے ارشاد ہوا ہے ؎

اک پری رُخسار اک جنسِ لطیف
نسلِ انساں کا مقدّر ہو گئی
ابنِ آدم نے پہن لیں چوڑیاں
بنتِ حوّا پھر منسٹر ہو گئی

ادھر ایک ہنگامہ بپا ہو رہا ہے اور آپ فرمارہے ہیں ایک لوٹا پائی ایک مٹکا کہئے ــ الحاج مظہر مظفر نگری فرمارہے ہیں۔ اس پہ یار لوگ مسکرا رہے ہیں اور چاند صاحب ان گنت قطعات رواں دواں سنا کر غل غباڑہ کرکے جارہے ہیں اور اس امتحان گاہ اور قربان کے میدان میں انور جبالپوری آکر اعتماد سے فرمارہے ہیں ؎

دوستو عیارِ دنیا کی تواضع کے لئے
آبِ زمزم ہو تو گنگا جل بھی ہونا چاہئے
آپ کی قربت سے یہ شب کٹ تو جائے گی مگر
ہم فقیروں کے لئے کمبل بھی ہونا چاہئے
یار تم کیوں آس پہ بارش کی بیٹھے ہو یہاں
آسمانوں پر کہیں بادل تو ہونا چاہئے

انور صاحب داد و تحسین پاکر اپنی جگہ آکر زحمتِ سخن دے رہے ہیں نور اندوری کو دیکھا تو نور صاحب سفید پتلون ــ لال جرسی زیب تن

گئے مائک پر آکر آلاپ رہے ہیں ؎

دلوں میں اگر بدگمانی رہے گی ـ پریشان ہر اک زندگانی رہیگی

سرِ شام اس نے بکھیری ہیں زلفیں

ہمارے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے عرض کیا زلف تو کالی ہوتی ہے لیکن فضا کیوں زعفرانی رہے گی غالبًا یہ حسینہ یورپین ہوگی دیکھا تو نور صاحب ایک اور ایک اور کے شور میں اسی بیچ و بیچ سے لہرا رہے ہیں ؎

وہ آنگن میں ہوں تو ٹھہرتی ہیں راتیں

بکھرتے ہیں گیسو سنورتی ہیں راتیں

سُنا کر داد میں ڈوبے خراماں خراماں عالمِ مستی میں پلٹ رہے ہیں آیئے پھر ایک لہجہ ایک انداز ایک منفرد غزل ڈاکٹر بشیر بدر سے سُنیں ؎

کوئی لشکر ہے کہ بڑھتے ہوئے غم آتے ہیں

شام کے سائے بہت تیز قدم آتے ہیں

مجھ سے کیا بات لکھانی ہے کہ [illegible] لئے

کبھی چاندی کبھی سونے کے قلم آتے ہیں

دل وہ درویش ہے جو آنکھ اٹھاتا ہی نہیں

اس کے دروازے پہ سو اہلِ [illegible] آتے ہیں

میں نے دو چار کتابیں پڑھی ہیں لیکن

شہر کے طور طریقے مجھے کم آتے ہیں

ڈاکٹر صاحب ہر حال میں داد و تحسین لوٹ ہی لیتے ہیں لہٰذا دو غزلیں عطا کر کے کامراں اپنی جگہ آ رہے ہیں اور انور صاحب درخواستِ کلام کر رہے ہیں راحت اندوری سے ــ راحت صاحب اپنے مخصوص انقلابی انداز سے یوں گرج رہے ہیں ؎

میں انتظار میں ہوں تو کوئی سوال تو کر

یقین رکھ میں تجھے لاجواب کر دوں گا

مجھے یقین کہ محفل کی روشنی ہوں میں

انہیں یہ خوف کہ محفل خراب کر دوں گا

مجھے بھروسہ ہے اپنے لہو کے قطروں پہ

میں نیزے کو شاخِ گلاب کر دوں گا

مہاجنوں سے کہو تھوڑا انتظار کریں

شراب خانے سے آ کر حساب کر دوں گا

راحت صاحب کئی قطعے سنا کر جا رہے ہیں اور توصیف صاحب مصر ہیں کہ ترنم سے سنایئے سامعین سے اپیل کر رہے ہیں میری خاطر آپ انہیں سنئے ـــ گویا راحت صاحب فرما رہے ہیں میں کوئی مجبوری کرنے نہیں آیا۔ اشعار سنانے آیا ہوں ـــ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ شاعر جو کہ فنکار بھی ہوتا ہے۔ بکا ہوا نہیں ہوتا۔ راحت صاحب کبھی ترنم سے پڑھتے ہوں گے لیکن جب وہ ترنم سے نہیں پڑھ رہے ہیں تو ان کو کیوں مجبور کیا جاتا ہے لہٰذا وہ بھی مائک سے نہایت خودداری سے الگ ہو رہے ہیں۔ ان دنوں ان کے اشعار کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اسی انقلابی انداز سے محفل کو گرمایا کریں ـــ ادھر توصیف صاحب بضد ہیں اور تیور بدل رہے ہیں کہ ترنم سے سنایا جائے اور ادھر راحت صاحب قلندرانہ شان سے اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں ٹس سے مس نہیں ہو رہے ہیں۔ لہٰذا انور صاحب نے مختصر سی درخواست کے بعد فرمایا دیوبند ایسی جگہ پر اگر ترنم کی فرمائش ہوئی تو میں سمجھوں گا کہ اُردو پر بُرا دن آ گیا اور اب سب ہی کی طرف سے راحت اندوری سے درخواست کی جا رہی ہے کہ وہ آ کر اپنا کلام سنائیں اس اعلان پر راحت صاحب کا تالیوں سے خیر مقدم کیا جا رہا ہے اور راحت صاحب پھر گرج رہے ہیں ؎

ظلم کے حق میں اصولوں کے پلے لگتے ہیں

میرے دشمن ہیں مگر پھر بھی بھلے لگتے ہیں

دوست۔ احباب۔ وفا۔ پیار۔ مروت۔ اخلاق

اب یہ الفاظ کتابوں میں بھلے لگتے ہیں

راحت صاحب تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں اور اب عالم فتحپوری تالیوں کی جھنکاریں آ کر فرما رہے ہیں ؎

ظلم پہ صبر کرو صبر کے پھل کو دیکھو

یعنی ظالم کے مکافاتِ عمل کو دیکھو

اپنے کردار پہ آ جائیں گے آنسو یارو

تم اگر آج کے آئینہ میں کل کو دیکھو

عشق کچھ اور نکھر جاتا ہے شامِ غم میں

تم اندھیرے میں کبھی تاج محل کو دیکھو

عالم صاحب بھی تالیوں کے شور میں مائک چھوڑ رہے ہیں اور انور صاحب مشاعرہ کو عروج کی طرف لیجاتے ہوئے درخواستِ کلام کر رہے ہیں شہریار غزل خمار بارہ بنکوی سے ۔۔ خمار صاحب

تالیوں سے استقبال کیا جا رہا ہے۔ قدرے سکوت کے بعد محفل کا جائزہ لے کر یوں محفل کو تشنگی میں ڈبونے چلے ہیں ؎

آنکھوں میں چراغوں میں اُجالے نہ رہیں گے
آ جاؤ کہ پھر دیکھنے والے نہ رہیں گے
اے ذوقِ سفر خیر ہو نزدیک ہے منزل
سب کہتے ہیں اب پاؤں میں چھالے نہ رہیں گے
جا شوق سے لیکن پلٹ آنے کے لئے جا
تا دیر ہم اپنے کو سنبھالے نہ رہیں گے
گھبرا نہ خمارؔ اس قدر آلامِ جہاں سے
یا دل یہ ہمیشہ ہی تو کالے نہ رہیں گے

خمارؔ صاحب محفل کو گرما کر مائک سے جُدا ہونا چاہتے ہیں کہ ایک اور ایک اور کے شور و غل نے ان کو پھر مائک سے جدا ہونے نہیں دیا اور اسی بیچ دھج سے غزل سرا ہیں ؎

مجھ کو شکستِ دل کا مزا یاد آگیا
تم کیوں اُداس ہو گئے کیا یاد آگیا
کہنے کو زندگی تھی بہت مختصر مگر
کچھ یوں بسر ہوئی کہ خدا یاد آگیا
میرے بغیر ہی جو گھٹا گھر کے کھل گئی
اک بے وفا کا عہدِ وفا یاد آگیا
حیرت ہے تم کو دیکھ کے مسجد میں اے خمارؔ
کیا بات ہو گئی جو خدا یاد آگیا

خمارؔ صاحب داد و تحسین لوٹتے تالیوں کے شور میں اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب صدر محترم جناب خوب سنگھ راہیؔ صاحب سے درخواستِ کلام کی جا رہی ہے۔ مسٹر راہی صاحب کیا آئے کہ فرمائشوں کا ایک ہنگامہ ساتھ لائے۔ آپنے کیا شروع کیا ہے یہ اللہ ہی جانے۔ یہ عالم ہے کہ یار لوگ سن کم رہے تھے اور داد زیادہ دے رہے تھے۔ آخر اس تفریح۔ خود ستی اور بدذوقی کو کیا کہا جائے کیا یہ کوئی منظم سازش تھی یا منصوبہ بند ہنگامہ ــــــ بمشکل تمام دو مطلع نوٹ کر پایا ہوں جو آپ تک پہونچانے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ سوچئے تو سہی آپ کیسے لاجواب کلام سے محروم رہ گئے آئیے سماعت فرمائیے ؎

راستہ چھوڑ کے ہٹ جائے ابھی دیر و حرم
شرط اتنی ہے کہ مل جائے ترا نقشِ قدم
بارِ عصیاں سے اُٹھائے نہیں اُٹھتے ہیں قدم
لے کے آیا ہے ترے در پہ مجھے تیرا کرم

پنڈال میں اسوقت کسی ہنگامہ یا مچھلی مارکیٹ کا گمان ہو رہا ہے تعجب ہے کہ محترم راہی صاحب بھی اس ہنگامہ کو نہیں تاڑ رہے ہیں کہ یہ داد ہے یا بیداد بہر حال آپ کے ساتھ ہی پہلا دَور تقریباً دو بجکر پچیس پر ختم ہو رہا ہے پھر شعرائے کرام کو دوسرے دور کے لئے مجبور کیا جا رہا ہے حالانکہ پہلے ہی دَور میں کئی شعرا سے دو دو تین تین غزلیں سنی گئیں اور وہ تھک کر چور بھی ہو گئے ہیں پھر بھی ان کو کمری کا مال یا قُرق شدہ اسباب اور مالِ غنیمت سمجھتے ہوئے مجبور کیا جاتا ہے یہ الگ بات کہ کئی شاعر نکل بھاگے ہیں یہ مشقِ ستم تقریباً ساڑھے تین بجے تک جاری رہی اس میں زیادہ وقت چاند صاحب نے چورن بیچنے میں ضائع کیا۔ اب مشاعروں میں یہ بدعت اور خرافات بھی داخل ہو گئی ہے ــ سڑکوں اور چوراہوں پہ مجمع لگانے والوں کو کیسے بُرا کہا جائے گا جب کہ آج اس محفلِ شعر و ادب میں زیادہ دیر تک یہی خرافات چلتی رہی اسی لئے شعرا جزبز ہو کر کھسکتے رہے اور توصیف صاحب بزعمِ خود خوش ہوتے رہے کہ اب مشاعرہ جما ہے یہ زیادتی تھی۔

یہاں ایک بات اور قابلِ ذکر یہ ہے کہ کئی مقامی شاعر بہت اچھا کہتے اور پڑھتے ہیں نہ جانے کیوں توصیف صاحب ہر سال ان پر یہ زیادتی کرتے ہیں کہ ان کو دیوبند کی نمائندگی کے لئے پیش نہیں کرتے۔ جب کہ ملک میں ان کو بلا کر ان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ ہر جگہ دو ایک مقامی شعرا کو پیش کیا جاتا ہے لیکن کئی سال سے توصیف صاحب مقامی شعرا کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ کیا یہ طریقہ کچھ اچھا ہے امید ہے کہ آئندہ جو صاحب مشاعرہ کے مطلق العنان کنوینر ہوں گے وہ اس زیادتی اور جانبداری کے مرتکب نہ ہوں گے۔ اور ساتھ ہی اس زمین کی تقدیس کا احترام کرتے ہوئے مشاعرہ کو میخانہ اور چنڈو خانہ نہ بنائیں گے اس میخانہ نما مشاعرہ کی وجہ سے بے شمار حضرات اس علمی و ادبی مجلس یعنی محفلِ مشاعرہ سے محروم رہ جاتے ہیں یقیناً آئندہ سال اس کا بھی تدارک اور سدِّ باب کیا جائے گا۔ کہاں دیوبند کی عظمت۔ دار العلوم

کا وقار۔ پاکیزگی۔ شہرت اور کہاں یہ مشاعرہ شرابیوں کی بزم۔ توبہ توبہ استغفر اللہ یہ مزدور ہنگامی کو ایسے محاسبہ کا حق نہیں ہے لیکن قوم کی دولت کا یہ بیجا مصرف اور استعمال بہر حال سب کو ہی کھٹکتا ہے اور یہ احتجاج اور انتباہ سب ہی کی طرف سے کیا جا رہا ہے اور حق بات کا اظہار کوئی جرم نہیں ہے۔

بقیہ: انکشافات ہی انکشافات

اپیل کی کہ وہ ہیضہ سے متاثرہ دیہات میں پہنچیں اور لوگوں کا علاج کریں جب محکمہ کے افسر دیہی علاقہ میں پہنچے تو عوام کی بہبود اور صحت وصفائی سے متعلقہ عملہ بھی پوری طرح حرکت میں آگیا۔ اس سے مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا کہ جب تک بااختیار افراد اپنے دفاتر سے باہر نکل کر عوام میں نہ جائیں اور کام کی نگرانی خود نہ کریں اس وقت تک کام نہیں ہو سکتا۔

یہ غالباً ۱۹۳۰ء کی بات ہے ماتا جی ایک جلسہ عام میں شریک تھیں وہ معمان پان سی تھیں۔ تدیجار رفٹ نوازنج تھا۔ وہ اکہری لبلی کی عورت تھیں۔ جلسہ عام پر لاٹھی چارج ہوا۔ تو ماتا جی بھی اس کی زد میں آئیں، لاٹھی کی چند ضربوں سے وہ بے ہوش ہو کر گر پڑیں اگر چند رضاکار انھیں پہچان نہ لیتے تو شاید وہ ہجوم میں کچلی جاتیں رضاکار انھیں اٹھا کر گھر لائے۔ اس وقت بھائی اور رنجیت پنڈت جی جیل میں تھے ان کو ماتا جی کے ساتھ پولیس کے سلوک کی اطلاع ملی تو انھوں نے احتجاجاً اپنی ملاقات بند۔ واپس کر دیں۔ اگرچہ لاٹھی کی ضربوں سے آنے والے زخم تو جلد مندمل ہو گئے۔ مگر بحیثیت مجموعی ماتا جی کی صحت گرتی جا رہی تھی بھائی جیل سے واپس ہو چکے تھے۔ ہم نے ماتا جی کو یورپ بھیجنے کا فیصلہ کیا ایک وقت ہم ان کی روانگی کا پروگرام طے کر رہے تھے میں تھکے اتر پردیش کی اسمبلی میں ایک بل پیش کرنا تھا اور رات ہی کو واپس جانا تھا۔ دو روز بعد بھائی نے ایک دورہ پر جانا تھا طے یہ ہوا کہ بھائی کی روانگی کے بعد ماتا میرے پاس آجائیں گی اور پھر ان کی یورپ روانگی کا تاریخ طے کی جائے گی۔ میں روانہ ہونے لگی تو ماتا جی بستر پر دراز تھیں انھوں نے مجھے اشیرباد دینے کے لئے اٹھنا چاہا تو بے جان ہو کر گر پڑیں۔ جلد ہی پتہ چلا کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ہے ماتا جی کی بڑی بہن بھی اس وقت وہیں تھیں۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ بھی

اس صدمہ سے پرلوک سدھار گئیں والدہ کی وہ ساڑھی جو پولیس کی لاٹھیوں سے خون آلود ہو گئی تھی الہ آباد کے قومی عجائب گھر میں محفوظ ہے

(جاری ہے)

بقیہ: کچھ نہفتہ داستانیں.....

دوسری شام کو یکایک نجم آفندی میرے گھر پر تشریف لائے میں سمجھا ملاقات کی غرض سے آئے ہیں مگر انھوں نے دو چار باتوں کے بعد اپنے آنے کا مقصد بیان کر دیا اور مجھ سے اصرار کیا کہ فوراً تیار ہو جائیے۔ میں اپنی حاضری کا ذکر کسی قدر تفصیل کے ساتھ علیحدہ کروں گا۔ اس کا ابھی موقع نہیں۔

اس طرح فانی نے مجھے اسی گرداب میں ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا جس میں کم و بیش دس برس سے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے اب دن کی ملاقاتوں کے علاوہ بحرف نی سے کبھی کبھی ان کے گھر پر ہوا کرتی تھیں۔ رات رات بھر دربار میں ساتھ رہنے لگا۔

اس طرح پورے سات سال مسلسل ان کی شب بیداریوں میں میں بھی برابر کا شریک رہا ہوں اور مجھ سے زیادہ فانی کو قریب سے دیکھنے کا دوسرے کسی کو موقع نہ ملا۔ جو ان کے دردناک انجام کو میری طرح من و عن لکھ سکے۔

میں انشاءاللہ اس فرض کو پوری ایمانداری سے ادا کروں گا۔ جو کچھ فانی سے خوش فکر شاعر پر حیدرآباد سے شہر میں اپنے دولت اور مقتول کی شان دیکھنا بے جا نہ ہوگا مگر سا مجھے صرف بحرف بیان کرنا ہے۔

(جاری)

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

* اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گرد و پیش خوشی اور مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
* ہم اپنے گھر صاف ستھرے رکھتے ہیں تو پھر اُن جگہوں کو صاف شفاف کیوں نہ رکھیں جنہیں ہم سب استعمال کرتے ہیں۔
* ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور درحقیقت ان تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں گرد و پیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ضروری ہے۔
* ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔ اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کیلئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔
* آپ بھی اس سلسلے میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے۔ اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمے کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور وہ صرف آپ کی خدمت کیلئے ہی رکھے گئے ہیں۔

آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے اِدھر اُدھر نہ بکھرنے پائے بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے

اسے صاف شفاف رکھیئے

ناردرن ریلوے

غزلیات

اختر شاہجہاں پوری

یہ دل کبھی نہ درازئ جہاں مانگے ہے
عشق سیمات کوئی اور کہاں مانگے ہے

وسعتِ بستی میں تو ہیں خارِ مغیلاں ہر سو
کیا کوئی آبلہ پا دشت ستاں مانگے ہے

اک جہاں گھوم پھرے کم دیوانۂ وحشتِ دل
پھر آمادہ کوئی تازہ جہاں مانگے ہے

تشنگی میں نے بسر کی ہے عبادت کی طرح
تو جبیں پہ مری سجدوں کا نشاں مانگے ہے

شام ہوتے ہی فروزاں کرو شمعِ امید
چشمِ غم ناب تو اب کاہکشاں مانگے ہے

اب خدا جانے کدھر رخ ہے ہوا کا اختر
تا ز منجدھار میں سب موجِ رواں مانگے ہے

بیخود شفائی دھولپوری

نہ دشمن کی خبر نہ دوست کا پیغام آتا ہے
برے وقتوں میں کب کوئی کسی کے کام آتا ہے

کچھ اس انداز سے برباد ہوتا ہے چمن اپنا
کہ بربادی کا خود اپنے ہی سر الزام آتا ہے

جس افسانے کی تحریر کی ہم نے اپنے خون سے لکھی
اس افسانے میں ذکر اپنا برائے نام آتا ہے

یہ کیا کم ہے ہماری داستانِ نامرادی میں
ہمارے نام سے پہلے تمہارا نام آتا ہے

وطن سے آنے والوں سے میں اتنا پوچھ لیتا ہوں
کبھی بھولے سے اس بچپن کا بھی نام آتا ہے

از زخمی حصاری

کیا کہوں کیا ہے مدعا دل کا
اب کہاں ہے وہ حوصلہ دل کا

بے وفائی پہ جان دیتا ہوں
کیا کروں آپ ہے باوفا دل کا

یا طبیعت کسی پہ آئی ہے
یا ہے کوئی یہ حادثہ دل کا

وادئ حسن میں رہیں جا کر
کبھی یہ بھی تھا اقتضا دل کا

شدتِ غم میں ہم نے دیکھا ہے
غنچہ غنچہ کھلا ہوا دل کا

جان کیا دی رہِ محبت میں
بڑھ گیا اور مرتبہ دل کا

خاک ہو کر بھی ہے وہی دمِ غم
کوئی دیکھے تو حوصلہ دل کا

رشتۂ عیش جب ٹوٹا ہے
سنگ و غم سے ہے رابطہ دل کا

عالمِ بے خودی میں اے زخمی
پوچھ کس کو پتہ گمشدہ دل کا

ہم ایک قوم ہیں

حضرت سلام ساگری

چراغِ حسن و اخوت کا پھر جلائیں گے
اور اس چراغ سے تاریکیاں مٹائیں گے

وطن کی آن پہ قربان کریں گے جاں اپنی
بہے گا خون تو ہم اور مسکرائیں گے

ہم ایک قوم ہیں کیا مسلم اور کیا ہندو
جہاں سے فرقہ پرستی کی بو مٹائیں گے

جنہیں فریبِ تعصب نے کر دیا تھا جدا
ہم ان کو اور وہ ہم کو گلے لگائیں گے

جو ہو چکے ہیں روایاتِ عشق سے خالی
حدیثِ عہدِ وفا ان کو پھر سنائیں گے

نہ امتیازِ من و تو نہ ذات پات کا فرق
ہم ایسی طرز کا ہندوستاں بنائیں گے

زمانہ بیت چکا ہے ہوس کی ہولی کا
یہ گل نہ اپنے گلستاں میں اب کھلائیں گے

گیا زمانے سے گمراہیوں کا دور گیا
جہاں کو مرکزِ جمہوریت پہ لائیں گے

سلام اپنی وفاؤں پہ ناز ہے ہم کو
وطن کا حکم جو ہوگا تو کام آئیں گے

مر کے بھی ہم خیالِ مئے رکھتے ہیں
چاہیئے تربت ہماری سایۂ انگور میں

شاعر نے سارے دوستوں کو یہ دعوت دی کہ قبرستان جائیں اور ایسی جگہ تلاش کریں جہاں سایۂ انگور مل سکے ۔

آپ جانتے ہیں اس دنیا میں سب سے ظالم شے محبت ہے۔ اگر کسی عام آدمی کو محبت ہو جائے تو وہ آم کی گٹھلی کی طرح ہو جاتا ہے اور اگر کسی خاص آدمی کو یہ سیل گذارہ ہو جائے تو پھر محبت ایک تاریخ بن جاتی ہے۔ ادیب و شاعر کو محبت ہو جائے تو دنیا کی سب سے بڑی ٹریجڈی جنم لیتی ہے۔

کسی ادیب کو جوانی میں محبت ہو گئی ۔ لیکن اس ہونہار ادیب نے مرتے دم تک کسی کو یہ پتہ لگنے دیا کہ اس کا محبوب کون ہے بس وہ روزانہ ایک خط لکھتا رہا اور انہیں ایک کمرے میں جمع کرتا رہا۔ جوانی کے عالم میں اس نے "خط بازی" شروع کی اور بڑھاپا آ گیا لیکن خطوط نویسی کا مشغلہ باقاعدہ جاری رہا۔ جوانی میں ادیب نے آنکھوں میں سرمہ لگا لگا کر خطوط لکھے اور بڑھاپے میں آنکھوں میں عینک چڑھا چڑھا کر نامہ پہ نامہ لکھا۔ لیکن ڈاک کے سپرد نہیں کیا جب اس کا کوچہ تک خطوط سے بھر گیا تو ایک دن ان طویل خطوط کو دیکھ کر اسے خیال آیا کہ یہ تمام خطوط محبوب کو بھیج دینا ضروری ہیں۔ ادیب سوچ رہا تھا کہ ساٹھ سال بعد جب بوڑھے محبوب کو یہ علم ہو گا کہ ایک ادیب اس سے محبت کرتا ہے تو ممکن ہے کہ یہ یاد دہانی اسے دوبارہ جوان کر دے ۔ چنانچہ اس نے تمام خطوط کو فراہم کرنا شروع کیا اور پورے ڈیڑھ یوم کی تگ و دو کے بعد وہ تمام خطوط بنڈلوں کی صورت میں اکٹھے ہو گئے اور پھر ادیب نے ان بنڈلوں کو لمبی رسی کے ساتھ باندھ دیا۔ یہ کام کرنے کے بعد نامہ بر کی تلاش ہوئی۔ آخر ایک نامہ بر مل گیا۔ ادیب نے نامہ بر کو مکان کا پتہ دیا اور خطوط لے جانے کی درخواست کی۔ نامہ بر اتنے سارے بنڈلوں کو دیکھ کر رک گیا اور ادیب کو مخاطب کرتے ہوئے بولا حضرت یہ بوجھ تو میں نہ اٹھا سکوں گا۔ آپ کوئی اور انتظام کریں۔ ادیب نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے بہت سے نامہ بروں کو بلایا لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ ہوئی۔ سب نے انکار کر دیا۔ نہ جانے کسی شاعر کے کان میں ادیب کی اس بے بسی کی بھنک کیسے پڑ گئی۔ انہوں نے اس بے بسی کو منظوم کر کے رکھ دیا ۔

اللہ رے میرا نامہ کہ کہتا ہے نامہ بر
اس بوجھ کے اٹھانے کو مزدور چاہیے

ہم لوگ پسینے کے لیے دانے کو لا میا دیکھتے ہیں اور کبھی کبھی انتقاماً ان سے ... کو چکیاں بھی کچھ پیتے ہیں۔ پرانے زمانے کے حکیم تو پسنے خوشحال ہو کر تھے لیکن

موجودہ زمانے میں اس طائفہ کے حالات ناگفتہ بہ ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ پرندے یا تو بہت ہی کم ہو گئے ہیں یا یہ خاصے ذہین ہو گئے ہیں۔ بہر حال چڑیماروں کی معاشی حالت خاصی خراب ہے۔ بہت دنوں کی بات ہے ایک چڑیمار نے ایک بلبل پکڑ لی اور اسے اپنے گھر لے آیا۔ دن بھر کی کمائی یہی ایک عدد بلبل تھی اور گھر میں صبح سے کچھ نہ کھایا تھا۔ چڑیمار نے بیوی سے پوچھا کیا کوئی دال دلیا ہے۔ وہ ہنس پڑی۔ دال دلیا کہاں سے آتا۔ چڑیمار بگڑ گیا کہ دن بھر بھوکے ہیں، اندھیرا ہو رہا ہے۔ اس نے بیوی سے کہا کہ جاؤ چراغ روشن کرو۔

وہ اٹھا اور جیب سے چاقو نکال کر بلبل کی طرف بڑھا ۔ بلبل بیچاری سہم گئی۔ چڑیمار قصاب بن چکا تھا۔ اس نے بلبل کو پکڑا اور ذبح کرنے کیلئے زمین پر لٹا لیا۔ بلبل نے ٹھنڈی سانس بھری اور چڑیمار سے ایک ایسی بات کہی کہ چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اور بلبل کی جان بچ گئی۔ رات بھر چڑیمار اور اس کی بیوی بھوک کی شدت سے جاگتے رہے اور بلبل کی یہ بات ان کے دلوں کو تڑپاتی رہی ۔

صیاد سے چھری کے تلے عندلیب نے
حسرت سے یہ کہا کہ غریب الوطن ہوں میں

وہ تنہا گھوم رہا تھا کہیں اپنے حسن ناز کی نظر پڑی۔ ایک بہت خوش حال نوجوان لپٹ کر صوفے پہ بیٹھا ہوا ایک نازنین سے کہہ رہا تھا۔ بیچاری نازنین خاموش تھی۔ چپ تھی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ نوجوان پھر بولا۔ دیکھا نا حسن کو ۔ عشق کے قدموں پہ سر بسجود ہونا پڑا۔ ہم نہ کہتے تھے کہ تم ایک روز ضرور آؤ گی ۔ وہ زمانے لد گئے جب عشق ۔ حسن کے پیچھے جنگلوں اور ویرانوں میں مارا مارا پھرتا تھا۔ اب تو حسن کو عشق کے دروازے پہ جبیں سائی کرنا پڑ گئی۔ آج کی محبت کسی ایسا کو پسند نہیں کرتی اب تو عشق کی عظمت، حسن کی ذلت میں پنہاں ہے ،

نازنین اتنی باتیں سن کر خاموش تھی۔ اس کے ہونٹ تو جیسے کسی نے سی دیئے تھے نوجوان اپنے صوفے سے اٹھا مسکرایا، سگریٹ سلگایا اور اس کے قریب آیا۔ بڑی محبت سے اس کی طرف دیکھتے ہی بولا ـ

تمہارے چھپکے کلیجہ کو لگے ہو بے مطلب + کیوں لب پہ رک گئے آہ میں تیری تاثیر نہیں

آپ ساری شاعری دیکھ ڈالئے۔ ہر شعر میں ایک کہانی اور ہر کہانی میں ایک طرفگی ملتی ہے۔ صرف شعر کی تہہ میں دھانا ایک نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

شعراء حضرات نے تو کمال ہی کر دیا ہے ہماری قوم سے جو عجیب و غریب کہانیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں یہ بعض دفعہ اشعار ہی کا تحفہ ہے۔

دوسری طرف قوموں کا ادب ... ہمارا ادب ایک معمّہ بن کر رہ گیا ہے ۔

...

لطائف الادب

اسکندر مقدونیہ سے کسی سائل نے ایک درہم مانگا۔ سکندر نے کہا۔ سلاطین سے حقیر چیز کا سوال کرنا بے ادبی ہے۔

سائل نے کہا تو پھر ایک ملک بخش دیجئے۔

سکندر نے جواب دیا۔ تو نے دو سوال کئے ہیں۔ پہلا میرے مرتبہ سے بہت کم تھا۔ دوسرا تیری حیثیت سے زیادہ ہے۔ دور ہو جا۔

ایک شخص کا مال چوری ہو گیا۔ وہ چور کو جانتا اور پہچانتا تھا مگر تلاش و تعاقب کی کوششوں کے باوجود چور کا پتہ نہ چلا کہ کہاں ہے۔ وہ شخص تھک ہار کر قبرستان میں آ بیٹھا۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو۔ اس نے کہا اپنے اندر اتنی ہمت نہیں کہ چور کو پکڑ سکوں۔ پولیس نے مایوس کر دیا ہے۔ سوچ کر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایک دن تو اسے یہاں آنا ہی ہے۔

ایک شاعر نے رئیس شہر کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ لیکن اس نے سن کر اظہار تحسین تو کیا مگر نقد کچھ نہ دیا وہ مایوس ہو گیا۔ شاعر نے غصہ اتارنے کے لئے ہجو لکھی۔ رئیس نے پرکاہ وقعت نہ دی۔ شاعر دل برداشتہ ہو کر رئیس کے دروازے پر جا بیٹھا۔ رئیس نے کہا۔ اب تو کس توقع پر یہاں آ بیٹھا ہے۔ مجھے نہ تیرے قصیدہ کی خوشی ہے نہ ہجو کا خوف۔ شاعر نے کہا۔ اب تیری موت کا انتظار ہے تاکہ رحلت کرے تو مرثیہ لکھوں۔ رئیس کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ بہت سا انعام دیکر رخصت کیا۔

خلیفہ ہارون رشید اپنے ندیموں اور مصاحبوں کے مجمع میں بیٹھا تھا کہ ایک عورت حاضر خدمت ہوئی اور کہا "اے امیر المومنین تیری آنکھوں کو سکون بخشے، خدا نے جو کچھ تجھے دیا ہے، تو اس سے خوش رکھے اور تیری خوش بختی کو انتہا تک پہنچا دے۔ تو بڑا عادل ہے۔ اور بڑا انصاف کرتا ہے۔"

ہارون نے پوچھا "اے عورت تو کون ہے"

اس نے جواب دیا "میں آل برمک میں سے ہوں۔ جس کے مردوں کو تو نے قتل کر دیا۔ جس کا مال و اسباب تو نے چھین لیا۔ جن کی دولت و ثروت پر تو نے قبضہ کر لیا۔"

یہ سن کر ہارون نے کہا۔ "برمک کے مردوں کا جہاں تک تعلق ہے ان پر خدا کا حکم نافذ ہو چکا۔ جو کچھ ان کے مقدر میں لکھا تھا وہ پورا ہوا۔ لیکن مال موجود ہے وہ تجھے واپس کیا جاتا ہے۔"

پھر وہ حاضرین کی طرف متوجہ ہوا اور کہا۔ کچھ سمجھے بھی یہ عورت کیا کہہ گئی۔ حاضرین نے جواب دیا "ہم اس کے سوا کچھ نہ سمجھے کہ اس نے آپ کو دعا دی کہ خدا تیری آنکھوں کو سکون عطا کرے تو مطلب یہ تھا کہ ان کی حرکت بند ہو جائے اور جب آنکھ حرکت سے رک جاتی ہے تو وہ اندھی ہو جاتی ہے۔ اور جب اس نے کہا۔ خدا نے جو کچھ تجھے دیا ہے تو اس کا شکر رہے تو وہ دراصل اس آیت قرآنی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ جس کا مطلب ہے کہ جب کفار اور ملاعنت اپنے مال و دولت میں رنگ رلیاں کر رہے تھے۔ تو خدا کا قہر دفعتاً ان پر ٹوٹ پڑا اور جب اس نے یہ کہا کہ خدا تیری خوش بختی کو انتہا تک پہنچا دے تو وہ درحقیقت شاعر کے اس شعر کی طرف میری توجہ مبذول کرا رہی تھی جس کا مطلب ہے۔ یعنی عروج کی انتہا زوال کا آغاز ہوتی ہے اور جب اس نے میری حکومت اور انصاف کی طنزیہ تعریف کی تو اس کے پیش نظر آیت قرآنی کا یہ مفہوم تھا۔ یعنی میں ایسا انصاف کرتا ہوں کہ مجھے جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا۔"

شاعر اور جلیس اور ادیبانہ چوٹیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ مشہور ہے عرفی ایک دن فیضی سے ملنے گیا تو دیکھا کہ فیضی کتے کے پلے سے جی بہلا رہا ہے۔ عرفی نے پوچھا۔ "مخدوم زادے کا نام کیا ہے" فیضی نے جواب دیا۔ عرفی۔ عرفی نے فوراً کہا۔ مبارک باشد۔

(واضح رہے کہ فیضی کے والد کا نام مبارک تھا) عرفی کا انتقال صرف ۳۶ برس کی عمر میں ہوا۔ کہتے ہیں جہانگیر جب شہزادہ تھا۔ یعنی سلیم تو عرفی اس پر فریفتہ تھا۔

اگر آپ کو گیٹ پر تھوڑا بہت

کرنا ہو تو پریشان نہ ہوں

لیول کراسنگ پہ جلد بازی

انتہائی درجہ خطرناک ہے

بند یا بند ہوتے ہوئے

پھاٹکوں سے

پار ہونے کی

کوشش

نہ کریں

پاکستان ریلوے

ہر چمکتی شے سونا نہیں ہوتی

یہ نام نہاد بدیسی (فارن) اشیاء اکثر نقلی اور جھوٹی ہوتی ہیں۔
جن کے بہان پر جھوٹے "غیر ملکی" مارکے لگے ہوں۔ اکثر یہ مقامی طور پر تیار شدہ ہوتی ہیں
جن کو "غیر ملکی" ڈبوں، بوتلوں وغیرہ میں بند کیا ہوتا ہے۔

فریب نہ کھائیے — اپنے روپے ضائع نہ کیجئے

سچے بھارتی بنیں، بھارتی اشیاء خریدیں

ڈائریکٹوریٹ آف ریونیو انٹیلیجنس
کسٹمز اینڈ سنٹرل ایکسائز، نئی دہلی 110 002

ہاتھ دھوئے۔ پھر ہم سب کے ہاتھ دھلائے گئے۔ خاص خاص مصاحبوں کو خاصے کا ایک ایک تولیہ اور ایک ایک قیمتی سگریٹ خدام نے پیش کیا۔ اس عنایت خاص سے میں بھی سرفراز ہوا۔ اس کے بعد پرنس اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مجمع منتشر ہو گیا۔

دربار کا ٹھاٹھ

اب قاآنی پھر مجھے محل کے باہر لے آئے اور کہا۔ آؤ تھوڑی دیر چہل قدمی کر لیں۔ اس کے بعد دربار کی مشقت کا سامنا کرنا ہے۔ چہل قدمی میں قاآنی نے مجھے نصیحت کی۔ خبردار ان درباریوں سے کبھی دل کی بات نہ کہنا۔ یہ سب کے سب منافق ہیں۔ دوستی کے پردے میں دشمنی ان کا خاص شیوہ اور شعار ہے۔ یہاں ہر شخص کو اپنا بدخواہ جاننا وغیرہ وغیرہ۔

کم و بیش آدھ گھنٹہ ٹہلنے کے بعد قاآنی نے گھڑی دیکھی اور کہا آؤ اب اندر چلیں۔ دربار کا وقت آگیا۔ اس مرتبہ قاآنی مجھے محل کی بائیں طرف لے گئے۔ ادھر بھی پہلے ایک گیلری تھی۔ جس میں قیمتی کرسیاں جا بجا بچھی ہوئی تھیں۔ گیلری کے سامنے نہایت وسیع ایک ہال تھا جو روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ ہم لوگ گیلری میں ایک جگہ بیٹھ گئے۔ یہیں اس وقت سب مصاحب جمع تھے۔ ٹھیک ساڑھے دس بجے پرنس برآمد ہوئے۔ سب لوگ اٹھ اٹھ کر آداب شاہانہ بجا لائے پرنس نے خفیف جنبش سر سے سب کے سلاموں کا جواب دیا اور تیز قدم چل کر ہال میں داخل ہو گئے۔ مصاحب پھر اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

دس منٹ کے بعد ہال سے آواز آئی۔ ڈھمک جنگ! ڈھمک جنگ سب سر جھکائے ہوئے ہال کی طرف دوڑے۔ سامنے پہنچ کر درباری آداب بجا لائے۔ حکم ہوا کہ اپنی جگہ پر بیٹھو۔ اس سرفرازی پر انھوں نے پھر سات سلام کئے۔ اب الک جنگ کی پکار ہوئی اور اسی طرح وہ بھی سلام و کورنش کرتے ہوئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ چھٹے نمبر پر قاآنی کی باری تھی۔ قاآنی کو حکم تھا۔ صدیق جائسی کو بھی اپنے ساتھ لاؤ۔ ہم لوگ ایک ساتھ باریاب ہوئے۔ پرنس صدر میں جلوہ افروز تھے۔ داہنے ہاتھ کے پیچھے صوفے پر الک جنگ اور ڈھمک جنگ بیٹھے تھے بائیں ہاتھ کے پیچھے صوفے پر قاآنی کے برابر مجھے جگہ ملی۔ اس وقت الک جنگ اور ڈھمک جنگ کا انداز و طرز دیکھنے کے قابل تھا۔ معلوم ہوتا تھا گویا زیر عرش بیٹھے ہیں دربار مجھے جیتے [illegible] کہ گیارہ بج گئے دوران مصاحبوں میں کوئی [illegible]

مصاحب ہوں گے۔

جب تک دربار جمے جمے میں اس ہال کے جائزے میں مصروف رہا۔ ہال قابل دید اور نہایت بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ تھا۔ صوفوں اور کرسیوں کے پائے چاندی کے تھے۔ انھیں صوفوں کے ساتھ ایک کرسی صدر میں بچھی ہوئی تھی جس پر خود پرنس جلوہ افروز تھے۔ مصاحبوں کے دونوں حلقوں میں دو دو رفیقوں کے درمیان بہت بڑے بڑے چاندی کے اگالدان رکھے ہوئے تھے جو ایسے پاک و صاف تھے۔ گویا ابھی ابھی دکان سے آئے ہیں۔ اسی التزام کے ساتھ ایک ایک گول میز بھی تھی جس پر ۵۵۵ نمبر کے سگریٹ کا ایک ایک ٹین تازہ کھلا ہوا رکھا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر مختلف نفیس رنگوں سے ایسے خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے جیسے اس سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھے تھے نہ شاید اب کبھی دیکھ سکوں۔ ہال میں جو قالین بچھا ہوا تھا معلوم ہوا کہ وہ بھی سات ہزار میں یورپ سے خریدا گیا تھا۔ جو رنگ دیواروں کا تھا اسی رنگ کے نہایت قیمتی اور ریشمی پردے ہر در پر بہت ہی خوبصورت اسٹینڈ پر پڑے ہوئے تھے۔ پرنس کی بائیں طرف ایک گول میز پر جو آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔ ایک نہایت قیمتی ٹائم پیس اور ایک خوبصورت آئینہ دھرا تھا جس کے پاس ہی ایک خوبصورت کنگھا بھی تھا۔ ہال کی چھت میں دو بڑے بڑے بجلی کے پنکھے ہلکی رفتار سے چل رہے تھے تاکہ کمرے کی ہوا صاف رہے ورنہ سردی کا موسم تھا۔ پنکھوں کی ضرورت نہ تھی۔ جب پنکھوں کی ہوا سے پرنس کے سر کا کوئی بال جگہ سے بے جگہ ہو جاتا تو کنگھا اٹھا کر درست کر لیتے۔ اس عمل کے بعد ہی خادم تسلا لوٹا اور صابن لے کر دوڑتے۔ پرنس صابن سے دونوں ہاتھ دھوتے۔ ایک خادم نہایت اجلا تولیہ پیش کرتا اس سے ہاتھوں کا پانی خشک کرتے۔ اب وہ تولیہ میلے کپڑوں میں پھینک دیا جاتا۔ اسی طرح رات بھر میں دس بارہ تولیے میلے کپڑوں میں پھینکے جاتے میں اس نفاست پر دنگ تھا اور دل میں کہتا تھا کہ ہندوستانی شاعروں کے محبوب اگر قیمتی اور میلے تولیے پا جائیں تو کم از کم ایک ہفتہ انھیں سے اپنا منہ پونچھیں۔ مگر ان کے نصیب ایسے کہاں کہ ایسے بیش قیمت تولیے ان کو ملیں۔ الحمد للہ کہ دھوبی اور دھوبن، ان کے بال بچے مہینوں [illegible] استعمال کرتے ہوں گے۔

غرض دربار کیا تھا [illegible] نفاست [illegible] کے لیے سامان مہیا تھے [illegible]

گویا اس بلا کی دوا ہے کہ اگر اس کی ایک گولی پہلے پہل کسی شخص کو کھلا دو تو وہ چوبیس گھنٹے تک اپنے بستر پر مُردے کی طرح پڑا رہے اگر جھنجھوڑ کر اٹھانے کی کوشش بھی کی جائے تو کسی طرح اس عرصے سے پہلے وہ جاگ نہیں سکتا۔ میں نے گھبرا کر کہا سرکار نے تو دو گولیاں کھائی تھیں اور تم کو بھی دو ہی گولیاں کھلائی تھیں۔ خانصاحب نے کہا یہ صحیح ہے مگر ان کا معاملہ یہ ہے کہ وقت سے جاگتے جاگتے ان کی نیند غائب ہو گئی ہے۔ ان پر وہ گولیاں اپنا پورا اثر نہیں کرتیں۔ تین بجے دو گولیاں کھاتے ہیں تو چھ بجے نیند آتی ہے۔

یہی صورت تجھ کو ہے وہ بھی اس دوا کے بغیر سو نہیں سکتے یہ سن کر مجھے اپنے بدن میں کپکپی سی محسوس ہوئی۔ پھر بھی میں نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اتنے میں میرا گھر بھی آ گیا اور میں خانصاحب "خدا حافظ" کہہ کر گھر کے اندر گیا پلنگ پر لیٹ کر گھڑی دیکھی تو ٹھیک چار بجے تھے۔ ساڑھے چار بجے کے قریب نیند آئی تو دس بجے دن کو آنکھ کھلی۔
(جاری ہے)

بقیہ: انکشافات ہی انکشافات

مارچ ۱۹۴۲ء میں برطانوی وزیر اعظم مسٹر چرچل نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ وہ سر سٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیج رہے ہیں اور برطانوی جنگی کابینہ کی طرف سے آئین میں ترمیم کے لئے مخصوص تجاویز لے کر جائیں گے مسٹر چرچل نے کہا کہ جاپانی حملہ نے لازم کر دیا ہے کہ ہندوستان کی تمام قومیں متحد ہو کر حملہ آور کے پیدا کردہ خطرہ کا مقابلہ کریں۔ سر سٹیفورڈ کرپس نے یہ تجویز کیا کہ جنگ کے خاتمہ پر دستور ساز اسمبلی منتخب کی جائے گی اور یہ اسمبلی ہندوستان کا آئین تیار کرے گی اس آئین سے اختلاف کا حق تسلیم کیا جائے گا۔ ہندوستانی ریاستوں کو بھی یہی حق دیا جائے گا ملک معظم کی حکومت اور مجلس دستور ساز کے درمیان ایک معاہدہ طے پائے گا جس کی رو سے انتقالِ اقتدار کی شرائط طے کی جائیں گی۔ انڈین یونین کو یہ حق ہو گا کہ وہ چاہے تو برطانوی دولت مشترکہ سے الگ ہو جائے۔

ان دنوں کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے گاندھی جی اور مولانا نے ان تجاویز کے بارے میں سر سٹیفورڈ کرپس سے کئی ہفتے تک تبادلۂ خیال کیا۔ کانگریس کی مجلس عاملہ میں بھی یہ مسئلہ زیر بحث آیا اختلافات بہت نمایاں تھے کانگریس جنگ میں تعاون کو ہندوستان کی آزادی سے مشروط کرتی تھی اور جنگ کے بعد تبدیلیوں سے متفق نہیں تھی۔

کانگریس اصلی میں والیانِ ریاست کے نمائندوں کو بعد کے صفحات حق اس کا مطلب ریاستوں کے کروڑوں باشندوں کو نظر انداز کرنا تھا صوبوں اور ریاستوں کو ہندوستانی یونین سے علیحدگی کا اختیار مستقبل میں مسائل پیدا کر سکتا تھا جداگانہ انتخابات کے طریق سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے قدامت پسند عناصر کو مذہبی جذبات سے کھیلنے اور دوری حاصل کرنے میں کامیابی حاصل ہو سکتی تھی برطانوی حکومت نے کسی بھی مرحلہ میں قومی حکومت کے قیام پر اتفاق نہ کیا کرپس مشن ناکام سر سٹیفورڈ کرپس اور ان کی بیگم ہمارے ذاتی دوست تھے انہوں نے دو آنند بھون میں ہمارے ساتھ قیام کیا۔ ہم نے ان کے لئے کابل سے خربوزے اور کوئٹہ سے انگور منگوائے۔

اب اندرا آکسفورڈ سے واپس آ گئی تھیں وہ بیماری کی وجہ سے آخری سال کا امتحان نہیں دے سکی تھیں چونکہ جنگ شروع ہو گئی تھی اس لئے وہ وطن واپس آ گئیں۔ واپس آتے ہی ان کی منگنی فیروز گاندھی سے کر دی گئی۔ مسٹر فیروز گاندھی ایک پارسی نوجوان تھے وہ الہ آباد میں رہتے تھے اور اندرا ان کو پہلے سے جانتی تھیں۔ فیروز گاندھی بھی طالب علمی کے دنوں سے قومی تحریکوں میں حصہ لے رہے تھے۔ انہوں نے لنڈن سکول آف اکنامکس میں تعلیم حاصل کی تھی۔

مارچ ۱۹۴۲ء میں آنند بھون میں ان کی شادی ہوئی چونکہ جنگ کا زمانہ تھا اس لئے شادی کی تقریب سادہ ہی تھی اندرا نے شادی کے موقع پر جو ساڑھی پہنی وہ ان کے والد کے کاتے ہوئے سوت سے تیار کی گئی تھی انہی دنوں جنرل چیانگ کائی شیک اور جنرل رسمو ہندوستان آئے گاندھی جی اور بھائی جواہر لال نہرو سے ملنے آئے تھے ان کا مقصد ان دونوں رہنماؤں کو اس امر پر آمادہ کرنا تھا کہ وہ مجوزہ عدم تعاون کی تحریک نہ چلائیں۔

اس وقت چین کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت اچھے تھے ہم نے چینیوں کی طرف سے جارحیت کی مزاحمت کی حمایت کی تھی۔

جاپانی ہوائی جہاز سے [illegible] پہنچ چکا تھا۔ سنگاپور، ملایا اور برما کا سقوط عمل میں آ چکا تھا۔ ان ملکوں سے ہزاروں افراد ہندوستان میں پناہ حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۴۲ء میں کانگریس نے ہندوستان چھوڑ دو تحریک شروع کر دی۔ (جاری ہے)

[illegible]

ڈاکٹر [illegible] بخاری

"کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ" کواڑ کھٹکھٹانے کی آواز آئی اور زبیدہ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "آیئے"

"دو کواڑ میں بند کئے دیتا ہوں تم اندر چلو" کریم بولا۔

"آپ تھکے ہارے آئے ہیں کیا میں کواڑ بھی بند نہیں کر سکتی"

"تکان تو تمہاری صورت دیکھتے ہی ختم ہو جاتی ہے" کواڑ بند کرتے ہوئے کریم نے کہا۔

"میری صورت کس کی دوا ہے کیا؟"

"میرے لئے تو ایسا ہی ہے" کہتا ہوا کریم زبیدہ کے پیچھے پیچھے آیا اور صحن میں پڑی کھاٹ پر "یا اللہ تو ہے" کہتا ہوا دراز ہو گیا "زبیدہ ایک بات تو بتاؤ" ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کریم نے کہا۔

"پوچھئے" زبیدہ نے قریب آ کر کہا۔

"میں نے جیسے ہی کنڈی کھٹکھٹائی تم نے کواڑ کھول دی۔ پوچھا بھی نہیں کہ کون ہو اگر کوئی غیر آدمی ہوتا تو؟"

"غیر آدمی ہو ہی کیسے سکتا تھا" زبیدہ نے کندھا مسوستے ہوئے یقینی انداز میں کہا۔

"تمہارا دروازہ راشٹرپتی بھون کا گیٹ تو ہے نہیں ہے"

"آپ بھی بڑے بھولے بنتے ہیں۔ آپ کے ڈیوٹی سے آنے کا وقت ہے اس وقت کوئی غیر آدمی کواڑ کھٹکھٹا کے اپنے چاند کو بوتوں سے سہلانے کی دعوت دیگا کیا؟"

"بری نیت سے آنے والے لوگ تو سو باتیں سوچتے ہیں"

"ٹھیک کہتی ہو۔ مان گیا تمہاری بات کو" آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے اس نے پھر کہا۔ "زبیدہ تم بہت دیر سے لالٹین کے پاس بیٹھی بیٹھی کیا سوچ رہی تھیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کواڑوں کی درازسے مجھے جھانک رہے تھے۔ اس طرح تک جھپ کے دیکھنے سے۔ لگتا ہے کئی سال شادی ہو گئے دیکھنے سے من نہیں بھرا۔"

"سوال پیچیدہ ہے جواب زبان کے بس کا نہیں آنکھیں دے سکتی ہیں" مسکراتے ہوئے ایک آنکھ بھینچ کر کریم نے کہا وہ کچھ رک کر پھر بولا "تم مجھ کو باتوں میں مت الجھاؤ اپنی خاموشی کا سبب بتاؤ۔ میں یہ پوچھ کر ہی مانوں گا۔"

"جب کوئی بات ہی نہیں ہے تو بتاؤں ہی کیا۔"

"یہ ایک قدرتی بات ہے کہ آدمی کبھی خاموش نہیں رہ سکتا کبھی دنیا سے بات کرتا ہے کبھی اپنے دل سے بات کرتا ہے جب کوئی بات سوچی جا سکتی ہے تو بتائی بھی جا سکتی ہے"

"ٹھیک ہے پہلے کھانا کھا لیجئے گا پھر بتا دونگی"

"اور کسی کو بھوک ہی نہ لگ رہی ہو تو۔"

"کیا کہیں دعوت کھا کر آ رہے ہیں جو بھوک نہیں لگ رہی ہے" مسکراتے ہوئے کریم کا پیٹ دباتے ہوئے زبیدہ نے کہا۔

"اری زبیدہ دعوت تو اس کو کھلائی جاتی ہے جس سے چار کام نکلتے ہیں۔ ہم لوگ کس کھیت کی مولی ہیں۔ جلدی بتاؤ کیا سوچ رہی تھیں"

"آپ ہر بات میں مذاق کیا کرتے ہیں ایک عورت اپنے گرہستی کے علاوہ اور کیا سوچ سکتی ہے۔ نیرا (ایک میلہ) آنے میں کل پانچ روز باقی ہے کب بچوں کے کپڑے آئیں گے۔ کب سلیں گے۔ ہماری تو کچھ نہیں ہے پرانے دھلے ہی صاف کر کے پہن جائیں گے مگر بچے کیا جائیں کس کے گھر بات آئی ہے۔ ان کی بلا سے کوئی غریب ہے یا کسی کی تنخواہ نہیں ملی ہو ان کو تو اپنی خوشی پوری ہونے سے غرض ہوتی ہے۔ اصل میں یہ وقت ان کی خوشی پوری ہونے ہی کا ہے بڑے ہو کر تو وہ بھی ہماری طرح گرہستی کی کیچڑ میں پھنس جائیں گے۔"

"زبیدہ یہ باتیں سوچنے کو تو میں ہی بہترا ہوں میرے ہوتے ہوئے تم ایسی باتیں کیوں سوچتی ہو۔ جو شخص اپنے اندر کو مکمل جامہ نہ پہنا سکے اس کا سوچنا ہی بیکار ہے کیوں سوچ سوچ کر کایا کو گھلاتی ہو۔"

"معلوم ہوتا ہے آج تنخواہ مل گئی ہے تبھی باتوں میں کچھ گرمی ہے"

"زبیدہ تنخواہ نہیں ملی ہے کیشیئر جمعی پر ہے وہ بیمار ہے۔ اس کی بیماری سے سیٹھ جی کی چاندی ہو گئی ہے۔ سات دن بعد آئیگا تب تک

سیٹھ جی کے خوب وارے نیارے ہو جائیں گے ۔،،

"ایک خزانچی کی بیماری ان کے حق میں کیا بھلی ثابت ہو گی ؟"

"تم نہیں جانتیں زبیدہ اس کے نہ ہونے سے لاکھوں روپیہ تنخواہ میں بچت ہو جائیگا اور سات روز تک بینک میں اس کا کتنا سود بیٹھو بیٹھے کو مل جائیگا اگر وہ بیمار نہ ہوتا تو یہ سود سیٹھ جی کو کیوں ملتا ۔،،

"تب تو یہ لوگ جان بوجھ کر بھی تنخواہ دیر سے بانٹتے ہوں گے ہو سکتا ہے خزانچی کی بیماری بھی ایک بہانہ ہو اسے بھی راز چھپانے کے لئے چھوڑ دیا ہو گا ۔،،

"اکثر ایسا ہی ہوتا ہے ۔ یونین والے کچھ شور مچاتے بھی ہیں تو سیٹھ جی ان کو بھی ٹکڑا ڈال دیتے ہیں اور حق کی بات دب جاتی ہے ۔،،

"مگر اور یونین مزدور کے حق میں بھی بڑا کرتی ہے ۔،،

"لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے ۔ اکثر بار وہ ہی کیت کر کمر توڑتی ہے ۔،، کہتے کہتے کریم کا گلا بھر آیا ۔ زبیدہ اس کا اصل راز نہ سمجھ سکی اور کچھ دوسری ہی وجہ سمجھتی رہی ۔ "تو یہ روپے رکھ لو بچوں کے کپڑے آجائیں گے اور نیز لے سے پیشتر سلوا بھی دونگا ۔" کریم نے سنجیدگی سے کہا ۔

"یہ اکیانوے ہیں ،، وہ گن کر بولی ۔ "کپڑوں کا انتظام تو ہو گیا ، نو بچ رہے ۔،،

"جوتوں کا بھی خدا حافظ ہے ،، گٹھری سنبھالتے ہوئے کریم نے کہا

"میں باتوں ہی باتوں میں یہ پوچھنا بھول گئی کہ آپ کی سائیکل کہاں گئی ۔

"اگلے پہیئے میں پنکچر ہو گیا تھا دکان پر چھوڑ آیا ہوں ۔،،

"رات کے نو بجے کون سی دکان کھلی ملی آپ کو ۔،،

"تم جانتی ہو یہ مشین کا زمانہ ہے یہاں رات دن کام ہوتا ہے تم سوچو ہی ہو کہ تمہارے بچے ننگے پیر ہی میلا دیکھنے جائیں گے

"نہیں میں یہ نہیں سوچ رہی ہوں ۔ میں آپ کے ہوتے ہوئے کیوں نہیں سوچوں گی پھر جو لیتے انکار کر کے جامہ نہ پہنا سکے اس کو کچھ بھی سوچنا نہیں چاہیئے ۔،، زبیدہ نے کریم کا جملہ دہرایا ۔

"میں تو یہی میں چاہتا ہوں ۔ اب لاؤ کھانا ۔،،

"بہت اچھا ۔ زبیدہ کھانا لانے چلی گئی وہ بظاہر خوش نظر آ رہی تھی مگر دل و دماغ میں ایک اضطراب تھا ۔ "لیجئے کھانا حاضر ہے ،، کھانا سامنے بڑھاتے ہوئے اس نے کہا ۔

"میں اکیلا ہی کھاؤں گا ۔ مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا ۔

"میں بنا بھوک کے کیسے کھا لوں ، کریم کے الفاظ دہراتے ہوئے بولی ۔

"میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بھوک نہ ہونے کی وجہ ،،

"کیا سمجھ رہے ہو ،،

"یہی کہ تم کھانا کم بچنے کی وجہ سے خود بھوکی رہ کر میرا پیٹ بھرنا چاہتی ہو اگر ایسی ہی ہے تو کوئی بات نہیں ایک روٹی تم کھا لو ایک میں کھا لونگا ۔ غریب تو جینے کے لئے کھاتے ہیں رئیس کھانے کے لئے جیتے ہیں جس روز بھارت کے غریبوں کو بھر پیٹ روٹی ملنے لگے گی اس روز یہ ملک جنت نما بن جائیگا ۔،، زبیدہ کا دامن پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کریم نے کہا زبیدہ اپنی ہار مان گئی اور کھانے میں شریک ہو گئی ایک روٹی ہلکی سی اور چھوٹی پیاز اس نے اٹھائی اور بھاری سی روٹی اور بڑی پیاز کریم کی طرف بڑھا دی ۔ کریم یہ دیکھ کر مسکرایا ۔ دونوں خوشی خوشی کھانا کھا رہے تھے ۔ "کیا آج کمالا کی شادی ہے ،، کریم نے لقمہ چباتے ہوئے رک کر پوچھا

"جی ہاں اس کی آج شادی ہے برات آچکی ہو گی ،،

"تو ہمارے پڑوسی کے گھر شادی ہے اور ہمکو پتہ بھی نہیں ،،

"رئیسوں کی شادی بیاہ کا پتہ غریبوں کو نہیں ہوتا جبکہ غریب کی شادی کا پتہ رئیسوں کو ہو جاتا ہے ،، بے پرواہی سے زبیدہ نے کہا ۔

"کیسے ،، کریم نے لقمہ ہاتھ میں لئے ہوئے حیرت سے پوچھا ۔

"غریب جب کوئی کام کرتا ہے تو قرض لینے رئیسوں کے گھر جاتا ہے ۔ اس لئے ۔

"ٹھیک کہتی ہو زبیدہ مگر میں اپنے بچوں کی شادی کرونگا تو کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا ،،

"بڑا لقمہ توڑ لو بڑی بات مت کہو غریبوں کو بڑی بات کہنا ٹھیک نہیں ہوتا ۔،،

زبیدہ اس میں بڑی چھوٹی بات کیا ہے میرے پاس جتنا روپیہ ہوگا اتنا ہی خرچ کروں گا ۔،،

"شادی بیاہ میں ایسا نہیں چلتا ہے تمہارے پانچ بچے ہیں مان لو ایک کی شادی میں ایک ایک ہزار روپیہ بھی خرچ کیا تو پانچ ہزار ہو گئے اور جیسے جیسے بچے بڑھتے جائیں گے خرچ بھی بڑھتے جائیں گے دیکھے اتنی رقم جوڑ لو گے ۔،،

"زبیدہ میں نے یہ کچھ سوچ کر ہی کہا ہے ،،

"کیا سوچا ہے کچھ میں بھی تو سن لوں۔"

"سب باتیں بتانے کی نہیں ہوتی ہیں۔"

"میں پوچھ کر ہی مانوں گی،" زبیدہ نے اصرار کیا۔

"پوچھنا ہی چاہتی ہو تو سنو۔ دیکھو فیکٹری کا یہ قانون ہے کہ اگر کسی مزدور کی ڈیوٹی پر ایک انگلی کٹ جائے تو فیکٹری تین ہزار روپے دیتی ہے۔ [illegible] انگلی کاٹ ڈالوں گا، فرق پڑتا ہے۔ شادی سے پہلے تو پھر وقت بھی ہوتی اب وہ بھی نہیں ہے چاہے کتنا ہی انگ بھنگ ہو جاؤں۔ تم مجھے چھوڑ کر تو نہ چلی جاؤ گی۔"

"بہت اونچا خیال ہے آپ کا۔ مجھ میں تو اتنی اونچی بات سوچنے کی عقل کہاں ہے ہاں اگر ایک یا دو بچوں کی ماں ہوتی تو یہ کڑوی بات سننے کو کیوں ملتی۔" اتنا کہہ کر وہ گمبھیر ہو گئی۔

"تم جو کچھ کہہ رہی ہو میں نے بھی کبھی سوچا تھا لیکن موتی لال کی نس بندی کرانے کے بعد مر جانے کی گھٹنا سے میرا دل کانپ گیا اور نس بندی کا خیال ترک کر بیٹھا۔ جب تک اس کی نس بندی نہیں ہوئی پٹواری اور گرام سیوک پیچھے پیچھے پھرتے رہے۔ پرچھائیں کی طرح اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑا اور جب نس بندی ہو گئی اور کیس بگڑ گیا تو کسی نے بیچارے کی مزاج پرسی بھی نہ کی۔ غریب آدمی تھا لگانے کو گھر میں کچھ تھا ہی نہیں رجھو بجھو کر مر گیا۔"

"سینکڑوں ہزاروں لوگ نس بندی کراتے ہیں اسی کا کیس کیوں بگڑ گیا۔ کوئی غلطی کر بیٹھا ہوگا" زبیدہ نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو مگر ایسا کچھ نہیں تھا میری اس سے بات ہوئی تھی وہ کہتا تھا کہ اس نے کسی قسم کی بد پرہیزی نہیں کی مگر نس بندی کے اگلے دن ہی خراب دیکھنے سے اس کی تکلیف بڑھتی گئی جو اسکی موت کا کارن بن گئی۔ ہونی پر تو کسی کا بھی قابو نہیں ہوتا ہے اسی خوف سے میں نے کان پکڑ لئے اور نس بندی کا خیال ترک کر دیا کیونکہ تم خواب میں بھی آتے جیتے نہیں اور میں بھی اس معاملے میں کچا ہوں۔" کریم نے مزاحیہ انداز میں کہا۔ "جس نے منہ چیرا ہے کھانے کو بھی دیگا۔ پانچ لڑکے ہیں کبھی پانچ ہوئیں بھی آئیں گی گھر بھرا بھرا دکھائی دے گا۔" وہ منہ چڑاتے ہوئے بولا۔

"کبھی کبھی خالی بھی دکھائی دے گا۔"

"مشکل کیوں ہوگا پانچ روپیہ بھی فی لڑکا کما کر لائے گا تو پچیس روپے روز کما کر لائیں گے۔ اتنا تو کھایا بھی نہیں جائے گا۔"

"اس وقت کی آمدنی پہ نظر ہے خرچ پر نہیں۔"

"تم تو بال کی کھال نکالتی ہو سو جاؤ مجھے تو نیند آ رہی ہے۔" کریم یہ کہہ کر پلنگ پہ لیٹ گیا اور سنہرے خیالوں کی دنیا میں گھومتے گھومتے نیند آ گئی۔

"لو بچوں کے جوتے بھی آ گئے بڑی پریشانی ہو رہی تھی۔ کپڑے بھی لے آؤں گا شام کو۔ دکھا لینا ذرا اپنے بچوں کو،" کریم نے جوتوں کے ڈبے کھاٹ پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"اب آپ اپنے کپڑے اتار دیجئے انکو صاف کر دوں،" جوتے سنبھالتے ہوئے زبیدہ نے کہا۔ کریم نے کپڑے اتارنا شروع کئے۔ "گھڑی کہاں گئی؟" کپڑے اترتے ہی ننگی کلائی کو دیکھ کر زبیدہ نے سوال کیا۔

"خراب ہو گئی ہے،" جلدی سے کریم نے بات بنائی۔

"سائیکل کی طرح مرمت کو دیدی ہوگی،" زبیدہ طنزیہ انداز میں بولی۔

"جی ہاں،" حقیقت کا ناٹک کھیلتے ہوئے کریم بولا۔

"میری قسم"

"گھڑی خراب ہونے کا یقین دلانے کے لئے تمہاری قسم کھاؤں گھڑی تو بڑوں بڑوں کی خراب ہو جاتی ہے زبیدہ۔" کہہ کر کریم زبیدہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کا بہانا بناتا رہا مگر وہ ہنسی نہیں اٹھ کر اندر چلی گئی اور کچھ روپے لا کر اس کی ہاتھوں پر رکھتے ہوئے بولی۔ "لیجئے جوتے بنا آئیے ننگے پیر اچھے نہیں لگتے۔"

"تمہارے پاس اتنے روپے کہاں سے آ گئے،" کریم نے شکوک انداز سے پوچھا۔

"بھینس کے گوبر کے اپلے بیچ بیچ کر جمع کئے ہیں،" اس کا شک دور کرتے ہوئے زبیدہ نے جواب دیا۔ [illegible] سادگی کے عالم میں بیوی کا یہ ڈھنگ دیکھ کر کریم بہت خوش ہوا۔ روپے جیب میں رکھتے ہوئے بازار چلا گیا اس کے من میں آیا کہ اگر کسی بہانے سے جوتے پہننے کی بات ٹل جاتی ہے تو یہ روپے بچوں کے کپڑوں کی سلائی اور [illegible] میں کام آ سکتے ہیں بہت سوچا لیکن کوئی معقول بہانا نہیں سوجھا۔ سوچتا بچارتا آگے چلا جا رہا تھا کہ سڑک کے کنارے مہترانی کا اکٹھا کیا ہوا نالی کا کوڑا سامنے آ گیا اچانک اس کا ننگا پیر پڑ گیا۔ جس میں ایک شیشے کا ٹکڑا ابھی تھا جو انگوٹھے میں گھس گیا [illegible] زنجیر ٹوٹ گئی۔ اور [illegible] اس نے شیشے کا ٹکڑا نکالا۔ خون بہتا چلا جا رہا تھا۔ اس کپڑے کے [illegible] سے کوئی [illegible] انگوٹھے پر کس کر باندھ لیا۔ [illegible] کسی طرح چوٹ کھا کر [illegible] ہوا گھر کو واپس ہو لیا۔

"کیا انگوٹھے پہ چوٹ مار لی،" لنگڑا لنگڑا کر چلتے ہوئے کریم کو دیکھ کر زبیدہ نے کہا
"چوٹ سالی لگ گئی۔"
"جو انگلی کاٹنے کی ہمت کر سکتا ہے وہ چوٹ بھی مار سکتا ہے،" اس نے اداسی سے کہا۔ "کھٹ کھٹ" دروازہ کھٹکا۔ "کون ہے؟" زبیدہ نے کواڑوں کی دراز سے باہر جھانک کر دیکھا۔
"میں ڈاکیا ہوں خط ہے۔" کواڑیں ہلاتے ہوئے اس نے جواب دیا
"یہ کیا خط ہے۔" بیمے کی رسید کریم کے سامنے کرتے ہوئے زبیدہ نے پوچھا۔
"یہ خط نہیں ہے بیمے کی قسط کی رسید ہے یونین کے پریذیڈنٹ نے دس ہزار کا بیمہ کرا دیا تھا اس کی قسط کی رسید ہے ہر ماہ تنخواہ میں سے کٹ جاتا ہے۔ پیسہ تو یکمشت جمع ہوتا نہیں اس بہانے سے کچھ دن کچھ تو جمع ہو جائے گا۔"
"پر آپ نے اچھا کیا جو ڈاکٹر کے پاس جا کر انگوٹھے پر پٹی بندھوا لی۔ آپ بڑے لاپرواہ ہیں کہیں اسپتال بند ہونے کا بہانا بنا کر یونہی مت لوٹ آیئے۔"
"نہیں نہیں پٹی بندھوا کر ہی آؤں گا۔" فوراً جواب دیا۔ چوٹ لگے کچھ دیر ہو گئی تھی اب انگوٹھے میں ترانٹ بڑھ گئی تھی اسپتال دور تھا ایک حکیم کا مطب پاس ہی تھا اس لیے وہ چلنے کی تکلیف اور ڈاکٹروں کے زیادہ مہنگے نسخے کے بوجھ سے بچنے کے خیال سے نزدیک کے حکیم ذمرد علی فراست کے یہاں چلا گیا۔ "سلام علیکم حکیم صاحب"
"وعلیکم السلام بھائی۔ آؤ، ارے انگوٹھے میں کیا لگ گیا" حکیم جی نے چشمے کے نیچے جھکا کر جھانکتے ہوئے دکھ ظاہر کیا۔
"مشین سے چوٹ لگ گئی ہے صاحب"
"ارے اتنی گرمی میں یہاں تک آیا ہے گھر پر ہی نیم کے پتوں کا [illegible] نچوڑ کر اس میں لگا لیتا چوبیس گھنٹے [illegible] پھر بعد کو مرہم [illegible]۔ کچھ ادھ جلا کپڑا برابر گھونٹ [illegible] لگا کر اس پر باندھتا رہتا چار پانچ دن میں ٹھیک ہو جاتا آ گیا تو پٹی باندھے دیتا ہوں" کہتے ہوئے شربت کی طرح گاڑھی دوا الماری سے [illegible] لیپ کر انگوٹھے پر باندھ دی۔ "اجی صاحب میں تو نہیں آ رہا تھا مگر بیوی نے [illegible] جو ہے وہ نہیں مانی اور اسپتال کو بھیج دیا میں ادھر جا کر ادھر چلا آیا۔" کریم پٹی بندھواتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"اچھا ہوا جو ادھر نہیں گیا ورنہ ڈاکٹر ایک تو سوئی لگاتا کھانے کی دوا دیتا اور ڈریسنگ کرتا۔ دس روپے آج ہی جھٹکا کر دیتا" پوری کے ٹکڑے سے سنے ہوئے ہاتھ پونچھتے ہوئے حکیم جی نے کہا۔
"کیا پیش کروں" تکلیف سے ناک بھوں سکوڑتے ہوئے کریم نے کہا۔
"ارے اتنے سے کام کا کیا لینا چل نہیں مانتا تو دو روپے دیدے۔ یہاں ڈاکٹروں کی سی لوٹ کھسوٹ تھوڑے ہی ہے" کریم چپکے سے دو روپے تخت پر بچھی برسوں پرانی گندی دری پر رکھ کر چل دیا۔ وہ گھر پہنچا۔ بچے میلاد دیکھنے کی خوشیاں منا رہے تھے۔ اچھل کود رہے تھے۔ مگر اس کو بہت کچھ برا لگ رہا تھا پھر بھی اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا کریم کو دیکھتے ہی بچے اور خوش ہو گئے وہ سب کو میلاد دکھانے لے گیا۔ میلے کو ۱۵ دن بیت گئے تھے آج کریم کو ہلکا سا بخار تھا ڈیوٹی پر جانے کا وقت بھی ہو گیا تھا لیکن وہ کھاٹ نہیں چھوڑ رہا تھا اور کروٹیں بدل رہا تھا "کیا آج ڈیوٹی پر نہیں جائیں گے" زبیدہ نے کہا۔
"آج بخار سا لگ رہا ہے۔ جانے کو جی نہیں کر رہا،" انگڑائی لیتے ہوئے کریم نے کہا۔
"اگر ایسا ہی ہے تو جا کر دوا لے آیئے یونہی پڑے پڑے تو ٹھیک ہو نہیں جائیں گے آپ"
"ذرا سی تکلیف میں ڈاکٹر کے پاس کیا جانا تلسی کے پتوں کی چائے بنا دو اسی سے ٹھیک ہو جاؤں گا اور ڈیوٹی پر بھی چلا جاؤں گا"
زبیدہ نے چائے بنائی۔ پلائی اور کریم چلا گیا لنگڑا لنگڑا کر چلتا۔ کریم آنکھوں سے اوجھل ہو کر بھی آنکھوں کے سامنے نظر آتا رہا اور زبیدہ جانے کیا [illegible] کی ضرورت کو محسوس کرتی رہی۔ وہ ڈیوٹی پر چلا گیا اور طبیعت تو صبح ہی سے کچھ ناساز تھی کام کرتے کرتے کچھ اور گر گئی کام کرنا دوبھر [illegible] شام تک اسے اپنا جسم سنبھالنا بھی مشکل ہو گیا۔ ہینڈل پر ہاتھ رکھے وہ کسی ساتھی کو [illegible] دیکھ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اس کا بایاں ہاتھ ایک طرف جھکا پھر جا پڑا اور دو انگلیاں کٹ کر نیچے گر گئیں۔ زمین پر پڑی پڑی کٹی انگلیاں بلی کی طرح تڑپ رہی تھیں اس نے مشین بند کر دی اور آس پاس کے ورکر جمع ہو گئے اور اس کو اسپتال لے گئے ڈاکٹر صاحب [illegible] گئے ہوئے تھے کمپاؤنڈر نے پٹی باندھ دی اور وہ گھر چلا گیا۔ "یہ کیا کر لیا

آپ نے " زبیدہ دیکھتے ہی بولی " ابھی تو کسی بچے کا خسرہ بھی نہیں ہو رہی ہے یہ آپ نے کیا کیا " دھیرے سے اس نے کہا کسی نے سنا نہیں سنا ۔ بچے چیختے چلاتے ہوئے آگئے ۔

" ابا جان کو کیا ہو گیا ۔ ابا جان کو کیا ہو گیا " ہر لڑکے کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا " کچھ نہیں مر جا گو بنانے سے " غصہ میں زبیدہ نے بچوں کو ڈانٹا ۔ کریم کو رات بھر نیند نہیں آئی اور تڑپ تڑپ کر درد میں ہر لحظہ رہا ۔ جسم اکڑ گیا تھا ۔ زبیدہ نے سوچا کسی بھوت پریت کا اثر ہو گیا ہے اس نے بدایوں والوں کی زیارت بولی نیاز کو سوا روپیہ اٹھا کر رکھ دیا ۔ کریم کو بڑی تکلیف ہو رہی تھی ۔ اس کی تکلیف کا اندازہ اس کے چہرہ پر پڑی سلوٹوں سے صاف صاف لگایا جا سکتا تھا جس وقت زبیدہ بازو میں سوا روپیہ نیاز کا باندھ رہی تھی اسی وقت ایک ورکر آیا " السلام علیکم " اس نے سلام کیا مگر کریم سلام کا جواب نہ دے سکا ۔ اور اشارہ ہی سے سلام لیا ورکر یہ دیکھتے ہی بھانپ گیا اور بولا ۔ " بھابھی جی کیا کر رہی ہو ان پر آسیب نہیں ٹیٹنس کا روگ ہوا ہے ۔ فوراً اسپتال لے چلو ذرا سی بھی دیر غضب ڈھا سکتی ہے میں نے کئی لوگ اس مرض میں مرتے دیکھے ہیں " یہ سنتے ہی زبیدہ کے ہاتھ پیر پھول گئے اور اسی ورکر سے متعلق ہو گئی ڈاکٹر شریف الدین کے اسپتال لیجایا گیا ڈاکٹر نے دیکھ بھال کر کہا " میرے دو تین دن کے اگر مجھے یہیں چوٹ لگی تھی اسی دن ساڑھے تین روپے کا ایک انجکشن لگنا چاہیے تھا اب ساڑھے تین سو بھی جائیں بچا دیں تو بڑی بات ہے فوراً سرکاری اسپتال لیجاؤ " یہ کہکر ڈاکٹر کرسی پر جا بیٹھا اور دوسرے مریضوں کو دیکھنے لگا ۔ یہ لوگ سرکاری اسپتال گئے تو ڈاکٹر نے کہا " سات آٹھ سو کا خرچہ ہے " بہت ہو تو پرچہ لکھوں "

" پرچہ کہاں کو سب لکھ رہے ہیں آپ " زبیدہ نے اوڑھنی سنبھالتے ہوئے عاجزی سے پوچھا ۔

" بازار کو " جلدی سے ڈاکٹر نے جواب دیا ۔

" کیا آپ کے یہاں یہ دوائیں نہیں ہیں "

" اتنی مہنگی دوا سرکاری اسپتال کیسے رکھ سکتے ہیں "

" سرکاری اسپتال غریبوں کے علاج کے لئے بنے ہیں اور غریبوں کا یہاں علاج نہ ہو تو کہاں جائیں جا سب پاس تو علاوہ جسم کے اور

کچھ بھی نہیں ہے ۔ ڈاکٹر صاحب یہیں تو کہیں قرضہ بھی نہیں ملے گا "

" بہن جی ہمارے سامنے ایسا کہنے سے کچھ نہیں ہوگا ۔ سب کی اپنی اپنی مجبوریاں ہوتی ہے ۔ دیکھو تم لوگ اپنا اپنا خون بیچ ڈالو اس کی قیمت سے انجکشن آجائیں گے کچھ ہم لوگ مدد کر دیں گے "

مجبوری اور وقت کا تقاضا تھا کہ سب نے ڈاکٹر کی رائے سے اتفاق کیا اور خون دیا انجکشن آئے اور لگے کچھ راحت کی صورت بھی پیدا ہوئی لیکن رات کے بارہ بجے ایک دورہ پڑا اور کریم رب کریم کو پیارا ہو گیا

زبیدہ کی آنکھوں میں آنسو تھے ۔ اور کانوں میں اس کے جملے گونج رہے تھے ۔ " میں اپنے بچوں کی شادی میں تو کسی آگے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا " غریب جینے کے لئے کماتے ہیں ۔ جس دن غریبوں کو بھر پیٹ روٹی ملنے لگے گی اسی دن ہندوستان جنت بن جائے گا میری ہوتے تم کسی بات کی فکر کیوں کرتی ہو ۔ جہاں تک کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اس کو فکر کرنا بیکار ہے "۔

بقیہ : من کہ مکتوب الیہ

جان لے نا عاقبت اندیش یہ رو کر نہ دے
کیا کرے گا بیٹھ جب وہ مالک جاں آئے گا (رحم)
رُلائیں گی تجھے نا عاقبت اندیشیاں تیری
فریب حسن میں تو اے دل دیوانہ آتا ہے (عزیز)

اس کے علاوہ حضرت ادیب صاحب لکھنوی کی یہ غزل دیکھی جا سکتی ہے لہذا اب کون سی وجہ رہ جاتی ہے کہ میں اپنی ترکیب کو معتبر نہ سمجھوں معاف کیجئے گا مانوس اور غیر مانوس ترکیب کے فرق کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں اور احتیاط رکھنا میرا شعار ہے ۔

خط میں اگر کوئی بات کسر شان تحریر ہو گئی ہو تو در گذر فرمائیں گا یہ ادبی نوک جھونک تو چلتی ہی رہتی ہے ۔ اچھا الوداع اگر یاد فرمایا تو کسی تخلیق کے ساتھ حاضر آؤں گا ۔ امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے ۔

والسلام
محسن ہاشمی بلاری
سکریٹری
بزم اردو ادب (مراد آباد)

ساغر نظامی ہندوستان کے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ یوں تو ہندوستان کی جنگِ آزادی کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں لیکن نظم کی صورت میں ساغر نظامی کی یہ کوشش بالکل انوکھے ڈھنگ پر ہے۔ اِس میں تاریخی تسلسل کو سامنے رکھ کر 1957ء تک کے اہم تاریخی واقعات کو نظم کیا گیا ہے۔ یہ نظم روانی اور دلکشی کے اعتبار سے پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں حُبّ الوطنی کے جذبات کُوٹ کُوٹ کر بھرے ہیں

کتابت اور طباعت عمدہ۔ دو رنگی چھپائی۔ خوبصورت جلد، گرد پوش

قیمت 41 روپے (ڈاک خرچ معاف)

"آجکل" کے خریداروں کو 20 فیصد رعایت

ملنے کا پتہ :— بزنس منیجر،
پبلی کیشنز ڈویژن،
پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی۔ 110001

DAVP-80/60

من کہ مکتوب الیہ

علی گڑھ

جناب محترم آداب و نیاز

ڈاکٹر نعیم احمد صاحب نے آج شانِ ہند کا وہ شمارہ لا کر دیا جس میں آپ نے بھی میرا مضمون " قصائد سودا کا ایک مأخذ " شائع کر دیا ہے۔ میں آپ کا ممنون ہوں کیونکہ اس مضمون کو شائع کر کے آپ نے ایک علمی خدمت کی ہے۔ اردو بیچاری جس کسمپرسی کے عالم میں ہے اس کی بڑی ذمہ داری یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبوں کے سربراہوں کی ہے۔ حکومت بیچاری تو خواہ مخواہ بدنام ہے (میری رائے تو یہ ہے کہ حکومت نے اردو کے معاملات میں غیر معمولی نیک نیتی سے کام لیا ہے مثلاً ہماری یونیورسٹی میں اردو کے تین پروفیسر ہیں جب کہ آرٹ فیکلٹی کے کسی بھی شعبہ میں دو سے زائد نہیں ہیں — اسی طرح اور بھی بہت معاملات ہیں۔) اب یہ کام شعبہ کے سربراہوں کا ہے کہ وہ ایمانداری سے نہ صرف تعلیم و تدریس کے معیار کو بلند کریں بلکہ واقعی ذی علم لوگوں کو تقرر اور ترقی دیں لیکن اس علمی دیانتداری کا کال سا معلوم ہوتا ہے۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے تمام اختیارات کو عموماً اپنا اقتدار ظاہر کرنے پر صرف کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر عتیق احمد صدیقی صاحب کو یونیورسٹی کے ضابطوں کو نظر انداز کر کے جس طرح پی ایچ ڈی کی اور ڈاکٹر ظل الحسن نقوی صاحب کو ڈی لٹ کی اعلیٰ ترین سند دی گئی اور پھر اسناد کی بنیاد پر ترقیاں عطا کی گئیں اس میں حکومت کا ہرگز کوئی قصور نہیں ہے۔ لیکن جب کوئی کم استعداد شخص اپنی صلاحیت سے زیادہ اعلیٰ مرتبہ پر پہنچ جائے تو اس کی جو کارکردگی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یونیورسٹیوں کے ارباب اقتدار کی نظر اس بات پر بھی ہو کہ کوئی شخص اپنے منصب کا غلط استعمال تو نہیں کر رہا ہے۔

ہم نے محض اس بنا پر کہ ہم دل سے اس بات کے خواہشمند ہیں کہ یونیورسٹیوں میں تعلیم کا معیار بلند تر ہو، قانونی چارہ جوئی کی راہ اختیار کی ہے، کسی شخص سے ہمیں ذاتی طور پر کوئی پرخاش نہیں چنانچہ میرے مذکورہ مضمون سے بھی آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ ہماری جدوجہد خالص علمی ہے۔ فقط

محمد انصار اللہ ۰۰۰
۲۶/۴/۸۰

بلاری
۲۳/۵/۸۰

جناب سرور صاحب آداب و نیاز

اپریل ۸۰ء کا شانِ ہند جو اپنی گذشتہ رنگینیوں کا حامل ہے اس شمارے میں آپ نے میری غزل شائع فرمائی ہے اس نوازش کا شکریہ۔ اس غزل کے مندرجہ ذیل شعر کو۔

آج بھی خدشہ ہے گلشن میں نزولِ برق کا
تجھ کو اے نا عاقبت اندیش اندازہ نہیں

آپ نے قصداً حذف فرما دیا ہے کوئی مضائقہ نہیں لیکن [illegible] سے اس کو حذف فرمایا گیا ہے وہ یقیناً قابلِ صد افسوس ہے۔ غالباً آپ نا عاقبت اندیش کی بجائے عاقبت نااندیش کو ترجیح دیتے ہیں یا درست مانتے ہیں میں آپ کی اس گرانقدر رائے سے بالکل متفق نہیں ہوں اور وہ ہو سکتا ہوں تقریباً پینتیس ۳۵ برس سے میں اسی دشت کی سیاحی میں مصروف ہوں اور تیس ۳۰ برس سے بزم اردو ادب بلاری کی رکنیت حاصل کر کے اردو کی حسب توفیق خدمت انجام دے رہا ہوں نیز تیرہ برس سے بزم ہذا کا سکریٹری ہونے کی وجہ سے معمولی سا تجربہ رکھتا ہوں قسمت سے مطالعہ و مشاہدے کی دولت بھی اپنے تنگ دامن میں لئے ہوئے ہوں میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ آپ کی ترکیب غلط ہے لیکن اپنی استعمال شدہ ترکیب نا عاقبت اندیش پر مکمل اعتماد رکھتا ہوں معلومات کے پیش نظر دو اسناد پیش کرتا ہوں پہلا سند تو حضرت جوش ملیح آبادی کی ہے جن کو زبان میں دخل بھی ہے اور شاعری کی مملکت کا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ دوسری سند حضرت عزیز صاحب لکھنوی کی ہے جن کو زبان میں ممتاز حیثیت حاصل ہے اور اپنے زمانہ میں مستند مانے جاتے تھے۔ لسان الہند کے خطاب سے نوازے گئے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے گا۔

غزل

آہر [illegible]

کل بھی تھا اور جنوں کیف شکن آج بھی ہے
عقل کا کل کی طرح نشہ ہرن آج بھی ہے

اوج پر سلسلۂ رنج و محن آج بھی ہے
آدمی غرقِ تحیر ہمہ تن آج بھی ہے

کل کے مانند ہی ماحولِ چمن آج بھی ہے
کل سا حبس آج بھی ہے کل سی گھٹن آج بھی ہے

کل بھی تھی وقت کے ملنے پہ شکن آج بھی ہے
سامنے معرکۂ صبر شکن آج بھی ہے

غیر ممکن ہی بہرحال ملن آج بھی ہے
دھرتی دھرتی سے بہت دور گگن آج بھی ہے

آج بھی اہلِ محبت ہیں تعصب سے بری
کل کے مانند ہی بے ساختہ پن آج بھی ہے

کیسے تم کہتے ہو ہر رسمِ کہن ختم ہوئی
بیوفائی کی وہ رسمِ کہن آج بھی ہے

آزمانے کو خرد ہی میں رہا اب نہ وہ دم
عشق تو باندھے ہوئے سر سے کفن آج بھی ہے

آج بھی اہلِ وفا درخورِ الطاف نہیں
بزمِ جاناں کا جو کل تھا وہ چلن آج بھی ہے

عشق نے کھول دیے کتنے ہی رازِ ہستی
عقل ناکام تجسس ہمہ تن آج بھی ہے

کیا خبر کب کسے ڈس لے رہو لوگو ہشیار
وقت کے ناگ کا پھیلا ہوا پھن آج بھی ہے

اس کو پہنا کے تو دیکھو کبھی زیور اس کے
زندگی بیوہ نہیں یار دلہن آج بھی ہے

تیری بے مہری سے خورشیدِ محبت کو وہ تب
لگ گیا تھا جو کسی دن وہ گہن آج بھی ہے

آیا تھا زلف پریشاں اک سمن اندام کبھی
ہر طرف پھیلی ہوئی بوئے سمن آج بھی ہے

کچھ بھی ہو اس سے تو انکار نہیں ہو سکتا
بے مثال اپنی جگہ اپنا چمن آج بھی ہے

تھا کبھی خوف اندھیروں کا نہ اب ہے ہم کو
داغِ دل کل کی طرح جلوہ فگن آج بھی ہے

جن کو ہوگی انہیں ہوگی خوشیِ مہر خوشی
ہم سے روٹھی ہوئی ایک ایک کرن آج بھی ہے

کل بھی آہر غربا میں تھا شرافت کا چلن
غربا ہی میں شرافت کا چلن آج بھی ہے

غزل

خادم کیتھلی ملتان (پاکستان)

جام و مینا تو ہیں تو سبھی کے لئے
وہ نظر ہے کسی کسی کے لئے

ہم نے تسلیم کا بھرم رکھا
جان دے دی تیری خوشی کے لئے

چمن کے دامن میں پھول کھلتے تھے
رو رہے ہیں کلی کلی کے لئے

محفلِ کائنات میں ہم نے
دل جلائے ہیں روشنی کے لئے

غمِ دوراں کی دل کشی، توبہ
لوگ مرتے ہیں زندگی کے لئے

کتنے کانٹوں کے زخم کھائے ہیں
پھول نے اک شگفتگی کے لئے

خادم احسانِ خضر بھی نہ اٹھا
کون رسوا ہو تشنگی کے لئے

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۹۰۲ — رجسٹرڈ آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر — رجسٹرڈ نمبر

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ماہنامہ شانِ ہند دہلی

ہر ذرّۂ وطن سے ہے فیاضؔ مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
(فیاض گوالیاری)

ایڈیٹر: سرورؔ تونسوی

زرِ سالانہ ۱۵/- روپے
فی پرچہ 1/50 روپے

جلد نمبر ۱۴ — جولائی سنہ ۱۹۸۰ء — شمارہ نمبر ۷

ہندی کے مسلمان شعراء

۱۔ ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے بعد ہر قاری یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ ہندو مسلم اتحاد پر ایسی مفید کتاب آج تک نہ تو اردو میں شائع ہوئی ہے نہ ہندی میں۔

۲۔ اس کتاب کے پڑھنے سے اردو اور ہندی کے وہ خود ساختہ نام نہاد دانش ور جو سرکاری اور غیر سرکاری طور پر "اردو" اور "ہندی" کی ٹھیکیداری کا دامن بنے بیٹھے ہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے کہ جو کام سرکار سے ہتھیائے ہوئے لاکھوں روپیہ سے نہ ہو سکا اور جو کام اردو اور ہندی کے یہ نام نہاد دانش ور آج تک نہ کر سکے وہ ایک فردِ واحد نے اپنی لگن کے باعث پورا کر دیا۔

۳۔ اس کتاب نے ہندوستانی مسلمانوں کا سر اونچا کر دیا ہے اور وہ ثبوت کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہندی زبان کی نشو و نما اور ترقی میں جو کردار مسلمانوں نے ادا کیا ہے اسے ہندی زبان فراموش نہیں کر سکتی۔ اور ہند کا مسلمان اس سلسلے میں اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے کوسوں آگے دکھائی دیتے ہیں۔

۴۔ اس کتاب کو پڑھنے والا ہر ہندی داں لیکھک کا گن گان کرے گا۔ اور ہر اردو داں مصنف کو دعائیں دے گا کہ جس نے اردو ادب کو ایسی بیش قیمت تصنیف سے مالا مال کر دیا۔

۵۔ ترقی اردو بورڈ۔ نیشنل بک ٹرسٹ۔ ساہتیہ اکادمی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) اور ریاستی اردو اکاڈمیوں کے ذمہ دار ارکان میں شاید غیرت کے جذبات اپنا اثر دکھانے لگیں اور وہ ندامت محسوس کریں کہ انہوں نے سرکاری یعنی عوامی کروڑہا روپیہ اردو کی اکثر غیر مفید اور غیر ضروری کتابیں شائع کر کے محض اپنوں کو فائدہ پہنچایا اور "ہندی کے مسلمان شعراء" ایسی بیش بہا اور خالص ہندوستانی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار تصنیف کو شائع کرنے کی طرف توجہ ہی نہ دی۔

۶۔ آپ ہمارے اس دعوے کی صداقت کو جانچ لیجئے یہ کتاب پڑھئے اگر آپ ہماری اس تحریر کا حرف حرف تائید نہ فرمائیں تو کتاب واپس کر کے اس کی پوری قیمت واپس لے لیجئے۔ حضرت سید یحییٰ نشیط ... نے اپنی زندگی کے عزیز ترین پچاس سال اس کتاب کی تالیف پر صرف کئے اور اپنی زندگی بھر کا سرمایہ اس کتاب کیلئے مواد فراہم کرنے میں لگا دیا اور اس کتاب کو ہر پہلو سے مستند بنانے کیلئے فاضل مؤلف نے ہزاروں کتابوں کا مطالعہ کرنے میں اپنی آنکھوں کو قربان کر دیا۔ ... کتاب ہندی کے ... چند دنوں تک ملک کی ایک معزز ہستی کے ہاتھوں ریلیز ہو کر آپ کو مطالعہ کی دعوت دے گی۔ قیمت ۵۱/- (اکاون) روپے

مزید معلومات کیلئے لکھئے: دفتر شانِ ہند - نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲

... پرنٹر پبلیشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس ... جامع مسجد دہلی اور سرورق پائنیر پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند نئی دہلی سے شائع کیا۔

ڈاک ـ گھر ـ بچت ـ بنک

دیتا ہے

سب سے زیادہ اور ٹیکس سے مستثنٰی سُود

اور اس کے علاوہ ۱۱ ہزار سے زیادہ نقد انعامات

پہلا انعام 1,00,000 روپے

ڈاک گھر بچت بنک مُلک کا سب سے پُرانا اور سب سے بڑا بچت بنک ہے۔ تقریباً 4.26 کروڑ افراد اس پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ اس میں 1695 کروڑ روپے سے زیادہ رقم جمع ہے۔

آپ بھی 200 روپے کم از کم 6 مہینوں کے لئے جمع رکھ کر ششماہی ڈرا میں نکلنے والا کوئی انعام جیت سکتے ہیں۔

اب تک ایک لاکھ سے زیادہ لوگ انعام جیت چکے ہیں۔

دلکش خصوصیات

- صرف پانچ روپے سے کھاتہ کھولا جا سکتا ہے۔
- 5.5 فیصد سالانہ ٹیکس سے بالکل مستثنٰی سود۔
- ایک لاکھ 29 ہزار ڈاک گھر اور ان کے علاوہ کئی چلتے پھرتے ڈاک گھر آپ کی خدمت کیلئے موجود ہیں۔ کھاتے ایک ڈاک گھر سے دوسرے ڈاک گھر میں منتقل کئے جا سکتے ہیں۔
- اپنے گاؤں کے ڈاک گھر میں رقم جمع کرانے اور شہر کے بڑے یا چھوٹے ڈاک گھر میں سے رقم نکلوانے اور اس کے برعکس شہر کے بڑے یا چھوٹے ڈاک گھر میں رقم جمع کرانے اور گاؤں کے ڈاک گھر سے رقم نکلوانے کی سہولیت۔
- آپ اپنی مرضی کے مطابق آسانی سے رقم نکلوا سکتے ہیں۔
- ملک بھر کے 23 ہزار ڈاک گھروں میں چیک کی سہولیت کا انتظام ہے اور باہر کے ڈاک گھر بچت بنک چیکوں پر کوئی "کولیکشن چارج" نہیں لیا جاتا۔
- شناختی کارڈوں کے ذریعے فوراً شناخت کا انتظام۔
- کھاتہ کو ضمانت کے طور پر رکھا جا سکتا ہے۔
- کسی کو بھی نامزد کرنے کی سہولیت۔

آج ہی کسی بھی ڈاک گھر میں اپنا کھاتہ کھول لیجئے۔

قومی بچت ادارہ پوسٹ بکس نمبر 96، ناگپور۔ 440001

DAVP-80/87

شری دھیان سنگھ کا عقلی طور پر دیوالیہ ہونے کا ثبوت ان کی اس غیر ذمہ دارانہ حرکت سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ڈائرکٹر محکمہ تعلیم دہلی کو لکھا کہ آر۔ کے۔ پورم سیٹ نمبر میں ماسٹر گیان چند مہتہ نے اپنے اسکول سٹاف کی تنخواہوں کا ہزاروں روپیہ چھیننے کی کوشش کی۔ جس کی ابتدائی رپورٹ آر۔ کے۔ پورم کے پولیس سٹیشن سیکٹر نمبر ۸ میں درج کرائی گئی۔

دو سال گزر جانے کے باوجود نہ تو آر۔ کے۔ پورم سیکٹر نمبر ۸ کے پولیس سٹیشن نے ماسٹر گیان چند مہتہ کے خلاف کوئی کارروائی کی اور نہ ہی محکمہ تعلیم کے افسران نے کوئی ایکشن لیا۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ سرے سے جھوٹا ہے ماسٹر گیان چند اس دن اپنے سکول میں حاضر تھا کیا یہ ممکن ہے کہ سیٹ نمبر کے احاطہ میں رقم چھیننے کی کوشش کی رپورٹ پولیس میں درج ہوتی اور پولیس خاموش رہتی۔

یہ تو محض ایک الزام کی تفصیل ہے باقی کے چھ الزامات بھی ایسے ہی بے تکے ہیں اور شری دھیان سنگھ کی حماقتوں اور بے وقوفیوں کی وضاحت کرتے ہیں۔

اس وائس پرنسپل نے ڈائرکٹر محکمہ تعلیم سے ماسٹر گیان چند مہتہ کی شکایت کی اور اس شکایت کا نتیجہ برآمد ہونے کا انتظار کئے بغیر ایک ماہ بعد ہی سیکریٹری ایجوکیشن دہلی ایڈمنسٹریشن کو وہی شکایت بھجوائی حالانکہ سکول سول رولز کے مطابق شری دھیان سنگھ کو اس قاعدہ شکنی کی فوری ضرورت لاحق نہیں ہوئی تھی کہ وہ ڈائرکٹر تعلیم پر بداعتمادی کرتے ہوئے سیکرٹری صاحب تک اس شکایت کرتے۔

اس وائس پرنسپل نے نہ معلوم کن وجوہات کی بنا پر سکول کو سیاسی اکھاڑہ بنا رکھا ہے ہم محترم لفٹیننٹ گورنر صاحب سے گزارش کریں گے کہ وہ اپنے عہد کو نبھانے کی کوشش فرمائیں اور محکمہ تعلیم میں سدھار لانے کے لئے سکریٹری ایجوکیشن دہلی ایڈمنسٹریشن سے کہیں کہ اس بد حواس بے عقل اور بے عمل وائس پرنسپل کے خلاف محکمانہ کارروائی کریں تاکہ دہلی ایڈمنسٹریشن کے باقی سکولوں کے سربراہوں اور سٹاف کو بھی یہ خدشہ رہے کہ اب ایسی حرکتیں نہ چل سکیں گی۔

منشی پریم چند کے مخالفوں کی وجہِ مخالفت

۳۱ جولائی ۱۹۸۰ء کو منشی پریم چند کے صد سالہ جشنِ ولادت کی تقریب ملک بھر میں اور بیرونِ ملک منائی جارہی ہے۔ نئی دہلی میں اس تقریب کا افتتاح عالیجناب ایم۔ کے۔ ہدایت اللہ نائب صدر جمہوریہ ہند فرمائیں گے اور صد سالہ جشن پریم چند قومی کمیٹی کی سرپرست اعلیٰ محترمہ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہند اور سرپرست جناب شیخ عبداللہ ہیں۔

جوں جوں ۳۱ جولائی نزدیک آرہی ہے منشی پریم چند کے بدشعور مخالفوں کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں اور وہ کھلے بندوں واہی تباہی بکنے سے گریز نہیں کررہے۔ اور قدرت ان بدبخت مخالفین کی چھاتی پر مونگ اس طرح دَل رہی ہے کہ حکومتِ ہند ۳۱ جولائی کو منشی پریم چند کی یاد میں ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کررہی ہے۔

اُردو دانش وروں میں ایک پشتینی مرض ہے کہ جب کسی طرح بھی کوئی ان کو گھاس نہیں ڈالتا تو یہ کسی مشہور ادبی ہستی کے خلاف رطب و یابس سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں تاکہ کوئی نہ کوئی تو ان کی خرافات کا جواب دے گا ہی۔ اور ویسے بھی اپنے ہی قماش کے کئی دوسرے ناکام لکھنے والوں کو بھی تیار کر لیتے ہیں کہ میں فلاں ادبی ہستی کے خلاف مصرع طرح دوں گا اور تم لوگ اس مصرع طرح پر گرہ لگانا یا دو غزلہ کہنا۔ اس طرح سے ہم سب کا کسی گنتی میں تو شمار ہونے لگے گا۔

یادش بخیر ابو محمد شبلی کی رگِ مسلم لیگی پھڑکی اور انھوں نے اپنے آپ کو قعرِ گمنامی سے نکالنے کے لئے منشی پریم چند کے خلاف لکھنا شروع کر دیا۔ کچھ اُردو جرائد و رسائل کے مدیرانِ کرام بھی اپنے پرچوں کی اشاعت بڑھانے کیلئے اس قسم کی غلیظ تحریروں کو بڑے شوق سے شائع کرنے میں ماہر ہیں لہٰذا اس طرح ابو محمد شبلی ایسے ناکام ادیبوں کو کچھ وقتی لذت مل جاتی ہے۔

کیا غضب ہے کہ اگر کوئی ہندو ادیب آریہ سماجی خیالات رکھے اور ہندی زبان کی ترقی کا ذکر کرے تو وہ گردن زدنی اور فرقہ پرست۔ اور اگر کوئی مسلمان ادیب دل کی گہرائیوں میں پاکستان کے تئیں وفاداری رکھے اور ہندوستان میں رہتے ہوئے بظاہر تو ہندوستانی زندہ باد کہے

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

قبلہ صولت صاحب ٹونکی۔ حضرت بسمل سعیدی ٹونکی۔ منشی عتیق اللہ خاں خوشنویس۔ رضا اللہ خاں (جو پاکستان چلے گئے تھے) یہ سب قریب قریب ہم عمر اور رفیقانِ خاص تھے۔ جوانی کا زمانہ تھا کہ منشی عتیق اللہ خاں خوشنویس نے ایک لڑکی کا اغوا کرلیا۔ لڑکی کے ورثا نے پولیس میں رپورٹ درج کرائی۔ نوابی دورِ حکومت تھا۔ چنانچہ معاملہ نواب صاحب تک پہنچا۔ لڑکی کے ورثا اور منشی عتیق اللہ خاں کی دربار میں پیشی ہوئی۔ لڑکی کے ورثا جب اپنی شکایت نواب صاحب کی خدمت میں زبانی طور پر عرض کرچکے تو نواب صاحب نے منشی عتیق اللہ خان کی طرف نگاہِ قہر آلود سے دیکھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اپنی صفائی میں جو کہنا ہو کہو۔ اتنے میں صولت صاحب یکایک اپنی جگہ سے اُٹھے اور نواب صاحب سے مخاطب ہوکر عرض پرداز ہوئے کہ سرکار لڑکی کا اغوا منشی عتیق اللہ خان نے نہیں کیا بلکہ میں نے کیا ہے۔ منشی عتیق اللہ بے قصور ہے اور لڑکی کے ورثا کسی خاندانی دشمنی کے باعث اس کا نام لے رہے ہیں۔ دربار میں بیٹھے ہوئے رؤسا اور اُمرا۔ اہل کار اور خود نواب صاحب صولت صاحب کا یہ بیان سُن کر دم بخود رہ گئے مگر ہر کوئی سمجھ رہا تھا کہ صولت صاحب اپنے دوست کو بچانے کے لئے اس قسم کا گھناؤنا الزام اپنے سر لے رہے ہیں۔ دربار برخاست کردیا گیا۔ نواب صاحب نے بعد میں صولت صاحب کو بلایا اور تمام واقعہ دریافت کیا۔ نواب صاحب بھی سمجھ گئے کہ صولت صاحب اپنے دوست کو بچانے کے لئے قبولِ جرم کر رہے ہیں۔ آخرکار نواب صاحب نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے لڑکی کے ورثا کو لڑکی واپس دلادی اور صولت صاحب کے اقبالِ جرم کے پردے میں منشی عتیق اللہ کی جان بچی۔

ریاست ٹونک کے آخری تاجدار نواب اسماعیل علی خاں کی وعدہ خلافیوں سے ناراض ہوکر قبلہ صولت صاحب نے کچھ ایسی رُباعیات نواب صاحب کی ہجو میں کہیں کہ جو فنِ شعر میں اپنا جواب آپ تھیں اور ان رُباعیات میں ایسی ایسی بددُعائیں تھیں کہ سُننے والے کا کلیجہ شق ہوجائے۔ صولت صاحب یہ رُباعیات بلاجھجک اقبال ہوٹل اور دوسری جگہوں پر سُناتے۔ ریاستی دورِ حکومت میں شہر کا ہر باشندہ اپنے نواب یا راجہ کا سی۔ آئی۔ ڈی ہوتا تھا۔ چنانچہ آنِ واحد میں یہ رُباعیات نواب صاحب تک پہنچا دی گئیں۔ صولت صاحب اس صورتِ حال سے بخوبی واقف تھے مگر کسی انسان سے ڈرنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا لہٰذا ان کی رُباعیات میں دن دونی اضافہ ہونے لگا۔ سُننے والے داد جھولیاں بھر بھر دیتے اور دوسرے ہی لمحہ نواب صاحب تک رُباعیات کی نقل پہنچا آتے۔ کچھ دنوں تک تو نواب صاحب کے یہاں کھچڑی پکتی رہی۔ نواب صاحب کے ایک بہنوئی تھے غالباً ان کا عرفی نام اچھو میاں تھا۔ شرابی کبابی وہ بھی رسیلے تھے۔ ایک رات کو نواب صاحب کے ہاں محفل جمی ہوئی تھی جب اچھو میاں شراب کے نشے میں مستانہ داد نواب صاحب کے اشعار پر نذر باغ میں دوسرے حواریوں کے ساتھ دادِ دے رہے تھے تو کسی بہی خواہ نے صولت صاحب کی رُباعیات کی یاد دلادی۔ اچھو میاں آپے سے باہر ہوگئے اور سب حواریوں کو ہمراہ لے اقبال ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے تاکہ صولت صاحب کو ان رُباعیات کا مزہ چکھایا جاسکے۔ ان دنوں ٹونک میں بجلی بھی غالباً نہیں آئی تھی نذر باغ سے اچھو میاں اپنے حواریوں کا قافلہ لے کر اقبال ہوٹل کی طرف آرہے تھے اور ادھر اقبال ہوٹل سے اُٹھ کر صولت صاحب اپنے گھر مرتی باغ جارہے تھے کہ اقبال ہوٹل اور بڑے کنوئیں کے درمیانی راستہ میں اچھو میاں اور صولت صاحب کی مڈبھیڑ ہوگئی اور اچھو میاں نے

چھڑی اٹھاتے ہوئے کہا کلو میاں اور ادھر صولت صاحب
نے چھڑی اٹھاتے ہوئے کہا اچھو میاں۔ اچھو میاں کے حواری
سب کے سب صولت صاحب کو بھی جانتے بلکہ مانتے تھے ان
حواریوں میں سے کچھ نے اچھو میاں کو اور کچھ نے صولت صاحب
کو پکڑ کر الگ الگ کر دیا مگر اس دوران میں اچھو میاں نے شراب
خانہ خراب کے نشے کے باعث بداخلاقی اور بدزبانی سے نواب
صاحب کے خلاف کہی گئی رباعیات کے بارے میں اظہار ناراضی
کیا جسے صولت صاحب سن کر نہایت خاموشی سے لمبے
لمبے ڈگ بھرتے اپنے گھر آ گئے۔ جاہو (صولت صاحب کی اہلیہ
محترمہ) کا فرمان ہے کہ بیٹا سرور! میں نے اپنی زندگی میں صولت
صاحب کا ایسا غصہ نہیں دیکھا تھا۔ صولت صاحب تو اپنے گھر چلے
گئے ادھر اچھو میاں بے ہوش ہو کر گر پڑے اور جنہیں بے ہوشی
کی حالت میں ہی ان کے حواریوں نے اٹھا کر ان کے گھر پہنچایا
اچھو میاں کی والدہ محترمہ نے جب تمام واقعہ سنا تو انھوں نے
آناً فاناً بیل گاڑی جتوائی اور رات کے گیارہ بجے صولت صاحب
کے گھر پہنچیں اور جاتے ہی صولت صاحب کے قدموں پر سر
رکھ دیا کہ میرے بیٹے کو بخش دو۔ صولت صاحب نے غصہ سے
کانپتی ہوئی آواز سے کہا کہ اب کیا کرنے آئی ہو اس کا فیصلہ تو وہیں
پر ہی ہو گیا تھا۔ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اچھو میاں کی والدہ
صاحبہ نے ہزار منت سماجت کی مگر صولت صاحب کا غصہ ٹھنڈا
نہ ہوا۔ آخرکار وہ بے نیل و مرام اپنے گھر واپس آ گئیں اور
اچھو میاں چوتھے دن بے ہوشی کی حالت میں ہی اس
جہان فانی سے چل بسے۔

صولت صاحب کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اس وقت کے
نواب صاحب کی والدہ محترمہ نے انھیں اپنا بیٹا بنا لیا
چونکہ صولت صاحب حضور رسول اکرمؐ کی ۲۳ ویں پشت
سے تھے اس لئے یہ بیگم صاحبہ اپنے منہ بولے بیٹے صولت صاحب
پر اپنی جان تک قربان کرنے کو ہر وقت تیار رہتی تھیں
صولت صاحب فرماتے تھے کہ بیٹا سرور میری یہ ماں میرا پسینہ
چاہتی تھیں صولت صاحب ان بیگم صاحبہ (غالباً اس کا نام
زمانی بیگم تھا) کا ذکر فرماتے تو ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔

ان بیگم صاحبہ نے اپنے بیٹوں کی طرح جائیداد کا پورا حصہ
صولت صاحب کو بھی دیا جو سات مکانوں (جن میں سے ایک مکان
اب بھی محلہ رجان میں موجود ہے) اور چار لاکھ روپیہ کلدار ترازو میں
تول کر ان کے حصے میں آیا صولت صاحب ایسے فقیر منش کو دولت
سے کیا واسطہ۔ دیکھتے ہی دیکھتے چار لاکھ روپیہ کلدار اور ساتوں
مکانات ختم ہو گئے۔ یعنی دوستوں کو چٹوا دیئے۔

گوٹھ (پکنک) میں مرغوں کی کلیجی کی دعوت دی جا رہی ہے
جس کا دل چاہے صولت صاحب کے خرچ پر کوکین کے پان کھائے
دعوتوں میں طرح طرح کے کھانے پک رہے ہیں جن کی خوشبو دور
دور تک جنگل (مقام گوٹھ) کو مہکا رہی ہوتی اور صولت صاحب
ہیں کہ خشک روٹی لئے ایک کونے میں کھا رہے ہیں دعوتی احباب
حیران سے پوچھتے میاں یہ کیا۔ ارے بھوک لگی تھی یہ روٹی ساتھ لائی تھی
اور کھا رہا ہوں یعنی طرح طرح کے بہتر سے بہترین کھانوں کو خود
چکھتے بھی نہ تھے۔ جو دوسروں کو کھلاتے مگر خود خشک روٹی ہی
کھاتے۔

صولت صاحب نئی شیروانی پہن کر اقبال ہوٹل پر آئے۔ کسی صاحب
نے تعریف کر دی کہ واہ واہ کیا شیروانی ہے اور صولت صاحب
نے وہ شیروانی اتار مع سونے کے بٹنوں کے اسے دیدی۔ غرضیکہ
تمام روپیہ اور ساتوں مکانات ایک دو سال کے قلیل عرصہ
میں ختم کر دیئے گئے۔

میری رہائش چاندنی محل میں تھی کہ صولت صاحب
تشریف لائے اور قریباً دو ماہ تک قیام فرمایا۔ ایک دن
فرمانے لگے کہ بیٹا سرور یہ مولانا عبدالقدیر صاحب کون بزرگ
ہیں۔ سنا ہے "شمع" کے مالک حافظ محمد یوسف صاحب دہلوی انھیں
پیر مانتے ہیں اور ان کی کوٹھی کی بنیاد رکھتے وقت بھی
مولانا عبدالقدیر صاحب نے ہی بسم اللہ فرمائی تھی۔ میں نے عرض
کیا کہ میرے غریب خانہ سے چند قدموں پر ہی ان کا مکان ہے
جس دن بھی آپ فرمائیں گے ان کے ہاں لے چلوں گا۔ بات
آئی گئی ہو گئی۔ ایک دن میں نے صولت صاحب سے بضد ہو کر کہا
کہ مجھے جن دکھایئے۔ مسکرائے پھر قہقہے لگاتے رہے۔ اور
کئی دن تک مجھے مذاقاً فرماتے رہے کہ اچھا آپ جن دیکھیں گے

میں بدستور مولانا کے ساتھ مطالبہ کرتا رہا کہ مجھے جن دکھایئے ایک دن فرمانے لگے سرورم جن کو دیکھو گے تو لرزتے خوف زدہ ہو جاؤ گے کہ شاید تمہارا دماغی توازن ٹھیک نہ رہے۔ اچھا کبھی موقع ملا تو تمہیں انسانی شکل میں جن دکھا دوں گا۔ کچھ دنوں بعد ایکا یک صبح سویرے ہی کہنے لگے کہ آج مولانا عبدالقدیر صاحب کے ہاں ضرور لے چلنا۔ دیکھنا بھولنا نہیں۔ شام کو چار بجے دریا گنج دفتر بند کر کے ہم چاندنی محل گھر پہنچے چائے پی اور میں نے عرض کیا کہ چلئے آپ کو مولانا عبدالقدیر صاحب کے ہاں لے چلوں۔ میرے غریب خانے سے زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو منٹ کا وقت مولانا صاحب کے مکان تک پہنچنے میں لگتا تھا۔ چنانچہ سوئی والان میں مولانا صاحب کے مکان پر آواز دیکر ہم اوپر چلے گئے۔ وہاں دو تین اصحاب تشریف فرما تھے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ مولانا صاحب بیمار ہیں گزارش کی گئی کہ ان سے دریافت کر لیا جائے اگر وہ اجازت دیں تو ایک منٹ کے لئے حاضری کا موقع دیں ہاں ان سے یہ کہدیجئے کہ ٹونک (راجستھان) سے سید صولت آپ کو دیکھنے کے لئے آئے ہیں۔ مولانا صاحب نے بلالیا۔ صولت صاحب نے ان سے مصافحہ کیا اور سلام دعا کے بعد ہم چلے آئے سیڑھیوں میں فرمانے لگے جاؤ اوپر جاکر اچھی طرح سے اس آدمی کو دیکھ آؤ جو لمبی لمبی بھوؤں والا خوبصورت نوجوان ایک طرف کو خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ وہی مبانی صاحب ہیں (صولت صاحب جنوں کو مبانی کے نام سے ہی پکارتے تھے) میں بڑے اشتیاق سے اُلٹے پاؤں اوپر گیا۔ اس شخص نے بڑی محبت اور شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھا میں نے سلام کیا وہ صاحب مسکرائے اور ہاتھ سے سلام کا جواب دیکر پھر نظریں نیچی کر لیں — سوئی والان سے میرے غریب خانے تک آتے آتے فرمانے لگے مولانا واقعی تعریف کے قابل ہیں۔ شہر والوں نے دیکھ بھال کر ان کا سکہ مانا ہے۔ میں نے گھر آکر پھر گزارش کی کہ میاں یہ کوئی جن کا دکھانا تھا۔ قہقہے لگاتے ہوئے کہنے لگے کہ اسی لئے تو تمہیں آج مولانا عبدالقدیر کے یہاں چلنے کو کہا تھا کہ مجھے رات کو سوتے میں ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہاں انسانی شکل میں کوئی جن آیا ہوا ہے۔ مگر میری تسلی نہ ہوئی اور میرا یہ مطالبہ بدستور رہا کہ حضور جن کو ایسی صورت میں دکھایئے کہ مجھے ڈر بھی نہ لگے اور مجھے یقین بھی ہو جائے کہ ہاں میں نے واقعی جن دیکھا ہے۔ فرمانے لگے اچھا وقت آنے دو ایسا بھی ہو جائے گا۔ (جاری ہے)

بقیہ: بُلبُل چہ گُفت......

اور بہ باطن اس مُلک کے خلاف دعائیں کرے تو وہ وطن پرست اور غیر فرقہ پرست۔ اگر کوئی ہندو ادیب مندر جائے تو وہ فرقہ پرست اور مسلمان ادیب دن میں پانچ وقت نماز پڑھیں (حالانکہ یہ نعمت ۹۸ فیصد مسلمان ادیبوں کو میسر نہیں) یہ روزے رکھیں شاہی امام کے زہر آلود خطبے سُنیں اور پھر بھی یہ وطن پرست اور غیر فرقہ وارانہ۔

انگریزی حکومت کے وقت کیا ابو محمد شبلی یا منشی پریم چند کے خلاف بکواس کرنے والے دیگر مخالفین کی یہ جرأت تھی یا ان کے آبا و اجداد میں بھی یہ ہمت تھی کہ وہ انگریزی حکومت کے خلاف چوں بھی کر سکیں اگر منشی پریم چند نے کسی وقت انگریز کی حمایت کی ہوگی تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ عشق کس نے نہیں کیا۔ ہاں اگر کوئی نامرد ہو تو دوسری بات ہے۔ وگرنہ اس وادی میں تو بڑے بڑے پرہیزگار بھی قدم رکھنے سے باز نہ رہ سکے۔ خواہ اُنھوں نے عشق اپنی بیوی سے کیوں نہ کیا ہو۔ دُنیا میں ہر شخص عشق کی ہی پیداوار ہے۔ اگر کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو پھر وہ اس کا اعلان کرتا ہے کہ اس کے ماں باپ جنسی طور پہ آپس میں میل نہ کھاتے تھے۔ اگر منشی پریم چند نے جوانی کے زمانے میں کسی سے عشق کر لیا تو کیا ہوا کیا آپ ڈاکٹر اقبال اور فیضی کے عشقیہ خطوط کو بھول سکتے ہیں جہاں ڈاکٹر اقبال ایک خط میں عطیہ فیضی کو مخاطب ہی یوں کرتے ہیں کہ کچھ کہئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں۔ پھر مولانا شبلی اور عطیہ فیضی کی خوش نظری آپ کو یاد نہیں۔

سوال صرف منشی پریم چند کے افسانوں تک ہی محدود رہنا چاہیئے تھا اور ویسے افسانے ابو محمد شبلی یا ان کی سات پشتوں میں پہلے اور نہ آئندہ سات آنے والی پشتوں میں کوئی لکھ سکے گا۔ منشی پریم چند ہر حال میں منشی پریم چند فخرِ ہندوستان رہے گا اور ان کے خلاف لکھنے والوں کو نہ تاریخ نہ عوام اور نہ ان کے اپنے گھر والے ہی یاد رکھ سکیں گے۔

صدق جائسی

کچھ نہفتہ داستانیں کچھ شگفتہ تذکرے

قسط نمبر

عیاشیوں کے مرقعے اور لہو ولعب کی تصویریں!

دربار کی دوسری رات

رات بھر کی بیداری اور تھکان دربار سے ایک ایک رگ دُکھ رہی تھی۔ حُسنِ اتفاق کہ وہ دن تعطیل کا تھا۔ میں نے بستر سے اُٹھ کر باطمینان ہاتھ منہ دھویا۔ غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔ ناشتہ کرنے بیٹھا تو دن کے گیارہ بجے تھے۔ خمارِ دربار کا تقاضا تو یہ تھا کہ پھر لیٹ رہوں مگر میں نے چائے کی دو پیالیوں سے جسم میں چستی پیدا کی۔ پان کی ڈبیا جیب میں رکھی اور سواری منگوا کر سیدھا چوک پہنچا۔ چاندی والے کی دوکان سے میں نے ایک نہایت خوبصورت گلوبند خریدا۔ پھر لپکا لپکا دستار بند کی دوکان پر جا کر دم لیا۔ وہاں فاختئی رنگ کی ایک دستار کا آرڈر دیا۔ پرنس کے درباری اسی رنگ کی دستار پہنتے تھے۔ ان کاموں کی بندوبست و انصرام میں دو بج گئے۔ ڈھائی بجے گھر واپس آیا اور کھانا کھا کر جی بھر کے سویا۔ بعد مغرب پرنس کے موٹر خانے کی ایک موٹر دروازے پر آ کر رکی۔ ڈرائیور نے گاڑی سے اُتر کر مجھے اطلاع دی کہ آپ کی یاد ہوئی ہے۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے تیار رہیئے گا۔ میں فانی صاحب کو ان کے گھر سے لیکر ادھر آؤں گا۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کر دوسرے کپڑے پہنے۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے اسی موٹر میں فانی آئے اور مجھے درباری لباس پہنے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ آج ہم دونوں ساتھ ہی فرسٹ پہنچے۔ کل کی طرح آج مجھ پر وہ وحشت تو سوار نہ تھی مگر نہ جانے کیوں پاؤں میں ایک کپکپی سی ضرور تھی۔ آج ڈنر ٹیبل پر تین معزز [illegible] نظر آئیں۔ کھانے پر پرنس زیادہ انہیں سے مخاطب رہے۔ یوں مجھے پرنس کو اچھی طرح دیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل گیا۔

نو وارد اصحاب میں ایک وجیہہ اور رئیس صورت معمر بزرگ تھے جن کی ایک ایک ادا بتا رہی تھی کہ یہ امیر پشتوں کے امیر ہیں۔ پرنس ان کو بیا کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ دوسرے بزرگ وجاہتِ ذاتی سے محروم سانولے رنگ کے معمولی شکل و صورت کے آدمی تھے جن کا قیمتی لباس اگر اُتار لیا جاتا تو دیکھنے والا انہیں کسی دفتر کا کلرک سمجھنے پر مجبور تھا۔ تیسرے مہمان اچھی صورت سے اسی کے کم عمر معلوم ہوتے تھے۔ اگرچہ یہ قیمتی لباس [illegible] تھے مگر شرافتِ خاندانی اور علمی وقار، ان کی بات بات سے ہویدا تھا۔ انہیں پرنس کبیر یو کہہ کر پکارتے تھے۔

ڈنر معمول کے مطابق ایک گھنٹہ میں ختم ہوا۔ آج دربار میں پہلے سے [illegible] ایک جنگ اور دھک جنگ کی بجائے پیا اور کبیر یو کی نشست تھی۔ یہ [illegible] صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ صدر میں پرنس کی کرسی کے قریب ایک دوسری کرسی پر وہی سانولے مہمان متمکن تھے۔ ان کے آگے ایک بیش قیمت گول میز پر چاندی کا نہایت شفاف پاندان رکھا تھا۔ انھوں نے پان بنا کر پہلے پرنس کو ایک طشتری میں نہایت ادب سے پیش کیا پھر خود کھایا۔ دربار میں ہر شخص جب اپنی اپنی جگہ بیٹھ چکا تو پرنس مجھ سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا "صدق تم اپنے ساتھ غزلوں کی بیاض بھی لائے ہو؟"۔ میں نے کھڑے ہو کر دست بستہ عرض کی۔ سرکار غزل کی بیاض میرے ساتھ شاذ و نادر ہی رہتی ہے۔ آج بھی معمول کے مطابق نہیں ہے۔

فانی نے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ "ان کے لئے بیاض کی ضرورت کیا ہے، بچپن سے اب تک جو کچھ کہا ہے۔ سب کا سب حافظے میں محفوظ ہے آپ سننا چاہیں تو یہ مہینوں اپنا کلام زبانی سنا سکتے ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ مشہور اساتذہ کے دیوان کے دیوان حفظ ہیں۔

پرنس نے مجھ پر حیرت و استعجاب کی نظر ڈالی۔ فرمایا کہ تم پیا اور کبیر یو کے درمیان آ کر بیٹھو۔ میں اٹھ کر دربار کے آداب بجا لایا۔ اور پرنس کے داہنے ہاتھ والے صوفے پر ان تازہ مہمانوں کے بیچ بیٹھ گیا۔

اب پرنس نے ان سانولے مہمان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا صدق! یہ ہمارے ماموں نواب [illegible] جنگ بہادر ہیں علاوہ اپنی آبائی معاش کے تمام گورنمنٹ کے ملٹری سکریٹری بھی ہیں۔ میں نے جھک کر آداب سلام کیا۔ نواب صاحب نے بھی البتہ اٹھ کر میرے سلام کا جواب دیا پھر بیٹھ کر پرنس نے فرمایا "یہ سرکار کے [illegible] کی عزت بڑھاتے ہیں۔ میں تو ایک ادنیٰ خادم ہوں"

پرنس پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا: "تمہارے بائیں ہاتھ پر نواب ناصر نواز الدولہ ہیں جو میرے مرحوم دادا کے رفیق خاص اور مصاحب تھے۔ خاندانی امیر ہیں۔ میں انھیں پیا کہتا ہوں۔" میں نے اٹھ کر ان کو سلام کیا وہ بھی کھڑے ہو گئے اور بڑی خندہ پیشانی سے میرے سلام کا جواب دیا۔ پھر ارشاد ہوا۔ "تمہارے داہنے ہاتھ پر فانی کے سلیمان ہیں جو بچپن میں میرے اور میرے بھائی (ولی عہد) کے اتالیق تھے۔ میں ان سے پڑھا ہوں تھا۔ ان کو کبیر ہو کہتا ہوں۔" اس تعارف کے بعد فرمایا اچھا ابھی وہی غزل پڑھو جس کے ایک شعر نے مجھے بہوت کر دیا ہے۔ فانی! تم اس بات کا واقعہ صدق کو سناؤ۔ جب پہلی بار تم نے وہ شعر مجھے سنایا تھا اور جو کیفیت وہ شعر سن کر میری ہوئی تھی وہ بھی بتاؤ۔" فانی مجھ سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا: "صدق صاحب آپ کا یہ شعر سن کر سرکار

اُس کے لطف عام کو غیرت نہیں کرتی قبول

اور میں کمبخت لطف خاص کے قابل نہیں

سرکار کی جو کیفیت تھی۔ اسے میں لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ تقریباً نصف گھنٹے تک مجھ سے یہی شعر پڑھواتے رہے۔ کسی طرح سیری نہ ہوتی تھی۔ پچاسوں سوالات آپ نے تلاش فرما ڈالے مجھے جس قدر علم تھا عرض کرتا گیا۔ اب حقیقتِ حال میری سمجھ میں آئی کہ یہ سب کچھ انھیں کی کارستانی ہے۔

پرنس نے فرمایا: "فانی یہ بتاؤ کہ یہ شعر میں نے تم سے کتنی بار پڑھوایا ہے؟" فانی بولے "کم سے کم نو بار"۔ پرنس نے فرمایا۔ "پیا! اُستاد کے کچھ سینگ دُم نہیں ہوتے، جو ایسا مکمل شعر کہہ دے وہی اُستاد ہے۔" پیا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "بہت صحیح ارشاد ہوا۔" پھر کہنے لگے صاحب کیا خوب بات فرمائی ہے کہ اُستاد کے سینگ دُم نہیں ہوتے جو ایسا مکمل شعر کہہ دے وہی اُستاد ہے۔ صدق صاحب مبارک ہو آپ کو اُستادی کی سند سرکار سے ملنا یہ بڑے فخر کی بات ہے۔" میں نے اٹھ کر پہلے سرکار کو پھر پیا کو سلام کیا۔

غزل سناؤ

حکم ہوا کہ یہی غزل سناؤ۔ میں نے پرنس سے مخاطب ہو کر مطلع پڑھا ؎

محنتِ عشاق، اے خود کام! بے حاصل نہیں

تجھ کو بے پروا جو رہنے دے وہ جذبِ دل نہیں

پرنس نے نہایت شگفتگی سے بہت ہی بہت اچھا فرمایا۔ فانی پیا، کبیر ہو، نواب قدرت نواز جنگ، سب نے تعریف کی۔ امک جنگ اور ڈھنگ جنگ نے بھی داد دی۔ حسنِ مطلع تھا ؎

گفتنی ہے ماجرائے غم مگر کس سے کہیں

آشنا دردِ محبت سے تمہارا دل نہیں

پرنس نے فرمایا: "پیا! کیسا سادہ اور پُر اثر کلام ہے" پیا کہنے لگے۔ "صاحب! غلام کو داغ یاد آ گئے پھر مجھ سے کہنے لگے صدق صاحب مگر کس سے کہیں۔ کیا غضب کر دیا ہے!" میں نے اٹھ کر پہلے پرنس کو پھر پیا کو سلام کیا۔ پرنس نے فرمایا۔ صدق! پیا کے سامنے شعر پڑھ کر داد لینا کوئی آسان کام نہیں۔ انھوں نے اعلیٰ حضرت مرحوم کے سامنے بارہا داغ کو پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ میں نے سر خم کیا۔ غزل میں جب یہ شعر آیا ؎

میرے دشمن وصل سے مایوس ہوں اے غمگسار!

اُس کی غفلت ہی تو کہتی ہے کہ وہ غافل نہیں

پرنس نے بے ساختہ "دیر کی بیوی قُل" فرمایا۔ پیا اور فانی نے بے انتہا تعریف کی۔ پیا نے پرنس سے ہاتھ جوڑ کر عرض کی "صاحب! یہ فیضانِ عشق ہے، فانہ زاد سمجھ گیا۔ دوسرے کی بس کی یہ بات نہیں" پرنس خوش دلی سے ہنسنے لگے۔ پیا اپنی بات پر مصر کہ سرکار تحقیقات فرمائیں۔ اگر یہ کسی پر عاشق نہ ہوں تو غلام کے مُنہ پر تھوک دیجئے گا۔" اس پر سب لوگ ہنسنے لگے۔

پرنس نے فرمایا: "یہ تو میرا عقیدہ ہے کہ عشق کے بغیر شاعری کرنا جھک مارنے کے مترادف ہے۔" فانی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ "بہت صحیح ارشاد ہوا۔ بغیر عشق کے شعر میں لُطف و لذت پیدا ہی نہیں ہوتی۔" پیا نے فرمایا۔ صاحب غلام تو یہ عرض کرتا ہے کہ جس نے عشق نہیں کیا۔ وہ غزل کیا شعر بھی سمجھ نہیں سکتا۔ کوئی عالمِ نحو اس کے لطف کو کیا سمجھے گا۔ ؏

اس کی غفلت ہی تو کہتی ہے کہ وہ غافل نہیں

"اے سبحان اللہ، سبحان اللہ"، میں سلام کرتے کرتے تھک کر چور ہو گیا۔ کیوں کہ ہر شخص کی تعریف پر مجھے کھڑے ہو کر سلام کرنا پڑتا تھا خصوصاً پرنس کے ہر لفظ پر سات سات فرشی سلام۔ غزل خوانی اس دن وبالِ جان بن گئی۔ مختصر یہ ہے کہ یکے بعد دیگرے پرنس نے پانچ غزلیں پڑھوائیں اور ہر غزل کا ایک ایک شعر کم از کم دو مرتبہ تو پڑھنا ہی پڑا۔ بعض شعر پرنس نے تین تین بار پڑھوا کر سُنے۔ جب یہ سلسلہ ختم ہوا، تو میں سلاموں کی کثرت سے قریب قریب بے دم ہو چکا تھا۔

اب پرنس نے فرمایا: "پیا بہت اچھا کلام ہے۔ اس کے علاوہ صدق کو میں نے بہت گہری نظر سے دیکھا۔ یہ ہر لحاظ سے میری صحبت میں بیٹھنے کے قابل ہیں!" میں اس عزت افزائی پر اُٹھ کر آداب بجا لایا۔ نواب قدرت نواز

جنگ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پاس آئے۔ میں تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ انھوں نے معانقہ کر کے مجھے مبارک باد دی کہ آپ سے سرکار نے پانچ غزلیں مسلسل سنیں۔ یہ فخر آپ کے سوا اس دربار میں آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ پھر سرگوشی کے لہجے میں فرمایا۔ صدق صاحب یہ بہت بڑا دربار ہے۔" میں نے مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔

امک جنگ نے سرکار سے دست بستہ عرض کی: "اب سرکار کے طفیل میں فدوی روزانہ صدق صاحب کے درشن کیا کرے گا۔" امک جنگ ان کی ہمزبانی کرنے لگے۔ مگر مجھے پہلے دن کی بے اعتنائی بھولی نہ تھی۔ میں نے دل میں ایک تہیہ کیا اور پہلی بار درباری نفاق کو دل میں چھپا کر بہ خندہ پیشانی ان حضرات کی قدر دانی کا شکریہ ادا کیا۔

سچ پوچھیے تو اُن کی بے اعتنائی ہی میری مصاحبت کا باعث ہوئی ورنہ میں فانی کے تیار کیے ہوئے اس پھندے کو ہزار ترکیبوں سے توڑ کر نکل جاتا مگر یہاں تو اب قدم جمانے کی فکر تھی۔ نکل بھاگنے کا کیا ذکر۔ غرض اس صحبت میں خود پرنس کی زبانی میری اعزازی مصاحبت کا اعلان ہو گیا۔

کیپٹن (قاری سلیمان صاحب) ذی علم اور باکمال بزرگ تھے۔ ان سے مل کر مجھے دلی مسرت ہوئی۔ پرنس کے اشارے پہ [illegible] بوتلیں چلے رنگ تاب پڑی اور پل فورٹ کی اصطلاح میں مشاعرہ شروع ہوا۔ مصاحبوں نے سرکار کے کلام کی ایسی ایسی داد دی کہ بے داد کی منزل تک پہنچا دیا۔ کہی ہوئی بات کا دہرانا میرا شیوہ نہیں مختصر یہ کہ اسی دھاچوکڑی اور گرماگرمی کے ساتھ وہ رات بھی گزر گئی۔ ۳ بجے مجھے اور فانی کو سرکار نے خدا حافظ کہہ کر رخصت کیا۔ نواب قدرت نواز جنگ۔ پیا اور کیپٹن نے بھی فرصت پائی۔ باہر نکل کر اُن حضرات نے مجھ سے نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ اور آج کی ملاقات پر اظہارِ مسرت فرمایا میں نے مناسب الفاظ میں فرداً فرداً شکریہ ادا کیا۔

لالہ رُخسار سے

ان سے فرصت ملی تو اس طفلِ ماہ رُخسار نے جس کا تفصیلی ذکر پہلی رات کے دربار میں نرت کے سلسلے میں آچکا ہے۔ آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور میرے کلام کی بڑی تعریف کی۔ پھر کہا کہ یہ غزلیں جو آپ نے دربار میں پڑھی تھیں مجھے لکھ کر عنایت فرمایئے۔ آپ کے کلام میں ایسا اثر ہے جس نے مجھے بے چین کر دیا۔ میں نے وعدہ کیا تو اس نے کہا کل اپنے ساتھ لکھ کر لایئے گا۔ دیکھیے وعدہ خلافی نہ ہونے پائے۔ فانی نے کہا کہ ان کی شامت ہے کہ آپ سے وعدہ خلافی کریں گے۔ اس گفتگو کے بعد میں نے ہاتھ ملا کر اُسے رخصت کیا

اور فانی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستے میں فانی نے مجھے مبارک باد دی اور کہا کہ پرنس نے تم کو پسند کر لیا۔ مگر میں تمہاری زبانی سننا چاہتا ہوں کہ خود تم نے اس دربار کے متعلق کیا رائے قائم کی۔ تم صاحب خوشی سے بیٹھے یا مجبوری سے۔ آئندہ تمہارا کیا ارادہ ہے۔

میں نے کہا پرنس کیا بہ لحاظِ صورت اور کیا بہ لحاظِ سیرت بے مثل ہیں۔ ایسے نیک خُو اور خوبصورت شاہزادے کی مصاحبت پر میں جس قدر فخر کروں کم ہے۔ مجھے یہ دربار بہت پسند آیا۔ رہے درباری وہ خاندانی امرا ہیں یا عہدیدار یا اہلِ علم اور صاحبانِ کمال۔ ایسی صحبتیں قسمت ہی سے میسر آتی ہیں۔ مجھے تنخواہ جو گورنمنٹ سے ملتی ہے وہ میری ضروریاتِ زندگی کے لئے کافی ہے۔ پرنس کی عطایا [illegible] مجھے احتیاج نہیں۔ جو سوال ہے وہ شب بیداری کا ہے۔ رات بھر جاگنے کے بعد اپنے فرائض کیوں کر انجام دوں گا۔ فانی نے کہا بے شک یہ سوال غور طلب ضرور ہے۔ لیکن اس پہ اطمینان سے غور کریں گے۔ [illegible] تو میں تمہارے منہ سے منظوری سننا چاہتا تھا وہ الحمدللہ سن لی۔" پھر کہنے لگے۔ "میں تیس برس انتونوں میں دربانوں کی طرح تنہا تھا۔ تمہارے آنے سے میرا [illegible] ہو گیا۔ مگر میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ اس دربار کے کسی آدمی کو کبھی [illegible] اپنا دوست نہ سمجھنا یہ سب کے سب ناقابلِ اعتبار اور منافق ہیں۔ بظاہر سب سے خلوص و محبت سے پیش آنا۔ مگر دل میں سب سے ڈرنا۔" میں نے کہا [illegible] ہے۔" فانی کہنے لگے: "کچھ بھی نہیں گل کے پہلو میں ہمیشہ کانٹے رہے ہیں [illegible] کیا کسی ذی عقل نے کانٹوں کے ڈر سے گل چیں سے پہلو تہی کی ہے۔ ہرگز نہیں [illegible] جس نے غفلت برتی ہے اس کے ہاتھ کو ضرور تکلیف پہنچی ہے۔"

یہ مشاعرے جن کا ذکر دو راتوں میں آچکا ہے [illegible] سے شروع ہوئے تھے [illegible] اب میرے معمولات نہ پوچھیے۔ رات کو بلا ناغہ پرنس کے ساتھ ۳ بجے تک سرکاری غزلوں کی داد دینا۔ گھر پلٹ کر چار بجے سونا پھر اصل خواب غفلت سے بیدار ہونے کا وقت ہے ۹ بجے دن کو جاگنا بہ عجلت دس بجے دفتر [illegible] شام کو چار ساڑھے چار بجے تک اقامت خانے کے معاملات دیکھنا۔ منشی جی کو [illegible] ہدایات دینا۔ بوڑھوں کی شکایتیں سننا۔ ان کے فیصلے کرنا [illegible] دربار کی تیاری اور اہتمام میں مصروف ہو جانا۔ فانی کے پاس الحمد [illegible] علاوہ اس وقت کوئی کام نہ تھا وہ اپنے وقت کے مالک [illegible] رخصت تیاری پر [illegible] کی وجہ سے [illegible] مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کی سرکار سے ان کو [illegible] کمال ونس بہ صورت نصف [illegible] سال بھر میں کبھی ایک ہی [illegible]

وقت فاقوں کی بسر اوقات صرف قرض پر تھی مہاجنوں کا سود بڑھتا جا رہا تھا۔

اتفاق سے ایک سال پہلے یعنی ۱۹۳۲ء ہی میں میری رفیقۂ حیات مجھے داغِ مفارقت دے چکی تھیں، میں تنہا تھا اور رات رات بھر کی اس غیر حاضری کا مجھ سے کوئی جواب طلب کرنے والا نہ رہ گیا تھا۔ ورنہ مشکل کا سامنا ہوتا۔ فاقی بیٹے تھے اور ان کی بیوی بھی جوان نہ تھیں اس لئے ان پر بھی کوئی مذہبی یا اخلاقی پابندی باقی نہ رہ گئی تھی جو اس دربار میں سدِ راہ ہوتی دونوں طرف "نے غم فرزند نے غم کالا" کا مضمون تھا۔ گھر میں تنہا نہ لیٹے دربار کی رنگ رلیوں میں رات گزار دی۔

میں اس سے پہلے سرسید ابو جعفر آف پیر پور (اودھ) اور پرنس حبیب اللہ خاں صاحب مرحوم آف بھوپال کی مصاحبت میں کئی کئی برس گزار چکا تھا۔ اس لئے اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ مصاحبت مجھے کہیں سیکھنے نہیں جانا ہے اس فن کے سارے ایچ پیچ سے واقف ہوں لیکن پرنس آف حیدرآباد کے دربار میں پیا (نواب ناصر نواز الدولہ) کی مصاحبت دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے اور مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ پیا اس فن کے استادِ کامل ہیں اور مجھے ہنوز ان سے برسوں سیکھنے کی ضرورت ہے۔

دربار میں کوئی مضمون زیرِ بحث ہو یہ ممکن نہ تھا کہ پیا خاموش رہیں ہر فن میں دخل دیتے اور ایسی دلچسپ گفتگو کرتے کہ سارا دربار انھیں کا منہ دیکھتا رہ جاتا۔ پیا کی مصاحبت دیکھ کر مصاحبت کا یہ گُر میری سمجھ میں آیا کہ مصاحب کی موجودگی میں بادشاہ کسی وقت دل گرفتہ اور متکدر نہ ہونے پائے ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں۔ بلکہ بہت مشکل ہے۔ بیشمار چٹکلے، لطیفے پیا کو یاد تھے جنہیں موقع اور محل سے وہ ایسی خوبصورتی سے بیان کرتے کہ پرنس کے ساتھ ہم لوگ بھی بیحد لطف اندوز ہوتے۔ پیا کو اس وقت کیا خبر تھی کہ میں جو تمام عالم کے لطائف دربار میں بیان کرتا ہوں۔ ایک روز میرا ایک واقعہ بھی لطیفے کی شکل اختیار کر کے ملک بھر میں مشہور ہو گا۔

ایک لطیفہ

واقعہ یہ ہے کہ یوں تو اعلیٰحضرت نواب میر محبوب علی خاں صاحب خلد آشیاں کے موکب میں پیا نے ہندوستان کے متعدد سفر کئے تھے ہندوستان کے باہر کبھی جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ یہ اتفاق بڑھاپے میں پیش آیا جب پہلی بار پرنس کے ہمراہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کو تشریف لے گئے۔ عبا، قبا اور عمامے کو علمائے ہند کے زیب بر اور زینتِ سر دیکھ کر پیا جانتے تھے کہ یہ لباس صرف علماء اور صلحاء ہی سے مختص ہے جس روز بغداد پہنچا اس کے دوسرے ہی دن ہوٹل میں پرنس کے پاس بیٹھے تھے کہ خادم نے ایک ملاقاتی کارڈ پرنس کے سامنے پیش کیا۔ ملاقاتی ایک جوان عمر کا مصری تھا۔ جس کے سرخ و سفید رنگت پر سیاہ ڈاڑھی بہت زیب دیتی تھی۔ اُسے عمامے اور عبا میں ملبوس دیکھ کر پیا دینی پیشوا سمجھ کر سروقد تعظیم بجا لائے مصافحہ کر کے ہاتھ چومے آنکھوں سے لگائے۔ اہلاً و سہلاً و مرحبا کہہ کر خیر مقدم کیا پھر اپنی جگہ نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ مصری تھوڑی دیر فرانسیسی زبان میں پرنس سے باتیں کر کے جب جانے لگا تو پیا نے پھر اسی احترام سے رخصت کیا۔ اُس کے جانے کے بعد پرنس سے دریافت کیا کہ صاحب! یہ کوئی عالمِ دین تھے یا کسی درگاہ کے متولی؟ چہرہ کیسا نورانی تھا کہ خانہ زاد کا دل باغ باغ ہوگیا، پرنس نے فرمایا "کاروباری آدمی تھا میرے پاس اس غرض سے آیا تھا کہ حسینانِ بغداد کو ملاحظہ فرمانے کے لئے ایک گھنٹہ مجھے بھی مرحمت فرمایئے تو ایسی ایسی صورتیں دکھاؤں کہ حسینانِ ہند یکسر آپ کی نگاہوں سے گر جائیں"

پیا نے کہا: استغفر اللہ! تو یہ حرام زادہ قرمساق تھا اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔ پرنس کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔ صوفے پر لوٹے جاتے تھے۔ پیا منہ پر طمانچے مارتے تھے اور توبہ و استغفار میں مصروف تھے۔ غرض پھر اس سفر میں پیا نے کسی عالمِ دین سے مصافحہ نہ کیا۔ سچ ہے کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے دربار میں جب کبھی ذکر آ جاتا تھا پیا نادم ہو جاتے اور کہتے "صاحب! وہ ذاتِ پاک غفور الرحیم ہے۔ خانہ زاد سے نادانستگی میں یہ گناہ سرزد ہوا ہے کیا عجب ہے کہ معاف فرما دے" پیا پرنس کے دربار کے نہایت نیک نفس، دلچسپ درباری اور امیر تھے۔ خدا مغفرت فرمائے۔

عید کی شیروانیاں

غرض انہیں دنوں جشن سالگرہ اور رنگ رلیوں میں رمضان کا مبارک مہینہ آگیا۔ وابستگانِ دامنِ دولت کو عید کے موقع پر پرنس کے دربار سے شیروانیاں عطا ہوتی تھیں۔ یہ وہ عطائے عام تھی جس سے کوئی مصاحب، کوئی خدمتگار، کوئی سقہ، کوئی فراش، کوئی باورچی۔ حتیٰ کہ باورچی خانے کا اسٹاف تک محروم نہ رہتا تھا۔

ان شیروانیوں کی مراتب کے لحاظ سے قیمتیں مقرر تھیں۔ مصاحبوں کی شیروانی ڈھائی سو سکہ انگریزی کی ہوتی تھی۔ خدمت گاروں کے لباس

کے لیے سو روپے کی منظوری تھی ۔ خود پرنس کی شیروانی پر چھ سات سو کی لاگت بیٹھتی تھی ۔ عید کی شام کو پل خوشبو کی بہار دیکھنے کے قابل ہوتی تھی ۔ جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا ۔ یہ شیروانیاں سکندرآباد کے ایک مشہور درزی جان برٹن کی دوکان سے تیار ہو کر آتی تھیں ۔

دستور یہ تھا کہ ماہ صیام میں پرنس دو چار پیڈ درباریوں کے ہمراہ نو دس بجے دن کو جان برٹن کی فرم میں تشریف لے جاتے ۔ برٹن شاہانہ استقبال کرتا ۔ فرم کے اس حصے میں جہاں صرف شیروانیوں کے تھان ہوتے تھے ۔ کرسیاں بچھ جاتیں ۔ برٹن ادب سے ہاتھ باندھے سامنے کھڑا رہتا فرم کے نوکر چاکر الماریوں سے تھان نکال نکال کر پرنس کے حضور میں پیش کرتے ۔ بے شمار تھانوں کے ملاحظہ کے بعد کسی ایک مصاحب کے شیروانی کا کپڑا پسند آیا ۔ ہر مصاحب کے جسم کی ناپ فرم کے رجسٹر میں درج رہتی تھی ۔ پسندیدہ تھان پر مصاحب کے نام کی چٹ لگا دی جاتی وہ تھان سب سے الگ کر دیا جاتا ۔ یہ تھان خاص شیروانیوں کے لئے فرانس سے تیار ہو کر آتے تھے ۔ اور عموماً دو گز کے ہوتے تھے ۔ مقصد ان دو گز کے تھانوں کا یہ ہوتا تھا کہ جس کپڑے کی شیروانی آپ پہنیں ویسی دوسرا نہ پہن سکے ۔

ہر تھان کے ڈیزائن کے لحاظ سے اس کے ساتھ بٹن بھی فرانس ہی سے آتے تھے جو نہایت بیش قیمت ہوتے تھے ایک مصاحب کی شیروانی کے انتخاب کے بعد پرنس دوسرے کے لئے کپڑا پسند فرمانے کا کام شروع کر دیتے اس میں بھی سینکڑوں تھانوں کے ملاحظے کے بعد کپڑے کا انتخاب فرماتے اس تھان پر بھی قاعدے کے مطابق مصاحب کے نام کا لیبل لگ جاتا ۔

مختصر یہ کہ دو یا تین کپڑوں کے انتخاب میں شام ہو جاتی اس کام کو دربار کی اصطلاح میں روزہ بہلانا کہتے تھے ۔ جتنی دیر پرنس برٹن کی فرم میں تشریف فرما رہتے فرم کے اس حصے میں کوئی وزیر یا امیر قدم دھر سکتا صرف وہ یورپین لیڈیز جن سے بے تکلفی کی ملاقات تھی اس روک ٹوک سے مستثنیٰ تھیں ۔ لیکن ان کی تعداد نہایت محدود تھی ۔ یہ بڑے بڑے فوجی یورپین افسروں کی بیگمات ہوتی تھیں ۔

ماہ مبارک کے طول طویل دن اسی شغل میں بہ آسانی گزر جاتے اس مہینے کے احترام میں رات کے مشاعرے موقوف رہتے ۔ ڈنر کے بعد رات کے دو بجے تک اِدھر اُدھر کی باتیں رہتیں ۔ اکثر و بیشتر مذہبی مسائل زیر بحث میں آتے ۔ یا اولیاء اللہ کے تذکرے رہتے ۔ بیچ بیچ میں اپنی حسن کا ذکر بھی رہتا تھا ۔ عید کے ایک دن پہلے سے ارباب نشاط کے طائفے جنہیں عید کی رات کے مجرے کے لئے دہلی ۔ آگرہ ۔ لکھنؤ ۔ بمبئی سے طلب کیا جاتا حیدرآباد میں اترنا شروع ہو جاتے ۔ قاسم صاحب ان کی سرپرستی پر مقرر ہوتے ۔ اس زمانے میں قاسم صاحب کی شان دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی ۔ سر پر کتھئی رنگ کی دستار جامے کرتے بکلوس باندھے ، ان مہمانوں کی خدمت گزاری میں ایسا فخر محسوس کرتے کہ شاید ہی کسی مدارالمہام نے حقوقی فرض کی ادائیگی میں اس طرح کا فخر محسوس کیا ہو ۔

عید کی رات

طائفوں کی طلبی میں پرنس نے جو بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے ۔ میں نے اپنی ہفت سالہ مصاحبت میں ایک بار ایک ایجنٹ کی ادائگی بچشم خود دیکھی ہے ۔ وہ اپنا حال کے ساتھ درج ذیل ہے ۔

رمضان کی ستائیسویں تاریخ تھی ۔ میں اور قاق دربار میں بیٹھے تھے ۔ یکایک صدیقی صاحب ایک ایجنٹ درباری آداب ادا کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے ۔ پچاس روپیہ ماہانہ پرنس کی سرکار سے پاتے تھے ۔ کمیشن الگ کھاتے تھے ۔ پرنس ان سے مخاطب ہوتے فرمایا : تم صبح کی ٹرین سے بمبئی جا رہے ہو ۔ صدیقی صاحب نے سر تسلیم خم کیا ۔ پرنس نے فرمایا : میں حکم دے چکا ہوں تم جانے سے پہلے فلاں شخص سے زادراہ لے لینا ۔ تمہارے اس سفر کے لئے میں نے سات ہزار کی منظوری دی ہے فرسٹ کلاس میں سفر کرنا ۔ بمبئی میں فرسٹ کلاس ہوٹل میں ٹھہرنا ۔ شہر کی سب گانے والیوں سے ملنا جو تمہیں پسند آئے اس سے بات چیت پختہ کر لینا ۔ اگر یہ روپیہ جو تم ساتھ لے جا رہے ہو کفایت نہ کرے تو تم مجھ کو ایک تار دے دینا ۔ میں اور روپیہ بھیج دوں گا ۔ مگر ایک بات کا خیال رکھنا ۔ جس روز وہ طائفہ حیدرآباد کے قصد سے بمبئی ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر آ جائیں اسی وقت سے وہ ہمارے مہمان ہیں ۔ پھر ان کے کھانے پینے کا اہتمام اسی درجہ پر کرنا جو ہمارے شایانِ شان ہو ۔ خبردار پیسے کا منہ نہ دیکھنا ۔ صدیقی صاحب نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی : کیا مجال فدوی سرکار کی شان کا قدم قدم پر خیال نہ رکھے گا ۔

پرنس نے پیا سے مخاطب ہو کر فرمایا : کیوں پیا ۔ ٹھیک ہے نا ۔ پلیٹ فارم پر آنے کے بعد وہ ہمارے مہمان ہو چکے ۔ پیا نے ہاتھ جوڑ کر کہا : بہت صحیح ارشاد ہوا ۔ پھر کہنے لگے ۔ بیشک بیشک ان کی مہمان داری اسی درجے کی ہونی چاہیے جو ایک شاہزادے کے عالی قدر مہمانوں کے شایانِ شان ہے ۔

پرنس نے صدیقی صاحب کو رخصت دی ۔ [illegible]

صدیقی صاحب اُس وقت غالباً دل میں حساب لگا رہے تھے کہ ان سات ہزار میں پانچ ہزار تو یاروں کے بقیتی ہیں۔ مُنہ سے کچھ نہ کہہ سکے۔ ہاتھ جوڑ کر سر کو ادب سے خم کیا۔

صدیقی صاحب اس حیثیت کے آدمی تھے کہ شاید ہی اپنی عمر میں کبھی انٹر کلاس میں بیٹھے ہوں مگر آج ان کو حکم تھا کہ فرسٹ کلاس میں سفر کریں۔ یہ عزت محض اس کام کی بدولت ملی تھی جو انھوں نے اپنا دین اور ضمیر بیچ کر اختیار کیا تھا۔ انصاف شرط ہے۔ کیا دین کی اتنی قیمت بھی نہیں کہ ایسے موقع پر پانچ سات ہزار روپے ایسے دین فروشوں کے جیب میں چلے جایا کریں۔ خالی بیچارے پیسے پیسے کو محتاج تھے۔ مہاجنوں کا قرض بڑھتا جاتا تھا۔ اور صدیقی صاحب کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ جس مد میں جتنا جی چاہے لکھ دیں کوئی ان کے حساب کا چیک کرنے والا نہیں۔ کسی کی شامت آئی تھی کہ وہ ان کے حساب پر نکتہ چینی کرے۔ غرض اس گفتگو کے بعد صدیقی صاحب جھک کر آداب بجا لائے۔ پرنس نے خدا حافظ کہا اور وہ رخصت ہوئے۔

درباری دلال

دوسرے ایجنٹ فاروقی صاحب ایم۔ اے تھے۔ ان کی صورت میں نے کبھی آنکھ سے نہیں دیکھی۔ ناظرین صدیقی صاحب ہی کے واقعے سے فاروقی صاحب کی آمدنی کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں۔

تیسرا ایجنٹ ایک پارسی تھا۔ جس کا مستقل قیام بمبئی میں رہتا تھا اُس کے نام تحریری احکام جاری ہوتے تھے۔ اور وہ ایسے موقع پر کوئی نہ کوئی تحفہ لے کر دربار میں حاضر ہو جاتا تھا۔ مگر اس کی ماں دان صدیقی صاحب اور فاروقی صاحب سے کہیں زیادہ تھی۔ پہلی بار تو اس کی صد سے زیادہ بےتکلفی پرنس کے ساتھ دیکھ کر میں نے اس کو بھی کسی ریاست کا والی یا ولی عہد ریاست سمجھا تھا مگر خیریت یہ ہوئی کہ پرنس نے اس کا تعارف مجھ سے خود کرا دیا وہ شخص لاکھوں پر ہاتھ مارتا تھا اور ایک تحفہ پر اتنا سمجھاتا تھا جو صدیقی صاحب اور فاروقی صاحب دس سفر کرنے کے بعد بھی نہ پاتے تھے۔

چوتھے ایجنٹ درباری رفقا میں میرے اور فانی کے ایک رفیق تھے بے چارے یہ دیکھ کر کہ یاں داری کے ساتھ رہنے میں کچھ ہاتھ نہیں آتا بال بچوں کی خاطر ایجنٹ بن گئے تھے۔

ان مستقل ایجنٹوں کے علاوہ شیام صاحب اور یتن صاحب کی طرح اور لوگ بھی اس منفعت بخش کام کو کرتے تھے۔ مگر ہر کارسے وہر مردے کے مصداق ان لوگوں کو وہ فارغ البالی کبھی نصیب نہ ہوئی۔ جو صدیقی اور فاروقی کو حاصل تھی۔ انھوں نے دین ضرور بیچا مگر اس سے دنیا ہاتھ نہ آئی بہ قول شخصے۔ ع

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے ہوئے نہ ادھر کے ہوئے

چاندرات کی صبح ہی سے یہ قافلے نام پلّی ریلوے سٹیشن پر اُترنا شروع ہوتے۔ شیام صاحب سر پر دستار جمائے کمر میں پٹکوس باندھے ہر قافلے کا استقبال کرتے تانگہ کو خوردانہ سلام کرتے۔ گو خود ان کی عمر پچاس سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ کسی کو اس تپاک سے لیتے۔ گویا کسی قریبی رشتہ دار کو برسوں کی مفارقت کے بعد دیکھا ہو۔ طبلچی اور سازنگیے سے دوستانہ اور برادرانہ ہاتھ ملاتے۔ اور جو کوٹھی جس کے لئے نامزد ہو چکی تھی اسے اس میں لے جا کر ٹھہراتے اس روز بقول شاعر کے انھیں مرنے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ ہر قافلے کے ساتھ ناشتے میں شریک ہوتے۔ سرکاروں کے ساتھ کھانے پر بیٹھتے اور ہر تانگے سے اس احترام سے پیش آتے کہ کوئی سعادت مند بیٹا بھی اپنی ماں کا وہ احترام نہ کرتا ہوگا۔

عیش کی رات

عید کی رات میں فانی کے ہمراہ ہل فورٹ پہنچا تو محل کی آرائش دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ آج اُن پری جمال خدام کا حسن و جمال دیکھنے کے قابل تھا۔ سُرخ و سبز رنگ کی قیمتی شیروانیوں میں ہر خادم خود رئیس زادہ نظر آتا تھا فاختئی رنگ کی دستار اور قیمتی بکلوس اُن کی نازک کمروں پر وہ زیب دیتے تھے کہ نہ پوچھئے۔

اتنے میں وہی پری زاد لڑکا جو نرت کرنے میں کامل تھا عطر میں بسا ہوا سامنے سے گزرا۔ مجھے دیکھ کر ایک خوش گوار تبسم کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر سر جھکا دیا (دربار میں سلام کا یہی طریقہ رائج تھا) میں نے بھی اسی طرح سلام کا جواب دیا۔ شمامۃ العنبر کی دل آویز خوشبو سے سارا کمرہ مہکنے لگا۔ فانی درود پڑھنے لگے۔ میں نے ان کی طرف دیکھ کر یہ شعر پڑھا۔

خوشبو سے ہو رہا ہے معطر مشام جاں
چلتی ہے کس طرف کی ہوا کچھ نہ پوچھئے

فانی جھوم گئے۔ کہا آگے کہو۔ میں نے کہا۔

ناگفتنی ہے عشق بتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکر خدا کچھ نہ پوچھئے

اب فانی پھڑک گئے۔ بولے ماشاءاللہ۔ اس وقت طبیعت حاضر معلوم ہوتی ہے میں نے کہا ہل فورٹ میں آجانے کے بعد طبیعت خود بخود حاضر ہو جاتی ہے۔

مصاحبوں کی آج پوری پلٹن ہل فورٹ میں موجود تھی بچاسوں عہدیدار پرنس کو نذر دینے کے لیے حاضر ہوئے تھے ہر شخص کے جسم پر قیمتی اور خوشنما شیروانی تھی اور پورے محل میں ایسی بہار تھی جیسی میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ بیسیوں عہدیدار عید کی نذر جیبوں میں رکھے عید کے سلام کو حاضر تھے۔ خدا خدا کر کے پرنس

نذر اُٹھا لیتا تھا۔ نذر دینے والا درباری سلام کرکے پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ مجمع چھٹتا جاتا تھا۔ اغیار سے محفل خالی ہوئی تو مصاحبوں کی باری آئی۔ میری اور فاّنی کی نذر پرنس نے اپنے ہاتھ سے اُٹھائی۔ یہ انتہائی عزت افزائی تھی۔ ہم دونوں نے شکریے کے سات سات سلام کئے۔

عید کا کھانا

نذر کے جھمیلے میں بہت وقت گزر گیا آج دس بجے پرنس خاصے کی میز پر تشریف لے گئے۔ عید کے ڈنر میں کم و بیش ستر بہتر آدمی شریکِ طعام تھے۔ اس ڈنر میں جو تکلّفات کئے گئے تھے ان کے تفصیلی ذکر کا موقع نہیں۔ قابلِ ذکر صرف یہ بات ہے کہ آج بھی میرے اور فاّنی کے آگے ہوٹل سے آئی ہوئی دو دو چپاتیاں لگی تھیں۔ حیدرآبادی امیر ہوں یا غریب صرف نان تنے میں گوشت یا پایا ٹکھ کھاتے کھاتے ہیں۔ دوپہر اور شام کو صرف چاول کا رواج تھا۔ خشکہ ہو یا بریانی۔ ملک ہی چاول کا تھا۔ اس لئے اہلِ ملک چاول ہی رغبت سے کھاتے تھے۔ ہم لوگوں کو ہندوستانی جان کر ہمارے آگے دو دو چپاتیاں بھی لگا دی جاتی تھیں تاکہ ان نعمتوں سے جو پرنس کی میز کی زینت ہوتی تھیں۔ ہم اپنے مذاق کے مطابق لطف اندوز ہو سکیں۔ ان چار چپاتیوں کی خاطر پرنس کے باورچی خانے میں انتظام نہ ... ہوتا۔ اس لئے خود ان کے اشارے پر یہ چپاتیاں نام پلی کے ایک ہوٹل سے آجاتی تھیں جس کا مالک بھی ہماری ہی طرح ہندوستانی تھا۔

آج آخری ڈش کے موقع پر ایک خادم نے سیر سیر کی حلوہ سوہن کی گول گول ٹکیاں پرنس کے سامنے لا کر ڈھیر کر دیں۔ میرے اندازے میں کسی طرح وہ ٹکیاں بیس سیر سے کم نہ ہوں گی۔ پرنس نے فرمایا، فاّنی یہ تمہارے وطن کا تحفہ ہے۔ یعنی لکھنؤ کا حلوہ سوہن۔ تم اور صدّیق دونوں رغبت سے کھاؤ گے یہ فرما کر ایک ٹکیہ اپنے ہاتھ سے ہم دونوں کو مرحمت فرمائی۔ ہم لوگ اٹھ کر آداب بجا لائے۔ پھر حکم ہوا کہ ایک ایک ٹکیہ پوری میز پر پہنچا دو۔ خدام نے باقاعدہ سروس شروع کر دی۔ اس روز پل فورث کی بالائی کے ساتھ وہی حلوہ سوہن کھایا گیا۔ لوگوں کی طرح اس رات کوئی ملنفت نہ ہوا۔

کلّو مالی

آج کے ڈنر میں آٹھ دس عہدے دار بھی تھے جن کو پرنس سے کوئی نہ کوئی خصوصیت تھی۔ مگر اس وقت صرف ایک کا ذکر مقصود ہے۔ کمال الدین نام، کلّو تخلّص سرکاری باغات کا نگرانِ سپرد تھی۔ ماتحتی میں صدہا مالی اور مالنیں کام کرتی تھیں عاشق مزاج آدمی تھے فرصت کے اوقات میں نوخیز اور خوبصورت مالنوں سے

جی بہلاتے۔ اس شغل سے تھک جاتے تو شعر کہتے۔ صاحبِ دیوان شاعر تھے۔ افسوس کہ زمانہ کی ناقدری سے وہ سرمایہ تلف ہوگیا۔ نمونۂ کلام [illegible] ہے ؎

دل در دمند کو بے چین نہ کھنچ کے لئے ہے
گزلن سے سوا، دُختر گرگن کے لئے ہے

شہر بھر میں اپنی کم خردی کی بدولت مشہور تھے۔ اُن کے عقل و ہوش کے ادراک کے لئے یہی ایک لطیفہ کافی ہے۔ برسات کی ایک شام کو اپنے برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے۔ بارش مسلسل ہو رہی تھی آپ نے سینڈ مالی کو آواز دی وہ بھیگتا ہوا دوڑا آیا۔ پوچھا پانچ گئے ہیں مالیوں نے اب تک گملوں میں پانی ڈالنا شروع نہیں کیا؟ اس نے گھبرا کر کہا۔ سرکار صبح سے بارش ہو رہی ہے۔ فرمایا۔ پرواکی بات نہیں۔ ان سے کہو چھتریاں لگا لگا کر پانی ڈالنا شروع کر دیں فرض بہرحال فرض ہے۔ مفت کی تنخواہ نہ میں کھاتا ہوں نہ مالیوں کو کھانے دوں گا۔ اُس روز سے برسات میں مالی چھتریاں لگا کر گملوں میں پانی ڈالنے لگے۔

اس فرض شناسی کا شہرہ رفتہ رفتہ شاہزادوں تک پہنچا۔ دونوں نے مشتاق ہو کر باری باری شرفِ باریابی بخشا اور کلّو میاں کو عقل سے بیگانہ محض پا کر نہایت محظوظ ہوئے۔ ولی عہد نے لنچ پر بلانا شروع کر دیا جو نیر پرنس ڈنر پر یاد فرمانے لگے۔ کلّو میاں اپنی تنخواہ کس حد تک حلال کرکے لیتے تھے۔ اس کا حال تو اللہ جانے۔ دونوں وقت کے کھانے سے تو زندگی بھر کے لئے بے نیاز ہوگئے۔ کھانا بھی کیسا۔ شاہزادوں کی میز کا کھانا جس پر ہر قسم کی نعمتیں موجود ہوتی تھیں۔ سرکاری باغ کے مہتمم کی یہ دعوت عام من و سلویٰ کے خوان سے کسی طرح کم نہ تھی دونوں وقت الوانِ نعمت سے پیٹ بھرتے تھے آخر اس مفت خوری نے آدمی سے گینڈا اور عرصے کے بعد گینڈے سے ہاتھی بنا دیا۔ چلنا پھرنا وبالِ جان بن گیا۔ عید کی رات محفل سے جھومتے اٹھے۔ بزمِ عیش و نشاط آراستہ تھی آگرے کا کوئی طائفہ مجرا کر رہا تھا۔ مغنیہ کھڑی جھلملاتی، سارنگئے، مجیرے بجانے والے قالین کے فرش پر التیاں پالتیاں سے بیٹھے اپنا اپنا کمال دکھا رہے تھے۔ انھوں نے بے خیالی میں ایک کے پاؤں پر پاؤں رکھ دیئے خود لڑکھڑائے۔ اُس نے بے ساختہ آہ کی۔ پرنس نے ذرا سختی کے ساتھ فرمایا۔ کلّو! دیکھ کر چلو، تم تو اُس مشہور ہاتھی کی طرح اپنی ہی فوج کو پامال کر رہے ہو۔ درباری ہنسنے لگے۔ میں نے دست بستہ عرض کی سرکار! اپنی ہی فوج کی تخصیص مزہ دے گئی۔ اس پر پرنس بھی خوش ہو کر ہنس دیئے۔ فرمایا بے شک یہ لوگ انھیں کی ذات کے ہیں۔ کلّو میاں خفیف ہو کر بیٹھ گئے

تقسیمِ حُسن

بالآخر طے یہ پایا کہ سابق مغنیوں نے عید کی مبارک رات کے لئے ایک حسین گانے والیوں کا بندوبست کیا تھا جن میں بعض جوان تھیں، بعض کی جوانیاں ڈھل چکی تھیں مگر اپنے فن میں باکمال سب تھیں۔ پرنس کا منشا تھا کہ سب کی سب دربار میں موجود ہیں اس مشکل کا حل یہ تجویز فرمایا کہ ایک طائفہ سامنے بیٹھ کر گائے۔ باقی گانے والیاں مصاحبوں کے پاس صوفوں پر بیٹھ کر گاتی تھیں۔ بیس سالہ عمر کی مغنیہ کو حکم ہوا۔ تم فانی کے پاس بیٹھو۔ بیس سال والی دوسری حسینہ میرے پاس بٹھائی گئی۔ فانی اس بھرے بازار میں اس عطا کے خاص پہ لجائے اور شرمائے ترنم بہت مگر "ہندوستانی پرستم می رسد" کے قولِ مشہور نے ڈھارس بندھائی۔ جھک کر آداب بجا لائے۔

مجھ سے ارشاد ہوا۔ تسلی تم کو اپنے پارٹنر سے کوئی شکایت تو نہیں؟ میں نے عرض کیا۔ سرکار! میں قسمت کا قائل ہوں۔ جو چیز کسی کی قسمت میں ہوتی ہے وہ ضرور ملتی ہے۔ یہ بھی قسمت کے کھیل ہیں اور میں تقدیر کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔ اسی مضمون کو میں نے نظم بھی کیا ہے۔ ارشاد ہوا سناؤ میں نے اپنا یہ شعر پیش کیا ؂

> کچھ طبیعت درد کی خوگر ہے اے درد آفریں
> کچھ مشیت سے تری مجبور ہو جاتا ہوں میں

غرض بقیہ گانے والیاں بھی خاص مصاحبوں کے پاس بٹھائی گئیں۔ نائکائیں بوڑھے مصاحبوں کے حصے میں آئیں۔ بیا اور کیر یوں بھی اس لطفِ خاص سے محروم نہ رہے۔ اگرچہ کیر تو قبل بہت واسطہ۔ مگر ایک نائکہ اشارہ پاتے ہی خود جھٹ کر ان کے پہلو میں بیٹھ گئی اور ان کو بھی اس عطیۂ قسمت کو صبر و شکر کے ساتھ منظور ہی کرنا پڑا۔ اس لطیفہ مذاق سے عید کا لطف زیادہ سے زیادہ ہو گیا۔

اب قالین کے فرش پہ سب سے ایک نائکہ باقی رہ گئی جو کسی زمیندار کی بھینس کی طرح موٹی تازی اور ناتراشیدہ کندے کی طرح بدشکل اور بدہیئت تھی۔ پرنس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اسے کس کی پہلو میں جگہ دیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر مجھ میں تابِ ضبط باقی نہ رہی۔ میں نے دست بستہ عرض کیا۔ سرکار! ان معظمہ کا بھی کوئی بندوبست فرما دیں۔ پرنس نے فرمایا۔ بولو۔ بولو۔ میں نے آنکھ سے ڈھمک جنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ڈھمک جنگ جل کر بولے۔ مناسب ہو گا کہ آپ ہی اپنے دوسرے پہلو میں ان کو بھی جگہ دیں۔ پرنس کو لطف آ گیا۔ ہنستے ہوئے اٹھے اور اس پر ڈوسی بھینس کو پکڑ کر ڈھمک جنگ کے پہلو میں بٹھا دیا۔ اس دن سے ڈھمک جنگ بھی "منتو" کہلائے۔

اب جلسے پر شباب پڑھنے لگی اور باہر سے آئے ہوئے مہمان اپنا اپنا کمال دکھانے لگے۔ ان مہمانوں کو بھی معہ کا جوڑا پرنس کی سرکار سے عطا ہوا تھا۔ گانے والیوں کو پانچ پانچ ہزار کی پسلہ بھی معہ پاؤنڈ، ساتھیوں کو سو سو روپے کی شیروانیاں۔ آج ان مغنیوں کی سوئی ہوئی تقدیر ساری عمر میں پہلی بار جاگی تھی۔ ان شیروانیوں کو پہن کر پھولے نہ سماتے تھے۔ غرض رات کب گزری کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ صبح کی آواز سن کر ساز موقوف ہوئے۔ مصاحبوں کو حکم ہوا ہاتھ منہ دھو ڈالو۔ اب ناشتہ کر کے اپنے اپنے گھر جانا۔

وہ نہاری جو پرنس کے باورچی نے خاص اہتمام سے تیار کی تھی یقیناً خوش ذائقہ ہو گی۔ مگر رات بھر کی بیداری اور اس کی تکان سے مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ نیم کی پتیاں چبا رہا ہوں ہر نوالہ حنظل کے پھل سے زیادہ کڑوا اور بدمزہ معلوم ہوتا تھا۔

انہیں عیش رانیوں اور عشرت ارزانیوں میں دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں اسی سرعت سے سال تبدیل ہو رہے تھے۔ جیسے دنوں کے پر لگ گئے ہوں۔ فانی انجام سے غافل، مستقبل سے بے پروا۔ مصاحبت کے بحرِ ناپیدا کنار میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ یکایک بیگم فانی علیل ہو گئیں۔ اب علاج کے لئے روپے کی شدید ضرورت محسوس ہوئی۔ مہاجنوں سے سود کا قرض لینا پڑا ادھر ان کی بیماری میں اشتداد بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ سال بھر میں وہ چارپائی سے لگ گئیں۔ اس وقت ڈاکٹروں نے صاف صاف بتا دیا کہ مریضہ کو سرطان ہے اس موذی مرض کے علاج کے لئے پھر روپیہ درکار تھا۔ جس کا کوسوں پتہ نہ تھا۔

بیگم فانی

مجبوری کا دوسرا نام صبر ہے۔ عطائیوں کی دوا ہونے لگی جس میں وہی چار پیسوں کا صرفہ تھا اس سے فائدہ نہ ہوا۔ تو فیروز علی خاں، فانی کے چھوٹے صاحبزادے اسپتال سے دوا لانے لگے۔ مہینوں اسپتال کی دوا ہوئی۔ فانی حسبِ معمول دربارداری کرتے رہے اسی زمانے میں کبھی کبھی پرنس فانی سے ان کی بیگم کا مزاج بھی پوچھتے رہتے فانی عرض کرتے۔ حالت اچھی نہیں۔ معلوم نہیں، فدوی یہاں سے واپس جا کر زندہ پاتا ہے یا نہیں۔ اسی پر یہ ذکر ختم ہو جاتا۔ یہاں تک کہ محرم کا مہینہ آ گیا اور بارہ دن کے لئے تمام دفاتر اور مدارس بند ہو گئے۔ محرم کی ساتویں تاریخ کو میں نہا کر غسل خانے سے نکلا ہی تھا کہ شام صاحب تشریف لائے اور انہوں نے یہ اطلاع دی کہ کل رات کو بیگم فانی کا انتقال ہو گیا۔ جنازہ تیار ہے میں شیروانی پہن کر فوراً فانی کے گھر گیا جو میرے گھر سے پانچ منٹ کی راہ تھا جنازہ جب قبرستان پہنچا تو میں نے ان آدمیوں کو شمار کیا جو جنازے کے ساتھ تھے مع مرحومہ کے

کا اسمِ گرامی اُردو کے تحفظ کا ضامن ہے۔ اُن کی حسبِ ذیل تصانیف یقیناً اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ کوئی بھی لائبریری ان بیش بہا کتابوں سے محروم نہیں رہنی چاہیے۔

چکبست اور باقیاتِ چکبست

حضرت چکبست پر اس سے پہلے ایسی مستند کتاب شائع نہیں ہوئی۔
قیمت -/۴۰ روپے

دعائے صباح

غالب کی ایک نادر فارسی مثنوی۔ مبسوط و ضخیم مقدمے کے ساتھ
قیمت -/۱۵ روپے

منشوراتِ جوش ملیسانی

اُردو ادب میں ایک ایسا اضافہ جس کیلئے ہر اُردو دان جناب رضا کا ممنونِ احسان ہے۔ قیمت -/۲۰ روپے

مکتوباتِ جوش ملیسانی بنام رضا

(مجموعۂ خطوط) اُردو خطوط نویسی کا ایک نادر مجموعہ جس کے مطالعہ سے آپ رموز شاعری سے کما حقہٗ طور پر واقف ہو سکیں گے۔ قیمت ۱۹/۵۰ روپے

ہندوستانی مشرقی افریقہ میں

مشرقی افریقہ میں ہندوستانیوں نے کس طرح اپنے ملک کا نام روشن کیا ہر ہندوستانی کے مطالعہ کیلئے ایک دلچسپ کتاب۔ قیمت ۱۰/۵۰ روپے

شعلۂ خاموش

رضا صاحب کا اوّلین مجموعۂ کلام جس پر حکومت ہند نے انعام دیا۔
قیمت -/۴ روپے

شورشِ پنہاں

رضا صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام جس پر اُتر پردیش کی حکومت نے انعام دیا۔ قیمت -/۱۰ روپے

شاخِ گل

تیسرا مجموعۂ کلام جس پر حکومت یوپی اور حکومت مہاراشٹر نے انعام دیا۔ قیمت -/۱۵ روپے۔

اُجالے (نعت اور سلام)

[illegible] کرام اور رسول اکرمؐ کو خراجِ عقیدت جسے پڑھ کر [illegible] رہیں گے پسند آئے تو قیمت واپس۔ قیمت -/۱۰ روپے

متعلقاتِ غالب

جسے پڑھ کر قاضی عبدالودود صاحب نے فرمایا کہ اس کتاب کے مطالعے سے مجھے کئی باتیں پہلی بار معلوم ہوئی ہیں۔ قیمت -/۲۰ روپے

[illegible] سراغ

جناب [illegible] مضامین کا ایسا نادر مجموعہ جس پر اُردو زبان ہمیشہ فخر کر[illegible]ت۔ قیمت -/۳۵ روپے

انتخابِ آتش و غالب

آتش و غالب دو برگزیدہ شاعروں کے کلام کا انتخاب از برج نارائن چکبست جسے کالی داس گپتا رضا نے ترتیب دیا اور پہلی بار مستند متن شائع کیا ہے قیمت -/۱۰ روپے

ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ
آفس نمبر ۲۳۲ [illegible] دوسری منزل
اوپیرا ہاؤس ، بمبئی - ۴۰۰۰۰۴

نوجوان ہے۔ کیا لوگے۔"

"پریم بُوٹی [illegible]"

"وہ کیا ہوتا ہے بابو" اس کی آنکھوں میں معصومیت کے جام چھلکنے لگے۔

مجھے اس کے اندازِ بیان پر ہنسی آگئی۔

"تم نہیں جانتی؟"

"نہیں بابو۔"

"پریم بُوٹی سے کسی کو بھی اپنے بس میں کیا جا سکتا ہے۔"

"کس کو چاہیے یہ بُوٹی؟"

"اس کو۔" میں نے یوسف کی طرف اشارہ کیا۔

میری اس حرکت پر یوسف جھینپ سا گیا۔ کچھ دیر ہم تینوں چپ رہے۔ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ پھر یکایک وہ بولی۔

"بابو ہم منتر جانت۔"

"کیسا منتر؟"

"پریم منتر۔"

"اچھا۔ [illegible]" یوسف کی طرف معنی خیز نظروں سے تاکا اور پھر [illegible] پوچھا۔

"ہاں، وہ تو ہمیں کیا کرنا ہوگا۔"

"آج رات دس بجے گنگا شمشان گھاٹ آجاؤ۔ میں منتر سکھا دوں گی۔"

یوسف تجسس سے اسے گھور رہا تھا۔

"تمہارا کام ہم پورا وہاں کام کر لیں گی۔"

تاشی وہاں سے غالباً [illegible] رخصت ہو گئی کیونکہ میں نے موضوع کو [illegible] بدل دیا تھا۔ [illegible] خیر کافی وقت ہو رہا تھا ہم آگے بڑھنے لگے [illegible] کر دیکھتا [illegible] پھر وہ گنگا [illegible] بنک پر [illegible] بیٹھے [illegible] کی [illegible] گزار [illegible] کر [illegible] میں قدم رکھا۔ رات کے تقریباً دس بج چکے تھے۔

"حسن میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"شمشان گھاٹ۔ تاشی نے بلایا ہے۔ انتظار کر رہی ہوگی۔"

"عقل کے ناخن لو یوسف۔ گھر جا کر آرام سے سو جاؤ۔ ساری انتظار کر کے خود چلی جائے گی۔ کیا تمہیں اس کے کہے پر یقین آگیا۔ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔"

"نہیں حسن" یوسف میری بات کاٹتے ہوئے کہہ رہا تھا

"مجھے تاشی کی بات پر [illegible] تھی۔ اس نے یقین دلایا کہ پریم منتر سیکھنے سے ممتاز میرے ارد گرد ایسے منڈلانے لگے گی۔ جیسے پروانے شمع کے گرد منڈلاتے ہیں۔ مجھ سے اب ممتاز کی بے رخی برداشت نہیں ہوتی۔ یہ منتر سیکھ کے میں اس کے غرور کو توڑ دوں گا۔"

میں نے ساتھ چلنے سے انکار کیا اور کہا کہ تو ضعیف الاعتقادی کا ہدف بن گیا ہے۔

یوسف منہ لٹکا کے کمرے کے باہر چلا گیا۔۔ میں سوچتا رہا کہ محبت کتنی دیوانی ہوتی ہے۔ پڑھا لکھا آدمی بھی اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔ غرض ساری رات طرح طرح کے خیالات آتے رہے اور نیند کوسوں دور۔ میرے تصورات کا مرکز یوسف تھا۔

ساری رات آنکھوں آنکھوں میں کٹ گئی۔

اگلے روز میں نے کوشش کی کہ ممتاز سے مل کے اس کی کیفیت جان سکوں۔

دفتر سے جلدی چھٹی کی۔ ممتاز کے سکول کے باہر اس کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ وہ اس مقامی ماڈل سکول میں استانی کے فرائض انجام دیتی ہے۔ ممتاز سکول سے باہر آئی تو علیک سلیک کے بعد میں نے یوسف کی بات کیا چھیڑی کہ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"کس دل پھینک کی بات کر رہے ہیں آپ۔ اسے اپنے آپ پر ہی اعتماد نہیں۔ وہ کسی دوسرے کی بہبودی کی بابت کیا سوچ سکتا ہے۔"

اتنا کچھ کہہ کے ممتاز اپنی کسی سہیلی کے ہمراہ شان بے نیازی کے ساتھ چلتی بنی۔ اور میں نے گھر کا رخ کیا۔

حسبِ عادت جب یوسف میرے گھر آیا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے دکھتی رگ کو چھیڑا۔

"کیا تمہیں یقین ہے یوسف کہ پریم بُوٹی سے ممتاز کو بس میں کر سکو گے۔"

"دیکھ لینا حسن کہ ممتاز کیسے میرے پیچھے پیچھے گھومے گی۔ میں اسے خوب تڑپاؤں گا۔"

"کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک۔ ہاں تو میرے دوست یہ پریم بُوٹی کا کورس کتنے دن میں ختم ہوگا۔"

"پندرہ روز میں۔"

"بہت لمبا کورس ہے۔ اگر جان کی امان پاؤں تو ایک منٹ کا کورس بتاؤں۔"

"کیا"

"ممتاز سے دل کھول کے اپنی محبت کا اظہار کر دو۔ تاکہ آمنے سامنے معاملہ طے ہو جائے۔"

میں نے دیکھا کہ اس کے لبوں پر ہنسی نام کو بھی نہ آئی۔ بلکہ وہ غمگین ہو گیا۔ جیسے اس کے احساسات کی نگری میں ارتعاش پیدا ہو گیا ہو۔

ویسے یوسف کو یار دوستوں سے جھگڑا مول لینے۔ سیاسی میدان سے لیکر کھیل کود کے اکھاڑے تک کے داؤ پیچ پر اور ادبی محفلوں میں ہنگامہ کھڑا کرنے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ لیکن محبت کے معاملے میں وہ طفل مکتب ہی تھا۔ کبھی حقائق کا سامنا کرنے کی زحمت اس نے گوارہ ہی نہیں کی۔

مشکل سے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ سننے میں آیا کہ ممتاز کی شادی کی بات طے ہو گئی ہے۔ وہ بھی ایک ایسے شخص کے ساتھ جو عمر میں اس سے کم از کم بیس سال بڑا تھا۔ گو ممتاز باصلاحیت۔ ضدی اور کسی حد تک تیز مزاج ہے لیکن اپنے والد کے سامنے صدائے احتجاج بلند کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔

ممتاز کے ارمانوں کا خون ہو جائے یا محبت کی قدریں پامال ہوں اس کے والد کو اس سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ ساہوکار کی طرح لین دین سے کام لینا جانتا ہے۔

یوسف کو یہ خبر سنانے کے لئے میں اس کے گھر گیا۔ مگر وہ موجود نہ تھا۔ میں نے انتظار کیا لیکن رات گئے تک وہ واپس نہیں لوٹا۔ میرے قدم خود بخود شمشان گھاٹ کی طرف چل پڑے۔

شمشان گھاٹ کے ایک گوشے میں ایک الاؤ جلایا گیا تھا۔ جس کی روشنی میں تاشی اور یوسف کے چہرے صاف نظر آ رہے تھے۔ تاشی کچھ پڑھ رہی تھی۔ میری موجودگی کا احساس ہوا تو دونوں جھینپ سے گئے۔

"اتنی رات گئے تم یہاں" یوسف کے منہ سے بے ساختہ نکلا

"یوسف چھوڑو اس ڈھونگ کو ...... اب منتر سیکھنے کی فرصت نہیں رہی"

"کیوں" اس نے حیرانی سے پوچھا"

"اس لئے کہ ممتاز کی شادی طے ہو چکی ہے" میں نے انگریزی میں کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو" یوسف انتہائی تعجب کے انداز میں بولا۔

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں نے بھی آج ہی سنا ہے"

"لیکن حسن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

آخر کار یہ انہونی ہو گئی۔ اور وہ دن آگیا۔ جب ممتاز کے ارمانوں کی مانگ کسی اور کی دنیا آباد کر گئی۔

یوسف کی زندگی کے سمندر میں ایک طوفان اٹھا اور گزر گیا۔ میں نے اس معاملہ پر پھر کبھی یوسف سے بات نہیں چھیڑی۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ ممتاز کی شادی کے بعد یوسف کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی۔ اب اس کے چہرے پر بشاشت اور زندہ دلی کے نقوش نظر نہیں آتے۔ وہ سدا کھویا کھویا سا نظر آتا ہے۔ اور محبت کے نام سے اس کا روان رواں کانپ اٹھتا ہے۔

یوسف کی یہ پژمردہ حالت دیکھ کر میں اکثر بار تڑپ اٹھتا ہوں۔ کل جب میں نے باتوں باتوں میں یوسف سے پوچھا کہ "اس طرح ممتاز کی جدائی اور اس کے غم میں کب تک اپنی زندگی کو روگ لگائے رہو گے اگر کسی اور کا دامن تھام لو تو بہتر رہے گا۔

جواب میں یوسف نے حسرت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا حسن اب دل چاہتا ہے کہ اس دنیا سے اٹھ جاؤں کیونکہ مجھ ایسے شکستہ دل کو اب زندگی میں کچھ بھی دلکشی دکھائی نہیں دیتی۔ ●●●

جاگتی آنکھوں کا کرب

انور ظہیر بی اے
مئوناتھ بھنجن۔ یوپی

آج کئی دنوں سے ممتاز کی طبیعت بوجھل چل رہی ہے۔ ہنسنا ہنسانا تو جیسے وہ بھول گیا ہے۔ اختر اس کے قریب بیٹھا ہے۔ کالج کے ادبی ساتھی بھی اس کے پاس ہی بیٹھے ہیں۔ ممتاز بہت اُداس اُداس تھا نہ جانے کیا سوچ رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کالج کے لڑکے چلے گئے اور ممتاز کے اشارے پر اختر نے اس کو اٹھا کر بٹھایا...

ممتاز ایم۔ اے کے آخری سال کا طالب علم ہے اور اختر اس کا سب سے گہرا دوست اور کلاس فیلو بھی۔ ادھر کئی دنوں سے کالج میں ممتاز بہت سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا اور پھر اچانک اس کی یہ حالت ہو گئی۔ کوئی سمجھ نہ سکا کہ ممتاز کو کیا ہو گیا۔ اور خاص طور پر اختر کو کافی تشویش تھی اور آج اس نے پوچھ ہی لیا۔

"ممتاز تم کو کیا ہو گیا ہے میرے یار۔ ایسا بھی کیا کہ اپنی مجبوری بھی نہ بتاؤ؟" "ہاں اختر! لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو چاہتے ہوئے بھی نہیں بتائی جا سکتیں۔ اور میں نے تم سے ساری باتیں چھپا کر بہت بڑی بھول کی ہے" ممتاز کی آواز کانپ رہی تھی۔ ایک درد تھا اس کی آواز میں اتنا کہہ کر وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

آج سے تین سال پہلے جب اختر اور ممتاز بی اے کے آخری سال میں تھے۔ پورے کالج میں دونوں کی کافی شہرت تھی۔ کالج کے ہر پروگرام میں دونوں سرِ فہرست ہوتے۔ ممتاز ایک بہترین گلوکار ہونے کے ساتھ ساتھ کالج کا سب سے ذہین طالب علم بھی تھا۔ اختر کھیل کود میں سب سے اچھا اور ہمیشہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوتا اور شاید اسی لئے دونوں دو جسم ایک جان سمجھے جاتے۔

وقت گزرتا رہا اور دونوں شہرت کی بلندی کو چھوتے رہے کالج میں وزیرِ تعلیم کی آمد کے سلسلے میں فنکشن ہو رہا تھا۔ اناؤنسر یکے بعد دیگرے لڑکوں کا نام پکارتا رہا اور پروگرام آگے بڑھتا رہا۔ آخر میں اناؤنسر نے اعلان کیا۔ حضرات! اب آپ کے سامنے اس کالج کے مشہور فنکار جناب ممتاز تشریف لا رہے ہیں۔" اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

ممتاز نے اپنے مخصوص انداز میں مائک پر آکر کہا "حضرات! فیض احمد فیض کی غزل آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں، سماعت فرمائیں" اپنی مترنم اور مسحور کر دینے والی آواز میں ممتاز نے فیض کی مشہور غزل کا مطلع سنایا ؎

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

تو سامعین اس کی جادو بھری آواز میں کھو سے گئے۔ غزل کے ہر شعر پر ممتاز نے اپنی طرزِ ادائیگی کے وہ جادو جگائے کہ سامعین دم بخود ہو کر رہ گئے۔ اور ہر طرف سے داد اور پسندیدگی کی تالیوں سے ہال گونج اٹھا۔

شام کو ممتاز لائبریری میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا کہ یکایک چونکا۔ ایک حسین دوشیزہ فیروزی رنگ کی شلوار اور قمیص میں ملبوس ممتاز کے سامنے کھڑی تھی "آپ کی آواز کے بے پناہ جادو نے میرے دل و دماغ کو مسحور کر دیا ہے۔ بغیر دیدار میں آپ سے مل نہ سکی اور یہاں چلی آئی" "شکریہ ...... تشریف رکھیں آپ کھڑی کیوں ہیں؟" بہت دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ پھر ممتاز نے سکوت توڑا "آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا" "جی" وہ چونکی اور جھینپ سی گئی۔ "میں نے اسی سال داخلہ لیا ہے، مجھے تبسم کہتے ہیں" "بہت خوشی ہوئی VERY GLAD" بہت دیر تک یونہی بیٹھے رہنے کے بعد اپنی اپنی راہ چلے گئے۔

راستے بھر ممتاز اس کے متعلق سوچتا رہا اور اس کے خیالوں میں کھویا رہا۔ لڑکیوں سے دور دور رہنے والا ممتاز آج نہ جانے کیوں تبسم سے ملنے کے بعد کچھ کھو سا گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں۔ تمتماتا ہوا سرخ چہرہ، موتی جیسے دانت اور کمر تک لٹکتے ہوئے بال۔ یہی تصور اسے رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا۔ اور اسی پریشانی کے عالم میں ممتاز رات بھر سو نہ سکا اور کوشش کے باوجود وہ تبسم کا نقش اپنے ذہن سے نہ مٹا سکا۔

دوسرے دن کالج میں ممتاز کی نگاہیں تبسم کو تلاش کرتی رہیں۔ آخر لائبریری میں پھر اس سے ملاقات ہو گئی۔ رات بھر جاگنے کے باعث ممتاز کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ "آپ کی آنکھیں سرخ کیوں ہیں۔ خدانخواستہ ......" اور تبسم نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ممتاز نے بڑے سنجیدہ پن سے

جواب دیا کہ مجھے شاعری کا شوق ہے کل ایک مترنم بحر میں غزل کا مصرع طرح دکھائی دیا تو رات بھر اسی مصرع طرح پر غزل کہنے کی کوششیں کرتا رہا مگر غزل تو درکنار مصرع طرح پر گرہ تک بھی نہ لگا سکا۔ چنانچہ اسی رت جگے کے باعث آنکھیں میری دلی کیفیت کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ تبسم کے دل و دماغ پر ممتاز کے اس خالص شاعرانہ جواب نے ایسا والہانہ اثر کیا کہ وہ ممتاز کے قرب میں راحت محسوس کرنے لگی اور دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے۔ دونوں کا زیادہ تر وقت ایک ساتھ ہی گزرتا اور دونوں زندگی کی تمام خوشیوں کو اپنے دامن میں سمیٹ کر ایک ہو جانے کے خواب دیکھنے لگے۔ ممتاز وفورِ جذبات میں کہتا تبسم! میں اب تمہارے اتنا قریب آچکا ہوں کہ اگر خدا نخواستہ کسی وجہ سے تم مجھ سے دور ہو گئیں تو کیا میں زندہ بھی رہ سکوں گا۔؟ اور تبسم اسے یقین دلاتے ہوئے کہتی ممتاز ایسا سوچو بھی نہیں۔ وہ دن آنے سے پہلے ہی میں اپنے آپ کو ختم کر دوں گی۔ میرا سب کچھ تمہارا ہے اور میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر میری زندگی میں کسی دوسرے کا عکس بھی دکھائی دیا تو میں جان دیدوں گی۔ میں ممتاز کی ہوں۔ صرف ممتاز کی۔

اس طرح ایک سال گزر گیا۔ امتحان کے دن قریب آتے ممتاز تبسم کو گھنٹوں پڑھاتا۔ جب ریزلٹ آیا تو تبسم فرسٹ کلاس آئی اور ممتاز نے حسب سابق سارے کالج میں نمایاں پوزیشن حاصل کی۔ ریزلٹ کے دوسرے ہی دن کالج بند ہو گیا۔ اور تبسم اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ ممتاز اور تبسم روزانہ ایک دوسرے کو خطوط لکھتے... ممتاز لکھتا تبسم رات کو جب ہر کوئی سو رہا ہوتا ہے۔ میں گھنٹوں آنکھوں میں تمہاری صورت کا تصور لئے جاگتا رہتا ہوں۔ ہو سکے تو اپنی تصویر بھجوا دو شاید اس طرح دل کو سکون مل سکے تبسم نے تصویر بھجواتے ہوئے لکھا کہ یہی حالت میری ہے خدا کرے کہ چھٹیوں کے یہ دن جلد ختم ہو جائیں تاکہ تمہیں دیکھ سکوں۔ وقت کے ساتھ کالج کھلنے پر دونوں محبت کے خوشگوار لمحات میں سانس لینے لگے۔ ایک ساتھ جینے اور مرنے کے عہد و پیماں کی تجدید ہوتی رہی۔ اور دونوں اس دن کا انتظار کرنے لگے جب ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ساری زندگی کے لئے ایک ہو جائیں گے۔

اچانک ممتاز کو ایسا محسوس ہونے لگا جیسے تبسم اس سے دور ہو رہی ہو۔ کالج میں بھی آمنا سامنا ہوتا تو کچھ ایسی اجنبیت کا احساس ہوتا ہے جیسے برسوں بعد ملے ہوں اور پہچاننے کی سعی کر رہے ہوں۔

اور پھر تبسم دو تین روز جب کالج نہیں آئی تو ممتاز کو تشویش ہوئی بڑی بے چینی سے ممتاز اس کا انتظار کرتا رہا۔ اور ایک دن ۔۔۔۔ ایک دن ممتاز نے تبسم کو سرفراز کے ساتھ دیکھا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اس کا سر چکرانے لگا اور وہ وہیں بیٹھ گیا۔ وہ دونوں ایک طرف کھڑے ہو کر نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔ اور تبسم مستقل مسکراہٹ کے پھول بکھیر رہی تھی۔ سرفراز شہر کے سب سے مشہور رئیس آدمی کا اکلوتا لڑکا تھا۔ روزانہ کار سے کالج آتا۔

دوسرے روز کالج کی لائبریری میں تبسم سے ملاقات ہو گئی۔ تبسم نے مڑ کر دیکھا تو پیچھے ممتاز کھڑا تھا۔ پھیکی سی مسکان تبسم کے چہرے پر بکھری۔ ممتاز کو ایسا لگا جیسے تبسم اس کی غربت اور اس کی مفلسی کا مذاق اڑا رہی ہو۔ ممتاز اس کی آنکھوں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا اور تبسم نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔ "دو تین دنوں سے تم سے ملاقات نہ ہو سکی تو میں پریشان رہا تمہارے لئے کیا میری یاد نہیں آئی؟ اور پھر کل کالج آئیں تو بھی دور ہی دور رہیں اور آج بھی۔ میری نگاہیں کتنی بے چین تھیں تمہارے لئے۔ کیا میری محبت میں تم کو کوئی کمی محسوس ہونے لگی یا میں اس قابل نہیں رہا کہ تم مجھ سے مل سکو؟" نہیں ممتاز ایسی بات نہیں۔ آپ کے لئے میرے دل میں اتنی ہی جگہ ہے جتنی پہلے تھی۔ آپ کچھ اور نہ سوچیں۔" اتنا کہہ کر تبسم چلی گئی۔ دیر تک ممتاز وہیں بت کی مانند کھڑا رہا۔ بار بار تبسم کے جملے اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ ممتاز نے محسوس کیا جیسے اس کی باتوں میں بالکل کھوکھلا پن تھا۔ اور اگلے دن کالج کے بعد ممتاز نے تبسم کو پھر سرفراز کے ساتھ اس کی کار میں دیکھا اور ممتاز دیر تک کار کو دھول اڑاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جیسے جیسے تبسم، ممتاز سے دور ہوتی گئی۔ رات کو بہت دیر تک ممتاز جاگتا رہا اور تبسم کے الفاظ اس کے کانوں میں پگھلے سیسے کی طرح اترتے رہے اور عہد و پیمان نشتر بن کر اس کے دل میں چبھتے رہے۔

ایک دن کالج بند تھا اور ممتاز اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا کہ سرفراز کمرے میں داخل ہوا۔ "ہیلو ممتاز!" "ہیلو۔"

"کیا بات ہے ممتاز! کمرے میں تنہا بیٹھے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے چھوڑو ان باتوں کو اگر کچھ ہوا ہو بھول جاؤ۔"

"تمہارے پاس نہیں آؤں گا تو کہاں جاؤں گا۔ تم سارے کالج کے سب سے ہونہار طالب علم تو ہو۔ میں تمہاری بہت قدر کرتا ہوں اور تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ مجھے مایوس تو نہیں کرو گے۔"

میں تمہیں کیا دے سکتا ہوں سرفراز۔ کہاں تم ایک شاندار کوٹھی ایک خوبصورت سی ... کے مالک اکلوتے وارث۔ اور کہاں میں جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ یہ تو میری خوش نصیبی ہوگی اگر میں تمہارے کسی کام آؤں۔

ممتاز! آج والد صاحب ماں کو لیکر میرا کاشا دیکھنے گئے ہیں اور اسی خوشی میں کل ہمارے گھر ایک پارٹی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ تم ضرور آنا۔ یہ میری دلی خواہش ہے۔ اچھا تو میں چلوں۔ سرفراز تمہارا ساتھ دینے کیلئے ہر دم حاضر ہے۔ "ارے ہاں میں بتانا ہی بھول گیا اپنے کالج میں ایک لڑکی ہے تبسم شاید تم جانتے ہوگے۔ تبسم مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ خاص طور سے اس کی آنکھوں میں بلا کا جادو ہے۔ جس دن سے میں نے دیکھا ہے اسی دن سے اس کو پانے کی کوشش کرتا رہا اور آج وہ خود بھی راضی ہے۔ وہ بھی مجھے بے پناہ چاہتی ہے۔" سرفراز چلا گیا۔ اور ممتاز تبسم کے متعلق سوچنے لگا۔ اچانک اس کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے اور وہ فرش پر چکرا کر گر پڑا۔ رات بھر ممتاز کرب کے عالم میں جاگتا رہا۔ دوسرے دن حسب وعدہ وہ سرفراز کے گھر پہنچا۔ شہر کی بڑی بڑی شخصیتیں موجود تھیں۔ یکایک اس کی نگاہ سرفراز اور تبسم پر پڑی۔ "بہت دیر کر دی ممتاز میں کب سے منتظر ہوں تمہارا۔" تبسم نے پلکیں اٹھا کر دیکھا تو اسے ایسا لگا جیسے ممتاز بے پایاں درد و کرب کے عالم میں کراہ رہا ہو۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے پڑ گئے تھے وہ مڑی اور کمرے میں چلی گئی۔ "حاضرین محفل! آج کی اس مبارک تقریب کے لئے آپ کے سامنے جناب ممتاز تشریف لا رہے ہیں۔ جو آپ کو اپنی غزل سے نوازیں گے۔" سرفراز بولتا رہا اور ممتاز بت کی طرح کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ "نہیں سرفراز! میری طبیعت اس قابل نہیں کہ میں سنا سکوں۔"

"اب تو اعلان ہو چکا ہے۔۔ ہاں تو سامعین مسٹر ممتاز مائک پر"

مجبوراً ممتاز کو مائک سنبھالنا پڑا اور ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ممتاز غزل سناتا رہا احساس کا ہر شعر اس کے دل کی آواز بن کر سامعین کے کانوں میں رس گھولتا رہا۔ تبسم بھی دروازے کی اوٹ سے سب سنتی رہی ۔۔۔

شب کی تنہائی میں اسکو ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں
کہ جیسے آواز دیکے سب نے آیا نہیں

پروگرام ختم ہو گیا اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ دوسرے دن تبسم ممتاز کے گھر پہنچی۔ ممتاز اپنے بستر پہ لیٹا بیتی یادوں میں کھویا ہوا تھا۔ تبسم کو دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔ "آؤ بیٹھو تبسم! کیسے میری یاد آگئی؟" "ممتاز میں آپ سے کچھ کہنے آئی ہوں۔ کچھ مانگنے آئی ہوں۔" "میں جانتا ہوں تبسم جو تم کہنا چاہتی ہو۔" "نہیں ممتاز! میں مجبور تھی۔" اور ممتاز کو سرفراز کے وہ جملے یاد آنے لگے۔ "وہ مجھے چاہتی ہے ممتاز اور مجھے بے پناہ چاہتی ہے۔" "ویسے بھی تبسم! میں تمہارے قابل بھی نہیں تھا۔ تم کو دینے کے لئے میرے پاس تھا ہی کیا! میں ٹھہرا ایک غریب اور مفلس ماں باپ کا لڑکا۔ اور سرفراز ایک رئیس خاندان کا چراغ جو تم کو سب کچھ دے سکتا ہے۔"

"ممتاز ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا اور اگر مہربانی فرما کر میرے خطوط لوٹا دیں تو میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔"

"اس دراز میں سے نکال لو۔ اب ان کی مجھ سے زیادہ تم کو ضرورت ہے۔" اور تبسم چلی گئی۔ ممتاز دیر تک اس کو جاتے دیکھتا رہا اور پھر اپنی آنکھیں چھت پر مرکوز کر دیں۔ اسی دن سے اس کی صحت گرنے لگی اور وہ بستر پہ پڑ گیا۔ ویسے بھی غربت و افلاس اس کا مقدر تھا۔ بخار کی تپش میں جلتا رہا۔ کئی دنوں سے کالج بھی نہیں گیا تو اختر کو تشویش ہوئی اور وہ اس کے گھر پہونچ گیا۔

اور آج ..... آج وہ اپنے دوست اختر کے ساتھ بیٹھا اپنی داستان غم سنا رہا تھا اور اختر اپنے دوست کے شکستہ دل پر اپنے دوست کی اجڑی ہوئی محبت کے مزار پر آنسوؤں کے پھول چڑھا رہا تھا۔

ماجد صاحب داد میں ڈوبے پلٹ رہے ہیں اور تنویر صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ ابن صادق منظر سہارنپوری کو۔ منظر صاحب یوں منظر کشی کرنے چلے ہیں ؎

پاؤں کے حسین زخم بہت چھوٹ سکے دور سے
ہم دُور بہت دُور نکل آئے تھے گھر سے
لے جاؤ گے بس اپنی صداؤں کی یہ لاشیں
کیا پاؤ گے تم ریت کے ٹیلوں کے نگر سے

جس سلیقہ اور والہانہ انداز سے داد دی جا رہی ہے وہ اہل منگلور کی سخن فہمی کا پتہ دے رہی ہے کئی بار دہرا کر اسی تشنگی کا مظاہرہ کیا ہے ؎

شعلوں کا سمندر ہوں تالاب نہیں ہوں
پانی کو گزرنا ہے تو گزرے مرے سر سے

پھر داد دینے والے چیخ رہے ہیں اور منظر صاحب گا رہے ہیں ؎

پھر جاگ رہا ہے مرے احساس کا جادو
کیا لوٹ کے آئی ہے تری یاد سفر سے

منظر صاحب محفل کو غمگی میں ڈبو کر کامران اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب رنگِ محفل بدلنے کیلئے محترم صوفی پروفیسر محمد یوسف پاپا تشریف لا کر اور محفل کو قہقہوں میں اتار کر شاداں پلٹ رہے ہیں میری درخواست پہ پاپا جی نے کلام نوٹ کرانے کا وعدہ بھی کیا تھا لیکن وہ ایسا نہ کر سکے۔ آئیے کوثر دیہاتکیراوی سے یہ حسین غزل سنئے گا۔ مطلع کے بعد فرمایا ہے ؎

زباں سے کہہ تو دیا ان کو بے وفا لیکن
یہ بات خود بھی ہمیں ناگوار گزری ہے
خدا کرے اسے اپنی سحر بھی راس آئے
وہ شخص جس پہ شبِ انتظار گزری ہے

کوثر صاحب خوب خوب داد لوٹتے مائک سے ہٹا ہو رہے ہیں اور اب عنواں صاحب درخواست کر رہے ہیں ایک گیت کی سکندر حیات کیلاشپوری سے۔ ملاحظہ حیات صاحب ان دنوں غزل میں بھی دوررس تجربات کر کے کھوپڑیوں کو جھنکار رہے ہیں۔ پھر بھی وہ بیکل ثانی بننے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں آئیے یہ گیت سن لیجئے ؎

تو ہے جوہی کی کلی میں ہوں ترا اینل کنول
آترا مانگ میں آکاش کے تارے بھر دوں
اے میری جانِ تمنا اے میری جانِ غزل

لیکے ان کالی گھٹاؤں سے نگاہوں کا جل
میں تری مانگ میں شبنم کے پرو کر موتی
تیرے ہونٹوں پہ گلابوں کی رچا کر سُرخی
چاند سے رُخ پہ میں چندا کا سجا کر ٹیکا
تیرے ہاتھوں پہ میں آشا کی رچا کر مہندی
اور تیرے رُخ سے حجابوں کی اُٹھا کر چُنری
اپنی آنکھوں میں بسا لوں تجھے ایمانِ غزل

سکندر صاحب بیکل کے ترنم کا منہ چڑا کر ہنسی مذاق میں جا رہے ہیں اور سردار آصف شاہجہانپوری فرما رہے ہیں ؎

وہ شخص کہ قد جس کا بہت ہم سے بڑا تھا
دیکھا تو کسی اور کے پیروں میں پڑا تھا
بیچا تھا جسے میں نے غریبی کے دنوں میں
اس گھر میں سنا ہے کہ خزانہ بھی گڑا تھا
افسوس کہ اس نے بھی مجھے غیر ہی سمجھا
میں جس کے لئے مدتوں اپنوں سے لڑا تھا

داد پا کر آپ جا رہے ہیں اور نسیم میرٹھی شتے تمنائے قطعات سنانے کے بعد غزل شروع کر رہے ہیں ؎

اس قدر مجھ پہ کرم اہلِ کرم رہنے دو
بارِ احساں سے نکل جائے نہ دم رہنے دو
مرے سجدوں کے لئے نقشِ قدم رہنے دو
یہ شوالے یہ کلیسا یہ حرم رہنے دو

نسیم صاحب بھی مناسب داد وصول کئے جا رہے ہیں اور عنواں صاحب درخواستِ کلام کر رہے ہیں پروفیسر کملا انجم بریلوی سے۔ انجم صاحبہ فرما رہی ہیں ؎

یہ مرا فسانہ ہے یہ تری کہانی ہے
کیا مری محبت کا عالم جوانی ہے
میں تری تمنا میں بن گئی تری صورت
تیرے پاس بھی کوئی پیار کی نشانی ہے
ہم وفا کے ماروں کا حال کوئی کیا سمجھے
جو کچھ بھی ہے ہر دھڑکن آنکھ میں ہم پانی ہے

انجم صاحبہ ہندی سے اُردو کی طرف لوٹ رہی ہیں لہٰذا آپ کو داد و تحسین سے مالا

ہال گونج گیا ہے رباب ملک کے مشہور و مقبول کوی سوم ناتھ کرجی تالیوں کی
جھنکار میں آرہے ہیں۔ دیکھا تو محترم جمیل میاں سلطان سبحانی رامپوری
نہایت نکھرے و نفیس پرشکوہ لباس زیبِ تن کئے مگر مؤدبانہ شان سے تشریف
لاکر اسٹیج ہی پر جلوہ افروز ہو گئے ہیں اور سوم جی عطا کر رہے ہیں ؎

یہ پیالہ پریم کا پیالہ ہے۔ تو ناچ نے اور گا کے پی
کھل کھیل کے پی۔ جھک جھوم کے پی مست الوہ نظر سے بچا کے پی

سوم جی کو خوب خوب سنا اور پسند کیا گیا اور خوب خوب داد کے ڈونگرے
برسائے تالیوں کے شور میں خراماں خراماں اپنی جگہ آرہے ہیں اور اب امتحان گاہ
میں پروفیسر خالد محمود دہلوی آکر نہایت اعتماد سے عنایت کر رہے ہیں ؎

اندھیری شب ہوا ہے اور میں ہوں
ترا بجھتا دیا ہے اور میں ہوں
میں بھی آمادۂ عصیاں ہوا ہوں
مگر میرا خدا ہے اور میں ہوں

خالد صاحب داد لوٹتے مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور اب سلیم شیرازی
لکھنوی بانکپن سے غزل سرا ہیں ؎

ممکن ہو تو رسماً ہی اکبار صدا دیجئے
مجھ کو مرے ہونے کا احساس دلا دیجئے
آئینہ دکھا لیجئے اس حسنِ مکمل کو
گستاخ نگاہی کی پھر مجھ کو سزا دیجئے

داد کا شور کم ہوا تو اسی دلکشی سے فرما رہے ہیں ؎

ہے فرصت تو کچھ دیر مل بیٹھئے + جدائی سے کس کو مفر ہے میاں
تو پھر نگاہی پہ اصرار کیوں + اگر سنگباری کا ڈر ہے میاں

آہ اور واہ کے شور میں سلیم صاحب جا رہے ہیں اور عنوان صاحب
یاد فرما رہے ہیں ساغر وارثی شاہجہانپوری کو ساغر صاحب فرما رہے ہیں ؎

عین ممکن تھا مرے غم کا ازالہ ہوتا
تم نے مفہوم خوشی کچھ تو نکالا ہوتا
لوگ بیگانہ سہی تم تو شناسا تھے مرے
تم نے تو سنگِ ملامت نہ اچھالا ہوتا

ساغر صاحب بھی مناسب داد لوٹتے چلتے بنے اور تالیوں کے شور میں
شگفتہ انجم آکر غزل سرا ہیں ؎

شمع خود زندہ نہ رہ پائی سحر ہونے تک

اپنے دامن میں جو پروانے کو جلتے دیکھا
اپنی ہستی کا بھی انجام نظر آنے لگا
سرخیِ شام کو جب رات میں ڈھلتے دیکھا

انجم صاحبہ داد ترنم پاکر جا رہی ہیں۔ اب اس رنگ کو بدلنے کیلئے عرشی ملک گرمیِ
محفل کو ذرا دیر کے لئے ہٹا کر رواں دواں شستہ کر چلتے بنے۔ آئیے پھر سنئے
ندیم برنی سے ؎

ترے غم سے شبِ فرقت کو سجا رکھا ہے
ورنہ اس رات کی تقدیر میں کیا رکھا ہے
تری تصویر کو اس دل میں چھپا رکھا ہے
میں نے کعبہ کو بھی میخانہ بنا رکھا ہے
سوچتا ہوں ترے وعدے کا بھرم رہ جائے
جانتا ہوں مرے وعدوں میں کیا رکھا ہے

ندیم صاحب داد لوٹتے مائک سے جدا ہو رہے ہیں اور نور تقی نور میرٹھی ترنم کا
اور قوالی کا سماں باندھتے ہوئے الاپ رہے ہیں ؎

دن ڈھلے کیا ملاقات ہو جائے گی
زلف کھولو ابھی رات ہو جائے گی

نور صاحب مسکرا کر فرما رہے ہیں اب مشاعرہ ہو گا --- یار لوگ جھوم جھوم
رہے ہیں ہاں اب مشاعرہ ہوا ہے اس نوک جھوک پر قہقہوں کا سلسلہ چلا
ہے اور میں سوچ رہا ہوں صرف سازندوں کی کمی ہے ورنہ قوالی ہو رہی ہے
اور آپ محفل کو گرما رہے ہیں ؎

وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے تو ہیں
غالباً اب کوئی بات ہو جائیگی

اور آپ اسی ہنسی مذاق میں جا رہے ہیں یہ دیکھ کر [illegible] شاعر
چند سکوں کی خاطر اس درجہ بھی گر سکتا ہے اور آج کے [illegible]
بھی ہو سکتے ہیں آج کا سخن فہم شعراء کو اس طرح [illegible]
بھی تو شعرائے کرام ہی میں سے جس طرح اور جیسا شعر پیش کرے گا اسی
طرح داد دیتا ہے [illegible] شاعر نے بھی اپنا معیار گرا لیا ہے اس کا معیار [illegible]
ہو گیا ہے کتنے [illegible] اور گلوکار جو اس صف میں آچکے ہیں ان سے کیا امید
کی جا سکتی ہے۔ لیجئے انور تاباں [illegible] رواں دواں عنایت کر رہے ہیں

جھوٹ کے چہرے پر سچائی کا پردہ کب تک
عقل کے [illegible] کا دعویٰ کب تک

وقت نے زیست کے آئینے بدل ڈالے ہیں
اپنے کمرے میں یہ ٹوٹا ہوا شیشہ کب تک
آپ بھی پیار کے دستور پہ قائم رہئے
ہم اکیلے ہی نبھائیں گے یہ نکتہ کب تک

[illegible] صاحب کی قوالی کے بعد غنیمت ہے کہ تاباں صاحب کو سُن لیا گیا اور آپ جا رہے ہیں اور عنوان صاحب یاد فرما رہے ہیں پروفیسر حنیف کیفی کو۔ کیفی صاحب عنایت کر رہے ہیں ؎

کل مسئلہ ہمارے لئے اپنی ذات ہے
اپنا حصار توڑ کے دیکھیں تو بات ہے
ظلمات کا طلسم ہے جس سمت دیکھئے
کیا جانے کس طرح میری راہِ نجات ہے
پانی کے پاس رہ کے بھی پیاسے ہیں کتنے لوگ
جاری ابھی روایتِ نہرِ فرات ہے

کیفی صاحب کی آہ اور واہ کے شور میں چلتے بنے دیکھا تو سحر صاحب نظر فرما رہے ہیں ؎

عشق کیا فرمایا ہم نے اوکھلی میں سر دیا
اس نے عرضِ مدعا پر دھرشٹ موسل دھر دیا

سحر صاحب رواں دواں شستہ کر محفل کو ہنساتے ہوئے یہ جا اور وہ جا اور [illegible] صاحب میر ٹھی فرما رہے ہیں ؎

مجھ کو تکتا ہے آئینہ دیکھو لے + اک ذرا مسکرا کر آئینہ
چونٹ سی بھی لئے اشک چاہئے + پھر بھی چہرہ ہے حالات کا آئینہ
میرا دل، میرا دل، میرا دل میرا دل + آئینہ، آئینہ، آئینہ، آئینہ
والو پہ کسی بحرِ کمال کا گمان ہو رہا ہے۔ کئی بار دہرا کر ارشاد ہوتا ہے ؎
بن سنور کے دیکھ لو تو مجھے دیکھ لے + تو مرا آئینہ، میں ترا آئینہ

پھر آہ اور واہ کا عالم ہوتا ہے کئی بار دہرا کر داد میں ڈوبے مائک سے جدا ہو رہے ہیں۔ تنویر صاحب بتلا رہے ہیں کہ وہ سامنے عرشی کا ظمی صاحب بیٹھے ہیں۔ دیکھ کر از حد افسوس ہوا۔ اردو کے بزم خورد و بیدار۔ محافظ انگریزی اور اردو شعر سے بیب احتیاطی۔ ان کی بستی کا مشاعرہ اور یہ کنارہ کشی۔ ان کی بستی میں مہمان شعرا کی آمد اور وہ کونے کھدرے سے یہ کیا بات ہوئی ——؟ آخر رشید انصاری بھی تو مشاعرہ کی دیکھ بھال اور مہمانوں کی خاطر مدارات میں جٹے ہوئے ہیں۔ لیکن عرشی صاحب کا یہ انداز دیکھ کر تعجب ہوا تصویر کا دوسرا رخ ہے یہ اللہ ہی جانے۔ میں کون — قاضیٔ شہر بھی عرشی اور

کاسہ لیسی سب سے بڑھتی رہی ہیں مجھے اپنی پگڑی اور ٹانگ کا خطرہ ہے اور عرشی صاحب اس کام میں مہارت رکھتے ہیں لہٰذا آپ بھی اس مسئلہ کو اہمیت نہ دیجئے اور ڈاکٹر سیدہ شان معراج شاہجہاں پوری سے یہ اشعار سنئے ؎

اگرچہ طرزِ عمل ناگوار بھی تھا
مگر وہ میرے تصور کا شاہکار بھی تھا

وہ بے وفا مجھے تنہا فریب کیا دیتا
قصور وار مرا اپنا اعتبار بھی تھا

دوسرے مصرعہ پر وہ ہنگامہ سا ہنگامہ ہے کہ کچھ نہ پوچھئے اور آپ اسی سنجیدگی سے عنایت کر رہی ہیں ؎

وہ کون شخص تھا معراجِ بزمِ یاراں میں
جو قہقہوں میں بھی شامل تھا سوگوار بھی تھا

سیدہ شان صاحبہ تالیوں کی جھنکار میں مائک سے جدا ہو رہی ہیں اور فاروق بخشی میرٹھی فرما رہے ہیں ؎

کیا زندگی کا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا
زخمی تھا اس کا جسم مگر چیختا نہ تھا
لفظوں کے خالی سیپ لبوں پر بکھر گئے
وہ محوِ گفتگو تھا مگر بولتا نہ تھا

فاروق صاحب بھی گلو خلاصی کر کے کبھی ترنم اور کبھی تحت سے سنا کر چلتے بنے اس عالم میں اس جمود کو توڑنے کیلئے رئیسہ سنبل علیگڑھی نغمگی بکھیرنے چلی ہیں ؎

کس کی یہ سیاست ہے کس کی ہیں یہ تدبیریں
رہزنوں نے پائی ہیں رہبروں کی تقدیریں
میرے خوابِ وحشت کی جانے کیا ہو تعبیریں
دار ہے نہ زنداں ہے طوق ہے نہ زنجیریں
آپ کی امانت ہیں آپ کی نشانی ہیں
یہ نقوشِ الفت کے یہ وفا کی تحریریں

شعلہ سا لپک جائے ترنم۔ حسین اور شگفتہ اشعار۔ سخن فہم سامعین اور اہلِ ذوق کی محفل۔ بس داد کا عالم نہ پوچھئے کہ آپ ایک اور ایک داد کے شور میں غزل میں پلٹ رہی ہیں اور عنوان صاحب درخواستِ کلام کر رہے ہیں ڈاکٹر مظفر حنفی سے۔ مظفر صاحب پُر وقار انداز سے [illegible]

ساحل ساحل ہانپ رہا ہے دریا

انسان کا دل

(ڈاکٹر اوددے سرن ارمان بلاری)

سینٹ ایڈ ڈبیو ڈ پولین نمبر تھری ویسٹ لندن میں واقع جوسن ولا کے مالک اور سینٹ میری چرچ کے ملازم پادری کا اکلوتا لڑکا ڈس کانسن یونی ورسٹی یو. ایس. اے کا گریجویٹ اور ہندی میں ایم. اے. مسٹر جان گلوری بلانڈ ہندی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینا چاہتا تھا اور وہ باپ سے اجازت لیکر ہندوستان آگیا۔ یہ کام انگلینڈ میں بھی ہو سکتا تھا لیکن ہندوستان میں رہ کر ہندی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنیکی بات ہی دوسری تھی۔

ہندوستان آتے ہی وہ سب سے پہلے ڈاکٹر ترجیون چندر شرما ہیڈ آف دی ہندی ڈیپارٹمنٹ دہلی یونیورسٹی دہلی سے ملا۔ ڈاکٹر شرما سے اس کی ملاقات لندن ہی میں پہلے ہو چکی تھی جبکہ مسلم کانفرنس میں شرکت کیلئے ڈاکٹر اقبال بھی لندن میں تھے۔ ڈاکٹر اقبال کو ساتھ لیے ڈاکٹر شرما اس کے والد جوسف سے ملنے جوسف ولا گئے تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر شرما متعدد بار جوسف ولا گئے۔ جوسف پنڈت جواہر لعل نہرو کے ساتھ ہیرو اسکول میں پڑھ چکے تھے۔ مسٹر بلانڈ نے اس واقفیت کی بنا پر ایک عرصے تک ڈاکٹر شرما کے مکان میں اپنا وقت بتایا۔

مسٹر بلانڈ نے ڈاکٹر شرما سے ہندی میں تھیسس لکھنے کیلئے مضمون کا انتخاب کرنے سے پہلے یہاں کے مشہور مذہبی اور تاریخی مقامات کی سیر کرنے کی ٹھانی۔ دہلی سے متھرا اور آگرہ پاس ہی پڑتے تھے۔ سب سے پہلے اس نے انھیں مقامات کا دورہ کیا۔ کار لے ہی رکھی تھی جس پر ایک ہندوستانی ڈرائیور رکھ لیا تھا۔ متھرا سے آگرہ اور آگرہ سے فتح پور سیکری کو روانہ ہوگئے۔ کار بلند دروازہ کے پاس جاکر رک گئی۔ مسٹر بلانڈ جیسے ہی کار سے باہر نکلے ایک سات آٹھ سال کا لڑکا قریب قریب چھ سات ماہ کی لڑکی کو گود میں لیے ان کی طرف بڑھا۔ "کیا ہے الگ ہٹ"۔ ہندی ڈرائیور نے کرخت آواز میں اس کو ڈانٹا۔ مسٹر بلانڈ کو نفرت کا یہ انداز پسند نہیں آیا اور انھوں نے آگے بڑھ کر پیار سے اس لڑکے کو اپنی طرف بلایا۔ لڑکا قریب آگیا۔ "تم بھیک مانگتے ہو کیا تمہارے ماں باپ نہیں ہیں؟" بلانڈ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوال کیا۔

"میری ماں مجھے پانچ سال کا چھوڑ کر مر گئی تھی۔ بت پچھلے سال ایک سیٹھ کی کوٹھی کی پاڑ پر اینٹیں لیکر چڑھتے ہوئے نیچے گر کر مر گئے"۔ اتنا کہہ کر اس لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور ہونٹ ہلتے رہ گئے وہ بولنا چاہتا تھا مگر کچھ نہ کہہ سکا گلا رندھ گیا۔ ڈرائیور ندامت سے ایک طرف دیکھ رہا تھا۔

"تمہارا کوئی بھائی نہیں ہے"، مسٹر بلانڈ نے اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میرا بھگوان بھی مر گیا۔"

"تمہارا کوئی نہیں ہے تمہارا بھگوان بھی مر گیا"۔ انھیں الفاظ کو دہراتے ہوئے کچھ ٹھہر کر مسٹر بلانڈ نے پھر پوچھا۔ "تم نے بھگوان کو دیکھا ہے؟"

"ہاں دیکھا ہے میں پکارتا رہا اور وہ دیکھتا رہا اور جب کہ میں بے خطا تھا تب بھی اس نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا"۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر بولا۔ بچے کی باتیں بلند دروازہ سے بھی بلند معلوم ہو رہی تھیں۔ مسٹر بلانڈ سہم گئے اور اس کو اپنی کار کی سیٹ پر بیٹھا کر بات چیت کرنے لگے ڈرائیور بھی باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔

"تم کہاں رہتے رہے اور بھگوان دیکھتا رہا"۔

"بابوجی جب میں پانچ سال کا تھا تب میری ماں نے ایک لڑکی کو جنم دیا تھا وہ لڑکی پیدا ہوتے ہی مر گئی یہ بات میں اب جانتا ہوں اس وقت میں مرنے جینے کی بات سمجھتا ہی نہیں تھا۔ میری ماں اور میرے پتا دونوں نے مجھے سمجھانے کے خیال سے مجھ کو بتایا کہ لڑکی کو شنکر بھگوان کھجوروں میں چھوڑ آئے۔ تیتا انھوں نے مانگی تھی اب اس کو بڑے ہونے تک وہی پالینگے میری عمر کم تھی کچی عقل تھی مان گیا لیکن دل میں انیکوں شک جنم لیتے رہے۔ شنکر بھگوان نے میری بہن کیوں مانگی ہے وہ بڑے ہونے تک اس کو کیوں پالیں گے کیا وہ ہمیں اسے دیکھنے بھی نہیں دیں گے اس طرح کی بہت سی باتیں میں سوچتا رہا اور جب میرے ماں باپ دونوں ہی سو گئے تو میں چپکے سے اٹھا اور گھر سے باہر نکل لیا۔ اس موقع کی تلاش میں میں بہت دیر سے جاگ رہا تھا سیکری کے باہر سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا مندر تھا جس کو شنکر بھگوان کا مندر کہتے تھے میں اندھیرے کی چھاتی چیرتا وہاں جا پہنچا اور بہن کو ڈھونڈنے لگا مجھے میری ننھی سی سندر بہن کہیں بھی نظر نہیں آئی وہاں کوئی آدمی نہیں تھا۔ میں نے ہمت سے کام لیا اور بھگوان شنکر کے پیچھے اچک کر دیکھنے کیلئے شنکر جی کے سر پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے پجاری آگیا۔ "اٹو کے پٹھے مورتی کی چوری کرنے آیا ہے ذرا سا بالک ہے اور اتنا بڑا سا کام کرنا خوب سکھایا ہے تیرے گروہ کے مالک نے پکڑا جائے تو بالک کہلائے اور نہیں تو مال صاف کر جائے"۔ یوں کہتا کہتا وہ میرے سر ہی پڑ گیا اور خوب پٹائی کی۔ کیا میں بے خطا نہیں تھا؟" "ہاں تم بے خطا تھے"۔ مسٹر بلانڈ نے تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "تو پھر وہ چپ چاپ یوں ہی دیکھتا رہا اپنے سوال کا جواب سنے بغیر ہی وہ لڑکا جس کے جذبات جوالا مکھی کی طرح امڈ رہے تھے پھر بولا پجاری نے گھسیٹتے ہوئے کہا چل تھانے وہاں تیرے گروہ کا پتہ بھی چل جائیگا۔ باہر سڑک پر ایک میاں بیوی نے جو بچہ دیکھ کر آ رہے تھے پجاری کو سمجھا بجھا کر مجھے چھڑوا لیا میں گھر آگیا اور لیٹ گیا بستر ٹھنڈا ہو گیا تھا میں چھپا کر رونے لگا خوب رویا ماں باپ دونوں سو رہے تھے ایک بار میرے تیز رونے کی آواز سے پتا جی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے حالانکہ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ میری آواز

تیز نہیں ہوگی۔ ان کے منہ سے نکلا "کیوں بیٹا ؟ کیا بات ہے ؟ کیوں رو رہا ہے ؟" میں نے کچھ نہیں کہا روتا رہا اور روتا ہی رہا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گئے اور وہی باتیں پھر دہرانے لگے میں ابھی تک چپ تھا اور سُبک سُبک کر رو رہا تھا اور میں اس پریشانی میں تھا کہ کہوں نہ کیا کہوں صحیح بات کہہ دیتا تو بھی مصیبت آجاتی وہ بیچاری جی کو جا بیٹھتے۔ بابو جی مجھے ملے لگنے کہ تو بتا بیچے گھر سے باہر کیوں گیا تھا وہ میری خاموشی پر آگ بگولہ ہو گئے اور پٹائی کرنے لگے اب ماں بھی جاگ گئی تھی اُس نے ان کو ڈانٹا۔

"کیوں رات میں اس کو پیٹ رہے ہو ارے بچہ ہے کوئی ڈراؤنا سپنا دیکھا ہوگا چپ ہو جائیگا۔ بجائے اس کو سُلانے کے تم نے پٹائی چالو کر دی مجھ سے تو پوچھ کتنی تکلیف اٹھاتی ہوں اور پھول کی ایک سنتی نہیں ملتی خبردار میرے لال کو مارا" ماں کے یہ الفاظ سن کر بابو نے پٹائی بند کر دی تو ماں نے مجھے بُلا کر اپنے پاس سلا لیا اور میری کمر اور سر کے بال دھیرے دھیرے اس طرح سہلاتی رہی کہ بابو جی میری دونوں پٹائیوں کی تکلیف ختم ہو گئی میرا جسم بالکل ہلکا ہو گیا میں کب سو گیا پتہ ہی نہیں چلا۔ مگر بابو جی میری ماں کا یہ پیار میرے لئے آخری تھا اُس کو صبح کو بخار آگیا دوپہر کو دَورے پڑنے شروع ہو گئے اور شام تک وہ چل بسی" لڑکے کی گود میں چھوٹی بچی رونے لگی اس نے ایک کاغذ میں حلوا سا نکالا اور اس کو چٹا دیا وہ منہ چلانے لگی اور چپ ہو گئی۔

"تم نے یہ کیا کھلایا" مسٹر بانڈ نے پوچھا

"میں نے آٹو آلو ابال کر باریک پیس کر چینی ملا رکھی ہے۔ یہی کھلا کھلا کر اس کو پال رہا ہوں"

"یہ بچہ کس کا ہے"

"میونسپلٹی ہال کے سامنے سیڑھیوں پر یہ لڑکی پڑی تھی۔ رو رہی تھی میں نے اس کو اٹھا لیا کچھ دیر تو میں اس کو چپ کرانے کی کوشش کرتا رہا مگر اس کی ماں نہیں لوٹی کئی گھنٹے گذر گئے کوئی نہیں آیا تو اس کا برابر رونا مجھ سے نہ دیکھا گیا اسے اپنے ساتھ لے لیا اب تک پال رہا ہوں یہاں آنے والے امیروں سے مانگتا ہوں اور اس کو پالتا ہوں اور خود کھاتا ہوں" کہتے ہوئے لڑکے نے اس پر ہاتھ پھیر ا پیار کیا۔

"کتنے دنوں کی ہے یہ"

"قریب قریب سات ماہ کی ہے بابو جی"

"تم جتنے چاہو وہ پیسے لو اور اس کو مجھے دیدو"

"بابو جی میں اس کو بہت دنوں سے پال رہا ہوں مجھے یہ اپنی بہن سی معلوم ہوتی ہے۔ اس کے سہارے میرے رات دن کٹ جاتے ہیں۔ بہن نہیں بیچی جاتی ہے دان دی جاتی ہے مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس دن یہ مجھ سے جدا ہو جائیگی اُسی دن میں بھی مر جاؤں گا" یوں کہتے ہوئے اس نے لڑکی میٹھی چٹنی اور چٹا دی۔

"تمہارا کیا نام ہے ؟" خوش ہو کر مسٹر بانڈ نے پوچھا

"پرشوتم"

"پرشوتم کا کیا مطلب ہوا" مسٹر بانڈ نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"سر یہ لفظ پرشتم کا بگڑا ہوا روپ ہے اس کا مطلب ہے۔ "پُرشوں میں اُتّم"

"ویری گُڈ۔ سچ مچ یہ کسی دن بڑا آدمی ہوگا" مسٹر بانڈ نے ڈرائیور سے کہا وہ مسکراتے ہوئے پھر بولے "بیٹے تمہارا گھر کہاں ہے دکھاؤ گے"

"ضرور دکھاؤں گا مگر میں وہاں رہتا نہیں ہوں اور نہ ہی کبھی وہاں جاتا ہوں"

"ایسا کیوں"

"گھر میں جاتے ڈر لگتا ہے صاحب۔ بالکل سونا سونا ہے۔ میں سٹیشن کی بینچ پر پڑے پڑے رات کاٹ دیتا ہوں" چلتی کار میں سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پرشوتم نے کہا "بائیں کو چلئے صاحب۔ وہ مندر جو دکھائی دے رہا ہے اُس کے پیچھے جو نیم کا پیڑ ہے وہ میرے ہی گھر کے سامنے ہے" ڈرائیور نے سب باتیں سمجھ لیں اور کار کو منزل پر جا کھڑا کیا مسٹر بانڈ کار سے اُتر کر ملکھن کے پیڑ کے نیچے چبوترے پر بیٹھے حقہ پیتے [illegible] سے پوچھنے لگے "کیا یہ گھر اسی لڑکے کا ہے" ؟

"ہاں صاحب اسی کا ہے" بھی نے نفرت سے کہا پھر ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہوئے کانا پھوسی کرنے لگے آج کسی انگریز کا سامان پار کر دیا معلوم ہوتا ہے"

"تم لوگوں کے ہوتے ہوئے یہ بھیک کیوں مانگتا ہے کیا تم پڑوسی مل کر اس کی کوئی امداد نہیں کر سکتے کچھ کام نہیں دے سکتے۔ اگر تم نے اس کی مدد کی ہوتی تو یہ بھیک نہیں مانگتا بھیک مانگنا تو بُری بات ہے۔"

"ابھی یہ کس کام لائق ہی کہاں ہے سرکار جب بڑا ہوگا تو کوئی کام بھی بتا دینگے" سب نے مل کر کہا۔

"تم لوگ جب چھوٹے کی مدد نہیں کر سکتے تو بڑے کی کیا مدد کرو گے بڑا تو خود ہی مدد کر لیتا ہے مدد تو چھوٹے ہی کی کی جاتی ہے۔ جب بڑا [illegible] خود تمہاری مدد کریگا" مسٹر بانڈ نے کار میں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سیکرٹریٹ جانے سے پہلے جہاں [illegible] اس کے لئے کپڑوں کا انتظام کیا اور اس کے بعد قلعہ دیکھا اور جی کو روانہ ہو گئے

"اب تم ہمارے ساتھ ہی رہا کرو گے" پرشوتم سے مسٹر بانڈ نے کہا۔ مسٹر بانڈ نے لڑکی کو پرشوتم کی گود سے اپنے ہاتھوں پر لے لیا۔ غور سے دیکھا تو کیا اس کے ناک نقشہ خوبصورت تھے ٹھوڑی پر چھوٹا سا کالا تل بہت اچھا لگ رہا تھا گلے پر ایک لال تل تھا۔ ایک ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں جنصر کے پاس ایک چھوٹی سی لٹکتی ہوئی انگلی دیکھ کر مسٹر بانڈ کو ہنسی آگئی ڈرائیور نے سامنے شیشے

میں کنکھیوں سے انہیں مسکراتے دیکھا، وہ سمجھا کہ وہ اس کی کسی غلطی پر مسکرا رہے ہیں وہ سیٹ پر سنبھل کر بیٹھ گیا اور اسٹیرنگ سنبھالتے ہوئے اور بھی احتیاط سے گاڑی چلانے لگا۔ مسٹر بلانڈ خوش خوش ڈاکٹر شرما کے مکان پر دہلی میں آگئے
"یہ دو بچے کس کے ہیں" ڈاکٹر شرما کے منہ سے نکلا
"میرے ہی سمجھ لیجئے" سنجیدگی کے ساتھ مسٹر بلانڈ بولے۔ مسٹر بلانڈ نے دو ماہ کے قیام میں سارا کو دہلی کا مکمل طریق اظہار پر تھیسس لکھنی شروع کردی دہلی کے لئے ایک آیا کو دی اور پرشوتم کو بھی۔ ڈی۔ ٹائلر سکول قریب اپنا داخل میں بھرتی کرا دیا۔ وقت کا پنچھی برابر پرواز بھرتا رہا اور وہ لڑکی جس کو چھ ماہ کی لائے تھے اب پندرہ سال کی ہو گئی اور بی اے میں پڑھتی تھی۔ پرشوتم نے ایم اے کر لیا تھا اور بائیس سال کا تھا چندرکا پرشوتم سے بالکل سگے بھائی جیسے برتاؤ کرتی تھی ایک دن تینوں کھانا کھانے کے لئے میز پر دیکھ کر کہنے لگے کسی ہوٹل میں رات کو ٹھہرے ہیں اس وقت ہوٹل کا نام یاد نہیں آرہا ہے۔ ایک حسین عورت مینو لیکر سامنے آئی۔ "یہ سب آپ کے ساتھ ہیں" اس نے کھانے کی فہرست (مینو) مسٹر بلانڈ کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ انگریز کے ساتھ دو ہندوستانی جوان لڑکے اور لڑکی کو دیکھ کر وہ کچھ چونکی پرشوتم کو دیکھ کر تو وہ اور بھی حیرانی سے چونکی "ایک شکل کے بہت سے لوگ ہوتے ہیں" پل بھر کو اس کے دماغ میں آیا مگر دل نہ مانا اور پوچھ ہی بیٹھی "تمہارا نام پرشوتم ہے؟"
"ہاں۔ مگر تم کیسے جانتی ہو میں نے تو تم کو کبھی دیکھا نہیں" پرشوتم تعجب کے ساتھ اس کی طرف دیکھتا رہا۔
"تم نے مجھے دیکھا ہے مگر تم بھول گئے ہو" پرشوتم کے پاس سرکتے ہوئے یہ تیس سالہ حسینہ بولی۔ پرشوتم نے اس کے گداز جسم کو نیچے سے اوپر تک بغور دیکھا ہر طرف سے جوانی ٹپک رہی تھی عمر کا صحیح اندازہ ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔
"کہاں دیکھا ہے؟" متعجب پرشوتم کے منہ سے نکلا۔
"میں بدحال گھر بار کی لڑکی ہوں جو گاندھی سمارک دلی میں کام کرتا ہے میرا نام چندا ہے جب میں کنواری تھی تو بچپن سے ایک لڑکی دیدیکی میں اس کو سیکری میونسپل کمیٹی کے دفتر کے سامنے سیڑھیوں پر ڈال آئی تھی۔ اس پاپ کو چھپانے میں میں نے کافی کوشش کی مگر چھپ نہ سکا اور میں سب میں بدنام ہو گئی۔ سب کی نظروں سے گر گئی میرا بھائی مجھ پر رحم کھاتی چھوڑ کر ملا ڈالنے کی ترکیب سوچ رہا تھا جس رات میں یہ ہونے والا تھا میں ایک دن پیشتر ہی دن نکلنے سے پہلے گھر سے نکل بھاگی۔ ایک نوجوان فنکار نے بے سہارا دیکھ کر کہیں جانا چاہا تھا میں اس کی کار کے آگے آ گئی کافی ہارن بجائے مگر میں ٹس سے مس نہ ہوئی میں نے یہی سوچ لیا تھا کہ یا تو مر جاؤں گی یا بچ گئی تو زندگی بن جائے گی
"کیا تم کو مرنے سے ڈر نہیں ہے" نوجوان نے منہ باہر نکال کر کہا۔
"جی ہاں" میں نے نڈر ہو کر کہا
"کیوں" وہ اسٹیرنگ پر گال ٹیک کر پھر بولا۔
"میرا کوئی نہیں ہے سارا خاندان مر گیا ہے میری برائی میری دشمن بن چکی ہے میرا باپ میری جان لیوا بن رہا ہے۔ جدھر جاتی ہوں لوگ مجھے بھیڑیوں کی طرح تکتے ہیں اسی لئے مر جانا چاہتی ہوں" "ٹھیک ہے بابو جی" میں نے یہ بات بتائی کہ نوجوان نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ میں اس کے پاس ہی اگلی سیٹ پر اس سے چپک کر بیٹھی میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہی کھانا آگیا میں بہت خوش تھی کہ اب زندگی بن گئی مگر جس ہوٹل میں آپ بیٹھے ہیں اسی ہوٹل میں وہ میرے ساتھ پوری رات رہا۔ دن نکلتے ہی وہ ضروریات سے فارغ ہونے کے بہانے سے ایسا گیا کہ آج تک منہ دیکھنے کو نہیں ملا میں اس کا انتظار ہی کرتی رہی آٹھ بجے کے قریب ایک آدمی آیا اور بولا حسینہ تم اسی ہوٹل میں عمر بھر رہو گی کوئی تکلیف نہیں ہو گی کوئی پریشانی نہیں ہو گی ہمارے مالک نے تم کو اس لڑکے سے دو ہزار روپے میں خرید لیا ہے تم کو کیا کام کرنا ہے آؤ میرے ساتھ مالک سے پوچھ لو۔ یوں کہہ کر وہ مجھے ساتھ لے گیا میں نے کوئی مخالفت نہیں کی کیوں کہ میں جانتی تھی کہ یہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش بیکار ثابت ہو گی اور کارآمد بھی ہو گئی تو میرا کہیں ٹھیک ٹھکانہ بھی تو نہیں تھا کہاں جاتی اس لئے حالات سے سمجھوتہ کرکے سر جھکا لیا اور جس طرح نصیب نے زندہ رکھا رہ رہی ہوں۔"
"کیا تم یہاں اپنے آپ کو خوش سمجھ رہی ہو" مسٹر بلانڈ نے پوچھا۔
"کیا بتاؤں مجبوری سب کچھ کرا لیتی ہے" یوں کہتے ہوئے چندا کچھ دیر کو چپ ہو گئی اور چندرکا کے چہرے کو بغور دیکھنے لگی ٹھوڑی پر کالا تل اور گردن پر سرخ تل دیکھ کر اس کے دل میں شک نے جنم لیا وہ آگے جھکی اور چندرکا کا دایاں ہاتھ کھینچ کر دیکھتے ہوئے بولی "کیا تمہارے اس ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں؟"
"ہاں تھیں مگر ابا نے دہلی لا کر ایک کٹوا دی لیکن تم کو اس کا پتہ کیسے ہوا کہ میرے اس ہاتھ میں چھ انگلیاں تھیں۔"
"تم کو یہ میونسپلٹی کے دفتر کی سیڑھیوں پر ملی تھی" چندا نے پرشوتم سے پوچھا۔
"جی ہاں" پرشوتم نے سچ کا اقرار کیا
"میری بیٹی" کہتے ہوئے چندا چندرکا کی طرف لپکی "میں تیری بدنصیب ماں ہوں مگر میں نے ماں ہونے کا کوئی بھی فرض تیرے ساتھ پورا نہیں کیا۔ میں کتنی بدنصیب ہوں سماج کا ڈر بھی کیسا برا ہوتا ہے کہ انسان کو اپنی اولاد کے ساتھ بھی چھینے

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ — رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۲۶۴۴/۵۷ — رجسٹرڈ نمبر D-۲۷۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

آزادی ایڈیشن

ماہنامہ

شانِ ہند نئی دہلی

ہر فرد وطن سے ہے فیضِ امن جگ پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
(غیاث گوالیاری)

ایڈیٹر: سرمد تونسوی

زر سالانہ: ۱۵/- روپیہ
فی پرچہ: ۲/- روپیہ

جلد نمبر ۴۱ — اگست ۱۹۸۰ء — شمارہ نمبر ۸

یومِ آزادی کی ۳۴ سالگرہ پر ... ایک تاثر

غازی مسکرو دھولی

سوزِ غم تیز کرو۔ درد جگاؤ، یارو
جشنِ آزادیِ جمہور مناؤ، یارو

آج کے روز کی عظمت کا تقاضا سمجھو
ملک و ملت کو تباہی سے بچاؤ، یارو

آج کا دن ہے فقط عہدِ محبت کے لئے
آج کے دن کو تماشا نہ بناؤ یارو

اپنے اسلاف کی تاریخ کا پیغام سنو
دورِ حاضر کی سیاست پہ نہ جاؤ یارو

تم کو درپیش ہیں پیچیدہ مسائل اکثر
دیدہ و دل کو تصادم سے بچاؤ یارو

تر پورہ ہو کہ ہو آسام سبھی اپنے ہیں
وقت کی راہ میں کانٹے نہ بچھاؤ یارو

کشمکش وقت کی ہے اپنی حدوں میں لیکن
یہ بھی ممکن ہے کہ بڑھ جائے تناؤ، یارو

دل سے آنکھوں میں [illegible]
تم کناروں سے بہت دور نہ جاؤ یارو

مقصدِ جذبۂ تعمیر و ترقی سمجھو
بستیاں اجڑے ہوئے دل کی بساؤ یارو

تم گراں باریِ ایام کا شکوہ نہ کرو
اپنے سینے کا ہر اک زخم چھپاؤ یارو

مختصر یہ کہ شہیدانِ وطن کی خاطر
گرم کرنا ہے محبت کا الاؤ یارو

ودیا پرکاش سرمد ایڈیٹر، پرنٹر پبلیشر نے کمیٹی کے صفحات خواجہ پریس بچہ مسجد منگو، جامع مسجد دہلی اور سرورق پائنیٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند فلیٹ نمبر ۸، مصدری مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

ملک کی ایکتا کا راز

"بنیادی طور پر ملک کے لئے باشندوں کی محبت اور اس کے لئے سب کچھ قربان کرنے کا عزم۔
اور یہ صرف دوسروں کی بھلائی کے خیال سے ہی نہیں بلکہ ہر فرد یہ جانتا ہے کہ اس کا اپنا مستقبل در اصل اس کے ملک کے مستقبل سے وابستہ ہے۔"

—— اندرا گاندھی

آیئے ہم اپنی آزادی کی

33 ویں

سالگرہ پر

سی آر داس کے ان الفاظ کی دائمی سچائی کو یاد کریں:

"اگر بھارت ہی نہ رہے تو رہے گا کون؟"

ہمارا ایک ہی نشانہ ——

مضبوط اور خود کفیل بھارت کی تعمیر

آیئے! ہم سب مل کر کام کریں

davp 80/115

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید و صبا چہ کرد؟

ممی نرودھ کیا ہوتا ہے؟

راقم الحروف کرزن روڈ پر ایک دوست کے یہاں کھانے پر مدعو تھا۔ ریڈیو سے وودھ بھارتی پروگرام کے فلمی گانے کانوں میں رس گھول رہے تھے کہ یکایک یہ اشتہار سنائی دیا۔ "بچے کی پیدائش میں فرق رکھنے کے لئے نرودھ استعمال کیجئے۔ جو ہر جگہ ملتا ہے ۲۵ نئے پیسے میں تین۔"

پانچ چھ سال کی بچی سوالیہ نظروں سے اپنی ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی ممی نرودھ کیا ہوتا ہے؟ چار مہمانوں کی موجودگی میں بچی کے اس "بالغانہ" سوال پر یہ محترم خاتون انتہائی گھبراہٹ سے کرسی سے اُٹھیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں اب بچی نے اپنے پاپا سے یہی سوال کیا۔ صاحب خانہ چونکہ صحافی ہیں اس لئے بغیر کسی گھبراہٹ کے کہنے لگے منی یہ کوئی نئی چیز چلی ہے میں بھی نہیں جانتا کسی سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ بچی کی رگوں میں بھی آخر اسی صحافی کا خون دوڑ رہا تھا اس لئے اس نے اب براہ راست ہم چاروں مہمانوں سے یہی استفسار کیا اور ہم نے "کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا" کی مجسم تفسیر بنے نیچی نظریں کئے جواب دیا کہ بیٹی تمہارے پاپا ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ کوئی نئی چیز نکلی ہے۔ ہمیں بھی اس کا پتہ نہیں ہے بچی کا چہرہ اور خصوصاً اس کی آنکھیں زبان حال سے پکار پکار کہہ رہی تھیں کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ ہمیں بھی جھوٹا سمجھ رہی ہے۔

بچے کی فطرت ہے کہ وہ جب اپنے کسی سوال کا شافی جواب نہیں پاتا تو وہ ہر ممکن کوشش کرتا ہے کہ اسے اس کے سوال کا شافی جواب ملے۔ اس لئے یہ یقینی ہے کہ یہ بچی اپنے سکول کی ہم جماعت لڑکیوں سے پوچھے اور اگر اس کی تسلی نہیں ہوتی تو عین ممکن ہے کہ وہ اپنی استانی سے بھی یہ استفسار کرے۔ اور اگر اسے کہیں سے "نرودھ" کی خصوصیات معلوم ہوگئیں تو آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس نازک اور کچے دل و دماغ پر کس قسم کے تاثرات اثر پذیر ہوں گے۔

کیا حکومت ہند کی وزارت فیملی پلاننگ جس کی طرف سے یہ اشتہار ریڈیو پر ہر شب دُہرایا جاتا ہے معصوم بچوں پر رحم کرتے ہوئے اسے مناسب الفاظ میں نشر کرائے گی۔ ویسے یہ ایک حقیقت ہے کہ "نرودھ" سے بچوں کی پیدائش میں فرق آیا ہو یا نہ مگر جوانی میں قدم رکھنے والی پود میں اس نے بدمعاشی کے راستے کھول دیئے ہیں۔

امریکی اور ہندوستانی صنعت کاروں کی ذہنیت میں فرق

مسٹر چیسٹر باولز ہندوستان میں امریکی سفیر کی حیثیت سے ایک نمایاں شخصیت رہے ہیں انھوں نے اپنی تصنیف لطیف (AMBASSADORS REPORT) میں ایک جگہ لکھا ہے کہ انھوں نے ایک ہندوستانی صنعت کار سے دریافت کیا کہ آپ اپنے کاروبار سے زیادہ منافع کمانے کے لئے کیا طریقہ استعمال کرتے ہیں ہندوستانی صنعت کار نے جواب دیا۔

۱۔ مال کی کوالٹی خراب کر دی جاتی ہے
۲۔ دام بڑھا دیئے جاتے ہیں۔
۳۔ مزدوروں کی اُجرت میں کمی کر دی جاتی ہے۔

مسٹر چیسٹر باولز فرماتے ہیں کہ میں نے اُسے بتایا کہ امریکہ میں ذیل کے طریقوں سے زیادہ منافع کمایا جاتا ہے۔

۱۔ اچھی کوالٹی ہونے کے باوجود کوالٹی کو اور بھی بہترین کرنے کی لگاتار کوششیں۔
۲۔ سستے دام۔
۳۔ زیادہ پیداوار

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی صنعت کار نہایت ایماندار

سے ہندوستانی صنعت کاروں کے طریق کار کی ترجمانی کی ہے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ آگرے کے جوتا سازوں کو روس سے جوتوں کا بیش بہا رقم کا آرڈر ملا کرتا تھا مگر ان جوتا تاجروں نے اپنی ہندوستانی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مال کی کوالٹی خراب کر دی اور نتیجے میں سارے جوتے واپس آگئے۔ جو بعد میں آگرے۔ دہلی اور دوسرے شہروں میں پٹریوں پر انتہائی کم قیمتوں میں فروخت ہوئے۔ اور آئندہ کے لئے روس سے آرڈر ملنا بند ہو گیا۔ آگرے کے جوتا تاجروں کا معاملہ ایک طرف رکھئے آپ کسی بھی چیز کو دیکھئے حتیٰ کہ معمولی بلیڈ تک کو لے لیجئے کہ شروع شروع میں مارکیٹ میں آنے والا ہر بلیڈ بہترین کارگزاری دکھاتا ہے اور جب اس کی شہرت ہو جاتی ہے تو وہی بلیڈ اولین استعمال میں ہی شیو بنانے سے انکار کر دیتا ہے۔ ٹوتھ پیسٹ بنانے والوں نے قیمتیں بڑھا دی ہیں اور ٹوتھ پیسٹ ٹیوبز کا سائز کم کر دیا ہے۔ نہانے کے صابنوں کو لے لیجئے قیمتوں میں دن دونی اضافہ اور کوالٹی کا یہ حالت ہے کہ جسم پر صابن کی ٹکیہ ملئے تو کھروچیں پڑ جائیں غرضیکہ کسی بھی چیز کو لیجئے قیمتیں بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی ہیں اور ان کی کوالٹی اسی رفتار سے نیچے آ رہی ہے حکومت تو اب دونوں کو محفوظ رکھنے کے لئے زیادہ فکرمند ہے۔ بہ نسبت عوام کی تکالیف کو دور کرنے یا ملک کے صنعت کاروں کو یہ فہمائش کر سکے کہ وہ اشیاء کی کوالٹی کو خراب نہ کریں اور مناسب داموں پر صارفین تک پہونچائیں۔ اس لئے صارفین ہی کچھ ایسا انتظام کریں کہ جس چیز کی کوالٹی خراب ہو جائے اسے خریدنا چھوڑ دیں تو شاید سرمایہ دار صنعت کار اپنے اس بھدے اور بے رحمانہ طریق کار کو بدل سکیں۔

انجمن افغان دوستاں

پچھلے دنوں میونسپل کارپوریشن ٹاؤن ہال کے دربار ہال میں انجمن افغان دوستاں کا پہلا جلسہ ہوا۔ جناب اٹل بہاری باجپائی سابقہ وزیر داخلہ حکومت ہند۔ جناب سکندر بخت سابق وزیر تعمیرات حکومت ہند۔ اور جناب عارف بیگ سابق وزیر مملکت حکومت ہند۔ نیز رام جیٹھ ملانی ایم۔ پی اور دیگر حضرات نے تقریریں فرمائیں آچاریہ دھرمیندر ناتھ آف جے پور اس انجمن کے جنرل سیکریٹری ہیں۔ انھوں نے انجمن کے اغراض مقاصد تفصیلی طور پر بیان فرمائے۔ مقررین نے افغانستان پر روسی حملہ کو ناجائز قرار دیتے ہوئے دلائل و براہین سے کام لیا اور حاضرین جلسہ نے متفقہ طور پر دو قراردادیں پاس کیں کہ روس کو چاہیے کہ وہ فوری طور پر اپنی مسلح افواج کو افغانستان سے واپس بلالے کیونکہ اس کے اس اقدام سے جہاں افغانستان کی آزادی سو فیصدی خطرے میں ہے وہاں ہندوستان کی سرحد پر روسی ہوا اپنے قدم جماتے ہوئے نظر آرہا ہے۔ اور دوسری قرارداد میں کہا گیا کہ حکومت ہند ناوابستہ ممالک کے نمائندوں کی ایک کانفرنس دہلی میں بلائے اور اس میں روس کے اس اقدام پر مشورہ کرے اور اس کا کوئی با اثر حل نکالے۔

دلی انتظامیہ کا مشاعرہ جشن آزادی

اس سال جشنِ آزادی کے سلسلے میں دہلی انتظامیہ کا اردو مشاعرہ سپرو ہاؤس میں ۱۵ اگست رات کے ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوا۔ مرکزی وزیر نشریات و اطلاعات جناب وسنت ساٹھے نے اس مشاعرہ کی صدارت کرنی تھی مگر وہ کسی باعث وقت پر تشریف نہ لا سکے تو جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر نے اعلان فرمایا کہ مجوزہ صدر صاحب کسی باعث ابھی تک تشریف نہیں لا سکے ہیں۔ خوش قسمتی سے ہندوستان گیر شہرت رکھنے والے اردو کے دیوانے جناب ڈی۔ این۔ آریہ انکم ٹیکس افسر کانپور سامعین میں تشریف فرما ہیں۔ میں آپ سب کی طرف سے ان کی خدمت میں گذارش کروں گا کہ وہ آج کے مشاعرے کی صدارت فرمائیں۔ تالیوں کی گونج میں جناب ڈی۔ این۔ آریہ مسند صدارت پر تشریف لائے تو انھوں نے صدارتی خطبہ دیتے فرمایا کہ آج کے مشاعرے کی صدارت "مفت کرم داشتن" والا معاملہ ہے مگر میں آپ سب کا ممنونِ احسان ہوں کہ اس مبارک موقع پر مجھے اس مشاعرہ کی صدارت کی عزت بخشی گئی ہے میں اپنی صدارتی تقریر صرف آدھے منٹ میں ہی

ختم کر دوں گا اور وہ اس طرح کہ میں الہ آباد سے آیا ہوں اور اسی نسبت سے آپ کے لئے گنگا جمنی پیغام لے کر آیا ہوں اس کے بعد آریہ صاحب نے جو گنگا جمنی پیغام دیا تو سپرو ہال تالیوں سے دیر تک گونجتا رہا۔ مسٹر سپرو جن کے نام پر یہ ہال ہے وہ بھی الہ آباد ہی کے تھے اور اردو کے دلدادہ تھے اور آریہ صاحب بھی الہ آباد سے ہی تشریف لائے ہیں لہذا گنگا جمنی پیغام لانے والے الہ آبادی پیغامبر نے جس انداز سے اردو کے لئے یہ حیات بخش پیغام دیا اس پر سامعین کی خوشنودی کا ترجمان ان طویل تالیوں سے مرحوم مسٹر سپرو کی روح بھی خوش ہو گئی ہو گی۔

یہ مشاعرہ اس سال کا ایک کامیاب ترین مشاعرہ تھا۔ حالانکہ پرانے شہر میں کرفیو کے باعث پرانی دلی کے حضرات اس مشاعرہ میں شرکت نہ کر سکے۔ اردو کے اس کامیاب مشاعرہ پر دلی انتظامیہ مبارک باد کا مستحق ہے۔ جناب وسنت ساٹھے صاحب قریب ڈیڑھ گھنٹہ دیر سے تشریف لائے اور انھوں نے آریہ صاحب کی صدارت میں ہی مشاعرہ جاری رہنے میں مسرت کا اظہار فرمایا اور خود سامعین میں تشریف فرما ہو گئے۔

بخشیش "یا بھرشٹاچار" کے دو نادر نمونے

ایک عدالتی پیادہ کسی دیوانی مقدمہ میں شہادت دینے کے لئے ایڈیٹر شانِ ہند کے نام سمن لایا۔ سمن کی کاپی اور خرچہ خوراک وغیرہ دینے کے بعد بھی وہ پیادہ بیٹھا رہا تو اسے ٹھنڈا پانی پلایا گیا مگر وہ پھر بھی بیٹھا رہا اس خیال سے کہ گرمی اور دھوپ کے باعث سستا رہا ہو گا۔ راقم اپنے کام میں مشغول رہا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد پیادہ نے نقلی کھانسی کھانستے ہوئے میرا دھیان اپنی طرف مبذول کرایا تو میں نے لکھنا چھوڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا کہ صاحب، ہماری بخشیش ۔۔۔ منٹ تک پیادہ کا منہ تکتے رہنے کے بعد عرض کیا گیا کہ معاف رہنے کونسی ایسی خدمت انجام دی ہے جس کے صلے میں آپ بخشیش کی توقع میں ابھی تک تشریف فرما ہیں۔ ایک صاحب نے طلبانہ ادا کر کے گواہی کے لئے سمن جاری کرایا اور خرچ خوراک سرکاری خزانے میں جمع کرایا۔ تم طلبانہ ادا شدہ سمن لے کر آئے ہو اور کسی صاحب کے سرکاری خزانے میں جمع کرائے ہوئے روپے دینے آئے ہو۔ اور یہ تمہاری ڈیوٹی ہے۔ جس کی تنخواہ تمہیں سرکار دیتی ہے۔ پھر بخشیش کس بات کی۔ پیادہ اس بات سے سراسیمہ نہیں ہوا بلکہ اور اونچی آواز سے کہنے لگا صاحب مہنگائی کا یہ حال ہے کہ تنخواہ ایک ہفتہ بھی نہیں چلتی تو پھر ہم کہاں سے کھائیں۔

ایک ۲۹ سالہ نوجوان کسی حادثہ میں ہلاک ہو گیا تو اس کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے لیجائی گئی۔ مرحوم کے لواحقین پوسٹ مارٹم گھر کے باہر درختوں کی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی گھنٹوں کے بعد جب لاش واپس ملی تو دو چار ملازم اس لاش کو باہر لائے تو انھوں نے مرحوم کے لواحقین سے بخشیش کا مطالبہ کیا۔ مرحوم کی نوجوان بیوی دہاڑیں مارتے مارتے بیہوش ہو چکی تھی۔ مرحوم کی بوڑھی ماں الگ سسک رہی تھی غرضیکہ مرنے والے کا ہر رشتہ دار اس جوان مرگی اور افسوسناک موت پر آنسو بہا رہا تھا اور اس ماتمی ماحول میں ان ملازمین کا بخشیش مانگنا ایسا تھا کہ اگر ان کا بس ہوتا تو ان ملازمین کو بھی مرنے والے کے ساتھ ہی نذر آتش کر دیتے۔ ایک صاحب نے روتے ہوئے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا اور یہ کہتے ہوئے کہ شاید مرنے والے نے ان کا بھی کوئی قرض دینا ہو گا ان کتوں کے سامنے پھینک دیا۔

بخشیش جو بھرشٹاچار کا ایک مہذب نام ہے۔ مندرجہ بالا دو نادر نمونے ملاحظہ فرمانے کے بعد آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سرکاری دفاتر اور خصوصاً عدالتوں وغیرہ میں عوام کا کیا حال ہوتا ہو گا۔

کرفیو کی نذر

انجمن عروج ادب کا سالانہ مشاعرہ آزادی ۱۶ اگست کو ایوانِ غالب میں منعقد ہونا تھا۔ اور اس مشاعرہ کا افتتاح عالی جناب ہدایت اللہ صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند نے فرمانا تھا۔ مگر کرفیو کی بدولت یہ مشاعرہ ملتوی کرنا پڑا۔ حالانکہ دہلی میں سال بھر میں ہونے والے مشاعروں میں انجمن عروج ادب کا

مشاعرہ آزادی اپنی طرز کا واحد مشاعرہ ہوتا ہے۔

راجدھانی میں ایک اور قابلِ ذکر مشاعرہ

دلی کلاتھ ملز والے ہر سال ایک مشاعرہ کراتے ہیں جو مشاعرہ کم اور دولت کی فراوانی کا مظاہرہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس سال مودی گروپ نے دلی کلاتھ ملز کے لیے یہ ایسا دہلا مارا کہ جو دلی کلاتھ والوں کے مشاعرہ کی تمام نزاکتوں اور دولت کی نمائش وغیرہ کو کوسوں پیچھے چھوڑ گیا۔

مودی گروپ ہر سال مودی نگر میں ایک مشاعرہ کرتا ہے۔ مگر جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا کے مصداق یہ مشاعرہ مرکزی حکومت کے ایوانوں میں اور حکومت کے ذمہ دار مہروں کو سنائی نہ دیتا تھا اور مودی گروپ کی یہ اردو نوازی یونہی رائیگاں جاتی تھی۔

اس سال مودی گروپ والوں نے مودی نگر کے بانی جناب گوجر مل مودی (مرحوم) کے جنم دن کی تقریب کے سلسلے میں ۱۰ راگست کو ایف۔ آئی۔ سی۔ سی۔ آئی ہال میں ایک ایسا شاندار انوکھا اور یادگاری مشاعرہ کرایا کہ غالب۔ ذوق۔ اور دلی میں دوسرے مدفون شعرائے قدیم کی روحیں بھی وجد میں آگئی ہوں گی۔ اس مشاعرے میں ۳۵ غیر مقامی اور چند مقامی شعرائے کرام کو مدعو کیا گیا جن میں کیفی اعظمی سے لیکر سلیم کھا تولوی تک سبھی قسم کے یعنی تجارتی۔ گویئے۔ بہروپئے اور خالص ادب خدمت کرنے والے شعرا تھے۔

سامعین کو جو دعوت نامے بھجوائے گئے ان کے ساتھ جوابی خط بھی بھجوائے گئے تاکہ تشریف آوری کے بارے میں ہاں یا نہ کی اطلاع دی جا سکے۔ جو مدعوئین اس خالص انگریزی طریقے سے واقف تھے اُنھوں نے اس جوابی کارڈ کو کام میں لاتے ہوئے ہاں یا نہ میں جواب دیا۔ جن حضرات نے مشاعرہ میں شرکت ہونے کی رضامندی ظاہر فرمائی تھی انھیں منتظمین مشاعرہ نے سیٹ نمبر بھجوا دیا۔ اور ان ہی حضرات کو ہال میں داخل ہونے دیا گیا جن کے پاس سیٹ نمبر تھے۔ ہال میں داخلے کے وقت ہر آنے والے کو ایک ماہ پارہ بہترین خوشبو کا پھویا پیش کرتی تو دوسری قاتلہ گلاب کا پھول لگا کر کے کوٹ پر ٹانکتی اور تیسری گلدستہ پیش کرتی ہیں۔

اسٹیج پر بافتا عدہ ۔ بہرے چائے اور مشروبات پیش کر رہے تھے۔

انگریزی طریق کار کے باعث وہ سامعین جو دعوت نامہ ملنے پر مگر سیٹ نمبر ملنے پر تشریف لائے تھے ہال میں داخل نہ ہو سکے جس کے باعث چوتھائی ہال خالی رہ گیا۔

حکومت ہند کے وزیر داخلہ جناب گیانی ذیل سنگھ نے مشاعرہ کا افتتاح بھی فرمایا اور صدارت بھی کی۔

جس مشاعرہ میں اس قسم کے لوازمات کا انتظامات کیا گیا ہو اس کے بارے میں آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دلی کلاتھ ملز والے اپنی سالہا سال کی محنت پر پانی پھرتے ہوئے دیکھ کر یقیناً اگلے سال اپنے مشاعرہ میں اس سے بھی زیادہ مالی نمائش کی آماجگاہ بنائیں گے۔

ہم مودی گروپ کے سربراہ جناب کے۔ این۔ مودی اور مشاعرے کے کنوینر جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کو مبارکباد دیتے ہیں جن کے اشتراکِ مالی و عقلی نے اس مشاعرے کو راجدھانی کا اوّلین مشاعرہ بنایا۔

پنڈت رام لکھن مشرا کی پیش گوئیاں؟

پنڈت رام لکھن مشرا (پوربیہ) کی پیش گوئیاں شانِ ہند میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ مشرا صاحب کی اکثر و بیشتر پیش گوئیاں صحیح ثابت ہوئی ہیں۔ ہوائی حادثے۔ زلزلہ۔ مسئلہ آسام اور دیگر پیش گوئیاں قریباً قریباً بالکل صحیح ثابت ہو چکی ہیں۔ اب مشرا جی کا فرمان ہے کہ ۲۱ روشمبر تک بہار کی موجودہ منسٹری ختم ہو جائے گی اور اس کی جگہ دوسری منسٹری بھی کانگریس کی ہی بنے گی۔

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ مشرا جی کی یہ پیش گوئی بھی شانِ ہند میں شائع ہوئی تھی کہ اگست میں اکثر مقامات پر دنگے ہونگے۔

ہماری حکومت کے اکثر اراکین یہاں تک کہ وزیر اعظم صاحبہ تک علم جوتش کی صداقت کو تسلیم فرماتی ہیں۔ امید ہے کہ ہماری حکومت کے وہ اراکین جو علم جوتش میں یقین رکھتے ہیں مشرا جی کی خدمات سے مستفید ہونگے۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

راقم الحروف کچھ دنوں سے بسترِ علالت پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا فرمان ہے کہ خوش رہوں۔ عیدِ سعید کی مبارک تقریب اور پھر یومِ آزادی۔ آیئے آپ کو بھی کچھ خوشگوار اور دل خوش کن واقعات کے قہقہوں میں شریک کر لوں جن کی دلفریب یاد بسترِ علالت پر بھی زیرِ لب مسکرانے پر مجبور کر رہی ہے۔

بائیس تیئیس سال ہوئے جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر گوڑگاؤں میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ڈسٹرکٹ ریلیف فنڈ کے سلسلے میں انھوں نے ہند و پاک مشاعرہ کا بڑے اہتمام سے انتظام فرمایا۔ لاہور سے جناب قتیل شفائی معہ اپنے صاحبزادے کے تشریف لائے۔ ان دنوں گوڑگاؤں جانے کے لئے بس کا اڈہ اجمیری گیٹ پر تھا۔ دلی کے چند شعراء اور قتیل شفائی وغیرہ گوڑگاؤں جانے کے لئے اجمیری گیٹ بس سٹینڈ پر پہنچے۔ ان دنوں یہ طریقہ تھا کہ بس جب "بلیک ہول" کے روائتی دل خراش واقعہ کی طرح ٹھُس جاتی تو ہی منزلِ مقصود کی طرف رواں ہوتی تھی۔ بس چلنے والی تھی کہ باہر سے ایک ریڑھی والے نے آواز لگائی جل جیرا جل جیرا۔ مٹی کے مٹکے پر سُرخ رنگ کا بھیگا ہوا کپڑا اس پر ہرے پودینے کی گٹھیاں رکھی ہوئیں اور بار بار ریڑھی والا دل خوش کن انداز میں آواز لگاتا "جل جیرا" ہاضمے والا۔ مصالحے والا جل جیرا۔ اس پر قتیل شفائی کے فرزندِ ارجمند کہنے لگے۔ اباجی جل جیرا کیا ہوتا ہے۔ بس چل پڑی تھی۔ مرحوم پنڈت ہری چند اختر فرمانے لگے بیٹے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ جل جیرا کیا ہوتا ہے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے مرحوم اختر صاحب فرمانے لگے کہ لاہور میں کسی ہندو رئیس کے ہاں شادی کی دعوت میں مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک بھی مدعو تھے۔ خالص ہندوانہ کھانے کے بعد میزبان کی طرف سے بڑے خوبصورت گلاسوں میں جل جیرا بھی پیش کیا گیا تو مولانا مہر اور سالک کے ساتھ گئے ہوئے ایک بچے نے پوچھا ابو جل جیرا کیا ہوتا ہے تو مولانا سالک فرمانے لگے۔ پُتر پی لے ایہہ ہندوواں دا سوڈا واٹر اے۔ اب قتیل زادہ بھی جل جیرا کا مطلب سمجھ چکا تھا اور ہم سب کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔

بس ابھی نئی دہلی سٹیشن کے پُل پر ہی پہنچی تھی کہ ایک ایسے شاعر نام دار کا ذکر آ گیا جو ان دنوں آل انڈیا ریڈیو پر اپنے آپ کو پوری طرح مسلط سمجھتا تھا۔ پنڈت ہری چند اختر فرمانے لگے۔ صاحب کس جاہلِ مطلق کا نام لے رہے ہو۔ گلزار دہلوی کہنے لگے پنڈت جی آپ انھیں جاہلِ مطلق کہہ رہے ہیں اس پر پنڈت جی نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا میاں اب اگر اللہ میاں بھی چاہیں تو ایسا جاہلِ مطلق پیدا نہیں کر سکتے اس پر شعراء کا ٹولا خاص طور پر پنڈت جی کی طرف متوجہ ہوا اور اکثر نے یک زبان ہو کر کہا کہ پنڈت جی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ میاں بھی ایسا جاہل پیدا نہیں کر سکتے وہ تو قادرِ مطلق ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ پنڈت جی نے اور بھی سنجیدہ ہو کر فرمایا کہ اللہ میاں آپ کی طرح تھوڑے ہیں جو وعدہ کر کے مکر جائیں گے۔ مضطر صاحب فرمانے لگے پنڈت جی آپ کیا فرما رہے ہیں۔ پنڈت جی بے ساختہ فرمانے لگے اوئے اللہ میاں نے پہلا وعدہ ایہہ کیتا ہویا اے کہ محمدؐ کے بعد نبی پیدا نہیں کروں گا اور دوسرا وعدہ ایہہ کیتا ہویا اے کہ اس ...... کے بعد جاہل پیدا نہیں کروں گا بس پھر کیا تھا قہقہے تھے کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے عزیز وارثی۔ مضطر صاحب۔ گلزار صاحب۔ قتیل شفائی اور دوسرے حضرات ہنستے ہنستے اپنی سیٹوں پر لڑھکنے لگے اور تو اور بس کا ڈرائیور سٹیرنگ چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کر زور زور سے ہنسنے لگا۔ پنڈت جی نے جب ڈرائیور کی اس "بے داد" کو دیکھا تو کہنے لگے سردار جی گڈی دا خیال کرو کدے اللہ میاں نوں [illegible] بھی تیسرا وعدہ نہ کرنا پئے۔ پھر قہقہوں کا ایک سیلاب تھا کہ

دم لاکنواں پر جا کر ٹھہرا۔ پاکستانی دانشوروں کا ایک وفد نئی دہلی آیا تو اس میں مولانا عبدالمجید سالک بھی تھے سالک صاحب کا قیام کاروَنیشن ہوٹل فتحپوری چاندنی چوک میں تھا۔ راقم الحروف جناب خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی اور پنڈت ہری چند اختر مولانا سالک کے ہاں ہوٹل میں حاضر ہوئے۔ تو ہوٹل کے ملازم سے خوشتر گرامی نے دریافت فرمایا کہ تمہارے یہاں گوشت جھٹکے کا پکتا ہے یا حلال کا۔ ملازم نے چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے بڑی تفصیل سے بتایا کہ ان کے یہاں حلال گوشت ہی پکتا ہے اور فلاں مسلمان قصائی کے یہاں سے آتا ہے وغیرہ وغیرہ اس پر پنڈت ہری چند اختر بڑی سادگی سے فرمانے لگے ہاں بھائی ہاں یہ پتہ چل گیا کہ تم سب "حلال خور" ہو۔ "حلال خور" کے اس برمحل استعمال سے مولانا سالک اور وہ حضرات جو اس لطیف چوٹ کا مطلب سمجھتے قہقہہ خوب لگا دیا اور جو حضرات "حلال خور" کے معنی سے ہی ناواقف تھے وہ ہمارے قہقہوں پر حیران تھے۔

محترمہ بیگم حمیدہ سلطان صاحبہ جنرل سکریٹری ترقی اُردو دہلی کے ہاں علی منزل میں ایک شعری نشست میں مرحوم حضرت نوح ناروی غزل سنا رہے تھے۔ ردیف "کیا کیا" تھی۔ نوح صاحب نے اپنے مخصوص تحت اللفظ طرز ادا میں جب یہ مصرع پڑھا

ع یہ دل ہے یہ جگر ہے یہ کلیجہ

تو پنڈت ہری چند اختر بے ساختہ کہہ اُٹھے۔ ع

قصائی لایا ہے سوغات کیا کیا

سامعین تو کیا خود حضرت نوح کا ہنستے ہنستے بُرا حال تھا حالانکہ ہنسی اور حضرت نوح میں اینٹ اور کُتّے والا بیر تھا۔

چیمسفورڈ کلب، نئی دہلی میں مشاعرہ تھا۔ شعرا کا طائفہ شراب نوشی میں مصروف تھا کہ قریب سے جناب دیویندر ستیارتھی (جو اُن دنوں ہندی آجکل کے ایڈیٹر تھے) گزرے تو ان کی ہیئت کذائی دیکھتے ہوئے بابا بشیشر پرشاد صاحب چیف کمشنر فرمانے لگے ستیارتھی صاحب ان کا منہ کس طرف ہے بشیشر پرشاد صاحب کے اس فرمان پر شعراء نے ایسے قہقہے لگائے کہ اُن کا نشہ دو گنا ہو گیا (یاد رہے کہ دیویندر ستیارتھی کی جٹائیں اور داڑھی اس قدر بے ترتیبی سے ان کے سر، گردن اور منہ کا محاصرہ کئے ہوتے تھیں کہ واقعی ان ... کے ... یہ پتہ ... کہ ... کا ...) [illegible]

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر دہلی میں سٹی مجسٹریٹ تھے۔ ان کی عدالت میں ایک چوری کا ایسا مقدمہ آیا جس میں ایک شاعر فکر ندوی (اُن دنوں ان کا یہی تخلص تھا) ماخوذ تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ایسا شاعری کا عاشق یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ ایک شاعر چوری کے جرم میں سزایاب ہو۔ سحر صاحب پولیس والوں سے کہنے لگے کہ دیکھئے صاحب میں یہ تو مان سکتا ہوں کہ کوئی شاعر دوسرے کسی شاعر کے اشعار چرا کر اپنے نام سے پڑھتا پھرے مگر میں یہ نہیں مان سکتا کہ شاعر واقعی چوری کر سکتا ہے اس لئے اس مجرم کی ہتھکڑی کھول دو اور ہم اس کا امتحان لیتے ہیں اگر واقعی اس نے طرح مصرع پر شعر کہہ دیئے تو یہ بے قصور ہے ورنہ اس پر باقاعدہ مقدمہ چلے گا۔ فکر ندوی صاحب کی ہتھکڑی کھول دی گئی اور کنور صاحب نے ایک مصرع دیا کہ اس پر شعر کہو۔ فکر صاحب کی قسمت یاوری کر گئی اور انھوں نے جلدی جلدی دو چار اشعار کہہ کر عدالت کے سامنے رکھ دیئے کنور صاحب نے اشعار پڑھے اور فرمانے لگے چپراسی انھیں ریٹائرنگ روم میں بٹھا کر چائے پیش کرو۔ اور پولیس انسپکٹر بیچارا کہتا رہا کہ جرم ثابت ہے۔ گواہ موجود ہیں۔ مال مسروقہ برآمد ہے۔ مگر کنور صاحب فرمانے لگے۔ مجسٹریٹ ہم ہیں آپ نہیں۔ ہم انھیں بری کرتے ہیں۔

احمد آباد میں مشاعرہ ہو رہا تھا ڈائس پر شعرائے کرام جلوہ افروز تھے۔ آنجہانی سردار بیگم اختر انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں گلے میں جڑاؤ ہار اور کانوں میں ہیرے کے ٹاپس پہنے کسی جیولرز کی دکان کا مجسم اشتہار بنی ہوئے نہیں سما رہی تھیں۔ بمبئی کی شاعرہ بینا رانی ناز کی آنکھوں اور چہرے پر خلافِ توقع معنوی حُسن جھلک اُبھر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اناؤنسر نے بڑے زوردار طریقے سے سردار بیگم اختر صاحبہ کا تعارف کرانے کے بعد ان سے کلام بلاغت نظام فصاحت التیام (حالانکہ یہ کلام مانگے کا اُجالا ہی ہوتا تھا) سنانے کی گزارش کی اختر صاحبہ بڑے طمطراق اور اندازِ معشوقانہ سے اپنی جگہ سے اُٹھ کر مائیک کی طرف جانے لگیں۔ تو بینا رانی ناز نے سردار بیگم اختر کی ساڑھے تین فٹ لمبی چوٹی پر دانستہ طور پر (مگر بظاہر نادانستہ) پاؤں رکھ دیا۔ اختر صاحبہ خدا کے فضل سے کافی جسیم تھیں، جھٹکے سے جو اُٹھیں تو یہ ساڑھے تین فٹ لمبی معطر مگر نقلی چوٹی بینا رانی ناز کے پاؤں تلے

[illegible] کے علاوہ ہی [illegible] بجے کے بعد پہلا دور ختم ہو کر دوسرا دور شروع ہوا جو نہایت کامیابی کے ساتھ فجر کی اذان تک جو جو سے برخاست کیا جا سکا۔ اس دور میں شعراء کی بھاری اکثریت خوب خوب سنا کر پسند کیا گیا اور شعراء کی خوب خوب پذیرائی ہوئی اور ہر طرح کا سپورٹ میدا کی گئیں یہاں تک کہ شیا مٹیا (منی لبس) مشاعرہ سے ایک روز قبل شعراء کو مدعو کرنے گئی اور مشاعرہ کے دن پھر سپاہ خود لینے کے لئے بھی گئی۔ اس طرح شعراء کرام کو کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا۔ سب کی خوب خوب خاطر مدارات کی گئی اور جو حضرات مدعو نہیں تھے ان کو بھی زادِ راہ پیش کیا گیا۔

یہ مشاعرہ فرینڈس ٹریڈرز (منی لبس) یونین گنگوہ کے منتظمین کی جانب سے منعقد کیا گیا ہے۔ ان کا پہلا تجربہ خلاف توقع اور خلاف امید کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ اب اجازت دیجئے خدا حافظ۔

پھر ملوں گا ذرا سا دم لیکر

غزل

نسیم شاہجہانپوری

ہر ایک داغِ دل ہے فروزاں ترے بغیر
آجا! کہ ہر قدم ہے چراغاں ترے بغیر

کتنی حسین ہے ترے ملنے کی آرزو
لینا پڑا حیات کا احساں ترے بغیر

آ اے غمِ حبیب! تجھے دل میں دوں جگہ
ہر گوشۂ حیات ہے ویراں ترے بغیر

راہِ حیات، جادۂ غم، منزلِ وفا
آساں ہو کے بھی نہیں آساں ترے بغیر

سب کچھ ہے میرے پاس مگر اس کے باوجود
کچھ بھی نہیں ہے اے غمِ جاناں ترے بغیر

ایک ایک کر کے بجھ گئی ہر شمعِ آرزو
بے نور اب ہے دل کا شبستاں ترے بغیر

اے عشق! تیرے دم سے ہے ہنگامۂ حیات
جینے کا مستحق نہیں انساں ترے بغیر

اتنا بھی مجھ کو ہوش نہیں اضطراب میں
کیا گذر رہے ہیں کہ مہینے ترے بغیر

[illegible] نسیم کی غزل [illegible]
کیسے [illegible] شبِ ہجراں ترے بغیر

[illegible] نسیم سب کو بہت یاد آئے گا
[illegible] کی محفل [illegible] ترے بغیر

کچھ نہفتہ داستانیں کچھ شگفتہ تذکرے

[illegible] — [illegible]

فانی کی محرومیاں

فانی پر دعوے

ناگہ فانی کے بعض مارِ آستین دوستوں نے جو خود بھی تک بندی کر کے شاعروں کی صفِ اوّل میں اپنا شمار کرتے تھے اور ادبی دُنیا میں کوئی وقار نہ رکھتے تھے۔ مہاجنوں سے ساز باز کر کے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ فانی کو قرض کی علت میں جیل بھجوا دیں۔ آخر ان شیاطین کی ریشہ دوانیاں رنگ لائیں اور دو چار مہاجن اس شیطانی کام پر آمادہ بھی ہو گئے۔ فانی پر بیک وقت متعدد دعوے دائر ہوئے اور یہ خبر فانی کے احباب میں عام ہو گئی کہ فانی قرض کی علت میں عنقریب جیل جانے والے ہیں۔ اس مصیبت کے وقت پھر قاضی عبدالغفار ہی کام آئے۔ انھوں نے نواب ہوشیار جنگ (ہوش بلگرامی) سے تنہائی میں گفتگو کی۔ گفت و شنید کے بعد یہ طے پایا کہ فانی کو جیل سے بچانا چاہیے۔ قاضی صاحب نے ایک ایک قرضخواہ سے فرداً فرداً ملاقات کی۔ ان کو سمجھایا کہ فانی کو جیل بھجوانے سے تمہارا روپیہ وصول ہونے سے رہا بلکہ اُلٹے اخراجات بھی تمہیں باضابطگی سے ہر ماہ برابر علیحدہ کرنے پڑیں گے۔ ایک کام جس کا کوئی حاصل نہ ہو خلافِ دانائی ہے۔ اس فضول کام سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ ہم سے مصالحت کر لو۔ ہم کچھ نہ کچھ تم کو زرِ اصل سے دلوا دیں گے۔ یہ بات مہاجنوں کی سمجھ میں آ گئی اور اب قاضی عبدالغفار صاحب کے دو تین گھنٹے روزانہ مہاجنوں کے ساتھ گپ شپ میں گذرنے لگے۔ کم و بیش ایک ماہ کے اندر قاضی صاحب نے ہوش صاحب کی مدد سے وہ سارا قرض بے باق کر دیا۔ زرِ اصل اور سود در سود ملا کر تقریباً [illegible] ہزار سے اوپر قرض تھا۔ ادائیگی یُوں ہوئی کہ جس نے ایک ہزار دیا تھا اسے پانچ سو دے کر راضی کر لیا گیا۔ اور اس طرح اس ناپاک قرض سے فانی کی گلوخلاصی ہوئی: قاضی صاحب کی اَنتھک کوششوں اور ہوش صاحب کے اثر و رسوخ سے مہاجنوں نے ڈر کر جو مل گیا قبول کر لیا۔

اور یہی وہ تنہا ذلت تھی جو آخر وقت یعنی موت سے پہلے فانی کے حصے میں نہیں آئی۔ فانی جیل جانے سے بچ گئے۔ ان حقیقی فرشتوں یعنی ہوش اور قاضی صاحب سے فانی کی معمولی یاد اللہ تھی۔ گہرا دوستانہ یا قریبی تعلقات نہ تھے۔ گہرے تعلقات والے اُن نازک لمحات میں اپنی کوٹھیوں میں آرام دہ صوفوں پر بیٹھے ہوئے فانی کی بدقسمتی پر اظہارِ افسوس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے۔ حالانکہ اگر وہ اپنی تعیش کی زندگی سے صرف ایک مہینے کی شراب کی رقم کو روک دیتے تو فانی ادبار و نکبت کے اس عمیق غار میں گرنے سے بچ جاتے جس میں اس کی بدقسمتی اور ناسمجھی انھیں کشاں کشاں لئے جا رہی تھی۔ قرض کا قضیہ رفع دفع ہونے کے بعد ہوش صاحب کی یہ رائے تھی کہ اب فانی کو اپنے وطن واپس جانا چاہیے۔ اس شہر میں جہاں اہلِ ادب کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ہرگز نہ ٹھہرنا چاہیے۔ یہ کام بھی ہوش صاحب نے قاضی صاحب ہی کے سپرد کیا۔ اور قاضی صاحب نے پھر اسی دوڑ دھوپ اور سرگرمی سے اپنا کام شروع کر دیا۔ بڑی بحث مباحثے کے بعد فانی وطن کی واپسی پر راضی ہوئے۔ اسباب بندھنے لگا اور ایک شام فانی بادلِ ناخواستہ اس مکان سے جس میں مرنا مقدر ہو چکا تھا آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے رخصت ہوئے۔ خاص خاص دوستوں نے رخصتی مصافحہ کر کے اُنھیں خدا حافظ کہا۔ مگر جس وقت سکندرآباد ریلوے سٹیشن پہنچے تو گرینڈ ٹرنک ایکسپریس جس پر جانا چاہتے تھے ان کو بے یار و مددگار چھوڑ کر دھواں اُڑاتی ہوئی ان کے سامنے سے بیگانہ وار نکل گئی۔

نوکری سے انکار

ریل گاڑی کی یہ بے اعتنائی دیکھ کر فانی کا دل ٹوٹ گیا۔ سمجھے کہ وطن کی واپسی قدرت کو منظور نہیں۔ یہیں رہنا، جبر سہنا اور یہیں مرنا ہے۔ یہ سفر بھی مارے باندھے کا ایک سودا تھا جو محض قاضی صاحب کے مضبوط دلائل سے مجبور ہو کر فانی نے منظور کیا تھا۔ ریل کا چھوٹ جانا ان کے ٹھہرنے کا بہانہ ہو گیا۔ مجبوری اور ناخوشی سے گھر چھوڑا تھا، شادا

دہاں واپس آ گئے۔ آتے ہی لڑکوں سے کہا کہ اسباب کھول دو۔ اب نہ جائیں گے۔ قاضی صاحب کو یہ حال [illegible] ہوا تو دوڑے ہوئے آئے اور سارا حال سن کر سناٹے میں آ گئے۔ فانی نے کہا "قاضی صاحب! اب ہمیں ہمارے حال پر رہنے دیجئے۔ تقدیر سے لڑنا آدمی کے بس کی بات نہیں" قاضی صاحب خاموش ہو گئے۔ مجھے یہ علم نہیں کہ جوش صاحب کو یہ رپورٹ قاضی صاحب نے کن لفظوں میں دی۔ مگر انھوں نے سارا حال سن کر یکایک گردنوں کے دونوں [illegible] جگہ ایسے چپ ہوئے کہ پھر کبھی اس کا ذکر تک نہ آیا۔ بات حسب معمول موٹر آئی اور فانی مجھے لیتے ہوئے بل فورٹ پہنچے۔ ڈنر ٹیبل پر بیٹھے تو میرے علاوہ یہ راز کسی کو معلوم نہ تھا کہ اگر اتفاق سے رزین مل گئی ہوتی تو فانی ہمیشہ کے لئے دربار کو خیرباد کہہ چکے تھے۔

فانی کو دربار سے گہری وابستگی تھی اور ان کا یہ تعلق خاطر بیجا بھی نہ تھا۔ شہزادۂ دکن کی خدمت میں بار پانا ہی بڑے فخر کی بات تھی۔ دکن کا ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونا۔ پھر دربار کے اندر کشش کے سامان اکٹھا تھے جو قسمت والوں ہی کے حصے میں آتے ہیں رہ گیا منفعت کا سوال، اس کا جواب شافی میری طرف سے یہ ہے کہ فانی کے ستارے ہی آخر عمر میں بہت خراب تھے بلکہ عجب نہیں کہ دو چار ہو جائیں رہے ہوں کیونکہ [illegible] ہر کام میں مخالفت کرتی تھی۔ یہ بات نہ ہوتی تو وہ منصفی ہی سے کیوں انکار کرتے جس کے [illegible] فائیڈ تھے۔

فانی کی پہلی غلطی تو یہی تھی کہ انھوں نے منصفی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ایسی عزت کی ملازمت جیسی حیدرآباد کی منصفی تھی۔ ملتی کسے ہے۔ دوسری سخت اور فاش غلطی ان کا اسراف تھا جس کے وہ عادی معلوم ہوتے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ آدمی چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتا ہے انھوں نے چھوٹی سی چادر میں پورے پاؤں پھیلا دیئے۔

سمجھنے کی بات ہے کہ ڈھائی سو تا چار سو کے گریڈ میں سیکڑوں ہی آدمی خاص شہر میں تعلیمات اور یونیورسٹی کے اندر کارگذار تھے۔ ہر شخص کے [illegible] اسی کے بال بچوں کا خرچ تھا۔ پھر کسی اور کو ان مشکلات کا سامنا کیوں نہ ہوا۔ جن سے فانی کی زندگی ان کے لئے وبال ہو گئی۔ جواب نہایت واضح اور صاف ہے کہ ہر شخص کے اخراجات اس کی آمدنی کے اندر تھے اور فانی کے بے انداز خرچ کا کوئی اندازہ ہی نہ تھا۔ پھر افراط و تفریط تو ہر حال میں بری ہوتی ہے۔ جوش کی ملازمت کی ابتدا بھی اسی گڑبڑ سے ہوئی تھی جس پر وہ کم و بیش دو برس کارگذار رہے۔ وہ کبھی قرض کے وبال میں نہ پھنسے۔ انھوں نے کبھی پرنس کی مصاحبت کی۔ نہ کبھی پرنس سے متوسل ہوئے۔ نہ جوش نے ان سے اس طرح کی توقع ہی رکھی۔

اعزازی مصاحبت کے معنی ہی یہ ہیں کہ دربار سے مصاحبت کو کوئی امداد نہیں ملتی۔ بلکہ ایمان کی پوچھئے تو ہم لوگ جن کا تعلق جونیئر پرنس کے دربار سے تھا۔ بادشاہ ذی جاہ کے مصاحبوں سے کہیں بہتر تھے۔ کیونکہ ہم لوگ ڈنر پرنس کے ساتھ کھاتے تھے۔ آرام دہ صوفوں پر بیٹھے تھے۔ ہمیں ننگے سر بیٹھنے کی اجازت تھی۔ ہم قیمتی سے قیمتی سگریٹ اور سگار پیتے تھے۔ ہمیں عید کی قیمتی شیروانیاں ملتی تھیں دربار میں چشم و نظر کی تسکین کے وہ وہ سامان مہیا تھے جن سے بہتر اس دنیا میں تو ممکن نہیں یہی حال گوش و سامعہ کی دعوت کا تھا۔ ہمارے لئے ہر رات شب برات سے زیادہ سہانی اور خوشنما آتی تھی۔

دربارِ شاہ

شاہ فلک بارگاہ کے مصاحبوں کو اس آسائش کا ایک عشر عشیر بھی میسر نہ تھا ان کے کھانے میں ایک ہی شے آتی تھی۔ وہ بھی سب کو روزانہ نہیں۔ بلکہ جس دن جس خوش نصیب کی باری آ جائے وہ لوگ ناشتہ کر کے گھر سے جاتے تھے۔ دوپہر کا کھانا گھر آ کر کھاتے تھے۔ یہی صورت دوسرے وقت کی مصاحبت کی تھی جا کے گھر سے پی کر دربار میں گئے۔ مغرب سے پہلے رخصت مل گئی کہ شام کا کھانا اپنے گھر کھائیں۔ بیٹھنے کے لئے ان کو کبھی ایک تپائی بھی نصیب نہ ہوئی جس طرح مقام میقات سے بعض چیزیں حاجیوں پر حرام ہو جاتی ہیں۔ بالتشبیہ یونہی آرام و آسائش کی تمام چیزیں شاہی درباریوں کو آستانہ مبارک پر پہنچنے کے بعد حرام ہو جاتی تھیں چونکہ ان میں سے اکثر سب امیر ابن امیر ہوتے تھے جنھیں بچپن میں آسائشوں کی [illegible] کی [illegible] دربار شاہی میں پہنچ کر انھیں اپنی طرح [illegible] جانے کے سامنے

درباری لباس میں پہروں کھڑے رہتے تھے۔ بتقاضائے فطرت کھانسی آنے پر پابند ہے۔ کھنکھارنا آدابِ دربار کے خلاف ہے کھانس نہیں سکتے۔ دم رد کے کھڑے ہیں۔ گلا گھٹ جارہا ہے لیکن دم نہیں مار سکتے۔ کھجلی بُری طرح ستائے ہوئے ہے۔ مگر کھجانا دربار میں جائز نہیں،... کھجا نہیں سکتے حوائج ضروریہ پر انسان و حیوان، کسی کو قابو نہیں جس کو جس وقت ضرورت محسوس ہو۔ مگر یہ درباری وہ بندگان مجبور ہیں کہ اس پر بھی قادر نہیں جب دربار سے چھوٹیں گے دیکھا جائیگا۔ پیٹ میں ریاح مچل مچاتیں یا قولنج کا دورہ پڑے مگر منہ سے اُف تک نہیں کرسکتے اتنا بھی تو ان کے امکان میں نہیں کہ کھڑے کھڑے ایک پاؤں ہی کو اُٹھالیں اسی لئے جب دربار سے چھوٹتے تو وہ راحت محسوس کرتے تھے جیسی راحت شاید ہی کبھی کسی مزدور کو مزدوری سے چھوٹنے کے بعد محسوس ہوئی ہو۔

نواب منظور جنگ بات میں بات نکلتی ہے۔ اس ضمن میں ایک لطیفہ سنئے۔ ایک شام کہیں کاچی گوڑہ ریلوے سٹیشن سے بائیسکل پر واپس آرہا تھا سرِ راہ نواب منظور جنگ کا مکان تھا۔ اتفاق سے نواب ممدوح سامنے ہی برآمدے میں مونڈھے پر بیٹھے تھے دور ہی سے صاحب سلامت ہوئی۔ میں عرصے سے ملا بھی نہ تھا۔ کوٹھی کے اندر چلا گیا پاس جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خادم ان کے پاؤں نواڑ سے کس رہا ہے گمان گذرا کہ شاید کوئی سخت عارضہ لاحق ہوا ہے خیر و عافیت پوچھی۔ تو انھوں نے کہا "الحمدللہ اچھا ہوں" میں نے پاؤں کسوانے کا سبب دریافت کیا تو ہنس کر کہنے لگے "ابھی ابھی دربار سے چھوٹا ہوں۔ تین گھنٹے مسلسل کھڑے کھڑے پنڈلیوں میں تشنج پیدا ہوگیا نواڑ کی یہ بندش اسی تشنج کا علاج ہے" اس دریافت پر میں ہنسنے لگا۔ تو خود بھی ہنسنے لگے۔ پھر بولے کہ "دو وقت کی یہ مقررہ مشقت اب ناقابل برداشت ہوگئی ہے مگر کاتبِ تقدیر کا لکھا آدمی مٹا بھی تو نہیں سکتا۔"

منظور جنگ دہلی یا اس کے قرب و جوار کے رہنے والے اور بہت دلچسپ انسان تھے۔ بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے مخلص دوستوں میں ان کا شمار تھا۔ ملازمت کے زمانے میں کسی ضلع کے تعلقہ دار اوّل (کلکٹر) تھے۔ منظور احمد نام تھا ہنوز خطاب سے سرفراز نہ ہوئے تھے اس لئے دستخط کرتے وقت صرف منظور لکھنے کی عادت تھی۔ اس دستخط نے ان کی کلکٹری کے زمانے میں عجیب عجیب پیچیدگیاں پیدا کیں مثال کے طور پر انھوں نے کسی کاغذ پر دستخط کئے۔ سائل پیشکار سے کہتا ہے "میری درخواست پر منظوری کا حکم موجود ہے احکام میرے موافق جاری کیجئے" پیشکار کہتا "بھائی یہ تو بڑے صاحب کے دستخط ہیں۔ حکم تمہارے خلاف لکھا ہے" بالآخر دونوں جھگڑنے لگتے۔ جب آئے دن اس قسم کے جھگڑے پیش آنے لگے۔ تو منظور جنگ رفعِ فساد کی خاطر اپنا پورا نام منظور احمد خاں لکھنے لگے۔

فانی کی تیسری غلطی مہاراجہ بہادر کے یہاں کی حاضرباشی میں کمی تھی۔ اگر فانی ان کے یہاں کی حاضرباشی میں کمی نہ کرتے تو مہاراجہ ایسے پابند وضع اور مروت کے پتلے تھے کہ فانی کا مقررہ الاؤنس کبھی بند نہ کرتے مگر باوجود نیک نفسی اور بے شمار خوبیوں کے، جن کی وجہ سے وہ تمام دکن کے امراء میں ممتاز تھے۔ تھے تو آخر انسان ہی جب انھوں نے فانی کو اپنی طرف سے بے پرواہ دیکھا تو درماہانہ کا وہ الاؤنس جو ان کی سرکار سے فانی کو ماہ بہ ماہ اب تک ملے جاتا تھا، بند کردیا۔

اب فانی کی کوئی مقررہ آمدنی نہ رہ گئی سوائے اس کے ہیڈماسٹری کی وہی نصف تنخواہ تھی جو رخصت کے زمانے میں الاؤنس رخصت کے نام سے کبھی چھٹے چھ ماہے مل جاتی تھی۔ مگر وہ سب کی سب قرضخواہوں کی نذر ہوجاتی تھی۔ کیونکہ غلہ، گوشت، ترکاری، جلانے کا تیل، لکڑیاں ہر چیز قرض ہی آتی تھی۔ آفریں ہے ان قرض دینے والوں پر جو مہینوں مہینے ضروریاتِ زندگی کی ہر شئے بلاعذر ان کے لئے مہیا کرتے تھے یا تعریف کے قابل ہے... فیروز علی خاں ہیں (فانی کے چھوٹے بیٹے) جو ہر چیز اُدھار لے آتے تھے موٹر اب بھی فانی کے پاس تھی۔ ڈرائیور کی تنخواہ چڑھتی جاتی تھی۔ پیٹرول کے دام بھی، جو ہر چیز کی طرح قرض ہی آتا تھا، بڑھتے بڑھتے کہاں سے کہاں پہنچ گئے تھے۔

عالم علی خاں اس نازک وقت میں نہ جانے کس فرشتۂ غیبی نے ان کا حالِ زار مسٹر عالم علی خاں ملنگ سے بیان کیا۔ جو اس وقت ہائی کورٹ [illegible]

جج کے معزز عہدے پر فائز تھے مرحوم فانی کے تمام و کمال
حالات سُن کر نہایت متاسف اور بے حد متاثر ہوئے۔ عدالت
ابتدائی ان کے سپرد تھی اور کمیشن اسی عدالت سے جاری ہوتے
تھے۔ انھوں نے فانی کو کمیشن دینا شروع کئے۔ اس طرح فانی
کو کبھی تین سو کبھی چار سو ماہانہ ملنے لگے۔ مسٹر عالم علی خان فانی کے
دُور کے عزیزوں میں تھے۔ نہ ان سے اور فانی سے قریبی تعلقات
تھے۔ نہ آنا جانا یا ملنا جلنا تھا۔ یہ ہمدردی انھوں نے محض اس اخوت
کی بنا پر کی تھی۔ جو علیگ ہونے کی وجہ سے ہر علی گیرین کو دوسرے
علی گیرین کے ساتھ ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس جذبے میں خدا ترسی اور
ادب نوازی کو بھی دخل ہو۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے
ایک ڈوبتے ہوئے بے سہارے آدمی کو کچھ دنوں کے لئے غرق ہونے
سے بچا لیا۔ اس وقت بھی مرتبع تھا کہ فانی موٹر نکال
دیتے تو ڈرائیور کی تنخواہ اور پٹرول کے مصارف سے بچ جاتے
اس لئے کہ اسکول کی آمد و رفت کا اب سوال ہی نہ تھا اور
... ابھی مقصد کے لئے انھیں موٹر کی ضرورت محسوس ہوئی
تھی مگر فکر انجام تو انھیں آئی ہی نہ تھی۔ کمیشن کی یہ آمدنی
کوئی مستقل آمدنی نہ تھی جس دن عالم علی خاں صاحب کا
عدالت ابتدائی سے تبادلہ ہو جاتا۔ اسی دن کمیشن موقوف
ہو جاتے مگر فانی اس عارضی فائدے پر ایسے مطمئن تھے گویا
وہ کوئی دوامی منصب ہے جس کے نہ ملنے کا کبھی کوئی امکان
ہی نہیں۔ یہ وہ سنبھالا تھا جو مرنے سے کچھ پہلے ہر بیمار لیتا
ہے یا صبح کے چراغ کی یہ وہ روشنی تھی جو بجھنے سے کچھ پہلے زیادہ
تیز ہو جاتی ہے۔

نواب شہید یار جنگ شہید جو دکن کے خوش گو شاعر
اور صاحب خیر امیر ہیں اس وقت دربار سلطانی کے رسوخ و اثر
سے مرجع خلائق بنے ہوئے تھے پرنس بھی ان پر پورا اعتماد کرتے
تھے۔ ان سے فانی کی خستہ حالی نہ دیکھی گئی انھوں نے بار بار پرنس
کو توجہ دلائی۔ حتیٰ کہ پرنس فانی کی امداد پر آمادہ ہو گئے اور ایک
دن وقت نکال کے بھائی (ولی عہد سلطنت) کے پاس گئے جو افواج
کے اعزازی سپہ سالار تھے اور نظم جمعیت کے ناظم تھے۔ ان کی
مددگاری میں دو سو تا چار سو کی ایک جگہ اتفاق سے زیر انتظام تھی

پرنس نے بھائی سے اسی جگہ پر فانی کو مامور کرنے کی سفارش
کی۔ بڑے بھائی نے بہ کمال شفقت پرنس سے کہا۔ بھائی جو چیز
میرے اختیار کی ہو اس کے تم خود مختار ہو۔ اس میں سفارش
کیسی۔ قدرت نواز جنگ سے کہہ دو وہ فانی کا تقرر کر کے
مسل میرے پاس بھیج دیں۔ میں منظوری دے دوں گا۔"

ایک بوڑھے شاعر کے لئے یہ جگہ خدائی انعام سے
کم نہ تھی۔ گھر بیٹھے چار سو روپے مہینے کا منصب تھا۔ محکمہ ایسا
تھا جس میں خود ناظم کے لئے کوئی کام نہ تھا۔ مددگار کے لئے
آرام دہ کمرے میں فرصت سے بیٹھ کر پان کھانے یا شعر کہنے
کے علاوہ کیا مشغلہ ہوتا۔ فانی کی بدقسمتی ان سے اگر یہاں
بھی انکار نہ کرواتی تو ڈنر پرنس کے ساتھ کھاتے تھے لنچ قدرت
نواز جنگ کے ساتھ کھایا کرتے۔ بقیہ کام ایسا زحمت طلب
نہ تھا۔ جو فانی کے بس سے باہر ہوتا۔ مجھے نواب قدرت نواز جنگ
کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن جس شان
سے وہ رہتے تھے اس سے اس کا اندازہ لگانا کوئی دشوار نہیں کہ پرنس
کے اور ان کے خاصے میں تھوڑا ہی سا فرق ہوتا ہوگا۔ فانی ان کی ماتحتی
میں آخر عمر تک آسائش سے رہتے۔

یہ واقعہ یعنی پرنس کی مجوزہ جگہ سے فانی کا انکار جس
طرح پیش آیا مجھے حرف بہ حرف اسی طرح بیان کرنا ہے۔

فانی اور شہزادہ

ایک دن سہ پہر کو میں بورڈنگ
ہاؤس کے حسابات چیک کر رہا تھا منشی جی (جن پر اللہ
کی رحمت ہو) سامنے کھڑے تھے۔ ناگاہ خلافِ معمول ہل فورٹ
کی موٹر آگئی۔ ڈرائیور نے موٹر سے اُتر کر اطلاع دی "آپ
کی فوراً یاد ہوئی ہے۔ پانچ منٹ کے اندر تیار ہو جائیے۔ میں
فانی صاحب کو لیکر آتا ہوں" میں گھبرا کر کرسی سے اُٹھ کر
کھڑا ہو گیا۔ منشی جی کہنے لگے آج یہ وقت سے پہلے یاد کیسی؟" میں
نے عجلت میں جواب دیا۔ "غالباً سرکار کہیں سنیما جانے کا قصد
رکھتے ہوں گے۔" ٹھیک ۵ منٹ میں فانی آگئے اور میں درباری
لباس میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ راستے میں میں نے فانی
سے کہا۔ شاید سرکار آج سنیما جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ فانی بولے

"یہ بات نہیں۔ بلکہ یہ قصہ ہی دوسرا ہے۔ آج سرکار نے مجھے نظم جمعیت کی مددگاری کا آفر بھیجا تھا جسے میں نے نامنظور کیا! چونکہ یہ ایک بڑی گستاخی تھی مجھے اس وقت تنبیہہ کی خاطر بلایا ہے"! میں نے گھبرا کر کہا "آپ کو تنبیہہ کی خاطر بلایا ہے۔

تو مجھے کس غرض سے طلب فرمایا ہے؟۔ فانی کہنے لگے تم کو عبرت حاصل کرنے کے لئے تاکہ تم کبھی اس طرح کی گستاخی کے مرتکب نہ ہو! بات یہیں تک پہنچی تھی کہ موٹر بل فورٹ گیٹ میں داخل ہوئی۔ ہنوز عصر کا آخری وقت باقی تھا۔ ڈرائیور نے موٹر محل کی بیرونی سیڑھیوں کے قریب کھڑی ہی کی تھی کہ پرنس خود گیلری میں تشریف لے آئے۔ ہم لوگ موٹر سے بہ عجلت کود کے آداب بجا لائے۔ اور ان کے ساتھ ہو لئے۔ پرنس ہم دونوں کو لئے دربار میں پہنچے۔ جہاں اس وقت ہال کے بیچ میں ایک بیش قیمت میز بچھی ہوئی تھی۔ میز کی ایک جانب پرنس خود کھڑے ہو گئے دوسری طرف ہم دونوں تھے۔

ناظرین چشم تصور سے اس موقع کی تصویر ملاحظہ فرمائیں دن کا وقت ہے، ہم لوگوں اور پرنس کے درمیان صرف ایک میز کا فصل ہے نہ میں فانی کو کسی طرح کا اشارہ کر سکتا ہوں نہ انھیں کہنی مار کر کسی غلط بات سے روک سکتا ہوں۔

پرنس :۔ فانی! مجھے معلوم ہوا کہ تم نے میرے آفر کو ٹھکرا دیا۔

فانی (دست بستہ ہوکر) سرکار! واقعہ یوں ہے کہ میرے لئے یونیورسٹی میں ساڑھے تین سو تا چھ سو کی ریڈری طے ہو چکی ہے۔ اسی مہینے کے آخر میں میرا اس جگہ پر تقرر ہو جائے گا۔ دو سو تا چار سو کی جگہ قبول کرنے میں میرا سراسر نقصان ہے!

پرنس :۔ کیا یونیورسٹی کونسل نے اپنی کسی میٹنگ میں تمہارے تقرر کا فیصلہ کر لیا ہے؟

فانی :۔ نہیں سرکار، یونیورسٹی کونسل نے اس قسم کا ابھی کوئی فیصلہ تو نہیں کیا۔ مگر مجھ سے ایک مقتدر اور ذمہ دار عہدے دار نے حتمی وعدہ کر لیا ہے۔"

یہ بے تکا جواب سن کر، جو سراسر دانائی کے خلاف تھا، میرا دل دھڑکنے لگا مگر اس وقت فانی کی طرف دیکھنے کا موقع بھی نہ تھا۔ میں صورت تصویر پرنس کے سامنے کھڑا رہا۔

پرنس :۔ آخر اس مقتدر اور ذمہ دار عہدے دار کا کچھ نام بھی ہے؟"

فانی (قدرے فخریہ لہجے میں) "نواب مہدی یار جنگ بہادر" اب قریب تھا کہ میں غش کھا کر گر پڑوں۔ بہ مشکل میں نے اپنے کو سنبھالا۔ کیونکہ میں نواب ممدوح اور ان کے وعدے کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف تھا۔ ادب برائے ادب کی طرح ان کا وعدہ بھی وعدہ برائے وعدہ ہوتا تھا۔ سال میں وہی ایک وعدے شرمندۂ وفا ہوتے تھے اور ہزاروں وعدے اس تابناک خواب کی طرح تھے جو ابتدائی شب میں دکھائی دے اور کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو۔

نواب کا ادبی ذوق شہر بھر میں مشہور تھا۔ مجھ پر اور جوش پر خاص عنایت تھی بلکہ ہم دونوں پر ان کے احسانات بھی تھے (اللہ آخرت میں بھی ان کے [illegible] زندگی شان و شوکت سے بسر کر گئے۔ وہ وہ اہم قلمدان ان کے سپرد رہتے تھے۔ صدارت، سیاسیات، وزارت تعلیمات کبھی وزارت فنانس اور تعلیمات اعلیٰ حضرت سلطان دکن کے معتمد علیہ تھے۔

جس وقت کا یہ ذکر ہے اس وقت فنانس اور تعلیمات کی وزارت تفویض تھی [illegible] ملک بھر میں مستند تھی مگر ساتھ ہی ساتھ [illegible] ان سے بھی خاص و عام کی [illegible] مزاج، بذلہ سنج اور لطیفہ گو تھے۔

مجھے پہلی ہی ملاقات میں یہ لطیفہ سنایا تھا: قارئین بھی لطف اندوز ہوں ——

(جاری ہے)

سکتی ہوں تیری ڈکیتی تیرے خاندان تک کی جان لے سکتی
ہوں۔ ہاتھوں کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کستوری
بولی۔ دوسرے کمرے میں بیٹھے نیک سنگھ کو بھی بھنک پڑ رہی تھی
مگر وہ بے بس تھا۔ کسمسا کر رہ جاتا تھا۔

"وہ کون سا ہتھیار ہے دنیا میں بھی دیکھوں" گوکل ہاتھ
چھوڑتے ہوئے بولا۔

"بد دعا" ہانپتے ہوئے بولی۔

"ارے واہ۔ مان گئے تمہارے ہتھیار کو ہارے ہوؤں کا یہی ہتھیار
ہوتا ہے کستوری رانی" یہ کہتے ہوئے اس نے پھر اس کو باہوں میں بھینچ
لیا اور رخساروں کا بوسہ لینے کو ہونٹ بڑھائے کستوری نے اپنا
منہ اس سے بچا لیا۔ اور کئی بار اسی طرح اس کی کوشش بے کار گئی
وہ بوسہ نہ لے سکا ایک بار اس نے پھر ہاتھ چھوڑ دیئے اور پلنگ پر
بیٹھ گیا۔ "کستوری میں تم کو خود راضی ہو جانے کے خیال سے آزاد
کر کے شکست مان کر بیٹھ گیا ہوں ورنہ جانتی ہو تم اپنے پھول
سے گال خود میرے ہونٹوں پر رکھ دو گی عورت آدمی کے مقابلے
کی طاقت ہی کہاں رکھتی ہے" اس طرح کہہ کر گوکل نے چاقو چمکایا
"گوکل تو اس چاقو سے مجھ کو جیت نہیں سکتا۔ مجھے جیتنے کے
لئے تم میں ہمت ہی نہیں ہے" ہونٹ بھینچ کر کستوری نے کہا۔ نیک
سنگھ کے کانوں میں کستوری کے بے خودداری میں سرشار یہ الفاظ
پہنچے تو اسے کستوری پر فخر ہوا۔ پل بھر کو نیک سنگھ کے بازو تنے
مٹھیاں سخت ہوئیں مگر کواڑیں بند تھیں وہ وہیں سہم گیا
اور دروازے کی درازوں سے باتیں سنتا رہا۔

"تجھے جیتنے کا کون سا گر میرے پاس نہیں؟" اپنے آپ دم خم
پیدا کرتے ہوئے گوکل نے کہا۔

"پیار"

"پیار؟ ہے ہے یہ تو چھوٹی سی بات ہے عورت مرد کے جسم
میں طاقت اور اس کی جیب میں دولت چاہتی ہے۔ یہی دونوں
اس کو بہلاتے ہیں"

"یہ عورت کی نہیں رنڈی کی خصلت ہے طوائف کے
اوصاف ہیں۔ اگر یہ ہتھیار میرے پاس ہوتا تو میری شادی
تیرے ساتھ ہوتی لیکن تو نے میرے ساتھ شادی کرنے
کے لئے میرے پتا جی پر غنڈوں کا اثر ڈالا جس سے تیرا بنا بنایا
کام بگڑ گیا۔ اگر تو پیار سے میرے پتا کو متاثر کرتا تو میری
شادی تیرے ساتھ کر دیتے تھے۔ ابھی سنکر ہی ذکر تے کستوری
کی سانس پھول رہی تھی ماتھے پر پسینہ جھلک رہا تھا دوسرے
کمرے میں نیک سنگھ کو بھی یہ بھنک پڑ رہی تھی اور وہ حقیقت
پہلا پہلا جاننے نے چکا تھا اب وہ سب کچھ جان گیا تھا کہ یہ سب
کچھ کیا ہے اور کیوں ہے۔

"اچھا کستوری تم نے مجھے کتا تو کہا ہے میں بھی تم کو کتیا بنا کر
ہی چھوڑوں گا" کہتے ہوئے اس نے چاقو کی نوک پلنگ کے پائے
میں گاڑ دی اور دونوں ہاتھ اس کے ناہموار گداز سینے کی طرف بڑھائے
اور نیچے کو جھکا کر کستوری نے اس کے دونوں کان سختی سے پکڑ لئے "اب
یہ بات ہے گوکل سے قیمتی چیز میرے ہاتھوں میں ہے"

"تیرے ہاتھ میں۔ کیا یہ ٹکے ہیں اور میرے ہاتھوں میں تیری
آبرو ہے نیچ" پل بھر کو کستوری ڈھیلی ہو گئی اس نے کچھ سوچا گوکل
حالات اپنے موافق سمجھتے سمجھ کر اس کے سینے سے الگ ہو گیا اور جھٹکا
مار کر کان چھڑا لئے "کستوری زبان کی بہت تیز ہو" پیر کی طرف ہاتھ
بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ کستوری نے ساری طاقت بٹور کر دونوں
ٹانگیں سمیٹیں۔ گوکل کو اس انداز میں کوئی خوشی کا پہلو ابھرتا نظر آیا۔
اور وہ اپنے حساب سے سوچتا رہا مگر کستوری نے دونوں لاتیں کس کر اس
کے نازک حصوں پر دے ماریں اور وہ غلیل کے غلے کی طرح نیچے جا گرا۔ کستوری
نے پائے میں گڑا چاقو نکالنے کی کوشش کی مگر وہ اس کوشش میں ناکام
رہی اتنی ہی دیر میں ظالم نیچے سے اٹھ کر پھر پلنگ پر چڑھ گیا اور
کستوری کے ہاتھ سے چاقو لے کر بولا "تم بھی جیت کے لئے اسی ہتھیار
کا سہارا لینے لگیں۔ یہ تو ہماری جیت کا ذریعہ ہے ہماری جیت کا
ہتھیار تو یہی ہے کہ بد دعا کا استعمال بند کرو" کہتے کہتے اس نے
ساڑھی کھینچنا شروع کر دی۔ کستوری سارا کام بگڑتے ہوئے دیکھ کر [illegible]
کا دم پھول رہا تھا اور اپنی کوشش میں ناکام ہوتی چلی جا رہی تھی۔
اس کے بال بکھرے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے مرد کے [illegible]
کا مقابلہ عورت کے نازک ہاتھ [illegible]
جسم سے ساڑھی الگ کر کے زمین پر [illegible]
[illegible] ابھی کیا ہے [illegible]

ہے" گوکل نے بھی بھیگی نظروں سے اور رکشے والے نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پاگل خون خون چلاتے جا رہا تھا۔ ایک اینٹ رکشے کے پہیئے کے نیچے آگئی اور اس کا توازن بگڑ گیا۔ پہیے کا رخ اچانک گھوما ہوا اور تیزی سے رکشہ الٹ گئی پیچھے سے چلے آرہے تیز رفتار ٹرک کو ہونے والے اچانک حادثے سے سنبھال نہ سکا اور بہت جلد بریک لگے اور ٹرک سڑک پہ پڑے ماں بیٹے کو کچلتا ہوا نکل گیا۔ پاگل پھر چلایا "خون خون"۔ اب کسی نے بھی اسکی آواز نہیں سنی تھی مگر وہ برابر چلائے جا رہا تھا۔

"بابو جی میری تو کوئی خطا نہیں ہے" بالو جو رکشہ کھینچنے والا گڑگڑا رہا تھا۔

"واقعی تیری کوئی خطا نہیں ہے" دونوں لاشوں کو غور سے دیکھتے ہوئے گوکل نے کہا۔ رکشے والا ایک طرف گھبرایا ہوا کھڑا تھا اور راہ گیر اکٹھے ہو گئے تھے سب کی نظریں ماں بیٹے کی لاشوں پر تھی اور گوکل دیکھ رہا تھا پاگل کی طرف۔

گوکل کو کشوری کی بددعا یاد آرہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ اس دور کے دروپدی کی بددعا بھی اثر رکھتی ہے۔

غزل

عروج زیدی

آپ کی چشمِ کرم مجھ کو رلاتی ہے
یاد آتی ہے تو پہروں مجھے تڑپاتی ہے

بے تکلف یہ مرے پاس چلی آتی ہے
جیسے ہر ساعتِ غم میری ملاقاتی ہے

ان کے اندازِ تغافل پہ یہ چھا جاتی ہے
کششِ عشق میں اک قوتِ اثباتی ہے

سبھی پتھر نہیں ہوتے ہیں جواہر والے
روحِ بالیدہ بھی توفیقِ وفا پاتی ہے

جو کبھی سینۂ طوفاں پہ چلا کرتی تھی
آج وہ ناؤ حبابوں سے بھی ڈر جاتی ہے

ہائے تقدیر کہ دل ٹوٹے تو آواز نہ ہو
جام چٹخے بھی تو جھنکار بکھر جاتی ہے

مستقل منتظرِ دید ہے چشمِ مشتاق
صرف میں کیا مری تصویر بھی جذباتی ہے

پُر شکن یوں بھی ہے سلگتا ہوا بستر لیکن
جب وہ یاد آتے ہیں تو نیند کہاں آتی ہے

شرطِ انصاف نہیں ہے کہ جہنم کہہ دوں
زیست شعلے ہی نہیں پھول بھی برساتی ہے

اب مرا نغمہ بہ تنہائی ہے اس منزل میں
زرد پتوں کو ہر اک شاخ بھی ٹھکراتی ہے

لوگ تاریک مکانوں میں بھی آسودہ ہیں
روشنی شہر کی آوارہ نظر آتی ہے

ان کو معلوم ہے [illegible]
ایک شعلہ ہے [illegible]

جناب عارف بیابانی حیدرآباد دکن

شانِ ہند کی یہ روایت رہی ہے کہ تعریفی خطوط۔ نظمیں۔ قطعات ہرگز شائع نہ کئے جائیں۔ کیونکہ اگر شانِ ہند کسی وجہ سے تعریف کے قابل ہے تو ایسا ہونا ہی چاہئے یہ کسی کا احسان نہیں ہے۔ اور اگر کسی کو مدیر شانِ ہند کی تحریریں پسند ہیں تو یہ راقم کی حوصلہ افزائی ہے۔ مگر اپنی تعریف میں خطوط۔ مضامین یا شعری تخلیقات شائع کر کے شانِ ہند کے صفحات ضائع کیوں کئے جائیں۔

مگر اب کی بار ہم اس روایت کو توڑنے پر مجبور ہوئے۔ جناب عارف بیابانی حیدرآباد دکن نے ذیل کی مسدس میں بلاشبہ شانِ ہند اور اس کے مدیر کی تعریف فرمائی ہے۔ آپ کو یا مجھ کو اس سے اتفاق ہو یا نہ یہ دوسری بات ہے مگر عارف بیابانی صاحب کی شاعرانہ صلاحیتوں کی عظمت کا احساس اس "مسدس" کو پڑھنے کے بعد یقیناً قاری کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور یہی احساس اس "مسدس" کی اشاعت کا محرک ہے۔ اس مسدس کی اشاعت سے یہ باور کرانا بھی مقصود ہے کہ ملک میں کیسے کیسے باکمال شاعر پڑے ہوئے ہیں اور ہمارے رسائل و جرائد کے مدیرانِ کرام ان شعراء کے کلام کی اشاعت میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ کیونکہ یہ بیچارے نہ تو کوئی گروپ رکھتے ہیں اور نہ ہی مالی طور پر اتنے خوشحال ہیں کہ مدیرانِ کرام ان سے مرعوب ہوں۔ شانِ ہند نے ہمیشہ نئے لکھنے والوں اور اس قسم کے باکمال شعراء کو متعارف کرایا ہے۔ عارف بیابانی صاحب کے شکریہ کے ساتھ یہ مسدس انتہائی اختصار کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے (سرور تونسوی)

اردو ماہنامہ "شانِ ہند" دہلی

پیغامِ تازگیٔ گلستانِ ہند ہے　　ارفع ہے شان اس کی جو شایانِ ہند ہے
جو اس کی پالیسی ہے نگہبانِ ہند ہے　　ہے اسم با مسمٰی بھی اور شانِ ہند ہے
راہوں کی مشکلات کو آساں بنا دیا
ہر خار رہ کو حسنِ گلستاں بنا دیا

علم و عمل کی شمع کی تابندگی بھی ہے　　روشن ہوں راہیں ایسی درخشندگی بھی ہے
ہے استقامت اس میں تو پائندگی بھی ہے　　یکجہتی بھی ہے اپنی نمائندگی بھی ہے
مرحلہ منزلوں سے ہر قطرۂ نظر [illegible]
ایسی مبارک کوشش [illegible]

مشاعرہ باڑمیر

(بے چین شفق [illegible])

راجستھان کا علاقہ پارلیمانی باڑمیر جیسلمیر تین سو میل لمبا اور دو سو میل چوڑا ہے۔ دُنیا بھر کے کسی ملک میں بھی اتنا طویل و عریض حلقۂ پارلیمانی نہیں ہے یا دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا یہ پارلیمانی حلقہ ہندوستان کے ایک صوبہ کیرل کے اجتماعی رقبے کے برابر ہے۔ راجستھان میں ہندوستان اور پاکستان کی سرحدیں بھی یہیں ملتی ہیں اور یہ علاقہ پارلیمانی اس سلسلے میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا کہ دُنیا بھر میں سب سے بڑا گاؤں شندر پور بھی اسی علاقے میں ہے جس کی لمبائی پندرہ میل ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کی آبادی والے اس علاقے میں مشاعرہ کے تصور سے بھی کوئی واقف نہیں ہے بلکہ وہاں پہاڑیوں سے گھرے ہوئے اس قصبے میں جہاں میلوں تک پانی نہیں ملتا اور جو زرعی لحاظ سے خشک اور بنجر ہے وہاں اُردو کی آبپاشی اور اُردو مشاعرہ کی تخم ریزی واقعی ایک معجزے سے کم نہیں ہے سید لیاقت علی ترنم گنگاپوری واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جن کی شبانہ روز کوششوں سے ۱۰؍ مئی ۸۶ء کی رات کو ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ جب مشاعرے کا اعلان کیا گیا تو شندر پور کے باشندے حیرت سے ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ یہ کاہے کا "مشاعرہ" ہو رہا ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ گانے والوں کی منڈلی آئے گی کوئی کہتا کہ بھجن گانے والے بلائے گئے۔

شندر پور کے ہائی سکول میں شامیانے لگائے گئے ہیں اور روشنی کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہے۔ گاؤں کے لوگ فرش پر اور کچھ کھلے میدان میں آ آ کر بیٹھ رہے ہیں رات کے دس بجے پنڈال اور میدان سامعین سے ہاؤس فل کا نقشہ پیش کر رہا ہے۔ مشاعرے کے سرپرست شری ایس ایس مہتہ (آئی۔ پی۔ ایس) مشاعرے کے کنوینر جناب سید زادہ لیاقت علی ترنم گنگاپوری انسپکٹر کوآپریٹو بنک۔ اور مہمانِ خصوصی جناب سید طاہر علی صاحب ڈپٹی رجسٹرار راجستھان [illegible] جودھ پور سے بھی تشریف فرما ہیں۔ ترنم صاحب نعت شریف کی صدارت کے لئے جناب شیخ [illegible] کلکٹر باڑمیر کے نام کا اعلان کیا جس کی تائید تالیوں سے کی گئی ہے۔

ترنم صاحب نے شعرائے کرام کی فہرست بنانا شروع کی تو اسٹیج پر بیٹھے ہوئے شعراء میں سے جب ایک صاحب سے نام اور تخلص دریافت کیا گیا تو وہ صاحب فرمانے لگے جناب میں طبلہ بجانے والا ہوں طبلے کی جوڑی اسٹیج کے نیچے رکھی ہے جب بھی آپ فرمائیں گے اپنا ہنر دکھانا شروع کر دوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی گانے والا اپنے ساتھ سازندے نہ لایا ہو تو اس لئے میں بھی حاضر ہو گیا ہوں۔ تاکہ بوقتِ ضرورت خدمت بجا لاؤں اس پر اسٹیج پہ بیٹھے حضرات کا قہقہوں سے بُرا حال ہو رہا تھا۔ بہرکیف اس خوشگوار ماحول میں مشاعرے کا آغاز جناب عاشق گنگاپوری نے نعت پاک سے کیا اب ترنم صاحب نے بطور اناؤنسر شندر نگر کے ہی ایک شاعر سے کلام سنانے کو کہا ہے۔ جنہوں نے اپنی غزل رواں دواں سنا کر گلو خلاصی کرائی ہے۔ اب جناب راکیش گاندھی مائک پر آئے اور بہت ہی اچھے ترنم سے مارواڑی زبان میں ایک گیت سنایا ہے جو میرے پلے تو پڑا نہیں مگر سامعین نے خوب خوب داد دی ہے۔ اناؤنسر نے جناب ح۔ ق۔ نظام جودھپوری کو زحمتِ سخن دی ہے۔ نظام صاحب محض اپنے نام کے باعث اسٹیج پر بیٹھے حضرات سے معمولی سی داد پا سکے۔ نظام صاحب کے بعد مہمان شاعر عزیز ارمان بابانوی تشریف لائے ہیں آپ جس قدر بزرگ ہیں اتنا ہی ترنم بھی اچھا ہے۔ شعر فرمایا ہے

کدورت دل میں رکھ کر پیار کا اظہار کرتے ہو
[illegible] مشقِ ستم یہ خوب [illegible] کرتے ہو
نہ ڈھب سے جینے دیتے ہو [illegible]
ذرا بھی تم ہی دیتے ہو [illegible] پیار کرتے ہو

جناب رس گا صاحب نے نہایت بہترین ہندی گوبیت سنا کر خوب داد بٹوری ہے۔

اب ترنم صاحب نے اعلان فرمایا ہے کہ اس مشاعرے میں یوپی کے ایک بزرگ شاعر جناب محمد حنیف صاحب ساحر شفائی مفرودی تشریف فرما ہیں۔ لہٰذا پہلے دور کا اختتام ان کے کلام بلاغت نظام سے ہوگا۔ لیجئے جناب ساحر شفائی مائیک پر تشریف لے آئے ہیں اور ارشاد فرما رہے ہیں ؎

کسی کے ستم کو ستم کیسے کہہ دیں
فسانۂ رنج و اَلم کیسے کہہ دیں
وہ ہیں بے وفا یہ تو سب جانتے ہیں
مگر بے وفا ان کو ہم کیسے کہہ دیں

داد کا ایک طوفان ہے کہ تھمنے میں نہیں آرہا ہے۔ قبلہ ساحر نے دوبارہ دہرایا ہے اور حسب سابق داد پانے کے بعد فرماتے ہیں ؎

گھٹ گئی اور غریبوں کے لہو کی قیمت
جب سے دولت کے پسینے پہ گرانی آئی
خونِ مزدور جوانی میں بھی ٹھنڈا ہی رہا
اہلِ دولت کے بڑھاپے پہ جوانی آئی

اس کے بعد ساحر صاحب نے ایک طویل نظم جس کا ٹیپ کا مصرع ہے کہ " نہ تم مسکراتے نہ یہ بات ہوتی " سنا کر بے مثال داد پائی۔

رات کے تین بجے مشاعرے کا پہلا دَور ختم ہوا ہے۔ اور دوسرا دَور جس میں شعراء نے اپنی مرضی سے کلام سنایا اور جی بھر کے داد پائی۔ صبح چار بجے مشاعرے کے اختتام کا اعلان کیا گیا۔

سرزمینِ باڑمیر (راجستھان) میں یہ پہلا موقع ہے کہ اردو مشاعرہ منعقد ہوا اور اس کے لئے جناب ترنم کو جس قدر بھی مبارکباد پیش کی جائے کم ہے۔

جس نذرکت فاروق بنارسی

ماڈل گرل

راحیل میں جانتی تھی کہ تم میرے بچے جانے کے بعد خوش ہوگے میں نے اپنا سب کچھ اس لئے نہیں چھوڑا تھا کہ تم مجھے صرف ایک ماڈل گرل بنا کر رکھو اور جب مجھے خوب شہرت عزت حاصل کر لوگے تو مجھے دودھ کی مکھی کی طرح الگ کر دوگے۔ تم آج جو کچھ ہو صرف میری وجہ سے ہو۔ تمہاری چاہ میں میں نے اپنے گھر بار اور والدین تک کو چھوڑ دیا۔ میں ماڈل گرل نہیں بننا چاہتی تھی لیکن تم خود سوچو گھر سے نکلنے کے بعد کیا کرتی سوچا ٹھیک ہے تم جو کہتے چلے آئے ہو کہ خوب پیسہ کما لوں تب شادی ہو۔ اسی امید پر اب تک رہی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم میرے سپنوں کو بکھیر کر رکھ دوگے۔ تم تو بڑے لالچی نکلے تم عورت کو اتنا کمزور نہ سمجھو وہ جب پیار کرتی ہے تو اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے لیکن جب انتقام لینے پر آتی ہے تو ناگن بن جاتی ہے۔ تمہارا وہ خط جو تم نے اپنے دوست کو تین ماہ پہلے لکھا تھا وہ میرے ہاتھ پڑ گیا تھا جس میں تم نے لکھا تھا " دوست ماڈل گرل سے شادی کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں نے تو محض روپیہ کمانے کے لئے یہ سب کچھ کیا ہے اب وقت آگیا ہے شہرت اور دولت سب کچھ میرے پاس ہے نادرہ کو میں پندرہ بیس ہزار دے دوں گا اس کی کٹ جائے گی میرا سپنا تو ایک ایسی مشرقی لڑکی ہے جو شرم و حیا اور وفاداری کے زیور سے مالا مال ہوگی۔۔ وہ آج بھی گاؤں میں سکھیوں کے ساتھ پنگھٹ پہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ نام بتاؤں وہی ہمسایہ تمہاری پڑوسن کی بہن۔ " راحیل یہی تم نے لکھا تھا اپنے دوست کو۔ جاؤ راحیل اگر ہمت ہو تو اپنی بہن کو گیری بالا کے کوٹھے سے لے آؤ۔ تب جانو میرا انتقام کتنا زبردست ہے حالانکہ مجھے اس معصوم سے کوئی بیر نہیں لیکن اللہ مجھے معاف کرے گا۔ تمہاری کرتوتوں کی وجہ سے ہی ایسا ہوا ہے جا کر کیسے بھی اس کی زبانی سن لینا۔

[illegible]

کوئی بہانہ ہاتھ سے نہ جانے دے گی اور جب اسے یہ موقع میسر آیا تو الزبتھ نے دل کھول کر میری سے انتقام لیا۔ اس کو بڑی قابلِ رحم طریقے سے قتل کرایا اس کی اس بے بسی کی موت پر کوئی شخص بھی ایسا نہ تھا جو متاثر ہوئے بغیر رہ سکا ہو۔

جولائی ۱۵۵۹ء میں فرانس کا شہزادہ ہنری دوئم گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ چالیس دن سوگ کے بعد سترہ سالہ میری نے دوسری بار تاجِ شاہی سر پر رکھا۔ بیمار اور لاغر فرانسس کسی بات [illegible] اور وہ سولہ سال کی عمر میں ہی بستر مرگ پر پڑ گیا تھا۔ میری ذاتی طور پر شوہر کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ لیکن تمام توجہ اور علاج کے باوجود فرانسس کی بیماری بڑھتی گئی ۱۵۶۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اسکاٹ لینڈ اور فرانس کی ملکہ ابھی اٹھارہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ بیوہ ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد اس کی ماں ملکہ ڈولریں کا بھی انتقال ہو گیا۔

ملکہ ڈولریں کا انتقال ہوتے ہی میری کا پھر مزید مشکلات آ پڑیں۔ اس کے خلاف سازشیں تیار کی جانے لگیں ان سازشیوں میں اس کا سوتیلا بھائی ارل آف مورا بھی شامل تھا۔ انگلستان کی الزبتھ اوّل نے اسے اپنے ساتھ ملا لیا تھا میری کے سوتیلے بھائی ارل نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ اسے اڈنبرگ سے کچھ عرصے کے لئے فرار ہونا پڑا۔ میری اسٹوارٹ کیتھولک تھی جب کہ ارل پروٹسٹنٹ تھا اس نے اس اختلاف کو خوب ہوا دی۔

شوہر اور ماں کے مرنے کے بعد میری اسٹوارٹ خود کو دنیا میں بالکل تنہا محسوس کر رہی تھی اس وقت اس کی عمر بھی کوئی خاص نہ تھی اس نے سوچا اس کا دوبارہ شادی کر لینا ہی مناسب ہے۔ اسے سہارے کی بھی شدید ضرورت تھی مگر چاہتے ہوئے بھی وہ شادی نہ کر سکی۔

وہ زیادہ تر وقت۔ شاعروں۔ موسیقاروں۔ اور مصوروں میں گزارنے لگی۔

ایک نوجوان شاعر شاتلار نامی سے اس کے رومانس کی خبر گرم ہو گئی۔ اس خبر کا میری کی شہرت پر کچھ اثر نہ پڑا۔ لیکن رومان کا غلط رنگ دیا گیا۔ میری کی جب تعلقات زیادہ بڑھی تو اسے اس کا احساس ہوا پھر اسے خود بھی احساس ہو گیا کہ وہ

[illegible] شاعر کی قدر دان تھی اور جو [illegible] کر بیٹھی۔ اس نے شاتلار کو گرفتار کرنے کے احکامات جاری کر دیئے شاتلار کو ۲۲ فروری ۱۵۶۳ء میں ملکہ سے گستاخی کی سزا میں پھانسی دے دی گئی۔ میری کے اس اقدام سے اسے اور بدنام ہونا پڑا۔ اس کی مخالفت بڑھ گئی۔ اسے سر عام طوائف کے نام سے پکارا جانے لگا۔ مخالفت کے دباؤ سے بچنے کے لئے اس نے فیصلہ کیا کہ جلد سے جلد شادی کر لینا چاہئے۔ اس نے لارڈ ڈارنلے کا انتخاب کیا۔ جو اس سے تین سال چھوٹا تھا۔ ڈارنلے کا تعلق انگلستان کے شاہی خاندان سے تھا۔ یہ عجیب بات ہوئی کہ وہ انگلستان کے تاج و تخت کا وارث بھی تھا۔

الزبتھ اوّل کے مرنے کے بعد وہ تاج و تخت کا وارث تھا لارڈ ڈارنلے اور الزبتھ اوّل آپس میں رشتہ دار تھے۔ خود میری کا [illegible] الزبتھ اول اور ڈارنلے کی رشتہ داری بھی تھی۔ اس وقت یورپ کی تمام حکومتیں۔ انگلستان۔ فرانس۔ جرمنی۔ سویڈن وغیرہ میں ایک ہی خاندان حکومت کر رہا تھا۔ ان کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں۔ مگر حصولِ اقتدار کے لئے جنگ اور حسد کا ماحول ہمیشہ ہی بنا رہا۔ ۲۹ جون ۱۵۶۵ء میں ایڈنبرگ کے شاہی محل میں میری اسٹوارٹ کی لارڈ ڈارنلے سے شادی ہو گئی اس کی خبر سنتے ہی الزبتھ اوّل حسد سے تڑپ اٹھی اس کی حسد اور نفرت انتہا کو پہنچ گئی۔ وہ کسی حالت میں بھی میری کو پھلتے پھولتے دیکھنا نہیں چاہتی تھی اس نے اس کو تباہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد میری سے کچھ ایسی غلطی ہو گئی جس سے اس کا شاہی وقار کمزور تر ہوتا گیا۔ اس کے تعلقات اطالوی ریزیو نامی ایک موسیقار سے ہو گئے۔ وہ گٹار بجانے کا ماہر تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ لارڈ ڈارنلے خاموشی سے سب کچھ برداشت کر رہا تھا ایک دن جب کہ ریزیو میری کے شاہی محل میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ڈارنلے کے [illegible] شاہی محل میں داخل ہو گئے انہوں نے خنجروں سے ریزیو کو وہیں ختم کر دیا اس کے جسم پر ۵۶ زخم آئے۔

میری کے یہاں ۱۹ جون ۱۵۶۶ء کو شہزادہ پیدا ہوا جس کا نام جیمس اوّل رکھا۔ ایڈنبرگ کے شہریوں [illegible]

ذرا ٹھہریئے!

آپ ہیں جناب ڈاکٹر اُدے سرن صاحب ارمان جو قصبہ بلاری ضلع مرادآباد (یوپی) میں اپنے آبائی پیشہ زمینداری کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کے نیک جذبہ کے تحت بھولے بھالے دیہاتیوں کی طبی خدمات انجام دیکر انھیں بیماریوں سے نجات دلاتے ہیں۔ آپ ایک اچھے شاعر ہیں حضرت ادیب لکھنوی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ادیب صاحب کے یہ شاگرد بھی رہے ہیں اس لئے ان کے ذہن پر ادیب صاحب کی گہری چھاپ ہے۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ارمان صاحب نے اپنے استاد محترم کے نقش قدم پر چلنے کی دل وجان سے کوشش کی ہے۔ اس وقت ان کے چار شعری مجموعے رازونیاز۔ سازوآواز۔ ارمانِ دل اور آئینے نیز دو ناول "آشیرواد" اور "مسلمان کا مندر" شائع ہو چکے ہیں۔ بارہ ناول اشاعت کے لئے تیار ہیں۔ جن میں دو ناول بچوں کی بہبودی کے لئے ہیں۔ نظموں کے تین مجموعے بھی تیار ہیں۔ ڈاکٹر ارمان ۶۴ سال کے ہیں مگر ایک جوان رعنا کی طرح دن رات مریضوں کی خدمت کرنے میں چاق وچوبند ہیں۔ کمیونزم خیالات کے حامی ہیں۔

ماہنامہ شان ہند کے لئے اس سال ایک ہزار نئے خریدار بنائے جانے کے پروگرام کے سلسلے میں آپ نے ایک صد نئے خریدار بنانے کا وعدہ فرمایا ہے اور اپنے وعدے کی تکمیل کے سلسلے میں ارمان صاحب نے باون (۵۲) نئے خریداروں کا زرسالانہ بذریعہ بنک ڈرافٹ بھجوا کر ماہنامہ شان ہند کی ٹھوس خدمت کی ہے۔ ڈاکٹر ارمان کے اس ٹھوس ادبی کارنامے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انھیں اردو سے کس قدر لگاؤ ہے۔

آیئے اب ان کے کچھ قطعات ملاحظہ فرمایئے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

جو لوگ کہ دیوانۂ ایمان و یقیں ہیں — جو لوگ کہ تہذیب گزشتہ کے امیں ہیں
جن کو کہ ابھی تک ہے حقیقت سے محبت — وہ آج کی تہذیب کے قابل ہی نہیں ہیں

حکمرانوں کو بھی معقول رہنا چاہئے — دل رفاہِ عام میں مشغول رہنا چاہئے
کرتی ہے برباد حاکم کو ہوائے انتقام — حاکمانِ وقت کو معقول رہنا چاہئے

ڈاکٹر ارمان سے ایک مرتبہ ملئے پھر آپ انھیں بھول نہیں سکتے۔ چہرہ ہر وقت مسکراہٹ لئے ہوئے۔ کمیونزم خیالات رکھنے کے باوجود خدائے برتر کے وجود کے قائل ہی نہیں بلکہ یہ یقین کامل رکھتے ہیں کہ اس کی مرضی کے بغیر پتا نہیں ہل سکتا۔ حال ہی میں ایڈیٹر شان ہند کی درخواست پر ڈاکٹر ارمان نے ایک یادگاری ادبی کارنامے کی بسم اللہ کی ہے جب یہ ادبی کارنامہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوگا تو اردو اور ہندی دونوں زبانیں ان کی مرہون منت ہوں گی۔

سفیرِ انسانیت کا دورۂ پاکستان

"سفیرِ انسانیت" جناب گورپال سنگھ واحد آف موگا (پنجاب) گزشتہ برس اپنے استادِ محترم خواجہ محمد لطیف انصاری مرحوم کے چہلم پر ڈسکہ تشریف لے گئے تو پاکستانی اخبارات نے انھیں "سفیرِ انسانیت" لکھا اور ہندوستانی اخبارات نے سعادت مند شاگرد کے عنوان سے مضامین اور خبریں شائع کیں قارئینِ شانِ ہند" "سفیرِ انسانیت" سے متعلق سالِ گزشتہ شانِ ہند کے مختلف شماروں میں ان کی پاکستان یاترا کے بارے میں پڑھ چکے ہیں اور یہی وہ ادب پرست شخصیت ہے جس نے میری ترغیب پر "ہندی کے مسلمان شعراء" کی طباعت کے سلسلے میں گرانقدر عطیہ بھی دیا۔ ۲۸ اگست سنہ کو ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھایا تو واحد صاحب کی رس گھولتی ہوئی آواز سنی عرض کیا کہ دفتر تشریف لایئے۔ فرمانے لگے جلدی میں ہوں کل رات ہی چنڈی گڑھ سے آیا ہوں۔ آج صبح پاکستان سفارتخانہ میں کونسلر جناب فاروق زماں صاحب سے ملاقات ہوئی پاکستان جانے کے لئے ویزا کی درخواست پیش کی اور انھوں نے چند منٹ میں ہی ویزا جاری فرما دیا۔ استادِ محترم خواجہ محمد لطیف انصاری مرحوم کی پہلی برسی میں شرکت کے لئے ڈسکہ سیالکوٹ جا رہا ہوں۔ ابھی چنڈی گڑھ جا کر پھر موگا جاؤں گا تاکہ یکم ستمبر کو پاکستان روانہ ہو سکوں۔ واپسی پر دہلی حاضر ہوں گا۔ اس قدر جلدی ویزا مل جانے کی بابت پوچھا تو فرمانے لگے ؎

ہاں یہ عجیب بات تو واقعی عجیب ہے
جس نے دیا تھا درد، اب میرا وہی طبیب ہے

واحد صاحب پاکستان سے واپس آنے پر حسبِ وعدہ دفتر شانِ ہند میں تشریف لائے اور اپنے پاکستانی دورے کے تاثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ڈسکہ ضلع سیالکوٹ

میں ان کے اُستاد مرحوم انصاری صاحب کی پہلی برسی تھی اس سلسلہ میں ۵ ستمبر کو ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں مشہور شیعہ عالم مفتی صغیر حسین صاحب اور مولانا اعجاز حسین صاحب نے شاندار الفاظ میں مرحوم خواجہ صاحب کی ادبی، علمی اور دینی خدمات کا تذکرہ فرمایا۔ اسی مجلس میں خواجہ صاحب مرحوم کے خاندان کے افراد نے خواجہ محمد لطیف انصاری میموریل ٹرسٹ قائم کئے جانے کا اعلان بھی کیا۔ ٹرسٹ کے پہلے گیارہ ٹرسٹیوں میں خواجہ صاحب کی تینوں صاحب زادیاں۔ تینوں داماد اور تینوں صاحبزادے شامل کئے گئے۔ دینیات سے متعلق خواجہ صاحب کی قریباً ۱۷۵ تصانیف کے سلسلہ میں اشاعت و طباعت کے لئے مشورہ حاصل کرنے کیلئے خواجہ صاحب مرحوم کے مشہور عالم دین شاگرد مولوی اعجاز حسین نقوی بھی ٹرسٹی مقرر کئے گئے اور گیارہواں ٹرسٹی مجھ فقیر و حقیر کو بنایا گیا۔ تاکہ موگا (ہندوستان) میں اس ٹرسٹ کی نگرانی میں خواجہ صاحب مرحوم کا ہر سال اکتوبر میں یوم پیدائش منایا جا سکے۔ ٹرسٹیوں نے فیصلہ کیا کہ خواجہ صاحب مرحوم نے اپنی زندگی کا دو تہائی حصہ ہندوستان میں گزارا۔ اور ہندوستان میں ہی انھوں نے جنم لیا۔ لہذا ان کا یوم پیدائش ہندوستان میں اور یوم وفات پاکستان میں منایا جایا کرے۔ ڈسکہ میں ایک شایانِ شان میموریل قائم کیا جائے گا۔ ایک قطعہ آراضی میں چھوٹی سی مسجد ایک اشاعتی ادارہ مکتبہ لطیف۔ چھوٹی سی لائبریری۔ اور امامیہ ہال وغیرہ تعمیر کئے جائیں گے اور مرحوم خواجہ صاحب کا خوبصورت ترین مقبرہ بھی ایک گوشے میں تعمیر کیا جائے گا۔

ڈسکہ میں منعقدہ اس مجلس کے سلسلے میں واحد صاحب کے ذاتی تاثرات کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمانے لگے کہ میرے پسندیدہ دو قطعات سُنئے جو اس مجلس میں سراہے گئے ؎

ترے مرنے سے یہ ہوا ثابت
نبضِ انسانیت نہیں مرتی
شخص مرتا ہے موت سے لیکن
موت سے شخصیت نہیں مرتی

(۲)

موت سے جو ملا سکے آنکھیں
بازی کب اس کی مات ہوتی ہے
یہ فسانہ نہیں حقیقت ہے
موت اس کی حیات ہوتی ہے (الف

اپنے تاثرات بیان فرمانے کے دوران واحد صاحب نے باتوں میں بتایا کہ چنڈیگڑھ میں ان کے دیرینہ رفیق جو [illegible] کے لحاظ سے انجنیئر ہیں کی والدہ محترمہ کی خواہش تھی کہ [illegible] میں ان کے آبائی مکان سے ایک بوتل پانی بھی بطور تبرک لا کر دیا جائے۔ لہذا اس ضعیف خاتون محترم کی خواہش [کے] احترام میں واحد صاحب اپنے ساتھ متعلقہ مکان سے بوتل پانی بھی لائے۔ جس کے چند گھونٹ اس خاتون نے [پینے] کے بعد قلبی اور ذہنی سکون حاصل کیا۔

اس مختصر سے دورۂ پاکستان کے دوران جن پاک[ستانی] حضرات نے واحد صاحب کو کھانے۔ چائے۔ عصرانہ وغیرہ پر [مدعو] فرمایا۔ اس کی روداد واحد صاحب نے سناتے ہوئے پاکستانی کا دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یہ احساس ہی نہ ہو سکا کہ میں کسی دوسرے ملک میں ہوں۔

یقیناً اس سفیرِ انسانیت کا یہ دورہ بھی ہند و پاک تعلقات میں خوشگواری کے دیرپا اثرات چھوڑے گا۔

سرمد تونسوی

PSB's Recurring Deposit Scheme – the easy way to save for your special wishes.

Deposit as little as Rs. 5/- per month, and soon you'll have enough to indulge in those special wishes. With PSB's Recurring Deposit Scheme.

PSB has a variety of Schemes to suit all your needs. Drop in at your nearest branch for details.

ASP/PSB/2/202/80

PSB—The name of total banking service

PUNJAB & SIND BANK

(A Government of India Undertaking)

تا ہے جو دس زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ مگر یہ تسلیم ہے اس کی چھپائی کا کنٹریکٹ ایک ایسی پارٹی نے لے رکھا ہے جو دراصل ایک پرنٹنگ ایجنسی چلاتی ہے مگر انہوں نے تین مشینیں پرنٹنگ کی لگا رکھی ہیں۔ مگر اس کے یہاں نہ تو تلگو۔ تامل۔ ملیالم۔ بنگالی اور گورمکھی کا ٹائپ ہے اور نہ ہی ایسا اعلیٰ انتظام کہ وہ فوراً ان زبانوں میں پرنٹنگ کا انتظام کر سکے۔ لہٰذا اس کا یہ ہے کہ ۱۳ اپریل ۶۳ء کا شمارہ ۲۲ ستمبر کو نشان ہند کو موصول ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ صاحب ملٹری سے ایک صفحہ کی کتابت کے لئے پچیس روپیہ وصول کرتے ہیں اور کاتب کو روپیہ فی صفحہ دیتے ہیں اور وہ بھی آسانی سے نہیں۔ جب کتابت کے معاملہ میں یہ حال ہے تو دوسری باتوں میں تو "چوروں کا مال لاٹھیوں کے گز" والا معاملہ ہوگا۔

ہمارا خیال تھا کہ ملٹری والے ٹینڈر پاس کرتے وقت ان باتوں کا خیال رکھتے ہوں گے اور وہاں سفارش یا ذاتی مفاد کارفرما نہ ہوں گے۔ مگر سینک سماچار کے معاملہ میں تو ایسا نظر آتا ہے کہ معاملہ صاف نہیں ہے۔ منسٹری آف ڈیفینس کے ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز جناب پرتاپ کمار ایک سمجھے ہوئے منتظم افسر ہیں اور وہ کئی مختلف محکموں میں اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر چکے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ اس معاملہ میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اصل معاملہ کی تہ تک پہنچیں گے کہ سینک سماچار کی چھپائی کا کنٹریکٹ ایسی پارٹی کے ساتھ کیوں کر دیا گیا جبکہ وہ دس زبانوں میں اس جریدے کو شائع کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔

اُردو بلٹز بمبئی اور حکیم دینا ناتھ آنند چیلنج [illegible]

چند ہفتے ہوئے کہ اُردو بلٹز میں ایک تصویر شائع کی گئی اور اس کے ساتھ یہ لکھا گیا کہ حکیم دینا ناتھ صاحب سیکٹر ۲۱۔ کالونی [illegible] گوڑگاؤں عوامی مفاد کے تحت مرض ذیابیطس کا نسخہ مفت بھجواتے ہیں صرف ۲۵ پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر یہ نسخہ منگایا جا سکتا ہے

ایڈیٹر نشان ہند بھی اس موذی مرض کا شکار ہے لہٰذا فوری طور پر ۲۵ پیسے کے ٹکٹ ڈاک بھیج کر حکیم صاحب مذکور سے نسخہ بھیجنے کی درخواست کی گئی۔ دو تین دنوں کے بعد ہی ہندی میں چھپا ہوا کئی صفحات کا لیٹر اور ایک لمبا چوڑا نسخہ اور ایک لمبی چوڑی کہانی جس میں اس نسخہ کے حصول کے بارے میں زمین آسمان کے قلابے ملانے کی ناکام کوشش کی گئی تھی موصول ہوئے۔ "بلٹز" ایک پُر وقار اخبار ہے اس میں جو چھپتا ہے پڑھنے والے اس پر یقین کر لیتے ہیں (یہ دوسری بات ہے کہ ایڈیٹر بلٹز کو پارلیمینٹ میں غلط بیانی پر معافی مانگنا پڑی) اور جبکہ کسی تصویر اور تحریر کے ساتھ یہ نہ لکھا ہو کہ یہ اشتہار ہے تو بیچارے قارئین کس طرح چالاک مشتہرین کے فریب سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس نسخہ کو بنانے کے لئے کم و بیش دو ہزار روپیہ چاہئے اور پھر جن بوٹیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی پہچان شاید خود نسخہ بھجوانے والے کو بھی نہ ہوگی۔ حکیم صاحب نے لکھا ہے کہ ایک پاؤ سونے کا کشتہ چاہئے۔ مگر حکیم صاحب کو شاید یہ علم ہی نہیں کہ کشتہ بنانے کے لئے کون سونا درکار ہوتا ہے۔ ورنہ وہ اس کی وضاحت فرماتے۔ اور تو اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ نسخہ کی جو ترکیب لکھی گئی ہے اس کے مطابق یہ صاحب خود بھی دوائی تیار نہیں کر سکتے اور اگر یہ حکیم صاحب ہمارا چیلنج قبول فرما لیں تو ہم نسخہ کی تمام لاگت ادا کرنے کو تیار ہیں مگر وہ ہمارے سامنے دوا تیار کریں اور اگر واقعی یہ دوا ان کے فرمان کے مطابق ایک کورس استعمال کرنے سے ذیابیطس ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ بیچارہ مریض ہی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے) اگر ایک کورس سے فائدہ یقینی ہے تو پھر ایک کورس کی قیمت ایک سو روپیہ اور دو کورس اکٹھے منگوانے پر پونے دو سو روپیہ کا لالچ کیوں دیا گیا جس کا صاف مطلب ہے کہ ایک کورس سے پورا فائدہ قطعاً نہیں ہوتا ہوگا۔

ایک اندازہ ہے کہ بلٹز میں یہ خبر یا اشتہار جس انداز سے چھپا ہے کم و بیش ایک ہزار خطوط حکیم صاحب کے پاس ضرور پہنچے ہوں گے اگر ان ایک ہزار میں سے ایک سو مریض بھی پھنس گئے تو حکیم صاحب نے راکھ بیچ کر دس ہزار روپیہ کما لیا (یہ راکھ بے شک ان کے لکھنے کے مطابق سونے کی ہی کیوں نہ ہو آخر ہے تو راکھ ہی)

کیا بلٹز کے ایڈیٹر اپنے اخبار میں اس سلسلے میں پڑھنے والوں کی تسلی فرمائیں گے کہ انہوں نے اس دوائی کے بارے میں اس طرح جو پبلسٹی فرمائی کیا وہ ان کے ذاتی تجربہ کی بنا پر تھی یا یہ ایک ترغیبی اشتہار تھا۔ اور اگر اشتہار تھا تو اس کو اشتہار کی طرح کیوں شائع نہ کیا گیا خبر کے انداز میں کیوں شائع کیا گیا جس کے باعث [illegible] گئے

مریض دھوکے میں مبتلا رہینگے۔

(جناب او۔ پی۔ آزاد آفیسرز گریڈ فسٹ سیٹ بینک آف انڈیا میرٹھ چھاؤنی نے بھی یہ نسخہ منگایا اور ڈھونگ نما نسخہ اور کہانی کو پڑھنے کے بعد فرمانے لگے سرمد صاحب "تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود (جب تک تریاق عراق سے آئے گا تب تک سانپ کا ڈسا ہوا مریض چل بسے گا)

کیا فرماتے ہیں قاضی سجاد حسین بیچ اس مسئلے کے،

لاہور (پاکستان) کے جناب محمد امجد خلیلی کا یہ مراسلہ ملاحظہ فرمایئے۔

گذشتہ ماہ میرے ایک عزیز نے بھارت سے کچھ کتابیں ارسال فرمائی تھیں۔ ان میں قاضی سجاد حسین صدر مدرس مدرسہ فتحپوری دہلی کے چند تراجم بھی تھے۔ ان تراجم میں سے گلستانِ سعدیؒ کا ترجمہ پڑھتے پڑھتے مجھے یاد آیا کہ ایسا ہی ترجمہ میرے پاس پہلے سے موجود ہے۔ نکال کر مقابلہ کرنے سے پتہ چلا کہ قاضی جی نے عبدالباری آسی الدّنی کے پرانے ترجمے کو اپنے نام سے چھاپ دیا ہے۔ آسی کا ترجمہ اردو کے مشہور پریس مطبع نول کشور لکھنؤ نے تقسیم ملک کے کئی سال پہلے چھاپا تھا۔ قاضی سجاد کی علمی حیثیت کو دیکھتے ہوئے یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ انھوں نے عمداً یہ سرقہ کیا ہے بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے سب رنگ کتاب گھر دہلی ۶ کی فرمائش پر انھوں نے یہ کام انجام دیا اور بجائے خود ترجمہ کرنے کے کسی دوسرے شخص سے معمولی اجرت پر ترجمہ کرالیا۔ مگر اس شخص نے قاضی جی کو جھکہ دے دیا یعنی عبدالباری آسی کا پرانا ترجمہ قاضی جی کے حوالہ کر دیا اور اس طرح انجانے میں قاضی جی سرقہ کر بیٹھے۔ قاضی جی کے اور کئی ترجمے بھی میرے سامنے ہیں مگر معلوم نہیں وہ کہاں سے نقل کئے گئے ہیں۔ لیکن اس ایک مثال نے سارے کتابوں کے ترجمے کو مشکوک بنا دیا جس میں مثنوی مولانا روم بھی شامل ہے۔

محمد امجد خلیلی، لاہور

جناب محمد امجد خلیلی کی واقفیت کے لئے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ سب رنگ کتاب گھر دہلی ۶ کے مالک خود قاضی سجاد حسین صاحب ہی ہیں۔

مندرجہ بالا مراسلہ سے قاضی صاحب کی پوزیشن یقیناً خطرے میں ہے اس لئے ہم ان کے مفصل جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ اگر ان کے دیگر تراجم بھی اس طرح سے سرقہ ہی ہیں تو قاضی صاحب نے ان تراجم کو شائع کرنے کے لئے حکومتِ ہند سے گرانقدر رقم کی امداد حاصل کر کے یقیناً عوام اور حکومت کو دھوکا دیا۔

مفتون کوٹوی کا انتقال

یکم ستمبر ۸۰ء کو جناب مفتون کوٹوی نے کوٹہ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ راجستھان کا ایک ایسا ادیب شاعر اور محقق چل بسا جس نے اردو ادب کو یقیناً بہت کچھ دیا۔ اگر اردو اکاڈمی راجستھان محض ایک فیونڈ بنک ہو کر نہیں رہ گئی تو اسے چاہیئے کہ وہ نہ صرف مفتون کے مضامین کو کتابی شکل میں شائع کرائے جن سے راجستھان کی ادبی روایات قائم ہیں۔ اور مفتون صاحب کی بیوہ کو مناسب پینشن بھی دے تاکہ مفتونؔ ایسے ادیب کی بیوہ کو مالی طور پر تکلیف نہیں ہونی چاہیئے۔

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

قریباً نو سال کا عرصہ ہوا کہ ریاست پٹیالہ کے ایک قریبی گاؤں کا آبلہ والیہ نوجوان مہاراجہ پٹیالہ کی فوج میں ملازم تھا۔ نیا نیا شادی شدہ نوجوان اپنی نئی نئی بیاہی دلہن سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا مگر اس زمانے میں کسی بیٹے کی یہ ہمت نہ ہوتی تھی کہ اپنے ماں باپ کی موجودگی میں اپنی بیوی سے بات بھی کرے اور نہ ہی کوئی بہو ایسی جسارت کر سکتی تھی کہ وہ سسر ساس یا جیٹھ کے سامنے اپنے شوہر سے بات کر سکے فوجی ملازمین کو ایک خاص مدت کے بعد ہی گھر جانے کی چھٹی ملتی تھی اور یہ بھی ناممکنات میں ہے کہ وہ ہر اتوار کو اپنے گھر جا سکے خواہ اس کا گھر اس کی جائے ملازمت سے دس بارہ میل کی مسافت پر کیوں نہ ہو۔ پھر بھی یہ نوجوان اپنے افسران کی منت سماجت کر کے کسی نہ کسی طرح مہینہ میں ایک دو بار گھر آتا اور اپنی دلہن کو دیکھ جاتا۔

شادی کے تین چار ماہ بعد اس فوجی کی بیوی حاملہ ہو گئی اور آنے والے بچے کے لئے ساس واہگورو سے پرارتھنا کرتی کہ پوتی کا بچہ لڑکا دینا لڑکی نہ دینا۔ فوجی بھی دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ وہ کچھ ہی ماہ بعد باپ بن جائے گا۔

وقتِ مقررہ پر فوجی کی بیوی نے بچہ جنا تو وہ لڑکی تھی۔ زچہ کی ساس نے دایہ سے پہلے ہی یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر لڑکی ہوئی تو اسے فوراً ہی باہر لے آنا اور اگر لڑکا ہوا تو وہیں رکھنا دایہ نے جونہی لڑکی کی نال کاٹی تو وہ روئی اور وہ بچی کو اٹھا کر لے گئی زچہ کی ساس اور دایہ نے پہلے ہی کمہار کے ہاں سے بڑی سی ہانڈی منگا رکھی تھی اس ہانڈی میں روئی بچھا کر نومولود بچی کو اس میں بٹھا دیا اور بچی کے انگوٹھے پر گڑ لپیٹ کر انگوٹھا بچی کے منہ میں دے دیا اور یہ کہتے ہوئے گڑ کھائیں۔ پونی کتیں۔ آپ نہ آئیں ویر نوں گھلیں (گڑ کھانا اور کپاس کاتنا۔ آپ نہ آنا بلکہ اپنے بھائی کو بھیجنا) ہانڈی کو حویلی کے ایک کونے میں گڑھا کھود کر دبا دی۔ زچہ کے جب ہوش و حواس درست ہوئے تو اس نے ساس سے اور دایہ سے بچے کے بارے میں دریافت کیا تو اسے بتایا گیا کہ مری ہوئی لڑکی پیدا ہوئی ہے زچہ دل ہی دل میں رو دھو کر چپ رہی۔

فوجی چھٹی پر گھر آیا تو آتے ہی سب سے پہلے اپنے بچے کی تلاش میں ادھر ادھر آنکھیں گھمائیں مگر کوئی نوزائیدہ بچہ نظر نہ آیا تو وہ اب کس سے پوچھے کہ بچہ کہاں ہے۔ ماں سے وہ شرم کے باعث پوچھ نہیں سکتا۔ خاوند اور بیوی ماں کی موجودگی میں بات تک نہیں کر سکتے تھے رات کو جب میاں بیوی کو تخلیہ میں بات چیت کا موقع ملا تو خاوند نے بے صبری سے بیوی سے پوچھا کہ بچہ کہاں ہے۔ بیوی رو دی اور روتے ہوئے کہا کہ ماں جی کہتی ہیں کہ مری ہوئی لڑکی پیدا ہوئی تھی میں نے تو بے ہوشی میں اسے دیکھا بھی نہیں مگر بے ہوشی کے عالم میں بھی میں نے بچی کے رونے کی آواز سنی تھی۔ فوجی کشمکش و پیچ میں پڑ گیا کہ اگر بچی مردہ پیدا ہوئی تھی تو روئی کیسے۔ فوجی نے بار بار اپنی بیوی سے اس کی تصدیق چاہی کہ اس نے بچی کے رونے کی آواز سنی تھی۔ فوجی نے رات آنکھوں میں کاٹی اور صبح ہوتے ہی اس نے تمام حجابات کو دور کرتے ہوئے براہِ راست اپنی ماں سے سوال کیا کہ ماں بچہ کہاں گیا۔ تو ماں نے لاپرواہی سے جواب دیا کہ مری ہوئی لڑکی پیدا ہوئی تھی۔ فوجی نے کہا ماں اسے کہاں دبایا ہے تاکہ میں اپنی بچی کو مردہ شکل میں ہی دیکھ سکوں ابھی کون سے زیادہ دن ہوئے ہیں۔ پندرہ ہی دن تو ہوئے ہیں جب فوجی کے انتہائی اصرار پر بھی ماں کچھ نہ بولی تو فوجی کمرے میں گیا اور بندوق اٹھا کر لے آیا اور ماں سے کہنے لگا کہ اگر تم نے سچ سچ بات نہ بتائی تو میں اپنے آپ کو گولی مار لوں گا۔ ماں نے بڑی لاپرواہی سے کہا اور اس خیال سے کہا کہ اب تک تو لڑکی مر گئی ہو گی جا اس کونے میں گڑھا کھود لے اور دیکھ لے اپنی لڑکی کو بیٹا آیا لڑکی والا ایک مردہ بچی کے لئے اپنے آپ کو بندوق مارنے چلا ہے شرم نہیں آتی ماں سے ایسی باتیں کرتے۔

فوجی نے آناً فاناً نشان شدہ جگہ کو کھود ڈالا تو تھوڑی ہی گہرائی پر اسے ہانڈی ملی اور جونہی اس نے ہانڈی کا ڈھکنا اٹھایا تو [illegible]

ِالت حال کے پیشِ نظر دیدہ دانستہ تُوڑ تھی میں کرتا رہا تاکہ
یم اور اس کا منگیتر میری ہدایت کے مطابق ڈیوا ر پھاند جائیں
ب مجھے اس شخص سے الجھتے ہوئے جیون لال شرما ایڈوکیٹ نے
یا تو وہ بھاگے بھاگے آئے اور کہنے لگے سرور صاحب آپ نہیں جانتے
اس مِل کے مالک ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ ذرا شمیم صاحبہ سے تعارف
جائے۔ میں نے کہا کہ شمیم تو باتھ روم میں ہے ابھی آتی ہے سیٹھ صاحب
ب اندر تشریف رکھئے اور خود فوراً باہر آ گیا۔ گپتا جی نے کار سٹارٹ کر
لی تھی۔ شمیم اور اس کا منگیتر روئی کی گانٹھوں پر چڑھ کر دیوار پر آ گئے
دوسری طرف کھڑی کار کی چھت پر اتر کر نیچے آ کر گاڑی میں بیٹھ گئے
ہ میں انتہائی تیزی سے دوڑ کر گپتا جی کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا
ر کار چل پڑی۔ مل کا صدر دروازہ بند تھا۔ گپتا جی نے ہارن دیا واچ
ن نے دروازہ کھول دیا اور ہم تیزی سے کار کو مل ایریا سے باہر لا کر بھٹنڈہ
اسڑک پر پوری رفتار سے جا رہے تھے۔ رات کے گیارہ بجے
رہے تھے کہ ہم گپتا جی کے گھر پہنچے۔ کھانا کسے یاد رہتا گپتا جی کی ماں
نے ہمیں دودھ کا ایک ایک گلاس دیا اور ہم سب پی کر سو گئے دوسر
ے گپتا جی ہمیں گاڑی پر سوار کرا گئے۔ اس دن کے بعد سے جیون لال
رما ایڈوکیٹ سے میرے تعلقات منقطع ہو چکے ہیں۔

گپتا جی کا وہ خط اب بھی میرے پاس موجود ہے جو بعد میں
نوں نے بھٹنڈہ سے لکھا کہ سرور صاحب آپ کی سوجھ بوجھ کی
د دینی پڑتی ہے کہ اس رات آپ نے شمیم کی عزت بچائی۔ اب
علوم ہوا کہ وہاں یہ نشست رکھی ہی اسی لئے گئی تھی۔ تمام شاعر تو
نشے میں بے ہوش تھے اور اس سازش میں آپ کے دوست جیون
ل شرما ایڈوکیٹ بھی شریک تھے۔

غزل

ڈاکٹر لطیف اکبر آبادی

اب ہجوم حسرت و ارماں نظر آتا نہیں
خانۂ دل میں کوئی مہماں نظر آتا نہیں

دار پر چڑھ جائے جو حق و صداقت کے لئے
آج ایسا کوئی بھی انساں نظر آتا نہیں

گر وفا نہ ہو سکے ہم پہ جفا تو کیجئے
کیا تمہیں یہ کام بھی آساں نظر آتا نہیں

اُڑ گیا دُنیا سے شاید غم گساری کا چلن
درد کے ہوتے ہوئے درماں نظر آتا نہیں

وقت کے گلچیں نے ہر غنچہ مسل کر رکھ دیا
باغباں پھر بھی مگر حیراں نظر آتا نہیں

آدمی ہوتا اگر رمزِ وفا سے آشنا
خونِ انساں اس قدر ارزاں نظر آتا نہیں

بار ہا ڈوبے ہیں ساحل پہ سفینے اے لطیف
کیا ہوا جو دور تک طوفاں نظر آتا نہیں

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ پرنس نے فانی سے دریافت کیا۔

"کیا مہدی یار جنگ نے تم سے کوئی تحریری وعدہ کیا ہے؟"

بے چارے فانی کی بدقسمتی! پرنس کا صحیح منشا اب بھی نہ سمجھ سکے۔ وعدہ تو زبانی ہی ہے۔ مگر تحریری وعدے سے زیادہ معتبر ہے۔

پرنس نے کہا بہتر ہے، جب تم میرا آفر منظور کرنے میں اپنا نقصان سمجھتے ہو تو وہ کام کرو جس میں تمہارا فائدہ ہو۔ یہ بات یہیں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد پرنس مجھ سے مخاطب ہوئے۔ اور ادھر ادھر کی پرلطف باتیں کرنے لگے۔

چند روز کی بات ہے گزر گئے اور وہ ساعت نزدیک آ گئی جس کے خوشنما تصور میں فانی نے پرنس کا آفر نامنظور کر دیا تھا۔ فانی شوق کی تصویر بنے ہوئے نواب کی ملاقات کو گئے۔ اس ملاقات کا حال خود انھیں کی زبانی سنیے۔

خوشنما وعدہ

"گیارہ بجے دن کو پہنچا۔ ملاقات کے کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ بیس پچیس ملاقاتی اور رہے ہوں گے۔ بارہ بجے، ایک بجا اندر سے کسی کی طلبی نہ ہوئی۔ بعض لوگ تھک کر اٹھ کے چلے گئے۔ وہی دانا تھے۔ ڈیڑھ بجے کے قریب جمعدار اندر سے نکلا اور اطلاع دی کہ آج نواب صاحب بے حد مصروف ہیں، کسی سے ملاقات نہ ہوگی آپ صاحبان پھر کسی دن تشریف لائیے۔ سب ملاقاتی یاس و حرمان کی تصویر بنے اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ گئے۔ کمرہ خالی ہو گیا۔ خدا جانے میری بے کسی پر خود جمعدار کو رحم آ گیا یا نواب ہی نے یہ تخصیص برتی۔ جمعدار نے کہا آپ اندر جائیے، صرف پانچ منٹ کا وقت ملے گا جو کہنا ہو جلدی سے کہہ دیجئے گا۔ ورنہ پھر موقع نہ ملے گا۔

میں اس پاس کے اندر گیا۔ سلام کیا۔ انھوں نے نہ میری طرف دیکھا۔ نہ سلام کا جواب دیا۔ صرف انگشت شہادت سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں سامنے کی خالی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا ہی تھا کہ جمعدار نے اطلاع دی کہ خاصہ تیار ہے۔ انھوں نے میری طرف دیکھا اور فرمایا۔ فانی صاحب! آتش و ناسخ میں آپ کس کو اچھا شاعر سمجھتے ہیں۔ [illegible] کے ساتھ ایک کو دوسرے پر ترجیح دیجئے۔"

— نواب کی خاص ادا تھی جس کو ثالث مقصود ہوتا تھا اس سے یہ سوال ضرور کرتے تھے۔ میری بات کا پورا لطف جوش اٹھائیں گے۔ کیونکہ خود انھیں بارہا اس سوال کا جواب دینا پڑا ہے۔ اس کے بعد ہی ان کا دوسرا سوال یہ کرتے تھے: اچھا طباطبائی صاحب کی شاعری کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

ایک دفعہ میں اور جوش ساتھ ساتھ نواب صاحب کی ملاقات کو گئے اور کسی خاص ہی ضرورت سے گئے تھے۔ نواب کام سے گریز کرنا چاہتے تھے۔ جوش کو مطلب کی طرف آتا دیکھ کر کہنے لگے "آتش و ناسخ میں آپ کس کو اچھا شاعر سمجھتے ہیں" اب مرتا کیا نہ کرتا۔ جوش نے اپنا کام بنانے کی خاطر وہی رٹا رٹایا سبق جسے پچاس بار سنا چکے تھے از سر نو پھر سنا ڈالا۔ نواب مزے لے لے کر سنتے رہے گویا پہلی بار یہ مضمون جوش کی زبانی سے سن رہے ہوں اور خود بھی سمجھنے کی کوشش میں ہوں۔ جوش جب اپنے نزدیک اپنے بیان سے نواب کی تشفی کر چکے تو انھوں نے بتاتا پھر اپنا دوسرا سوال بھی کر ڈالا۔ "اچھا جوش صاحب طباطبائی صاحب کی شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" مطلب سے ایسا صاف اور واضح گریز دیکھ کر جوش جھلا گئے۔ جھلاتے ہی ہوتے جھنجھلا گئے اپنی ضرورت کا بھی خیال نہ رہا۔ کہنے لگے "اس مسخرے کو شاعری سے کیا تعلق؟ دنیا میں اور ہزار کام ہیں۔ جوتا گانٹھے، پتنگ بنائے، پیچ باندھے، تسلی کرے کیا ضرور ہے کہ شعر ہی کہے" نواب اس جوشیلی تقریر کی تاب نہ لا سکے کھڑے ہو گئے۔ فرمایا اچھا جوش صاحب پھر ملاقات ہوگی اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔ ہم لوگ سلام کر کے باہر نکل آئے۔ مطلب فوت رہ گیا۔ یہی نواب کا عندیہ تھا جب موٹر پر بیٹھے تو میں نے جوش کو توجہ دلائی کہ آج تو آپ کی تقریر نواب کو گراں گزری۔ پوچھا "وہ کیوں؟" میں نے کہا کہ طباطبائی کا وہ احترام کرتے ہیں۔ جوش کہنے لگے "ایسی تیسی ایسے احترام کی۔ مجھے کیوں دق کرتے ہیں اچھا تمہیں کہو تم اس مہمل سوال کا کیا جواب دیتے؟" میں نے کہا۔ "میں کہتا کیا بات ہے آج ملک میں اس علم و فضل کی دوسری شخصیت نہیں۔ مفسر، محدث اور وحید عصر ہیں۔" جوش بگڑ کر بولے "تم نے سوال

شاعری کے متعلق تھا۔ میں سمجھا ہوں مگر میرا جواب یہی ہوتا نواب نکتہ سنج اور معنی شناس ہیں۔ سمجھ جاتے کہ اُن کی شاعری کے مداح نہیں مگر علم و فضل کے قائل ہیں یا جوش برہمی سے پوچھتے عقت بھجو۔ ہمارا کام تو بیشک چھوٹ ہوا مگر آج سے مجھ سے یہ سوال بھی نہ کریں گے۔

نفسِ مضمون سے میں دور جا پڑا۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ نواب نے فانی سے آتش و ناسخ پر موازنہ کرنے کی فرمائش کی۔ فانی لکھنؤ کے ان اساتذہ کے رنگِ سخن پر جب کافی روشنی ڈال چکے تو جمعدار کی وہ نصیحت یاد آئی کہ جو کچھ کہنا ہو جلدی سے کہہ دیجئے گا۔ کہنے لگے پرسوں یونیورسٹی کونسل کی میٹنگ ہے جس میں اُردو کی انتظام طلب جگہ پر تقرر کا مسئلہ زیر غور آئے ہوگا۔ میں اسی کی یاد دہانی کے لئے حاضر ہوا تھا۔ نواب نے کمال بے اعتنائی سے فرمایا: فانی صاحب! اس جگہ کے لئے مجھے آپ سے بہتر اُمیدوار مل گیا ہے، آپ کے لئے پھر دیکھا جائیگا۔" چلئے وہ خوبصورت خیالی محل جسے فانی ایک مہینے سے تصور میں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ یک بیک مسمار ہو گیا۔

نواب کھڑے ہو گئے اور فانی سلام رُخصت کر کے باہر نکل آئے اسی جگہ کی اُمید میں فانی نے پرنسپل کی پیشکش کو نامنظور کر دیا تھا۔ اب اپنی غلطی پر نادم اور پشیمان تھے۔ مگر اس جگہ کا بھی انتظام ہو چکا تھا وہ موقع بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا اب اُنھیں موٹر کے نکالنے کا خیال آیا اپنے اس ارادہ کا بھی انھوں نے کسی سے ذکر نہ کیا ایک شام کو موٹر پر بیٹھے اور سیدھے آج خانے و نیلام گھر) میں جا کر نیلامی کے سپرد کر آئے۔ اُس نے دریافت کیا کس قیمت تک آپ نکالنے پر آمادہ ہیں؟۔ انھوں نے کہا۔ آٹھ سو سے کم پر ہرگز نہ بیچنا۔

موٹر فروخت کردی

فانی کی ہلکی پھلکی خوبصورت کار کی ایسی اچھی حالت میں [illegible] کے مول بکتی تو آٹھ سو میں سستی ہی سمجھی جاتی مگر [illegible] قسمتی وہاں ہمیں ساتھ ملی نیلام کے دن [illegible] موٹر [illegible] ہی نہ نکلا۔ تین سو سے اُوپر کوئی

دام لگانے والا ہی نہ تھا۔ موٹر کا نیلام ملتوی رہا۔

نیلامی نے فانی کو واقعے کی اطلاع دیکر دو آنے فی روپیہ کے حساب سے تین سو پر اپنا کمیشن طلب کیا۔ یہ ہوئے پر سوا روپے تھے۔ فانی ایسے تنگ دل ہوئے کہ دوسرے دن اس سے کہہ آئے جس قیمت پر موٹر بکے بیچ دینا۔ اگلے نیلام میں ایک ہزار مالیت کی موٹر تین سو میں نیلام ہو گئی۔ دونوں نیلاموں کا کمیشن وضع ہونے کے بعد فانی کے ہاتھ جو آیا وہ ڈرائیور کی چڑھی ہوئی تنخواہ کے لئے بھی کافی نہ تھا۔

اب فانی نے مجھ سے اس تازہ مصیبت کا ذکر کیا۔ مگر موٹر نیلام ہو جانے کے بعد عملی ہمدردی کا موقع ہی کیا رہ گیا تھا جس کے لئے میں کوئی دوڑ دھوپ کرتا۔ جو لوگ تقدیر کے قائل نہیں اُنھیں فانی کی سرگزشت سے سبق لینا چاہئے سعدی علیہ الرحمہ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

اگر بہ ہر سرِ مویت ہُنر دوصد باشد
ہُنر بکار نیاید چو بختِ بد باشد

شراب خانہ خراب

عید تو گذر گئی مگر اپنے پیچھے سیکڑوں رعنائیاں دربار میں چھوڑ گئی۔ یعنی ہنوز وہ مہمان جو ہزار روپیہ خرچ ہونے کے بعد دُور دراز مقامات سے اس تقریب سعید کے لئے بلوائے گئے تھے۔ اپنی مقررہ قیام گاہوں میں مقیم تھے۔ ان کی سیر و تفریح کے لئے ٹیکسیاں پرنس کے اشارے پر مقرر ہو گئیں جو رات دن اُن کے دروازے پر حاضر رہتیں۔ ہر ٹیکسی چوبیس گھنٹے کا کرایہ [illegible] روپیہ یومیہ کے حساب سے چارج کرتی تھیں۔ صبح کا ناشتہ کر کے یہ سواریاں اس شان سے نکلتیں کہ اگلی موٹر پر سب سے حسین مہمان کے ساتھ شاہم صاحب خیم سے سبب بلوا کر بیٹھتے۔ شاید اپنا جسم وفاتوں جسم کو بہ قربِ شباب کی گرمی سے گرمانا مقصود ہو۔ اس میں شک نہیں کہ بجلی کے اس بے ضرر علاج کا طریقہ جس قدر اچھوتا اور انوکھا تھا اتنا ہی زود اثر اور مفید بھی تھا۔ ان کے موٹر کے بعد جتنی موٹریں ہوتیں جس سڑک سے یہ سواریاں گذرتیں ماہ چلتے تصویر حیرت بن جاتے معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے کچھ ستارے سرزمین حیدرآباد کی سیر کرنے اُتر آئے ہیں۔ اسی طرح کی ایک سواری نکلتا رہتے

[illegible] جاتی ہے۔ سامنا ہوتے ہی پرنس کے حضور درباری آداب بجا لایا۔ پھر ادب سے اُسی جگہ کھڑا ہو گیا۔

آمیختۂ شراب و مہتاب

پرنس نے مجھ سے بلطف فرمایا۔ صدق بمبئی کے ایجنٹ سے تم بخوبی واقف ہو۔ اُسی نے مجھے یہ تحفۂ نایاب بھیجا ہے میں نے تم کو حسن کا نقاد جان کر سب سے پہلے یاد کیا ہے اور تمہاری [illegible] کا مشتاق ہوں۔ میں نے دست بستہ عرض کیا ؎

خدا آباد رکھے ہم صفیرانِ گلستاں کو
جو کوئی پھول کھلتا ہے تو ہم کو یاد کرتے ہیں

فرطِ مسرت سے پرنس کا چہرہ دمکنے لگا۔ اس حسینہ سے فرمایا یہ ہمارے دربار کے شاعر صدق جائسی ہیں۔ دیکھو حسبِ موقع کیا شعر پڑھا ہے۔" اب اس نے بھی مجھ پر لطف آگیں نظریں ڈالیں اور بڑے نازو ادا سے سلام کے لئے ہاتھ اُٹھایا۔ میں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ کر سر جھکایا۔ اب پرنس نے میری ذہانت ذکاوت اور [illegible] کلام کی انتہا سے تعریف و توصیف شروع کر دی۔ کاش پرنس مجھے بیٹھنے کا حکم دیتے اور جس قدر میری تعریف فرمائی اس کا سواں حصہ بھی توصیف میں نہ صرف کرتے۔ مگر وہ بیٹھنے کی اجازت دینا شاید بھول گئے۔ میں از خود بیٹھ نہ سکتا تھا۔ یہ بات آدابِ دربار کے خلاف ہوتی۔ اُن کے ہر تعریفی جملے اور توصیفی فقرے پر مجھے سات سات سلام علیحدہ کرنے پڑے۔ کھڑے رہنے کی سزا کیا کم تھی [illegible] ان پر سلاموں کی مصیبت۔ میں جان سے بیزار تھا۔ [illegible] بنا ہوا تھا [illegible] مصداق۔ [illegible] بہت [illegible] اجازت [illegible] تھا کہ [illegible] ایک گھنٹہ کی سزا کے بعد [illegible] جان کو میری بے بسی پر رحم آیا۔ پرنس سے کہا یہ بیٹھتے کیوں نہیں؟ اس سوال پر پرنس چونک پڑے۔ فرمایا کہ تم بیٹھے کیوں نہیں؟ میں نے اس مرحمت خسروانہ پر پھر سات سلام کئے اور بیٹھا کیا [illegible] ایک کرسی پر گر پڑا۔

[illegible] اُس کا تعارف شروع کیا۔ فرمایا اس کا نام [illegible] صاحب کی [illegible] عرض کرتا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کس [illegible]

بدن کی توصیف میں شعر پڑھوں۔ کس پر مسلسل غزل لکھوں۔ بالآخر دل ہی دل میں یہ شعر پڑھنے اور اس کا لطف لینے لگا ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

پرنس نے بمبئی کے ایک سفر اور وہاں کے حسن بے پناہ کی داستان چھیڑ دی۔ میں موقع موقع سے بجا اور درست کہتا رہا [illegible] کو پرنس کے اے۔ ڈی۔ سی۔ حاضر ہو کر آداب بجا لائے۔ ان کے بعد دو ایک امیر زادے اور چند پیدل دربار کا حاضر ہوئے سب کے آخر میں کومیاں نے حاضر ہو کر سلام کیا۔ آج دس پانچ سے زیادہ نہ تھے۔ فانی۔ کیرتو۔ پیا۔ امک جنگ۔ [illegible] کو یاد نہ فرمایا تھا۔ میں نے [illegible] سے آہستہ اس کا سبب [illegible] انہوں نے کہا۔ یہ بزمِ خاص ہے وہ لوگ بزمِ عام سے متعلق ہیں اس محفل میں ان کا گزر کہاں۔

دس بجے رات کو ایک خوبصورت خادم نے پہلے پرنس کے آگے پھر مہ جبیں کے آگے دو شفاف میزیں لگائیں۔ اس کے بعد مصاحبوں کے آگے اسی طرح کی میزیں رکھیں۔ دوسرے خادم نے پرنس کے سامنے بادۂ آتش رنگ کی دو بوتلیں لا کر ایک ڈش [illegible] کی رکھی جس میں بکرے کے گردے اور کلیجی کے کباب تھے۔ وہ جگہ [illegible] کی خوشبو سے مہکنے لگی۔ پھر [illegible] میں جام [illegible] صفائی [illegible] بھی شرما جائے بوتلوں کے پاس قرینے سے رکھ دیئے آج پہلی مرتبہ میں نے شرابِ انگوری کو بوتل کے اندر سرِ بمہر دیکھا۔ اشارہ پا کر [illegible] نے ایک بوتل کی کاگ کھولی جو رقیق قطعے میں جام بلوروں سے [illegible] پرنس نے اپنے ہاتھ سے ان بلوریں ساغروں کو بھرا اور مجھے اُستاد جلیل کا یہ شعر یاد آیا۔

ساقی! تری شراب جو شیشے میں تھی پری
ساغر میں آکے اور بھی سانچے میں ڈھل گئی

ایک ساغر پرنس نے اپنے سامنے رکھا اور دوسرا [illegible] نازنین کو عطا فرمایا۔ تیسرے کے لئے اُنہے اشارہ کیا کہ [illegible] اپنے ہاتھ سے لے۔ دوسری بوتل کی [illegible] خادم [illegible] مصاحبوں کو دینے لگا۔ جس کے آگے [illegible] کرتا اور پیالہ خادم سے لیتا۔ وہ آنکھیں [illegible]

پیسا گلاس بائیں ہاتھ میں لے کر اُٹھی اور میرے داہنے ہاتھ کی طرف آکر کھڑی ہو گئی۔ میں گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور بڑی سے ہاتھ جوڑ کر عرض کی سرکار اسے اُس سے معاف فرمائیں پینا تو کجا میں نے تو آج سے پہلے اس کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔ مگر پرنس اس وقت غالباً دل میں طے کر چکے تھے کہ آج حضرت کو بے پلائے نہ رہوں گا۔ فرمانے لگے۔۔ افسوس تم یہ نہیں دیکھتے کہ تمہارے لئے زحمت کون کر رہا ہے ایسے موقع تو قسمت والوں کو ہی ہاتھ آتے ہیں عمر بھر آج کا دن یاد کر کے فخر کرو گے کہ پہلے پہل مجھے کس کے ہاتھ سے شراب ملی تھی۔

شرما کے پی گیا

میں نہایت لجاجت سے عذر کرتا رہا۔ مگر پرنس نے کوئی عذر نہ سنا وہ یہی فرماتے رہے کہ اگر اب تم نے ان کے ہاتھ سے شراب پینے میں عذر کیا تو میں آج سے تمہاری شاعری کا قائل نہ رہوں گا غضب خدا کا غزل گو شاعر اور ایسے ماہ وش ساقی کی بات ٹھکرا دے۔ میں کیونکر سمجھاؤں مختصر یہ کہ اس رد و بدل میں دس منٹ تو ضرور صرف ہوتے ہونگے جب یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ اگر اب تم نے انکار کیا۔ تو مجھے خود اُٹھنا پڑے گا میں سمجھ گیا کہ اب مفر کی کوئی صورت نہیں فرار کے سب راستے بند ہیں ہندوستانی بہ ستم ہی رسد والا معاملہ ہے میں نے بہ مجبوری اُس دلربا کے نازک ہاتھوں سے جام لے لیا ایستادہ ہو کر پرنس کو درباری سلام کیا پرنس خوش ہو گئے۔ فرمایا۔ یہ عقل کی بات ہے۔ میں نے یا غفیہ کہہ کر پہلا گھونٹ پیا معلوم ہوا جیسے کسی نے نیم کا پانی پلا دیا۔ کڑوی ایک تیز تند حلق سے سینے تک اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ منہ بنانا مقتضائے فطرت تھا۔ پرنس ہنسنے لگے۔ فرمایا۔ میں نے تم کو نہایت ہلکی شراب دی ہے اسے شیمپین کہتے ہیں اور لیڈیز ڈرنک کہلاتی ہے دوسرے

صاحبوں کی طرف اشارہ فرمایا یہ لوگ ہُوسکی تیز قسم کی بی رہے ہیں۔ یہ تیز ہوتی ہے۔ چونکہ تم عادی نہ تھے۔ میں نے شیمپین سے ابتدا کی۔ نقل را چہ عقل۔ میں بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی اسی طرح ایک ایک گھونٹ پینے لگا۔

اسی جگہ ایک قابل ذکر بات رہی جاتی ہے کہ اس محفل میں قاضی میر محمد صاحب [قاضی حیدر محمد صاحب] میر تخلص [illegible] تاب گڑھ کے مضافات کے متوطن۔ اس وقت جالس انگریزی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ انگریزی کے علاوہ عربی و فارسی میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے۔ فرصت کے اوقات میں تعویذ لکھتے۔ تقریبا اُتارتے۔ شاد بجاتے شطرنج کھیلتے۔ نجوم میں بھی کافی مہارت تھی، شعر بھی کہتے تھے اور بے حد زندہ دل تھے۔ اب مدت سے تصوف کی طرف زیادہ رجحان ہے ستاسی سال کی عمر ہے۔ جوش کی شاعری کے قائل نہیں۔ ان کو فکر قدرت شاعر اور ان کے جواہر پاروں کو ہذیان۔ بلکہ اس اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں بکم و بیش چالیس سال سے لکھنؤ میں شاہ عبدالرحمٰن صاحب کی درگاہ میں قیام ہے انہی نے میرا زائچہ بنایا تھا۔ من جملہ اور پیش قیاسیوں کے ایک پیشین گوئی یہ بھی کی تھی کہ ایک دن شراب بھی پیو گے۔ میں نے اسی وقت ہنس کر ٹال دیا تھا مگر قاضی صاحب نے یہ بات کہہ کر معذرت کی تھی کہ میں تو وہ بات کہتا ہوں جو تمہارے ستاروں کی رفتار کہتی ہے اپنی طرف سے ایک حرف بڑھاؤں گا تو کافر۔ بات گئی گذری۔ لیکن مدت کے بعد پیشین گوئی اس طرح پوری ہوئی۔

کچھ دیر بعد میں نے نشے کی کیفیت کو بھی محسوس کیا۔ اس میں شک نہیں کہ واقعی مسرت میسر ہوئی۔ خدا خدا کر کے یہ جلسہ ختم ہوا۔ مگر اس عرصے میں کئی میاں بھانڈی کے دس [illegible] ختم کر چکے تھے دونوں آنکھیں [illegible] کی سرخ تھیں آواز [illegible]

غزل

اسماعیل ذبیح (سرونج)

موت کی سمت چل دیئے اُٹھتے ہوئے کئی پیام
ٹوٹے ہوئے دلوں نے جب زہر بھرے اُٹھائے جام
حالانکہ کائنات میں ذرہ بے بساط ہوں
ذات ہے میری ہی مگر ذاتِ خدا سے ہم کلام
دل کی شکست کو نہ تو درد کی انتہا سمجھ
راہ میں عشق کی نہیں کوئی بھی آخری مقام
کھنچ رہے ہیں کچھ خطوط کیا ہیں یہ کچھ خبر نہیں
دیکھئے گل کھلائیں کیا اس نئے دور کے امام
اہلِ جہاں کا یہ خراج مجھ کو نہیں ہے سازگار
آ ذبیحؔ کہ میں نے آج اپنا سمجھ لیا مقام
زخموں کی اوڑھ کر ردا کرب کا احترام کر لیا
اپنے ہی قتل کا ذبیحؔ آؤ کریں کچھ اہتمام

پھر اہٹ پائی جاتی تھی۔ لیکن اب بھی ہاتھ جوڑ کر پرنس کا جواب دیتے تھے اس بدمستی کے عالم میں بھی اتنا احساس تھا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔ ان کے علاوہ دوسرے جلیسوں نے بھی پانچ پانچ چھ چھ ساغر لنڈھائے تھے۔ مگر کیا مجال جو کوئی بہکا ہو۔ سب کے سب آداب دربار کے اسی طرح پابند تھے جیسا میں ہوش و حواس کے عالم میں ان کو دیکھنے کا عادی تھا اس سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جو لوگ شراب پی کر بدمستی کرتے ہیں اُن بہکنے میں بڑا دخل تصنع اور بناوٹ کو ہوتا ہے۔

اب پرنس کے اشارے پر مغزادہ بندو نے ساز سنبھالا اور سرکاری مشاعرہ شروع ہوا۔ میں رات کے ۲ بجے کھانے کا عادی۔ بارہ جو بج گئے تو بھوک سے برا حال تھا۔ اُدھر پرنس نے مجھے یہ کہکر مخاطب فرمایا: صدق آج تم اکیلے ہو۔ لیکن ایک ایک شعر پہ تڑپ اُٹھو تو سند ہے۔ سرکار کو کیا خبر کہ صدق آج بے شعر سنے ہی بھوک سے تڑپ رہا ہے۔ مگر بندگی بیچارگی۔ میں نے بھوک کا خیال ... چھوڑ کر شعر ہی پہ تڑپنے میں مصلحت دیکھی۔ مصیبت یہ تھی کہ فانی بھی نہ تھے۔ وہ ہوتے تو کچھ وہ کہتے کچھ میں کہتا [illegible] کا پاسٹ ادا کرنا تھا۔ خدا خدا کر کے دو بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ پرنس نے اے۔ ڈی۔ سی سے فرمایا: آج صدق بہت تڑپے ہیں، دیکھو کھانا تیار ہے؟ غلام نے عرض کی، تیار ہے۔ پرنس اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے حکم ہوا۔ تم منہ دھو ڈالو۔ دو منٹ میں ہاتھ منہ دھو کر میں ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔ اور سب پہلے ہی سے حاضر تھے۔

پرنس کے داہنے ہاتھ کی پہلی کرسی پر وہ حسینہ جلوہ گر تھی بائیں ہاتھ کی طرف پہلی کرسی پر مجھے بیٹھنے کا حکم ہوا میں درباری آداب کر کے اپنی جگہ بیٹھا۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے گمان ہوا کہ سحری کھانے بیٹھا ہوں۔ یا تو بھوک سے بے چین تھا یا اب مطلق اشتہا نہ تھی۔ کھانے کا جو وقت ٹل گیا تو بھوک بھی مر گئی تھی کھانے پر پرنس نے فرمایا: صدق! مہمان عزیز کی خاطر آج کھانے میں تم کو تھوڑے تکلف نظر آتا ہوگا۔ اسی مجبوری سے کھانے میں [illegible] دیر بھی ہوتی ہے لیکن میں یہ کیونکر گوارا کرتا کہ حسب معمول گھر میں کھانا تیار ہو وہ ان کے سامنے رکھا جائے مہمان کی تواضع کے لوازم ہر مذہب میں موجود ہیں۔ میں نے عرض کیا۔ خصوصیت کے ساتھ مہمان حسین کے لئے۔ پرنس نے خوشدلی سے میرے جملے کو دہرایا پھر فرمایا شاباش! میں نے عرض کیا ؎

مہمان حسین قابل عزت ہے جدھر جائے
آنکھوں میں ٹھہر جائے کہ سینے میں اُتر جائے

پرنس نے فرمایا۔ مصرع ثانی نے شعر کو بہت بلند کر دیا ہے خوب ہے۔ پھر پڑھو! میں نے دوبارہ پڑھا، پھر فرمانے لگے: تم نے بھی محسوس کیا کہ ان کی وجہ سے آج وقت کا پتہ نہیں معلوم ہوتا کہ کب صبح ہو جاتی تھی مگر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی آیا ہوں۔ میں نے دست بستہ عرض کیا ؎

زلفوں پہ کبھی شوق سے چہرے پہ نظر جائے
کیا وقت ہے وہ کیا جو حضوری میں ... جائے

پرنس نے بے ساختہ "بہت اچھی غزل" کہا۔ پھر فرمایا حضوری کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے اُردو کے کسی شاعر نے اس لفظ سے وہ فائدہ نہیں اٹھایا جو تم نے اُٹھایا ہے مجھ نے ایک خوشگوار تبسم کے ساتھ کہا: بہت اچھا کہتے ہیں۔ پرنس فرمانے لگے۔ صدق یہ تمہاری شاعری کی معراج ہے۔ مہاراجہ کشن پرشاد یا سر اکبر یا اس قبیل کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی تمہارے حق میں سو تعریفی جملے کہتا تو میری سامنے میں تم کو وہ روحانی مسرت حاصل نہ ہوتی جو ان کے اس جملے سے ملی ہوگی۔ میں نے اُٹھ کر پہلے پرنس کو پھر اس آفت جاں کو سلام کیا۔ اس نے ایک عجیب انداز سے سر کے اشارے سے سلام لیا۔ اس کے بعد وہ صحبت ختم ہو گئی۔ گھر جانے کی اجازت ملی۔ دوسرے دن میں نے قاضی میر محمد صاحب کو خط لکھا کہ آفریں ہے آپ کی پیشین گوئی پہ۔ شب گذشتہ مجھے اس طرح مجبور ہو کر شراب پینی پڑی۔ قاضی صاحب نے جواب لکھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مارے خوشی کے جامے میں پھولے نہیں سماتے۔ اللہ میرے خط کو معاذ اللہ اپنی غیبت دانی کے لئے ایک طرح کی سند سمجھتے ہیں۔

اس یادگار رات کے بعد پھر پرنس نے عام نائٹ وش کی محفلوں میں کبھی مجھے پینے کو نہ کہا۔ خاص خاص محفلوں میں میں چونکہ ان کا شریک ہوتا تھا۔ لیکن ایسی محفلیں سال میں کہیں دو چار مرتبہ ہوتی تھیں۔

(باقی آئندہ)

ناردرن ریلوے

عزیز طلباء، زائرین اور سیاحو!

ہندوستان دیکھئے سہل طریقے سے

ملک کے گرد سرکلر ٹور کے لئے اور دوسرے درجے کے سرکلر ٹور ٹکٹ مقررہ ریلوے سٹیشنوں سے خریدئیے میل ایکسپریس کے کرایوں میں ۵ا فیصد رعایت کے ساتھ یہ ٹکٹ ۳۰۔ ۶۰۔ ۹۰ دن کی مدت کے اندر قابل استعمال ہوں گے۔ مدت کا انحصار طے کئے جانے والے سفر کے کل فاصلے پر ہے۔ سفر کے دوران آپ جب چاہیں جتنی بار چاہیں اور جتنے عرصہ کے لئے چاہیں گے آگے کا سفر ملتوی کر کے کہیں بھی قیام کر سکتے ہیں شرط یہ ہے کہ ٹکٹ کی کل مقررہ میعادِ استعمال نہیں بڑھ سکے گی۔

آپ کی سہولت اور ضرورت کی مناسبت سے ہم نے ایسے تیس سرکلر ٹورز کا بندوبست کیا ہے ان کے ذریعہ اس سارے عظیم الشان تکارے کا احاطہ ہو سکے گا۔ جسے ہندوستان کہا جاتا ہے۔ ان ٹورز میں سے کسی کا انتخاب کر لیجئے۔

اور اگر آپ کا کوئی ایسا پروگرام ہے جو آپ کی انفرادی ضرورت کے مطابق ہو تو اس کے لئے ہم سے خود ملئے یا ہمیں اپنا پروگرام لکھ کر بھیجئے۔ ہم آپ ہی کے ٹور پروگرام کے لحاظ سے کرائے کا حساب کبھی رعایتی شرح پر لگا کر آپ کو مطلع کر دیں گے۔

یہ ٹور سرکلر ہونا چاہئے اور اس کا فاصلہ ۲۴۰۰ کلو میٹر سے کم نہیں ہونا چاہئے اس کے ساتھ وہ فاصلہ جس کا کرایہ چارج کیا جا رہا ہے۔ ٹور پروگرام کے آغاز کے سٹیشن سے پروگرام کے آخر تک کے سٹیشن تک ان سٹیشنوں کے درمیان براہِ راست مسافت کے فاصلے کے مقابلے میں کم از کم تین گنا سے زیادہ ہونا چاہئے۔

مزید معلومات کے لئے براہِ کرم اپنے قریب ترین ریلوے سٹیشن ماسٹر یا متعلقہ ڈویژنل کمرشیل سپرنٹنڈنٹ سے ملئے۔ یا پھر ہم سے براہِ راست رابطہ قائم کیجئے۔

چیف کمرشیل سپرنٹنڈنٹ

ناردرن ریلوے، نئی دہلی

ٹیلیفون: ۳۸۔۴۳۲۶، ۳۸۔۷۵۰۳

نگارش ان کا ہی ایک "طرۂ امتیاز" ہے۔ اور نعت گوئی میں یہ اپنی مثال آپ ہے۔ ؎

یہی ہے وہ حسین وادیٔ عرفانِ وجود
کہ ہر قدم پہ اہلِ عشق پڑھتے ہیں درود
یہاں نہیں ہوا تھا موجوداتِ عالم کا نظام
گوشِ ہستی نے سنا تھا پہلے فطرت کا پیام

نعت گوئی کے ساتھ منقبت نگاری کا بھی ایک منطقی رشتہ ہے مگر یہ صنفِ شاعری بھی بڑی نازک اور پُر پیچ سی ایک منزل ہے۔ اس میں رسولِ اکرم حضرت علی، حضرت فاطمہ جناب امام حسنین دوسرے اہلِ بیت صحابہ کرام اور اولیاء اللہ اور صوفیاء کا مقام آتا ہے۔ چنانچہ "منقبت نگاری" میں ہر صاحبِ منقبت کے مقام و منصب کا خاص طور سے لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ حضرت آرزو سہارنپوری نے اس منزل میں بھی کاوشیں کیں اور خوب کیں اور یہاں بھی کامران اور کامگار ہی نہیں بلکہ ایک ممتاز اور منفرد مقام کے حامل نظر آتے ہیں انھوں نے حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ حضرت امام حسن و حسین اور دوسرے اہلِ بیت کی شان میں قلم فرسائی کا بہت سی منقبتیں لکھیں لیکن ہر منقبت میں۔ صاحبِ منقبت کی شان و عظمت کے بیان اور ان سے عقیدت و محبت کے اظہار میں آرزو سہارنپوری کا وہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے جس کی کسی بڑے سے بڑے عالمِ دین سے توقع کی جاسکتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی ہر منقبت گہری ہوئی ہے اور اس سلسلہ میں ان کی وسیع تر اور گہری معلومات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور بے ساختہ زبان پر آتا ہے کہ "مجموعۂ اس شانِ ایمان کو کیسے کفر سا مانی" حضرت علی کی کرامات اور ان کی شان میں آپ کی کئی تخلیقات ہیں ان میں سے "تجلیٔ ایمان" میں آپ کی حضرت علیؓ سے حسنِ عقیدت دیکھیے ؎

عکسِ جمال جلوۂ یزداں ہے بوتراب
چرخِ ولا کا نیرِ تاباں ہے بوتراب
اوراقِ کائنات کی ترتیبِ بے مثال
تفسیرِ بے نہایتِ قرآں ہے بوتراب

اسی طرح حضرت فاطمہؓ کی شان میں کئی تخلیقات میں سے "شہزادیٔ کونین" کا ایک بند ہے۔ ؎

اے گنجِ وفا، کانِ حیا، معدنِ عفت
سرچشمۂ پاکیزگی، نورِ طہارت
اے نکہتِ محسوسِ گلستانِ رسالت
اے تابشِ آئینۂ اسرارِ امامت
خوشبو تری فردوسِ حقائق کی مہک ہے
جلوہ تیرا عصمت کے ستاروں کی چمک ہے

حضرت امام حسن کی عظمت و توقیر کا اظہار "ولادتِ حسن" میں اس طرح کیا ہے۔ ؎

نکہتِ رنگ و نور کا چار طرف ہجوم ہے
خانۂ بوتراب میں خلقِ حسن کی دھوم ہے
جوہرِ نورِ فاطمہ زینتِ روحِ مصطفیٰ
گوہرِ درجِ ہاشمی چشم و چراغِ مرتضیٰ

"دلبندِ فاطمہ" کے عنوان حضرت امام حسینؓ کی شان و عظمت کا ایک بند ہے۔ ؎

پردہ کشائے زلفِ رخِ غم تو ہی تو ہے
انسانیت کے باب کا پرچم تو ہی تو ہے
مقصودِ ذہنِ خالقِ عالم تو ہی تو ہے
نازِ تمام و عظمتِ آدم تو ہی تو ہے
پیکر ہے ایک جلوۂ حسنِ قبول کا
دلبند فاطمہ کا ہے بیٹا رسول کا

جناب آرزو سہارنپوری نے اپنی منقبت نگاری کو صرف پنجتن اور اہلِ بیت تک ہی موقوف نہیں رکھا بلکہ اس سلسلہ کو بڑھا کر ان بہت سے جلیل القدر اور عالی مرتبہ بزرگانِ دین اور اولیا و صوفیا تک پہنچا دیا ہے۔ جن کا دینِ حق و صداقت کی تبلیغ اور پرچمِ وحدت و رسالت کی سربلندی میں بڑا عظیم اور تاریخی کردار ہے۔ اس سلسلہ کی تمام نظمیات کا مجموعہ "بہارستانِ اولیا" کے نام سے اردو ادب اور تاریخِ منقبت میں ایک سنہری باب ہے۔ اس "صحیفۂ تبریک" کا آغاز بھی حضرت آرزو سہارنپوری نے قرآن پاک کی اس آیت سے کیا ہے جو اولیاء اللہ کی شان میں ہے "اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ" یہ مجموعہ تقریباً ۹۰ منقبتی نگارشات پر مشتمل ہے اس میں پنجتن اور دنیائے اسلام کے بڑے بڑے عالی مرتبہ بزرگانِ دین کے علاوہ ہندوستان کے جلیل القدر

اولیائے کرام کی کافی بڑی تعداد موجود ہے۔ دنیائے اسلام کے بزرگانِ دین میں حضرت اویس قرنیؓ، حضرت خواجہ حسن بصریؒ، حضرت رابعہ بصریؒ، حضرت سلطان بایزید، حضرت جنید بغدادی اور حضرت غوث الاعظم وغیرہ کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں اور ہندوستان کے اولیاء کرام کی ایک بڑی تعداد حضرت خواجہ معین الدین چشتی سے لیکر حضرت بابا تاج الدین تک حضرت آرزو سہارنپوری کے اس منقبتی مجموعہ "بہارستانِ اولیاء" میں شامل ہیں۔ اس کاوش کے مطالعہ سے آپ کے تبحرِ علمی اور تاریخی معلومات پر حیرت ہوتی ہے کہ آپ کو اولیاء کرام اور بزرگانِ دین سے صرف محبت و عقیدت ہی نہیں بلکہ ان تمام بزرگانِ دین کی تاریخ اور ان کی سوانح حیات کا بھی آپ گہرا مطالعہ رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ نے جس بزرگ اور صوفی کی شان میں منقبت لکھی اس میں صرف تخیل پروازی ہی سے کام نہیں لیا بلکہ ہر ایک کے منصب اور مرتبہ کا لحاظ رکھا اور ہر ایک کے اپنے تصرفات اور کرامات پر روشنی ڈالی ہے اور صرف یہی نہیں کہ یہ تخلیقات آپ نے گھر بیٹھ کر کہی ہوں بلکہ ہر منقبت کے ساتھ آپ نے اس مقام و سال کا اندراج کیا ہے کہ جہاں اور جب آپ نے حاضر ہو کر اور اس بزرگ کے آستانہ مبارک پر سرِ نیاز جھکایا اور یہ سعادت حاصل کی ہے۔ حضرت آرزو سہارنپوری کی ان بزرگانِ دین سے یہ کتنی محبت اور دلی عقیدت کا ثبوت ہے۔ اختصار و انتخاب کے مدِ نظر کچھ مخصوص اور جلیل القدر اولیاء کرام کی شان کے مظہر ان کی متعلقہ منقبت میں سے دو دو گلہائے عقیدت پیش ہیں۔

حضرت اویس قرنیؒ سے

عاشقِ نادیدہ پیغمبرِ خیر الانام
کُشتۂ عشق سراپا سوزِ پنہانِ تمام
کیوں نہ تیری ذاتِ اقدس پر شیت کو ہو ناز
خود رسولِ دوسرا کرتے تھے تیرا احترام –

حضرت خواجہ حسن بصریؒ سے

کنزِ عرفان و فنا فی العشق ختم المرسلین
قطب الاقطاب زماں جانِ امیر المومنین
سب تری نظروں میں ہے جھے تجلی سر جلی
تیرے سینہ میں ہے علم سینۂ مولا علی

سلطان العارفین حضرت بایزید بسطامیؒ سے

سرگروہِ رِندان ہیں بایزید بسطامیؒ
آفتابِ عرفاں ہیں بایزید بسطامیؒ
وحدت و حقائق کا حکمت و معارف کا
جوہرِ نمایاں ہیں بایزید بسطامی

حضرت جنید بغدادیؒ سے

فروغِ بزمِ ولا ہیں جنید بغدادی
امیرِ ملکِ فنا ہیں جنید بغدادی
رُخِ نگارِ حقیقت کے حسنِ باطن کی
لطیف سی اک ادا ہے جنید بغدادی

حضرت غوث الاعظمؒ سے

میری زباں سے کیا ہو تری ثنا یا غوث
کہ تو ہے تاجِ سرِ جملہ اولیا یا غوث
جہاں پہ ختم ہو ہر مرکزِ فنا و بقا
وہاں سے ہے تری منزلِ ابتدا یا غوث

غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے

خواجۂ ہند الولی نورِ ہدایت السلام
تاجدارِ تاجدارانِ ولایت السلام
مرہمِ زخمِ دل و جاں مونسِ بیچارگاں
چارہ سازِ دردمندانِ عقیدت السلام

حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ سے

رشدِ پاکانِ رئیس الاولیا گنجِ شکر
ذی وقارِ ذی حشم ذی مرتبت عالی گہر
پاک ظاہر، پاک باطن پرتوِ مہرِ یقین
شاہکارِ کلکِ فطرت آفتابِ علمِ دین

حضرت نظام الدین محبوب الہیؒ سے

ادب سے لیتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بشر کی فہم سے اونچا مقام ہے تیرا
خدا نے تجھ کو عطا کی ہے شانِ محبوبی
ترا جمال سراپا ہے جانِ محبوبی

حضرت علاء الدین مخدوم صابر کلیریؒ سے

واسے علاء الدین علی احمد علی کے نورِ مبین
اے سکونِ قلبِ شاہ و مشرقین و مغربین
جس کا شیدائی ہے تو وہ اور ہے کائنات
جس مقامِ عشق پر تو ہے وہاں دن ہے نہ رات

حضرت بو علی شاہ قلندرؒ سے

عجب مجھے ہے متاعِ قلندری تیری
کہ دیکھتی ہے تجھے رشک سے شہنشاہی
ہزار ارض و سما جذب ہیں ترے دل میں
نہ جانے خضر ہیں گم کتنے تیری منزل میں

حضرت امیر خسروؒ سے

شاعرِ معجز بیاں اے خسروِ عالی مقام
جانِ محبوبِ الٰہی پیکرِ سوزِ تمام
جذبۂ عشق و محبت تیرے آب و گل میں تھا
ہر قدم تیرا فنا فی الشیخ کی منزل میں تھا

غرض یہ کہ جناب ساہو رام آرزو سہارنپوری شعر و سخن میں اپنی عام استادانہ اور فنکارانہ خوبیوں کے علاوہ نعت گوئی اور منقبت نگاری میں بھی ایک نام نہاد غیر مسلم ہونے کے باوجود نہایت ہی بلند اور منفرد و ممتاز مقام کے حامل ہیں اور اس سلسلے میں آپکے دونوں مجموعہ ہائے کلام "ظہورِ قدسی" اور "بہارستانِ اولیاء" نہ صرف اردو ادب اور تاریخ شعر و سخن میں بلکہ حلقہ ہائے رشد و ہدایت کے لئے بھی وہ گرانقدر عطیات ہیں جن پر رہتی دنیا تک پرستارانِ نبی اکرم و اہل بیت اور عقیدت مندانِ اولیاء کرام ناز کرتے رہیں گے اور فیضانِ وجدان پاتے رہیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ؎

کہنے کو یوں تو کفر بداماں ہے آرزو
سچ پوچھئے تو رشکِ صد ایماں ہے آرزو
ہے نعت و منقبت کی جو دنیا کا فخر و ناز
عالم کا وہ ایک فکرِ درخشاں ہے آرزو

غزل

جناب احسن رضوی
(باندرہ بمبئی)

فروغِ جلوہ آنکھوں کے لئے پردہ بھی ہوتا ہے
تڑپتی بجلیوں سے آدمی اندھا بھی ہوتا ہے
اسی حد تک یقینِ وعدۂ فردا بھی ہوتا ہے
کہ بھیگی چاندنی پہ صبح کا دھوکا بھی ہوتا ہے
شبِ غم کہہ رہی ہے دل کی لو سے گھر کی ویرانی
اکیلی شمع جلتی ہے تو سناٹا بھی ہوتا ہے
تم آئے ہو خریدارِ دل و جاں بن کے سوچو تو
یہ وہ بازار ہے گاہک جہاں رسوا بھی ہوتا ہے
کہاں منجدھار میں پھنستے ہو دریا چھاننے والو
ارے طوفان تو آنسو کا اک قطرہ بھی ہوتا ہے
صدا آتی ہے جیسے دور سے بے مدعا دل کی
چھڑا تا ہے جو تم سے ہاتھ وہ تنہا بھی ہوتا ہے
محبت کتنی کافر ہے دلِ بے تاب سے پوچھو
جسے کہتے ہیں بت اس کے لئے سجدہ بھی ہوتا ہے
ادائیں بھر رہی ہیں رنگِ عبرت زمانے میں
کوئی سنتا بھی ہے سن سن کے شرمندہ بھی ہوتا ہے
عجب نیرنگِ عالم ہے کہ انساں بزمِ ہستی میں
حقیقت بن کے جیتا ہے افسانہ بھی ہوتا ہے
اثر نازِ تبسم کا ہو یا رنگِ طبیعت ہو
ترے ہنسنے سے اپنے غم کا اندازہ بھی ہوتا ہے
سمجھ لو دل کا ویسا حال جیسا وقت پڑ جائے
یہی پتھر بھی ہوتا ہے یہی شیشہ بھی ہوتا ہے
ہنسی آجائے گی ان کو مرے آنسو بہانے پر
یقیں آتا نہیں دل کو مگر ایسا بھی ہوتا ہے
نہ بن مغرور اتنا دیکھ قیمت حسنِ یوسف کی
بہت مہنگا ہے جو سودا بہت سستا بھی ہوتا ہے
یہ ہستی بوجھ ہے احسن مگر دل مطمئن رکھو
اٹھاتے ہیں جسے کاندھا کبھی ہلکا بھی ہوتا ہے

یوپی سے ایک علمی و ادبی ماہنامہ "العلم" جاری کیا جو ۱۹۱۶ء تک شائع ہوتا رہا اس کے بعد علامہ کو ۱۹۱۶ء میں انسٹی ٹیوٹ گزٹ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی ایڈیٹری سپرد کی گئی۔ تقریباً دو سال تک علامہ اس خدمت کو بحسن و خوبی انجام دیتے رہے اس کے بعد ۱۹۲۰ء سے ہندوستان کی آزادی کی قومی تحریکوں میں سرگرم حصہ لینے لگے۔ کچھ عرصے بعد نان کوآپریشن تحریک میں شامل ہونے اور تھانہ چوری چورا ضلع گورکھپور کا مشہور قومی واقعہ علامہ اور علامہ کے چند رفقا کی رہبری میں پیش آیا اور گرفتار ہوئے ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۲ء تک علامہ نے ایک علمی و ادبی اور سیاسی ماہنامہ "سبحان" گورکھپور سے شائع کیا اس کے بعد مولانا اکرم خاں صاحب نے علامہ کو کلکتہ آنے کی دعوت دی اور وہاں سے روزنامہ "زمانہ" علامہ کی ادارت میں نکلا جسے ایک سال بعد قومی تحریکوں کی پرزور حمایت کے الزام میں حکومت برطانیہ نے بند کر دیا۔ اسی زمانہ میں سید سجاد حسین الہ آبادی نے روزنامہ "انقلاب زمانہ" کلکتہ سے ہی نکالنے کا مشورہ دیا علامہ نے اس مشورہ کو قبول کر کے روزنامہ "انقلاب زمانہ" جاری کیا جو ۱۹۲۵ء تک بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ "بق چوں چوں" ایک مزاحیہ اخبار بھی نکلا۔ اس کے بعد علامہ کیفی چڑیا کوٹی صحت کی خرابی کے باعث کلکتے سے چلے آئے اور الہ آباد یوپی سے ہفتہ وار ترجمان "بق چوں چوں" روزنامہ خادم، ماہنامہ کلیم اور ہفتہ وار استقلال وغیرہ متعدد اخبارات و رسائل یکے بعد دیگرے جاری کئے۔ اور صحافت و علم و ادب اور شعر و سخن میں ہندوستان شہرت حاصل کر لی۔ ۱۹۲۷ء میں الہ آباد میں ہندوستانی اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا اور سر تیج بہادر سپرو آنجہانی اور علامہ کے خالہ زاد بھائی سر شاہ محمد سلیمان مرحوم چیف جسٹس الہ آباد ہائیکورٹ نے علامہ کی علمی قابلیت اور تحقیقی مہارت اور زبان دانی سے متاثر ہو کر ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں اردو اسکالر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا مشورہ دیکر صحافت کے میدان سے کنارہ کش ہونے کی رائے دی۔

علامہ کیفی نے ملک و قوم کی اس خدمت کا بھی بیڑا اٹھا لیا اور ۱۹۲۷ء سے علامہ نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد میں تالیف و تصنیف تحقیق و ریسرچ وغیرہ کا کام شروع کیا اور ۱۹۳۶ء تک بڑی جانفشانی اور دماغ سوزی سے اس کام کو انجام دیتے رہے۔ روز و شب کی شدید محنت سے علامہ کی صحت خراب ہو گئی آخر مجبور ہو کر ۱۹۳۶ء میں خرابی صحت کے باعث ہندوستانی اکیڈمی کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر وطن واپس آ گئے۔ ہندوستانی اکیڈمی میں قیام کے دوران علامہ کیفی کو ناصر گونڈوی اور ڈاکٹر تارا چند جیسی علمی و ادبی شخصیتوں کی رفاقت حاصل رہی اس سے علامہ کو کام میں اور زیادہ انہماک ہو گیا تھا۔

علامہ کیفی چڑیا کوٹی کی تصنیفات

جواہر سخن جس میں اردو کے شعراء اور ادیبوں پر مکمل تبصرہ ہے تقریباً چار ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور سات جلدوں میں ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی نے چار جلدیں شائع کیں۔ جواہر خسروی یعنی کلام خسرو کو علامہ نے بڑی مشقت سے ترتیب دیا۔ اردو ڈرامہ، وفا کی دیوی، جس کا پلاٹ عربی سے لیا گیا ہے ۱۹۳۲ء میں الہ آباد سے رام دیال پریس نے شائع کیا۔ دوسرا ڈرامہ آدھونا عربی و ترکی زبانوں سے پلاٹ لیا گیا ہے۔ مگر شائع نہیں ہو سکا۔ فلسفہ سیاسیات اسلام جو اسلامی فلسفے اور مذہب پر علامہ کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو دس برس کی کاوش کے بعد مکمل ہوئی بارہ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ لاہور میں زیر طباعت ہے۔ انگریزی IRRIGATION کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں ہندوستان گورنمنٹ کی فرمائش پر ۱۹۲۴ء میں مکمل کیا۔ تصنیف عمر نہایت کاوش سے تیار کی ہوئی کتاب ہے ۱۹۲۸ء میں ... اس میں فرانسیسی زبان سے مواد اکٹھا کیا گیا ہے ۱۹۴۰ء میں سر شاہ سلیمان مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم علیگڑھ یونیورسٹی نے البیرونی کی مشہور کتاب قانون مسعودی جو نجوم اور فلکیات پر مستند ترین کتاب ہے کا ترجمہ اردو زبان میں کرنے کے لئے علامہ کو علیگڑھ بلایا۔ علامہ نے کام شروع ہی کیا تھا کہ یکایک سر شاہ سلیمان کا انتقال ہو گیا اور یہ کام تشنہ رہ گیا۔

۱۹۴۳ء میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم سابق وائس چانسلر یونیورسٹی علی گڑھ نے اردو، عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور ترکی قلمی کتابوں کا کیٹ لاگ تیار کرنے کے لئے علامہ کو علیگڑھ بلایا جسے علامہ نے ۱۹۴۶ء تک بخیر و خوبی انجام دیا۔ ...

عربی قصیدہ مکمل کر کے علامہ نے ۱۹۱۱ء میں مصر بھیجا تھا جو بہت
وہ بیحد پسند کیا گیا اور علامہ کو سحبان الہند کا خطاب مصر سے عطا
ہوا علامہ کے ہندی کلام کا مجموعہ نوین سنگرہ ۱۹۳۶ء میں مکمل
ہوا مگر ابھی شائع نہیں ہو سکا۔ علامہ کا دیوان اردو غزلوں اور
نظموں کا دو حصوں میں ترتیب دیا گیا ہے۔ غزلوں کا حصہ کیف و الہام
اور نظموں کا حصہ جمال و جلال کے ناموں سے ہے۔ غزلیں آٹھ سو سے
زائد اور نظمیں نو سو سے زائد ہیں غزلوں اور نظموں میں عربی فارسی
ہندی اور انگریزی کے کلام بھی شامل ہیں۔ علامہ مرحوم ان پانچوں
زبانوں کے استادِ کامل تھے۔ علامہ کے کلام میں گجراتی۔ بنگلہ۔ چینی
جاپانی۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ سنسکرت۔ عربی اور روسی زبانوں کی
نظموں کے اردو ترجمے بھی شامل ہیں۔ دیوان ابتک شائع نہیں ہو سکا
مگر ترتیب دیا جا چکا ہے (یہ اردو زبان اور اہل اردو کی بدنصیبی ہے)

علامہ کیفی چڑیاکوٹی کی شاعری

شعر و شاعری کا شوق علامہ کو تقریباً اٹھارہ سال کی عمر سے شروع ہوا۔ وہ باقاعدہ طور پر شاعری میں نہ کسی کے شاگرد تھے اور نہ انھوں نے اپنے شاگرد ہی بنائے شعر و شاعری کے میدان میں وہ استادی اور شاگردی کے اصول کے خلاف تھے مگر روحانی طور پر زبردست درویش و عالم حضرت آسی (سکندرپوری) غازی پوری سے گہرا لگاؤ تھا۔ علامہ کی شاعری حضرت آسی کی دعا تھی حضرت مولانا شاہ وارث حسن صاحب کو شاہجہاں آبادی سے (جو علامہ کے والد ماجد کے شاگرد رشید تھے) علامہ بیعت تھے علامہ کا کلام بڑا منفرد ہے۔ فلسفہ اور حیاتیاتی پہلو کا مکمل نچوڑ ہے۔ الفاظ و محاورات کی چستی۔ ترکیب اور بندش کی شگفتگی اور الفاظ و روزمرہ کی صحت کا علامہ کو بڑا خیال تھا۔ عرفانیات میں علامہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ فارسی میں حافظ و رومی کے کلام سے متاثر تھے۔ اردو میں مومن کا کلام بے حد پسند تھا۔ تمام اساتذہ سے الگ اپنا رنگ قائم رکھا۔ علامہ کے کلام میں گداز و خلوص دونوں چیزیں ملتی ہیں گہرا فلسفہ اور عارفانہ رنگ تو علامہ کی سب سے بڑی خصوصیت ہے ترکیب و بندش میں کلام لاجواب ہے زبان بڑی پیاری استعمال کی ہے علامہ کا رنگ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی دونوں انداز لئے ہوئے گنگا جمنی انداز کا ایک سنگم معلوم ہوتا ہے۔ قوافی

اور ردیف کی تلاش میں علامہ کو کمال حاصل تھا۔ فن کے اعتبار سے علامہ شاعری کے ایک علیحدہ اسکول کے موجد تھے اور اس کے سب سے پہلے اور سب سے آخری فنکار خود ہی تھے۔ علامہ کو تمام اصناف سخن پر یکساں کمال حاصل تھا۔ پانچ زبانوں اردو۔ ہندی۔ فارسی۔ عربی اور انگریزی میں یکساں روانی اور استادی سے اشعار کہتے تھے۔ اشعار بہت جلد کہتے تھے بڑی زود گوئی تھی مگر کمال یہ تھا کہ معیار سے کبھی کوئی شعر کم نہ ہوتا علامہ علوم و فنون کے گویا انسائیکلوپیڈیا تھے اور علم و ادب کا مینار جہاں سے تمام دنیائے علم و فن روشنی حاصل کرتی تھی علامہ کا مزاحیہ رنگ بھی بڑا مستند تھا۔ مزاحیہ کلام کا ذخیرہ بھی اچھا خاصہ محفوظ ہے ۱۹۴۸ء میں علامہ نے مہاتما گاندھی کی یاد کے نام سے نظموں کا ایک مجموعہ تیار کیا جو پانچ زبانوں اردو، ہندی، عربی، فارسی اور انگریزی میں ہے جناب محمد اسماعیل صاحب مرحوم سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ نے شائع کرایا جس کی کاپیاں ہندوستان کے تمام ذمہ دار لیڈروں اور اہم شخصیتوں کے پاس بھیجی گئیں جنہوں نے اسے بہت پسند فرمایا علامہ کو شکریہ کے خطوط لکھے اور علامہ کی عظمت کا اعتراف کیا۔ ان تصانیف کے علاوہ علامہ نے نظموں غزلوں اور فارسی عربی و انگریزی و ہندی نظموں کے متعدد انتخابات شائع کرائے جن میں پارہ ہائے جگر اور میکدۂ کیفی بہت مقبول ہوئے۔ علامہ کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو ہند نے علامہ کی تقریباً سو غزلوں اور نظموں کا ایک انتخاب "انتخاب کلام کیفی چڑیاکوٹی" کے نام سے شائع کیا۔

علامہ کیفی چڑیاکوٹی کی زندگی کا آخری دور

۱۹۴۸ء میں اہل بنگال کے برابر اصرار پر علامہ نے کلکتہ کو [illegible] کیا اور ۱۹۵۳ء تک وہاں اردو کو زندہ کرنے میں بیش بہا خدمات انجام دیں مگر صحت کی خرابی کے باعث ۱۹۵۳ء میں وطن واپس تشریف لائے۔ علامہ ایک خوشحال زمیندار خاندان کے فرد تھے مگر جنگ آزادی میں شامل ہونے کے بعد علامہ نے اپنی جائیداد کا ایک بڑا حصہ غرباء اور بے گھر لوگوں میں تقسیم کر دیا اور ہندوستان کی آزادی کے بعد علامہ کیفی مع اپنے پورے خاندان کے گردش روزگار کے شکار رہے مگر صبر و شکر و استقلال کو آخر وقت تک ہاتھ سے جانے نہ دیا علامہ صحت سے سخت آزمائش میں بھی غربت [illegible] اور [illegible] وحدانیت کے اصول [illegible] فلسفی [illegible]

کالی داس گپتا رضا
کا نام گرامی اردو کے تحفظ کا ضامن ہے۔ ان کی مستند تصانیف یقیناً اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ کوئی بھی لائبریری ان بیش بہا کتابوں سے محروم نہیں رہنی چاہیے۔
چکبست اور باقیاتِ چکبست
حضرت چکبست پر اس سے پہلے ایسی مستند کتاب شائع نہیں ہوئی
قیمت ۴۰/- روپے
دعائے صباح
غالب کی ایک نادر فارسی مثنوی بسوط و ضخیم مقدمے کے ساتھ۔
قیمت ۱۵/- روپے
منشوراتِ جوش ملسیانی
اردو ادب میں ایک ایسا اضافہ جس کیلئے ہر اردو والا جناب رضا کا ممنونِ احسان ہے۔
قیمت ۲۰/- روپے
مکتوباتِ جوش ملسیانی (مجموعہ خطوط)
اردو خطوط نویسی کا ایک نادر مجموعہ جس کے مطالعہ سے آپ رموزِ شاعری کے کما حقہ طور پر واقف ہو سکیں گے۔
قیمت ۱۹/۵۰ روپے
ہندوستانی مشرقی افریقہ میں
مشرقی افریقہ میں ہندوستانیوں نے کس طرح اپنے ملک کا نام روشن کیا ہر ہندوستانی کے مطالعہ کیلئے دلچسپ کتاب۔
قیمت ۱۰/۵۰ روپے
شعلۂ خاموش
رضا صاحب کا اولین مجموعۂ کلام جس پر حکومتِ ہند نے انعام دیا۔
قیمت ۳۰/- روپے
شورشِ پنہاں
رضا صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام جس پر اتر پردیش کی حکومت نے انعام دیا۔
قیمت ۱۰/- روپے
شاخِ گل
تیسرا مجموعۂ کلام جس پر حکومتِ یوپی اور حکومتِ مہاراشٹر نے انعام دیا
قیمت ۱۵/- روپے
اُجالے نعت اور سلام
قیمت ۱۰/- روپے
متعلقاتِ غالب
جسے پڑھ کر قاضی عبدالودود صاحب نے فرمایا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے انھیں کئی باتیں پہلی بار معلوم ہوئیں۔
قیمت ۲۰/- روپے
سہو و سراغ
قیمت ۲۵/- روپے
انتخابِ آتش و غالب
آتش و غالب ایسے برگزیدہ شاعروں کے کلام کا انتخاب از برج نارائن چکبست جسے کالیداس گپتا رضا نے ترتیب دے کر بہترین انداز میں شائع کیا ہے۔
قیمت ۳۰/- روپے
آفس نمبر ۲۳۲ "پنج رتنا"
ساکار پبلشرز پرائیویٹ لمیٹڈ
دوسری منزل، اوپیرا ہاؤس، بمبئی ۴۰۰۰۰۴

غزل

محمد حسین شمس ایڈوکیٹ کشن گنج

وہم کا سایہ مرا جزوِ وجود
چھپ نہ جائے آگہی کا آفتاب

جانے کیسا رابطہ ہم دونوں میں تھا
سانس اِدھر اُکھڑی اُدھر ٹوٹا حباب

جو بھی چاہیں شوق سے آکر پڑھیں
میں نے رکھ دی میز پر اپنی کتاب

شرم سے کٹ کٹ گئیں پگڈنڈیاں
اس قدر تھا رہروؤں کا اضطراب

رات اک جگنو چمک کر رہ گیا
کھو گیا گھر کے اندھیرے میں شہاب

وقت نے ہر قطرۂ خوں لے لیا
ہو گیا ہے باقی اب میرا حساب

شمس کو شب بھر ڈراتا رہ گیا
بسترِ غم خواب کا خوں گشتہ خواب

غزل

زخمی حصاری

ہم غمِ آرزو سوا مانگیں
ان سے مانگیں تو اور کیا مانگیں

انتہا اس کی چاہنے والے
کیوں ترے غم کی ابتدا مانگیں

گیت آور ہو زندگی جس سے
آؤ ہم ایسی اک فضا مانگیں

شوقِ منزل کا اقتضا ہے کہ ہم
راہ میں تیرا نقشِ پا مانگیں

لذتِ درد سے ہیں واقف ہم
کیوں دوا مانگیں کیوں دعا مانگیں

ہم وفاؤں کو اُن کی نذر کریں
وہ جفاؤں کا جو صلا مانگیں

ساری دنیا تو مل گئی ہم کو
اب جو مانگیں تو ان سے کیا مانگیں

حاصلِ زندگی کہیں جس کو
آؤ ہم ایسا حادثہ مانگیں

ساقیِ وقت سے نہ کیوں زخمی
مست نظروں کا آسرا مانگیں

بیتاب (ریوا)

ان کی گلی میں سب بجز سویرے
ہم بجھے بجھے رہے ہیں بال بکھیرے
ایک تمہیں کیوں یاد آتے ہو
میرے شناسا ہیں بہتیرے
مہکی مہکی اُن کی باتیں
جیسے کوئی پھول بکھیرے
تو کیا جانے یہ مجبوری
آنکھیں میری سپنے تیرے
اے غمِ دنیا بھول گئے ہم
بانکے چھوکرے جسم چھریرے
آ تو گئے اس بزم سے لیکن
ٹکڑے کر کے سپنے ہیں تیرے
گھر گھر کالے بادل آئے
لوگ کھڑے ہیں آنکھیں پھیرے
ہائے دلوں کی یہ ویرانی
جیسے خالی ڈیرے
جانے وہ دن کب آئیں گے
جب نہ رہیں گے تیرے میرے
نفرت کی دیوار گرے گی
ٹوٹیں گے ملکوں کے گھیرے
خوشبو گیت ترنم [illegible]
آج اُٹھے پہلو سے تیرے
تم بھی شہاب سے ملکر دیکھو
جاگ اٹھیں گے دل کے [illegible]

گاؤں کی عزت

ڈاکٹر [illegible]

نروما پاور ہاؤس کے چیف انجینئر مسٹر برجموہن پانڈے معہ بیوی اور دو بچوں کے دہلی سے ایک برات میں شرکت فرما کر واپس لوٹ رہے تھے۔ متھرا روڈ پر دوڑتی ہوئی کار اچانک ہی مسنگ کرنے لگی۔ ڈرائیور نے یہ سمجھتے ہوئے کہ پٹرول ٹیوب میں کچرا پھنس گیا ہوگا کچھ دھیان نہ دیا۔ حسنِ اتفاق کہ کار کا مسنگ از خود ٹھیک ہو گیا۔ سب کی آدھی سی جاتی رہی۔ ڈرائیور سنجیدگی سے کار چلاتا رہا مگر چھ سات کلو میٹر کے بعد پھر کار میں پھر وہی حرکت ہوئی اور چار پانچ فرلانگ چل کر ایسی رکی کہ ذرا بھی جنبش نہ جنبش ہو۔ گرمی کا موسم۔ ڈرائیور نے بہت کوشش کی مگر بات سمجھ میں نہیں آئی وہ اپنے علم اور تجربہ کے مطابق مقدور بھر کوشش کر چکا تو ماتھے کا پسینہ پونچھنے کے بہانے سڑک پر دور تک کسی آتے جاتے گاڑی کو تکنے لگا تاکہ کسی دوسرے ڈرائیور سے اپنی پریشانی کا حل نکالے۔

اسے ایک لوڈڈ ٹرک آتا ہوا نظر پڑا اس نے فوراً بیچ کس پوائنٹ پر رکھ کر اس کو ہاتھ دیا ٹرک برابر آ کر رک گیا ٹرک ڈرائیور نے باہر جھانکا۔ "کی گل اے" "کار مسنگ کر کے اچانک رک گئی بہت کوشش کرنے پر بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔" کار ڈرائیور بولا۔

"اچھا جی" کہہ کر سردار جی باہر آئے اور انھوں نے ضروری ضروری باتوں پر دھیان دیا۔ "بھائی جی تو ڈا کوال خیل اے۔ بالکل جل گیا اے"، سردار جی نے کہا۔

"میرے نال دہلی چلو ہور لیا کے لگا لو۔ اس دے علاوہ ہور کوئی چارہ نہیں جے۔" یہ سن کر ڈرائیور کچھ شست ہو گیا اور سوچنے لگا۔ پانڈے جی نے سنجی سے کہا۔ "سوچنے کا وقت نہیں ہے دو سو روپے اور فوراً جاؤ شام ہو رہی ہے۔" ڈرائیور سردار جی کے ساتھ چلا گیا۔ پانڈے جی نے گھڑی پر نظر ڈالی پھر میل کے پتھر کو دیکھا۔ اکتالیس کلو میٹر فاصلہ ہے دہلی۔ وہ بڑبڑائے۔ اور من ہی من میں بکنے لگے دو گھنٹے تو آنے جانے میں لگ جائیں گے اور مارکیٹ میں گھومنا پھر نا سامان

دیکھنا بھالنا خریدنا کل ملا کر چار گھنٹے ضرور لگ جائیں گے یعنی دس بجے تک اس جنگل میں سڑک کے کنارے معہ بچوں کے گزارنا خطرے سے خالی نہیں ہے مگر جائیں تو کہاں جائیں۔ پانڈے جی سوچ رہے تھے اور ان کی بیوی بچوں سے کہہ رہی تھیں۔ "اگر تم لوگوں کو پیاس لگ رہی ہو تو اس رہٹ پر پانی پی آؤ۔"

"ممّاں جی وہ مسلمان ہے دیکھو اس کی کتنی لمبی داڑھی ہے کہیں ہم کو مار کر کنویں میں نہ ڈال دے۔"

"بیٹی مراد آباد کی گھٹنائیں یاد آ گئیں کیا۔ یہ باتیں شہروں میں ہوتی ہیں گاؤں میں نہیں ہوتیں تم نے کبھی کسی گاؤں میں کر فیو لگتے سنا ہے"

"نہیں سنا"

"بس تو جاؤ پانی پی آؤ دیکھو ان بڑے میاں سے کہنا بابا سلام ہم پانی پینا چاہتے ہیں کیا آپ اجازت دیں گے۔ اگر ہاں کر دیں تو پانی پینا۔"

"اور اگر نہیں پینے دیں تو چلے آنا"

"بیٹے وہ تم کو پانی پینے سے نہیں روکیں گے یہ تو تہذیب کی بات ہے جو تم کو سکھا رہی ہوں" یہ سنتے ہی بچے اچھلتے کودتے پانی پینے چلے گئے ماں ان کو پیار سے دیکھتی رہی۔

"مینا اب کیا ہوگا" پیچھے سے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پانڈے جی نے پوچھا۔

"کیا بتاؤں کیا ہوگا بڑے بے وقت خراب ہوئی ہے کوئی بستی بھی پاس نہیں ہے اور اوپر سے رات تیزی سے چلی آ رہی ہے"

"بابو جی سلام" دونوں کی باتوں میں مخل ہوتے ہوئے کسی نے پیچھے سے سلام کیا اور ان کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

"سلام بھائی صاحب" پانڈے جی نے سلام کر کے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور غور سے دیکھتے رہے۔

"بابو جی کار خراب ہو گئی ہے کیا۔"

بیشک جنت بن جائے۔

"ذرہ نوازی کا شکریہ۔ بابو جی آج کی رات آپ کسی بھی ضرورت سے باہر نہیں نکلیں گے۔ بیٹھک سے ملا ہوا پاخانہ ہے غسل خانہ ہے جب بھی کوئی حاجت ہو اندر چلے جائیے۔ مگر باہر نہیں جائیں گے۔"

"جب باہر سے تالا لگا ہوگا تو ہم باہر جا ہی کیسے سکتے ہیں۔" بھوجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بیٹی تم نے سن لیا تھا کیا جو میں اپنے بیٹوں کو سمجھا رہا تھا کیا تو بہت دھیرے سے تھا خیر آج تم سبھی لوگ میری باتوں پر عمل کروگے۔ آداب عرض ہے۔ فی امان اللہ۔" کہتے ہوئے ضمیر احمد بھالا لیکر بیٹھک کی چھت پر جا بیٹھے اور وہیں کتے کو باندھ لیا ایک فلیل اور جھولے میں مٹی کے پکے ہوئے گولے تھے۔

پانڈے جی اور بھوجی اسی تذبذب میں رات کے بارہ بجے تک سو ہی نہیں سکے طرح طرح کی باتیں سوچتے رہے دونوں لڑکے کار کی دیکھ بھال کو سڑک پر جا چکے تھے اور دونوں الگ پیڑوں پر چڑھ کر بیٹھ گئے تھے۔ باپ کی سخت تاکید کے مطابق چستی کے ساتھ جاگتے رہے۔

اُدھر ایک بجے کے قریب گاؤں میں ایک طرف زور کی روشنی ہوئی شور مچا "آگ لگ گئی آگ لگ گئی" یہ سن کر بچے چونکے انھوں نے کھٹ کھٹ تھ بیٹھک کی چھت پر سے کہا "تمہارے مکان پکے ہیں یہاں تک آگ نہیں آئے گی۔ سب اندر ہو باہر نکلنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"چاہے جل کر مرجاؤ" چھوٹی بہو بیگم تنے اوپر سے کھڑکی پر منہ رکھ کر کہا ضمیر احمد کے کان میں یہ الفاظ بھی پہنچ گئے اور انھوں نے پھر کہا "چاہے جل کر مر جاؤ مگر باہر نہیں نکلنا ہے۔" ہر ایک اپنے ہاتھوں میں کوئی نہ کوئی ہتھیار لے لے اور مستعدی سے بیٹھا رہے یوں کہہ کر ضمیر احمد نے کتے کی زنجیر ہاتھوں میں لے لی اور ادھر سے اُدھر گھومنے لگے عورتیں اندر ہی آپس میں باتیں کرتی رہیں کہ ہو سکتا ہے ہندو لوگ مارنے کو گاؤں پر چڑھ آئے ہوں اور انھوں نے آگ لگائی ہو وہ طرح طرح کی باتیں سوچتی رہیں۔ پانڈے جی بولے بولے "یہ پردھان پاگل تو نہیں ہے کہ گاؤں میں آگ لگی ہے اور کہتا ہے کہ گھر سے باہر نہیں نکلنا ہے چاہے اندر ہی جلکر مر جاؤ جب اپنے گھر والوں کو نکلنے کی اجازت نہیں دے رہا ہے تو ہمیں باہر کیوں نکلنے دیگا۔ ہمارا تو آگے سے تالا لگا ہوا ہے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اب تو تقدیر کے حوالے کر دو دن بُرے نہ ہوتے تو کار خراب نہ ہوتی اور وہ بھی شام کو اور بیابان جنگل ہیں۔" دونوں سوچ رہے تھے اور پریشان ہو رہے تھے پھر ضمیر احمد کی آواز آئی: "الحمدللہ رب العالمین گاؤں والوں نے آگ پر قابو پالیا وہ بجھ گئی ہے۔" یہ سن کر سب کے دم میں دم آیا اس طرح رات کے تین بج گئے اور بے فکر ہو کر جیوں ہی سب کو نیند آنے کو ہوئی کہ دعائیں دعائیں چار پانچ فائروں کی آواز آئی سبھی لوگ نیند سے بیدار ہو گئے۔

"ہائے اللہ میں تو مرگیا" رات کا سناٹا چیرتی ہوئی تیز آواز تمام فضا میں پھیل گئی۔ کسی ہندو نے کسی مسلمان کو مار دیا۔ ہر ایک کے دماغ میں یہی ایک بات گھوم رہی تھی لیکن ضمیر احمد کے دماغ میں دوسری ہی بات تھی وہ چھت پر گھومتے رہے اور حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ ان کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ آج فہیم یا نعیم میں سے کسی ایک کی جان ضرور گئی ہے۔ ضمیر احمد کے دماغ میں یہی ایک خیال رہ رہ کر آرہا تھا۔ مگر انھوں نے کسی طرح دل کو سمجھا رکھا تھا ڈھارس باندھے ہوئے ادھر سے اُدھر گھومتے رہے۔ فائروں کے خوف سے تمام گاؤں کے لوگ سو نہیں پا رہے تھے۔ چڑیاں چہچہانے لگیں سورج نکلنے کے آثار نظر آنے لگے۔ ضمیر احمد چھت سے نیچے اُترے اور بیٹھک کا تالا کھولا پانڈے جی کو سلام کیا اور باہر نکلا۔ "دن نکل رہا ہے حاجات ضروریات سے فارغ ہو چکے ہوں تو ناشتہ کر لیجئے میں دودھ لے آیا ہوں اور یہ بسکٹ ہیں۔"

"پردھان جی آپ نے اتنی جلدی یہ سب تکلیف کیوں فرمائی ہے اتنے سویرے تو ہم لوگ گھر بھی ناشتہ نہیں کرتے ہیں اب تو ہی بجے ناشتے کے وقت تو ہم آگرے پہنچ جائیں گے۔" پیشنکر پردھان جی مسکرائے اور چپ ہو گئے۔ گھر کے چھوٹے چھوٹے بچے آم پاس کھڑے تھے "تم لوگ اندر جاؤ" انھوں نے کہا اور خود اٹھا کر پانڈے جی کو کار کے پاس لائے جتنا زیور کار کے پاس تھا فہیم اور نعیم بھی اس کے پاس ہی کھڑے تھے دونوں کو بخیریت کھڑے دیکھ کر ضمیر احمد کا دل باغ باغ ہو گیا اور جو غم تو لڑکے سلامت

رہا تھا کافور ہو گیا۔ پھر کون مرا تھا مات میں۔ لمحہ بھر کو من ہی من ضمیر احمد نے سوچا۔ ارے یہ کیا، کار کے پاس پہنچ کر ڈکی کے پیچھے پڑی لاش کو دیکھتے ہی ان کے منہ سے نکلا۔

"یہ تو وہی آدمی ہے جو کل مجھے اپنے گھر مہمان بنانا چاہتا تھا شاید کردار علی نام بتایا تھا اس نے" پانڈے جی بولے۔۔

"جی ہاں یہ وہی کردار علی ہے بدمعاش کہیں کا۔ ظالم بد چلن بدکار"، ہونٹ بھینچتے ہوئے پہلوان جی نے آگے پھر کہا۔ "اسکو آپ سے باتیں کرتے دیکھ کر ہی تو میں کل شام آپ کے پاس گیا تھا مجھے سوجھ رہی تھی کہ یہ مردود آپ کو دھوکا دے کر آپ کو اپنا مہمان بنائے گا اور رات کی تاریکی میں آپ کا سب کچھ لے لے گا عزت بھی جان بھی اور مال بھی اسی لئے میں نے آپ کو اپنے ساتھ لے جانے کی ٹھانی تھی۔۔"

"ہمیں اندر بند کیوں کیا تھا آپ نے۔۔"

"میں جانتا تھا کہ یہ اس رات کوئی سازش کر سکتا ہے وہی کیا بھی مکان کے چاروں طرف اس کے آدمی لگے رہے ہیں اس نے گاؤں میں ایک چھپر میں آگ لگائی تھی تاکہ سب لوگ باہر نکل آئیں اور اس کے چھپے ہوئے آدمی آپکو اڑا لے جائیں اور اپنی مذموم خواہش پوری کر لیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ شیطان کی خواہش پوری نہیں ہونے دیتا ہے میں نے ان تمام باتوں کو سوچتے ہوئے ہی یہ انتظام کیا تھا صاحب کا مطلب آپ لوگ کیسے نہیں ہوں گے چھوڑیئے اسے اور کار میں بیٹھ کر جلدی سے رخصت ہو جایئے ورنہ کوئی نئی مصیبت آسکتی ہے۔" جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے ضمیر احمد نے کہا سب لوگ کار میں بیٹھ گئے۔ ضمیر احمد نے ۲۱ روپے نکال کر بھوجی کی طرف بڑھا دئے۔۔"

"یہ کیسے پہلوان جی۔!"

"بیٹی تم نہیں جانتی۔ ہم لوگوں کے یہاں سے جب کبھی بیٹی وداع ہوتی ہے تو خالی ہاتھ نہیں جاتی ہے۔ اور کہہ کر ان کو اصغر انداز مسکراتے ہوئے ضمیر احمد نے کہا بھوجی نے روپے پیشانی سے لگا کر پرس میں رکھ لئے اور کار اسٹارٹ ہوئی اس کا دھواں کردار علی کا منہ کالا کرکے اوپر اڑ گیا۔ ضمیر احمد نے فہیم اور نعیم کو اشارہ کیا کہ اس لاش کو سڑک کے کنارے گڑھے میں ڈال دیں ۔۔۔ ۰۰۰

بقیہ: علامہ کیفی ۔۔۔ ۔۔۔

ماہر علوم مشرقیہ پانچ زبانوں کا استاد اور مستند شاعر تقریباً دس زبانیں جاننے والا قوم وملک وملت کی آزادی کی جنگ لڑنے والا صف اول کا سپاہی آزادی کے لئے جیل کی صعوبتیں جھیلنے والا ملک وقوم زبان و ادب کی تقریباً پچاس سال بے لوث خدمت کرنے والا ہندوستان کی آزادی کے بعد فراموش کر دیا گیا اور اپنی زندگی کے دن پورے کرنے کے بعد پہلی اکتوبر ۱۹۵۵ء بروز دوشنبہ بوقت ڈیڑھ بجے دن یک بیک فالج اور خناق کے مرض میں مبتلا ہو کر چھیاسی سال کی عمر میں دارِ فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گیا علم و ادب کا یہ خزانہ خاکِ تاخوردہ میں روپوش ہو گیا۔

پوچھے نہیں جاتے ہنر مند جہاں میں
یہ خون ہنر کس نے کیا بے ہنری نے

(مہدی ۱۹)

باب انتقاد

نامہ ہائے دوست۔ جناب مبشر علی صدیقی ماہر تعلیم کے ناطے سب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ موصوف اس وقت تک بارہ تصانیف شائع کر چکے ہیں اور ہر تصنیف کسی مقصدی زاویۂ نگاہ کے تحت ہی ہوتی ہے۔ ان کی ایک تصنیف "معاصرین کے خطوط" ادبی حلقوں میں پسند کی گئی اور اس کتاب کو نقادوں اور ریسرچ کرنے والوں کے لئے مفید سمجھا گیا۔ معاصرین کے کچھ خطوط اس کتاب میں شائع ہونے سے رہ گئے تھے جنہیں اب "نامہ ہائے دوست" کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ معاصرین کے خطوط کی طرح یہ کتاب بھی یقیناً پسند کی جائے گی $\frac{20\times30}{16}$ کے ۱۱۲ صفحات کی غیر مجلد اس کتاب کی قیمت آٹھ روپیہ ہے جو یقیناً زیادہ ہے۔ اسے سلیم مبشر اُردو سوسائٹی (رجسٹرڈ) گلی دھینکش۔ محلہ سوتھ۔ بدایوں۔ یوپی۔ سے طلب کی جا سکتی ہے۔

تحفۂ جگر جناب جگر جالندھری کا یہ دوسرا مجموعۂ کلام ہے جو سنہ ۱۹۶۹ء میں شائع ہونے والے شعری مجموعوں میں صفِ اوّل میں نمایاں مقام رکھتا ہے۔ سرورق قیصر سرمست کے چابک دستِ قلم کا ایک بہترین شاہکار ہے۔ ہزاروں کتابوں میں تحفۂ جگر اس حسین و جمیل سرورق کے طفیل اپنی جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ مجموعہ کے شروع میں جگر صاحب نے چار صفحات پر اپنی تصاویر کو شائع کیا ہے جو مصنف کے لئے یادگاری حیثیت کی حامل ہیں۔ اس کے بعد اپنے اُستادِ محترم قبلہ جوش ملسیانی مرحوم کی اصلاح شدہ غزل کا عکس اور جناب ساحر سیالکوٹی صاحب کا کمانیہ کمیٹی کے عکس تحریر بھی شائع کیا ہے۔ شروع کے ۵۶ صفحات میں قبلہ جوش ملسیانی کا اظہار رائے۔ اشعر سنگھ شائق کا جگر صاحب کی شاعری اور تنازک خیالی پہ اظہارِ رائے۔ جناب عرش ملسیانی کا جگر جالندھری کی شاعری پر اپنے شعر گرامی جناب پیارے ناروی کا جگر جالندھری کا مقام شاعری۔ جناب ساحر ہوشیارپوری کے جگر جالندھری کے شاعری کے متعلق تاثرات۔ جناب نازش دہلوی کا سخن ہائے گفتنی جناب رفا پشاوری کی طرف سے جگر جالندھری میری نظر میں۔ جناب گپت ماہیئے سروپ استوا مزقت اُردو دوست جو کہ ادقار میں ہندوؤں کا حصہ کا درج کردہ

غزل مضمون جگر جالندھری کا مقام شاعری پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں ان جملہ حضرات نے جگر صاحب کے جو اشعار اپنے مقالے میں اپنی آرائے گرامی کے حق میں بطور ثبوت دیئے ہیں۔ جگر صاحب نے ان اشعار کو مجموعہ میں شامل نہیں کیا۔

"تحفۂ جگر" غزلیات، نظمیات۔ قطعات اور متفرقات پر مشتمل $\frac{20\times30}{16}$ سائز کے ۱۶۰ صفحات پر یہ مجموعہ ایسے بہترین کاغذ اور چھپائی اور دلکش کتابت سے مزین ہے کہ آپ کی لائبریری میں یقیناً ایک اچھی کتاب کے اضافہ کا موجب ہوگا۔ ہم اس مجموعہ کے پسندیدہ ہونے کے بارے میں یہ گارنٹی کر سکتے ہیں کہ اگر آپ کو مجموعہ کسی طور پر بھی پسند نہ آئے تو واپسی کی شرط۔ دفتر ماہنامہ شانِ ہند، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۲ سے طلب کیا جا سکتا ہے۔ قیمت صرف دس روپیہ ہے جو یقیناً کم ہے۔

ہماری فلمیں ہمارا سماج فلم یقیناً اس دور میں پروپیگنڈہ کا سب سے بہترین اور موثر ذریعہ ہے۔ مگر ہمارے ملک میں فلمی سرگرمیوں پر دانشوروں نے قطعاً دھیان نہیں دیا۔ اور یہ صنعت وہ ترقی نہیں کر سکی جو اسے کرنی چاہئے تھی۔

جناب پریم پال اشک نے یہ کتاب ترتیب دیکر یقیناً معاشرے کی رہنمائی فرمائی ہے۔ فلم سے تعلق رکھنے والے مختلف تیرہ موضوع پر اشک صاحب نے سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف یہ کہ فلموں سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے مفید ہے بلکہ یہ ہر اس قاری کے لئے فلموں سے متعلق مکمل واقفیت کا ایک گنجینہ ہے جو فلموں سے دلچسپی تو نہیں رکھتے مگر کبھی کبھار فلمیں دیکھتے بھی ہیں۔ بہترین گٹ اپ۔ اعلیٰ درجہ کا کاغذ۔ بہترین کتابت۔ اعلیٰ چھپائی مع مجلد۔ قیمت بارہ روپیہ۔ دفتر شانِ ہند سے دستیاب ہے۔

بھگوان رام

از [illegible]

پیار کی شمع ہر اک دل میں جلائی تم نے
راہ دُنیا کو محبت کی دکھائی تم نے
تم نے انساں کو بتایا کہ وفا کیا ہیں
دل سے ماں باپ کے [illegible] جو [illegible] کیا ہیں
حق پرستی کا زمانے میں اک انعام ہو تم
بات پہ اپنی جو مٹ جائے وہی رام ہو تم
پیار دُنیا کے ہر انساں کو دیا ہے تم نے
سلطنت چھوڑ کے بن واس لیا ہے تم نے
[illegible] لوگوں کے لئے صاحب ایمان ہے وہ
پیار [illegible] انسان ہے وہ
[illegible] دل کی آواز
[illegible] تمہارے انداز
[illegible] منہ موڑ دیئے [illegible] طوفانوں کے
ہو بھگوان اسی واسطے انسانوں کے
اب بھی ہر باپ کی دُنیا کے سہارے تم ہو
اب بھی ہر ماتا کے لئے راج دُلارے تم ہو
دوستوں کے لئے اب بھی سہارے ہو تم
پاکیزہ و معصوم ہو پیارے ہو تم
آج ہر بھائی کو مل جائے جو بھائی تم سا
پیار کی شمع رہے پھر تو ہمیشہ زندہ
تم سا شوہر جو کسی پیار کی ماری کو ملے
تو ہر سانس محبت کا وہ بھگوان کہے
چاہیے رام ہر اک دور میں راون کے لئے
رام درکار ہیں سیتاؤں کے جیون کے لئے
[illegible] انساں کا سمجھتے وہی انسان ہو تم
دل یہ کہتا ہے کہ بھگوان کے [illegible] ہو تم
آج دُنیا پہ عداوت کی گھٹا چھائی ہے
ظلم اور جور کی نفرت کی گھٹا چھائی ہے

[illegible] ماں باپ کے دل توڑے جاتے ہیں
بھائی بہنوں سے بھی منہ موڑے جاتے ہیں
کتنے مہندی لگے ہاتھوں نے کئے ہیں ماتم
بیوہ کتنی ہیں تقدیر میں جن کے لئے غم
[illegible] کے گھر دن میں ہے ابھی تک ماتم
لکشمن کتنے ہیں بھائی کے لئے جن کو ہے غم
آج سیتاؤں کے ناموس کو گھر گھر خطرہ
آج راون کے مظالم کا جہاں میں سکہ
نام پر دھرم کے انساں کا لہو ارزاں ہے
ظلم اور جور کا ہر ایک طرف طوفاں ہے
بھوک و افلاس کے ماروں کا خدا کوئی نہیں
بے سہاروں کے لئے راہنما کوئی نہیں
کعبہ و دیر پہ ہیں شیخ و برہمن حاوی
رام کوئی بھی نہیں آج ہیں راون حاوی
رام کی سارے زمانے کو ضرورت ہے آج
جب کہ طوفاں میں گھری شمع محبت ہے آج
ہم کہ ہندو ہوں مسلماں ہوں ہمارے ہو تم
رام کہتے ہیں تمہیں سب کے سہارے ہو تم
مسجد و مندر و گرجا کو بچاؤ آکر
پیار کی راہ ہر انساں کو دکھاؤ آکر
ساتھ میں گوتم و عیسیٰ و محمدؐ بھی رہیں
ظلم انسانوں کا انسانوں پہ وہ بھی دیکھیں
وہ بھی دیکھیں تو ذرا حال پرستاروں کا
راج مظلوم دنیا میں ہے خونخواروں کا
تم ہی چاروں کو زمانے کا بدلنا ہے نظام
تاکہ اب ہو نہ سکے دھرم تمہارا بدنام
ساری دُنیا کو سنا دیں گے تمہارا پیغام
لیتے رہتے ہیں ہر اک سانس میں تمہارا نام

پیار کے دیپ ہر اک دل میں جلا دو پھر سے
جگمگا اٹھے گی بھارت کی مقدس دھرتی

محکمہ سے ہوں۔

شمع کے مالکان نے اپنے آپ کو ہندوستانی مقدم سمجھا اور بنایا۔ مسلمان تو وہ بفضلِ خدا ہیں ہی اور یہ حضرات اپنے مذہبی فرائض دوسرے مسلمانوں سے بہتر انداز میں ادا کرتے ہیں مگر ان لوگوں نے اپنے مذہب کو دوسروں کے لئے ہمیشہ راحت اور رحمت کا آئینہ دار بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ مذہب ہر کسی کا قطعی خالص ذاتی معاملہ ہے اور یہ اپنے مذہبی عقیدے پر سختی سے پابند ہیں اور دوسروں کے بارے میں بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا دین ان کے ساتھ ہمارا دین ہمارے ساتھ۔ جس کا بہترین نتیجہ یہ ہے کہ شمع آج ملک کا ایک نامور ماہنامہ ہے۔ جسے ہر مذہب کے لوگ دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور شمع گروپ پر اکثریتی فرقہ کو ہر قسم کا اعتماد ہے اس لئے اگر ہندوستان کا مسلمان اپنے آپ کو ہندوستانی کہلانے میں شرم محسوس نہ کرے تو ان فسادات کے ختم ہونے میں سب سے زیادہ مدد مل سکتی ہے اور جب یہاں کا مسلمان اپنے آپ کو ہندوستانی سمجھے گا تو اس کے ووٹ کا استعمال بھی ہندوستان کی عظمت کے لئے ہی ہوگا اور اس وقت جو سیاسی بے قراری کا دارومدار زیادہ تر مسلمانوں کے ووٹ پر منحصر ہے وہ سیاسی خوشگواری میں مبدل ہو جائے گا۔

وزارتِ حُسن و عشق

وزارتِ اطلاعات و نشریات کے تحت ایسے تمام محکمے آتے ہیں جن کا تعلق براہ راست شعبۂ لطیف سے ہے ریڈیو، ٹیلی ویژن، ڈرامہ ڈویژن، فلم ڈویژن اور ظاہر ہے کہ یہ سب محکمے ایسے ہیں جن میں صنفِ لطیف کی بہتات ہے۔ اور بدقسمتی سے ہمارے یہاں اہلِ اقتدار کا معیار اس قدر پست ہے کہ اگر نوجوان بہن بھائی بھی سڑک پر جا رہے ہوں تو دیکھنے والے یہی کہتے ہیں کہ عاشق و معشوق جا رہے ہیں۔ اگر کوئی باپ اپنی بیٹی یا بہو کے ساتھ جا رہا ہو تو دیکھنے والے اندازہ لگاتے ہیں کہ بڈھے نے خوب شکار مارا ہے۔

ٹیلی ویژن پر آنا اناؤنسر خواتین کو یقیناً اپنے آپ کو خوش قسمتی کی حالت میں بھی آنا پڑتا ہے۔ ڈرامہ اور فلم میں تو زیادہ تر ایسی لڑکیوں کا ہی گزر سکتا ہے جو خوبصورت ہوں۔ ریڈیو پر پروگرام حاصل کرنے کے شوق میں اکثر حسین لڑکیاں ریڈیو اسٹیشن کا چکر کاٹتی ہیں اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مختلف محکموں میں کام کرنے یا کام مانگنے والی خواتین یا لڑکیوں کو متعلقہ افسران۔ ڈائرکٹرز۔ سیکشن آفیسرز۔ پروگرام آفیسرز سے بات چیت کرنی ہی ہوتی ہے اور اس تلخ حقیقت سے بھی فرار نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ افسران یا متعلقہ اشخاص ضرورت مند لڑکیوں کی مجبوری سے ہر ممکن فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع رائیگاں نہیں جانے دیتے۔ اور اسی وزارت کے تحت ایک اور بڑا اہم محکمہ بھی آتا ہے اور وہ محکمہ ڈی اے وی پی ہے۔ یہ محکمہ ملک بھر کے اخبارات کو سرکاری اشتہارات دیتا ہے۔ چنانچہ بعض اخبارات نے اشتہارات فراہم کرنے کے لئے خوبصورت لڑکیوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں اور ہمارے یہاں یہ روایت ابھی تک قائم ہے کہ اکثر و بیشتر افسران۔ وزیر اور فرموں کے مالکان عورت اور خصوصاً خوبصورت لڑکی کی فرمائش کو رد کرنا پاپ سمجھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ... یہ خوش اخلاقی واقعی کسی اخلاقی قدر کی آئینہ دار ہوتی ہے یا اس میں بھی کوئی ذاتی غرض پنہاں ہوتی ہے۔ بہرکیف ہمیں یہ کہنے میں کوئی خدشہ نہیں کہ وزارتِ اطلاعات و نشریات نے کسی وقت بھی جنسی افواہوں سے نجات نہیں پائی اور یہ افواہیں سچی ہوتی ہیں یا جھوٹی اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہے مگر اس سچائی سے بھی روگردانی مشکل ہے کہ آگ بھڑکنے کا کوئی نہ کوئی کارن تو ہوتا ہی ہے۔ جب ڈاکٹر کیسکر اس وزارت کے مالک تھے تو ان کے ہاں اکثر ریڈیو اور فلم ڈویژن کی "محترمات" کے پروگرام موسیقی ہوتے رہتے تھے۔ اور لقا دسالہ شام نا تو ایسا شریف النفس اور دلی کی روایتی شرافت کا آئینہ دار جب اس وزارت کے ڈپٹی منسٹر بنے تو انھوں نے ایک بے تکلف محفل میں فرمایا کہ اس وزارت کا نام بدل کر "وزارتِ حُسن و عشق" رکھا جانا چاہئے۔ ہم ذاتی طور پر جانتے ہیں کہ ایک بدنام شاعرہ نے محکمہ ڈی اے وی پی میں جنتا پارٹی کی حکومت سے پہلے ایک ڈائرکٹر پر ایسا جادو کر رکھا تھا کہ یہ صاحب واقعی اس شاعرہ کی انگلیوں پر ناچتے تھے۔ اور اس شاعرہ نے مختلف پروگراموں کے سوونیئر شائع کر کے ان ڈائرکٹر صاحب سے خوب اشتہارات لئے (اس وقت سوونیئر میں بھی یہ محکمہ اشتہارات دیدیا کرتا تھا) ڈاکٹر کیسکر کے عہد میں ہی جامع مسجد کی ایک افغان لڑکی نے ریڈیو اسٹیشن پر اپنی متوازی حکومت قائم کر رکھی تھی۔ اور دہلی یونیورسٹی کی ایک تقریب میں ڈاکٹر کیسکر نے ان صاحبہ سے بڑے خضوع و خشوع سے مصافحہ فرما کر اپنے محکمے کے افسران کو نشاندہی کرائی تھی کہ اس لیم و شحیم لڑکی کی متوازی حکومت کو تم لوگوں کو تسلیم کرنا ہی ہوگا اور یہ حقیقت ہے کہ اسی لڑکی کو ریڈیو کے ہر شعبۂ نشریات میں ہر ماہ متعدد پروگرام

سکتے تھے۔

ریڈیو اسٹیشن پر کچھ لڑکیوں کو ڈیلی ویجیز پر مسودات کی نقول کرنے پر بُلایا جاتا ہے۔ ان ڈیلی ویجز میں کام کرنے والی ایک حسین دہلوی لڑکی سے ریڈیو اسٹیشن کے ایک سکھ افسر نے کہا کہ اگر تم مجھ سے شادی کر لو تو میں مسلمان ہونے کو بھی تیار ہوں۔ راقم الحروف کو اس موٹے سکھ کی اس یک طرفہ والہانہ وارفتگی کا علم ہے۔ چنانچہ اس لڑکی کی موجودگی میں ایڈیٹر شانِ ہند نے ان حضرت کو فون پر بتلایا کہ آپ جس لڑکی کی خاطر مسلمان ہونے کو تیار ہیں وہ دو بچوں کی ماں ہے براہ کرم آپ اُسے پریشان نہ کیجئے۔ مگر اس بندۂ خدا نے شوقِ نیموی کا یہ شعر سنا کر فون کا ریسیور رکھ دیا ؎

دل کا دینا مجھے کیا آپ ہی منظور ہوا
چھٹ پڑی اُن پہ جوانی تو میں مجبور ہوا

اب اس لڑکی نے تیسرے بچے کو جنم دیا ہے مگر سردار جی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہیں اور اب بھی اس امید میں ہیں کہ وہ اس لڑکی کو حاصل کر لیں گے۔

مندرجہ بالا واقعہ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اچھی صورتیں نادانستہ یا دانستہ طور پر بھی اکثر دفاتر میں کام کرنے والے مردوں کی عقل پر پردہ ڈال دیتی ہیں۔

آج کل بیچارے وزیرِ اطلاعات و نشریات جناب وسنت ساٹھے اس وزارت کی سابقہ روایات کا بُری طرح سے نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ جس انداز سے جناب ساٹھے صاحب کو بدنام کرنے کی مہم چلائی جا رہی ہے وہ اس امر کی غمازی کر رہی ہے کہ یہ محض ساٹھے صاحب سے کسی ذاتی دشمنی کا بدلہ لیا جا رہا ہے اور ان کے ساتھ ساتھ ان مشہور خواتین سے بھی کوئی ذاتی دشمنی کا حساب چکایا جا رہا ہے جن کا ذکرِ خیر ساٹھے صاحب کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔ اور اگر ان واقعات میں کوئی سچائی ہے تو بھی ساٹھے صاحب کے خلاف مسلسل مہم چلانے والوں کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ کوئی شخص وزیر بننے کے بعد نامرد نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اقتدار کا نشہ مُردہ رگوں میں بھی جوانی پیدا کر دیتا ہے۔ لہٰذا یہ ساٹھے صاحب اور اُن خواتین کا ذاتی معاملہ ہے جس میں کسی کو دخل دینا مناسب نہیں۔ ہاں اگر یہ ناپاک اتحاد وزارت کی ذمہ داریوں میں دخل دے رہا ہے تو بیشک یہ مہم جاری رہنی چاہئے۔

بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ

بینک ہذا کی دلی شاخ (دریا گنج) نے ایک سال کے عرصہ میں ہی جو کامیابی حاصل کی ہے وہ دوسرے بینکوں کو کئی کئی سالوں میں بھی نصیب نہیں ہوتی۔ دریا گنج برانچ کے منیجر جناب شمیم کاظم صاحب نے اپنے حسنِ اخلاق۔ شبانہ روز محنت۔ اور عوام سے دلی ہمدردی کے باعث اس بینک کو کامیابی کی جن حسین راہوں سے روشناس کرایا۔ اس کی مفصل تفصیل شانِ ہند کے کسی گذشتہ شمارہ میں ہم دے چکے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ بینک کے تمام سٹاف نے اپنے با اخلاق منیجر صاحب کا دلی ساتھ دیا اور عوام کی ہر ممکن خدمت ہمدردانہ انداز میں انجام دی۔ اس بینک کا سٹاف جس قدر مہذب اور خوش اخلاق ہے۔ اس کی مثال دلی کے کسی دوسرے بینک میں نہیں ملتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ بینک میں کاروباری لوگوں کا ہجوم رہتا ہے بمبئی مرکنٹائل کوآپریٹو بینک لمیٹڈ کے مینیجنگ ڈائریکٹر جناب زین جی رنگون والا بینک کو جس شاہراہِ ترقی پر گامزن کر رہے ہیں اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ ۲۶ اکتوبر سنہ اس بینک کی برانچ سری نگر کشمیر میں کھل رہی ہے جس کا افتتاح جناب شیخ محمد عبداللہ وزیرِ اعلیٰ کشمیر فرما رہے ہیں۔ ہمیں دلی خوشی ہے کہ جس مناسب قدر و منزلت کی پیش گوئی ہم نے کئی ماہ قبل کی تھی اسے بینک کے مینیجنگ ڈائریکٹر نے عملی جامہ پہناتے ہوئے جناب شمیم کاظم صاحب کو ریجنل منیجر دلی ریجن مقرر فرمایا ہے۔ جب کسی کارکن کو اس کی حسنِ کارکردگی کا مناسب حق ملتا ہے تو یہ ایک نیک فال سمجھی جا سکتی ہے کہ بینک کے دوسرے کارکن بھی اپنی حسنِ کارکردگی سے ترقی کے زینے طے کر سکتے ہیں۔ ہم جناب شمیم کاظم صاحب کی اس عزت افزائی اور جناب زین جی رنگون والا کی حق شناسی پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے یقین رکھتے ہیں کہ مینیجنگ ڈائریکٹر صاحب۔ میرٹھ۔ سہارنپور۔ مرادآباد۔ بریلی۔ لکھنؤ کے علاوہ دہلی میں اوکھلا میں بھی بینک کی برانچیں کھول کر ان مقامات کے عوام کی دلی خواہش کو پورا کریں گے۔

"جسونت سنگھ نرولہ"

ہندوستانی اور نا لیلیٰ

۱۶ اکتوبر کی رات کے ساڑھے آٹھ بجے دلی دور درشن سے "سرگم" پروگرام کے تحت گورو مہر کشی بائر سینیڈی

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

وہ دہلی ریلوے سٹیشن پر ایک پارسل کلرک تھے۔ اُن کا ہفتے میں ایک بار سردار دیوان سنگھ مفتون کے ہاں آنا ضرور ہوتا تھا۔ دیکھنے میں تو یہ صاحب خاصے وجیہہ اور صاحبِ فہم وذکا معلوم پڑتے تھے مگر جب زبان کھولتے تو پتہ چلتا کہ اُن کے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہے۔ چار پانچ سال کے بعد جب یہ ریٹائر ہوئے تو اُن کا سردار صاحب کے ہاں آنا جانا بڑھ گیا۔ اور یہ سردار صاحب سے اکثر کہتے مجھے ایسا کوئی کام بتایئے کہ جس سے میری زندگی آرام سے کٹ جائے۔ ان لالہ صاحب نے سردار صاحب سے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اُنھیں ریٹائرمنٹ کے بعد قریباً نصف لاکھ روپیہ بھی محکمہ ریلوے سے ملنے والا ہے۔ سردار صاحب ہنسی ہنسی میں کہتے کہ آپ ایسے لائق، وجیہہ اور صاحبِ عقل و ہوش کو کسی ملک کا ایمبیسیڈر ہونا چاہیے۔ مگر یہ صاحب سمجھتے کہ سردار صاحب سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں۔ شام کو جب سردار صاحب کے ہاں محفل جمتی اور کسی دن یہ صاحب بھی آجاتے تو باتوں باتوں میں سردار صاحب انھیں یعنی ان لالہ جی کو مخاطب کرتے وقت کہتے کہ ایمبیسیڈر صاحب آپ کے لئے ہم پنڈت جواہر لال نہرو سے سفارش کریں گے کہ ایسے دانا اور تجربہ کار کو کسی ملک میں ہندوستان کا سفیر بنا کر بھجوایا جائے اور یہ سن کر لالہ جی کا گورے رنگ کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو جاتا۔

جناب نیاز فتحپوری ایڈیٹر "نگار" لکھنؤ کسی کام سے دہلی تشریف لائے تو اُن کا قیام سردار صاحب کے ہاں تھا۔ چنانچہ نیاز صاحب سے ملنے کے لئے اکثر ادیب، شعراء اور صحافی سردار جی کے ہاں کثرت سے آتے مگر نیاز صاحب سے ملاقات کے اوقات بھی وہی تھے جو سردار صاحب کا تفریح کا وقت تھا یعنی شام کو سورج غروب ہونے کے بعد۔ نیاز صاحب دن بھر جہاں بھی تشریف لے جاتے میں اُن کے ساتھ رہتا۔ سردار صاحب نے سردار سر دلیپ سنگھ کونسلر کی کار منگالی تھی تاکہ نیاز صاحب کو جہاں بھی جانا ہو اسی کار سے آجا سکیں۔

ایک دن جب نیاز صاحب اور میں قریباً ۷ بجے شام سردار صاحب کے مکان پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سردار صاحب کی محفل میں دستور سے زیادہ حاضری ہے اور پاکستانی ہائی کمیشن کے پریس اٹیچی جناب محمد شریف بھی تشریف فرما تھے اور ریٹائرڈ ریلوے پارسل کلرک بھی موجود ہیں۔ اور قہقہوں کا ایک سیلاب ہے کہ رکنے میں نہیں آرہا۔ جب حاضرین اور نیاز صاحب میں علیک سلیک ہو چکی تو سردار صاحب نے سلسلہ گفتگو جاری کرتے ہوئے فرمایا کہ صاحبان پاکستانی سفارت خانے کے ایک ذمہ دار افسر یہاں موجود ہیں۔ یہ لالہ صاحب کو بتائیں گے کہ ایمبیسیڈر بننے کے لئے کسی امیدوار کی کیا کوالیفیکیشن ہونی چاہیے۔ محمد شریف صاحب بھی سمجھ چکے تھے کہ معاملہ کافی دلچسپ ہے لہٰذا انھوں نے فرمایا کہ اس جاب کے لئے امیدوار میں حسب ذیل اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

۱۔ انگریزی رواں دواں بول سکتا ہو۔

۲۔ نہ صرف یہ کہ اس کی بیوی اچھی خوبصورت ہو بلکہ وہ بھی انگریزی رواں دواں بول سکتی ہو۔ اگر امیدوار رنڈوا ہو تو اس کی لڑکی یا بہن ہونا ضروری ہیں کہ سفارتخانہ کی تقریبات میں آنے والے مہمانوں کی آؤ بھگت بہتر انداز میں کر سکے اور ان سے انگریزی میں بے تکلف گفتگو کر سکے

سردار صاحب نے کچھ شرارت کرتے ہوئے فرمایا کیونکہ سردار صاحب دو منٹ سے زیادہ کسی دوسرے کی بات سن ہی نہیں سکتے تھے محمد شریف صاحب ان دو خصوصیات کے علاوہ باقی کسی بات کی ضرورت ہی نہیں۔ لالہ صاحب کہنے لگے کہ آپ کی بیوی تو پچھلے زمانے کی ہوگی اس لئے آپ کسی وقتی بیوی کا انتظام کیجئے تاکہ آپ کے لئے پنڈت نہرو سے سفارش کی جائے۔ سردار صاحب نے مزید یقین دلاتے ہوئے فرمایا کہ جوش صاحب کا پنڈت نہرو پر بہت اثر ہے کہ وہ بے تکلف پنڈت جی سے آپ کی سفارش کر سکتے ہیں اسی ہنسی خوشی میں ساڑھے نو بجے کے بعد سب لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے۔

ابھی ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ قبلہ جوش صاحب کو سردار جی نے کھانے پر مدعو فرمایا۔ اس شام کو سردار صاحب نے چار پانچ احباب کو بھی مدعو کر رکھا تھا۔ احباب تو حضرات کو پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ جوش صاحب سے کسی خاص مسئلہ پر بات چیت ہونی ہے اس لئے وہ تشریف لائیں

مجھے سردار صاحب نے اس شام کے لئے نہ تو مدعو فرمایا تھا اور نہ ہی آنے سے منع کیا تھا۔ مگر میں نے از خود اس شام کو سردار صاحب کے ہاں جانا مناسب نہ سمجھا۔ اور بیوی کو ساتھ لے کر گولچہ سینما میں فلم دیکھنے چلا گیا۔ ½ 9 بجے رات کو جب گھر پہنچا تو بچوں نے بتایا کہ سردار صاحب کے ہاں سے دو مرتبہ ملازم بلانے آیا تھا اور کہہ گیا ہے کہ سرور صاحب جونہی آئیں تو سردار صاحب کے ہاں چلے آئیں بہت ہی ضروری کام ہے۔ میں اُلٹے پاؤں سردار صاحب کے ہاں پہنچا تو کھانا چل رہا تھا اور لالہ جی بھی شراب میں مست اور مرغ کی ٹانگ کو جھنجھوڑ رہے تھے۔ سردار صاحب فرمانے لگے کہ آپ کھانے پہ کیوں نہیں آئے جب کہ آپ کو معلوم تھا کہ جناب جوش صاحب کو مدعو کیا گیا ہے میں نے اصل بات کہہ دی کہ آپ نے کھانے کے لئے کہا ہی نہ تھا۔ تو سردار صاحب قہقہے لگاتے ہوئے فرمانے لگے۔ سرور صاحب جب ہر شام کا کھانا آپ یہیں کھاتے ہیں تو آپ سے اس شام کے لئے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ عرض کیا کہ جب آپ نے ایک دن پہلے یہ کہا تھا کہ ابھی جوش صاحب کو ایک خاص معاملے کے لئے مدعو کیا گیا ہے اس لئے کل محفل نہیں جمے گی۔ اتنے میں ملازم میرے سامنے بھی پلیٹ رکھ چکا تھا۔ اور سردار صاحب نے سنہرے فقری سٹار برانڈی کا ایک بڑا پیگ مجھے دیتے ہوئے فرمایا کہ آج لالہ جی کو عملی ٹریننگ دینی شروع کر دی گئی ہے آج انہیں شراب پینا سکھایا گیا ہے کیونکہ سفارت خانوں میں تو شراب پینے اور پلانے کی صلاحیت ایمبیسڈروں میں ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اور سردار صاحب نے یہ خوشخبری بھی سنائی کہ جوش صاحب نے پنڈت نہرو سے ان کی سفارش کرنا منظور کر لیا ہے۔ میں نے اشارے سے سردار صاحب سے پوچھا کہ کل تو آپ نے لالہ صاحب کو آج کے لئے آنے کو منع فرمایا تھا پھر یہ کیسے آ گئے۔ تو سردار صاحب ہنسی کو ضبط نہ کر سکے اور اپنی مخصوص ہنسی میں آنکھوں کو سکیڑتے اور پیشانی پہ بل ڈالتے ہوئے کہنے لگے ابھی جناب ہمارے ایمبیسڈر صاحب کو ریوے سے روپیہ بھی مل گیا ہے اور انہوں نے نئی شادی کا بھی انتظام کر لیا ہے۔ یہ خوشخبری دینے لالہ جی تشریف لائے تو ان کی موجودگی میں میں نے جوش صاحب سے گزارش کی ہے کہ وہ پنڈت نہرو سے ان کی سفارش کر دیں اور جوش صاحب نے منظور کر لیا ہے۔ اس کے بعد بیس منٹ بعد جوش صاحب کو میں تیرا ہا ہرم ... تک ان کی کار پہنچا کر سے ہوتے سوئی والان میں اپنے گھر چلا آیا۔

دوسرے دن ابھی شام کے ساڑھے پانچ ہی بجے تھے کہ سردار صاحب کا ملازم بلانے آیا کہ جلدی چلئے سردار صاحب نے کہا ہے کہ اپنے ساتھ ہی لے کر آنا تعمیل حکم میں جب میں سردار صاحب کے ہاں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لالہ صاحب مع ایک فیشن ایبل محترمہ تشریف فرما ہیں۔ سردار صاحب نے رازدارانہ لہجہ میں فرمایا سرور صاحب یہ .... ایم۔ بی۔ اے تک پڑھی ہوئی ہیں پہلے کسی پرائیویٹ فرم میں ملازمت کرتی تھیں آج کل بے کار ہیں۔ خاوند سے ناچاقی کے باعث طلاق ہو چکی ہے چونکہ لالہ صاحب بہت جلد کسی ملک میں ایمبسڈر بن کر جانے والے ہیں اس لئے یہ ان صاحبہ سے شادی کر رہے ہیں تاکہ تعلیم یافتہ بیوی کو اپنے ساتھ لے جا سکیں یہ سنتے ہی میرے پاؤں تلے سے زمین نکلتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ تقریباً تیس بتیس سالہ یہ حسینہ پورے کیل کانٹے سے لیس ہو کر آئی تھیں میں نے انہیں ایک نظر دیکھا اور لالہ جی سے پوچھا کہ آپ کی پہلی بیوی کو اس شادی کا علم ہے۔ فرمانے لگے سرور صاحب اسے بتا کر میری بچوں کو بتایا جاتا ہے بھلا۔ مجھے جو رقم ریلوے سے ملی ہے وہ سب انکے نام کر دی ہے تب یہ میرے ساتھ شادی کریں گی۔ جب سردار صاحب نے بخوشی تو میں نے محسوس کیا کہ ان کے دماغ میں بھی ہلچل مچ گئی۔ سردار جی نے گرم سموسے منگائے اور چائے پلا کر ان دونوں کو رخصت کیا لالہ جی کہا کہ میں آج سوچوں گا کہ یہ عورت آپ کے لئے موزوں رہے گی کہ نہیں لہٰذا شادی کا فیصلہ کل کرنا۔ جب لالہ جی اور ان کی دریافت چلے گئے تو سردار صاحب فرمانے لگے سرور صاحب۔ ہم تو ہنسی مذاق میں شروع کر رہے تھے۔ اور یہ معاملہ تو بڑا خطرناک حالت اختیار کر رہا ہے۔ اگر اس بڈھے کے پھٹے نے سارا روپیہ اس کے نام لگوا دیا تو اس کی بیوی بچوں کا کیا بنے گا۔ یہ حرافہ تو اسے چند دنوں میں کنگال کر دے گی۔ لہٰذا ابھی جا کر لالہ جی کی بیوی اور بچوں کو سارا واقعہ بتا دو کہ وہ لوگ روپیہ پر قبضہ کر لیں اور لالہ جی کی ذرا اچھی طرح سے خبر لیں۔ تاکہ یہ دوسری شادی نہ کر سکیں۔ میں اسی وقت شاہدرہ گیا۔ اور لالہ جی کے گھر جا کر سارا قصہ سنا دیا۔ لالہ جی کے میٹر کے آثار چڑھاؤ پر نظر دوڑائی تو انہیں یقین آنے لگا۔ کیونکہ لالہ جی ایک ہفتہ میں ہی تقریباً ایک ہزار روپیہ گھر سے لے جا چکے تھے۔ رات کو جب لالہ جی گھر پہنچے تو ان کی بیوی اور جوان بچوں نے جوان کی سمری ... کی کہ اس کی رو داد جب لالہ جی نے خود

(بقیہ صفحہ ۲۶ پر)

مضمون نویسی کا مقابلہ

"سماج میں معذور افراد کا مقام"

1980ء ہیلن کیلر کی صد سالہ سالگرہ کا برس ہے۔ ہیلن کیلر تمام رُوئے عالم پر معذور افراد کے لئے شعاعِ امید بن چکی ہیں۔ اقوامِ متحدہ نے 1981ء کو معذور افراد کے بین الاقوامی سال کے طور پر منائے جانے کا اعلان کیا ہے۔

ان دو اہم تقریبات کو موزوں طریقے سے منانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ عوام کے اندر معذور لوگوں کے مسائل اور ان کی صلاحیتوں کے تئیں شدید احساس بیدار کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے بھارت سرکار کی وزارتِ سماجی فلاح کی نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار وژولی ہینڈی کیپڈ "سماج میں معذور افراد کا مقام" کے موضوع پر مضمون نویسی کے ایک مقابلے کا اہتمام کر رہی ہے۔

اس میں ملک کے کسی بھی حصے کے گیارہویں اور بارہویں درجے کے طالب علم بچے حصہ لے سکتے ہیں۔ مضمون ہندی اور انگریزی میں لکھا جانا چاہیئے اور یہ ایک ہزار الفاظ سے زائد نہ ہو۔ مسودے فل اسکیپ کاغذ پر ٹائپ کئے ہوئے یا بہت خوشخط لکھے ہوئے ہونے چاہئیں۔

ہر زبان میں اولین تین بہترین مضمونوں پر انعام دیئے جائیںگے۔ پہلا انعام 1000 روپے کا، دوسرا 500 روپے کا، تیسرا 250 روپے کا ہوگا۔

مضمون جس پر اسکول کا نام، طالب علم کا نام اور ریاست کا نام درج ہو، ذیل پتے پر 30 نومبر 1980ء تک پہنچ جانے چاہئیں۔ لفافے پر "مقابلہ مضمون نویسی" صاف صاف لکھا۔

ڈائرکیٹر، نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار دی وژولی ہینڈی کیپڈ۔
راجپور روڈ، دہرہ دون۔

کچھ نہفتہ داستانیں کچھ شگفتہ تذکرے

صدق جائسی

قسط ۔ ۹

شہ عقیل صدیقی

درباری اللّے تللّے

دوسرے دن سہ پہر کو فانی کے گھر گیا۔ ان کو شبِ گزشتہ کا تمام و کمال رُوداد سُنائی۔ فانی بھی پیش قیاسی کے حرف بحرف پورا اُترنے پر بہت خوش نظر آتے تھے کہنے لگے۔ "مجھے اس بات کا مدتوں سے دھڑکا لگا ہوا تھا تم نے اچھا کیا کہ پرنس کی بات کو نہیں ٹالا۔ میرا خیال ہے کہ آئندہ وہ تم کو مجبور بھی نہ کریں گے۔ ان کا مطلب تو صرف یہ تھا کہ بزم رنگین میں کوئی زاہد خشک نہ رہے" جب میں نے اپنے ایک گھنٹے تک کھڑے رہنے اور تین بجے رات تک بھوک سے تڑپنے کا ذکر کیا تو بہت ہنسے۔ کہنے لگے کہ بھوک کی مصیبت تھی میں نے تو اس سے کہیں زیادہ سختیاں جھیلی ہیں۔ شکر ہے کہ تم اس وقت دربار میں نہ تھے ورنہ دوسرے ہی دن بھاگ کھڑے ہوتے۔

میں نے ہمہ تن شوق بن کر ان کی داستانِ مصیبت سننے پر آمادگی ظاہر کی۔ فانی کہنے لگے کہ برسات کا موسم اور ساون کا مہینہ تھا آسمان پر ابر سیاہ دھواں دھار چھایا ہوا تھا۔ بجلی اس زور و شور سے چمک رہی تھی کہ میں اپنی جگہ بیٹھا الحفیظ کا ورد کر رہا تھا خاصے کا وقت آیا تو پرنس نے اسٹاف افسر کو حکم دیا کہ خاصے کی میز اس وقت لان پر بچھواؤ۔ پھر پیا کی طرف دیکھ کر فرمایا "موسم خوشگوار ہے۔ باغ میں کھانے کا لطف آئے گا۔ پیا نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بہت صحیح ارشاد ہوا" پھر کہنے لگے۔ صاحب! ماشاء اللہ آپ نے بالکل اپنے دادا کا مزاج پایا ہے۔ اعلیٰ حضرت مرحوم بھی برسات میں اکثر لان ہی پر خاصہ تناول فرماتے تھے۔ پھر دست بستہ ہو کر شعر پڑھا ؎

کیا موسم گل ہے روح فزا چلتی ہے عجب رنگین ہوا
وہ بد قسمت چمن میں خار بنا، جو چاک گریباں ہو نہ سکا

پرنس نے کہا۔ پیا سچ کہتے ہو۔ موسم ایسا ہی فرحت بخش اور فرحناک ہے۔ دو منٹ بعد پرنس اٹھ کھڑے ہوئے پیچھے پیچھے اس وقت چالیس پینتالیس مصاحب ہوں گے۔ میں نے باہر نکل کر آسمان کا رنگ دیکھا تو کانپ گیا۔ ایسی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ گویا آج ساری دنیا کو ڈبونے کا تہیہ کر کے اٹھی ہے۔ وہ گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ صرف پرنس کا راستہ برقی قمقموں کی قطار سے دن کی طرح روشن تھا۔ بجلی کا انجنیئر جس کی ڈیوٹی تھی حکم کے ساتھ ہی باغ میں پہنچ چکا تھا۔ باغ بقعۂ نور بنا ہوا تھا ہر درخت میں سُرخ، سبز، زرد، گلابی، سفید اور اُودے رنگ برنگ کے پچاسوں بلب روشن تھے جس کی نور افشانی سے پورا باغ جگ مگ کر رہا تھا۔ پرنس خراماں خراماں لان پر پہنچے۔ خاصے کی میز اس عالم نور میں آئینے کی طرح چمک رہی تھی پرنس کے بیٹھتے ہی مصاحب صنیق۔ اپنی مقررہ نشستوں پر بیٹھ گئے۔ خدام کی خوبصورت اور نظر فریب۔ گھٹنوں تک سفید وردیوں میں ملبوس پانی پلانے کے لئے سامنے کھڑی تھی ایک طرف باورچی خانے کا عملہ تھا۔ اسٹاف افسر حکم کا منتظر بُت بنا ہوا کچھ فاصلے پر حاضر تھا۔ سروس شروع ہوئی پانی جیسے سروس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ پرنس نے پستئی رنگ کے سوپ سے اور پانی نے بھوار سے ابتدا کی۔ دو ہی چار منٹ میں ہماری رکابیوں میں تین حصے سوپ تو ایک حصہ پانی بھر گیا۔ پرنس نے غالباً سوپ کی بدمزگی محسوس کر کے چمچہ ہاتھ سے رکھ دیا۔ پیا سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا۔ پیا! سوپ اس وقت مزا دے رہا ہے۔ "پیا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ بہت صحیح ارشاد ہوا۔ اس وقت یخنی غلام کو بھی روز سے زیادہ لذیذ معلوم ہو رہی ہے۔ یخنی کی پلیٹوں کا اٹھانا تھا کہ موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ حسن اتفاق سے اس روز پرنسس بھی شریک طعام تھیں۔ ان سے تو پرنس نے اتنا ضرور کہا کہ آپ اپنے کمرے ہی میں خاصہ منگوا لیجئے وہ اُٹھ کر فوراً محل میں چلی گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ اب خود حضرت بھی اٹھ کھڑے ہوں گے مگر توبہ کیجئے جو اس اللہ کے بندے کے کان پر جوں بھی رینگی ہو۔ بارش ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی اور تم یقین کرنا کہ سروس اسی ادب [illegible]

خود ہی پلیٹوں کے آنے اور اُٹھنے میں پرنس اور دو باری شرابور ہو چکے تھے۔ تم ہوتے تو کم از کم اس دن وضعِ جنگ کی وضع داری کا لوہا مان جاتے۔ میرے پاس کچھ ایسے آن بان سے بیٹھے تھے گویا کیمرے کے سامنے تصویر کھنچوانے بیٹھے ہوں۔ میں نے معترضِ سخن ہو کر کہا "آپ تو درپردہ انھیں چکنا گھڑا کہہ رہے ہیں"۔ فانی بےساختہ ہنس پڑے۔ کہا "تم اپنی شاعری سے کسی وقت نہیں چوکتے"۔ آگے سنو، میں کھانا کیا کھا رہا تھا یوں سمجھو کہ زہر مار کر رہا تھا۔ شاہ ہرادلہ کے دسترخوان کی بریانی جسے تم روز مزے لے لے کر کھاتے ہو اس دن میرے سامنے آئی تو اس ڈر سے میں نے ایک بار چکھ لیا کہ اس طوفان آب میں اتنا ہی کھانا دشوار ہو جائے گا۔ بہ عجلت میں نے ایک لقمہ منہ میں رکھا دو سیکنڈ میں کیا دیکھتا ہوں کہ بریانی کا ایک ایک چاول پانی کے بہاؤ پر مائل بہ فرار ہے۔ لاحول پڑھ کر اس سے بھی دست کش ہو گیا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ "این چچہ بریانی فانی تہ آب ادلی"، اس برجستہ تصرف پر فانی لوٹ پوٹ ہو گئے جب جی بھر کے ہنس چکے تو بولے۔ خدارا اس مصرعے سے میرا نام تو نکالو۔ میں نے کہا اسے رہنے ہی دیجئے اگر کسی وقت داستان میں قلم بند کر سکا تو پڑھنے والوں کو بڑا لطف آئیگا کہنے لگے کیا ایسا ارادہ ہے؟ میں نے کہا لکھنے کی چیز اور مرے کی بات ہے وقت ملا تو انشاء اللہ ضرور لکھوں گا۔ بولے آگے سنو، سالن آنے شروع ہوئے، جو سالن لیتا ہوں، پلیٹ تک آتے آتے بوٹیاں اس طرح دھل جاتی تھیں گویا آج انھوں نے مسالے کا منہ ہی نہیں دیکھا البتہ ہلکی بوٹیاں جیسے میں فوراً ہی منہ میں رکھ لیتا تھا کسی قدر نمک اور مرچ کی آمیزش باقی رہ جاتی تھی اسی کو صبر اور شکر کے ساتھ چبا کر نگل لیتا تھا بقیہ دھل دھلا کر کھانے کے قابل نہیں رہ جاتی تھیں۔ غنیمت یہ ہوا کہ سالن آٹھ دس قسم کے تھے میں نے ہر سالن کی ایک ایک بوٹی سے پیٹ کے دوزخ کو بھر لیا۔

پرنس ایسی ادائے بے نیازی سے صدر میں رونق افروز تھے گویا سینما ہال میں کوئی پکچر ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ اُدھر پانی کے قطرے زبانِ حال سے کہہ رہے تھے۔ آج ساتوں سمندر کا پانی اُلچ کر تم سب پر نہ پھینک دیا تو ہمیں ساون کی گھٹا نہ کہنا۔ غضب خدا کا تمہارے شعور تحسین سے۔ پڑوسیوں کی نیند حرام ہو گئی۔ غریب رحمت علی (رحمت علی ایک انجینئر ہل فورٹ کے پیچھے رہا کرتے تھے) ساری

رات قُلقُل قُلقُل کے گزارتا ہے۔ چوتھے آسمان پر حضرت عیسیٰ کا شب میں خلل پڑتا ہے۔ اے بدانجامو! رات اللہ نے سونے کے لئے بنائی ہے یا تمہاری اُس یاوہ گوئی کے لئے جس میں تم [illegible] تک مبتلا رہتے ہو۔

پانی کا زور دم بدم بڑھتا ہی جاتا تھا۔ طوفانِ نوح کا نقشہ میرے پیشِ نظر تھا۔ وہاں بڑھیا کے روشن تنور سے پانی کا دھواں تھا یہاں بار بار میں سہمی نظروں سے اپنی پلیٹ کو تکتا تھا کہ کب اس سے چادرِ آب اُٹھتی ہے اور کب ہم سب کے سب دریا بُرد ہوتے ہیں۔ افسوس کہ وقتِ آخر کفن سے بھی محروم ہے۔ قسمت کی دو چپاتیاں حسبِ معمول آج بھی میرے سامنے رکھی تھیں مگر اُنھیں چھونے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ یہ مصرع میرے حسبِ حال تھا۔ ہاتھ آنے تو انھیں ہاتھ لگا۔ بنے نہ بنے۔ اس تصرف معنوی کی میں نے بہت تعریف کی۔ فانی نے خوش ہو کر کہا۔ خدا خدا کر کے لوزِ بالائی کی ڈش میرے پاس آئی۔ میں نے پیشتر بالائی کے ٹکڑے لیکن قبل اُٹھاتے وہ پھٹے ہوئے دودھ کی شکل میں تبدیل ہو چکی تھی پھر بادامی اور پستی لوزوں پر نگاہ ڈالی وہ مٹھائی کی دو رنگی گولیاں کی شکل میں ابھی تک ہاتھ میں تھے جھلا کر انھیں گولیوں کو منہ میں رکھ لیا کہ ذائقہ کچھ تو مزید ہی تبدیل ہو جائیگا۔ تاخیر کرنے میں یہ بھی خدشہ تھا کہ کچھ دیر میں یہ گولیاں کوئی نیا روپ نہ بھر لیں۔ اور پھر کام سے رہ جائیں۔ مبالغہ نہ سمجھنا۔ ہمارے مونڈھوں پر اتنا پانی پڑ چکا تھا کہ ڈنر کے اختتام پر پانی کی ایک موٹی دھار شیروانی، قمیص اور بنیائن کو میری پیٹھ پر مسلسل بہہ رہی تھی طرفہ یہ کہ اس کمبخت دھار کا رُخ جانبِ نشیب تھا جس سے سارا پاجامہ علیحدہ لت پت ہو گیا تھا۔

ڈنر کے خاتمے پر پرنس نے اطمینان سے ہاتھ دھوئے۔ طمانیت کے ساتھ گلوری کھائی۔ پھر بڑی دلجمعی سے خلال کرنے لگے۔ خدمتگاروں نے اب مصاحبوں کے ہاتھ دھلوانے شروع کر دیئے حالانکہ اس دن یہ ایک غیر ضروری سی بات تھی۔ ہمارے ہاتھ پہلے ہی سے دھل دھلائے تھے۔

پرنس پیاسے راجہ بھرے کے سفر حج پر گفتگو فرما رہے تھے مجھے اس بےکسی میں تصور بندھا کہ میں غالباً کوئی وحشتناک خواب دیکھ رہا ہوں آنکھ کھلے گی تو گرم بستر گرم ملیں گے اور میں بھی ہونگا

ے نصیب ہوئے منہ بگاڑے دیتے تھے۔ پانی آنکھوں میں گھسا جاتا تھا۔ ایسی
بلا کو خواب کیوں کر تسلیم کرتا۔ پندرہ منٹ کے بعد پرنس کرسی سے
اٹھے ہم سب بھی اُٹھ کھڑے ہوئے آگے آگے پرنس، پیچھے مصاحبوں
کا مریتر انبوہ۔ سرکار اس وقت بھی اسی اطمینان سے چل رہے تھے گویا
تپتے ہوئے دن میں گل گشتِ چمن میں مصروف ہیں۔ چلتے چلتے یکایک
رکے۔ پیار سے فرمایا۔ حضرت رابعہ بصری اپنے وقت کی قطب تھیں
میاں نے دست بستہ عرض کیا۔ بہت صحیح ارشاد ہوا صاحب خانہ زاد
نے بزرگوں سے سنا ہے کہ ان کی خدمت میں بڑے بڑے اولیاء اللہ
حاضر ہوا کرتے تھے۔ غرض اسی طرح ٹھہرتے اور چلتے خدا خدا کر کے
ان فورٹ کی گیلری میں داخل ہوئے چھت کا سایہ ہمارے سروں
کو اور کسی قدر گرمی ہمارے جسموں کو نصیب ہوئی۔

اسی حالت میں ہمیں چھوڑ کے خود بدولت غسل خانے
میں گھس گئے اور پانچ منٹ کے اندر لباس تبدیل فرما کر برآمد
ہوئے۔ مجھے امید تھی اب حکم دیں گے۔ تم لوگ بھی گھر جا کر کپڑے
بدل ڈالو اور آرام کرو یا توشے خانے کے داروغہ کو حکم دیں گے
کہ ان کو ایک ایک دھلا ہوا جوڑا دیدو۔ یہ لوگ بھی بدن پونچھ
کے لباس بدل لیں۔ مگر توبہ کیجئے جو ان میں سے ایک بات بھی کی
ہو۔ دربار ہال میں اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہم سب کی باری باری
پکار ہوئی ہم سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے۔ معزز اور بندوچوکی پر گئے
اور مشاعرہ شروع ہو گیا۔

میں نے کہا آپ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ نہ مبالغہ کرنے کی
عادت ہے اس لئے میں اسے صحیح سمجھنے پر مجبور ہوں۔ دوسرا کہتا
تو کبھی یقین نہ کرتا فانی کہنے لگے۔ یہ سب اسی طرح صحیح ہے جیسے
اس وقت شام کے پانچ بجے ہیں اور تم یقین کرنا کہ تین بجے رات
تک وہ بھیگے کپڑے ہمارے جسموں ہی پر خشک ہو گئے۔ جب کہیں
ہمیں گھر جانے کی اجازت ملی۔ اب انصاف سے کہو۔ تمہاری چند
منٹوں کی بھوک اور صرف ایک گھنٹے کھڑے رہنے کی زحمت زیادہ
تھی یا میری مصیبت۔ میں نے تسلیم کیا۔ آپ کی مصیبت میری زحمت
سے زیادہ تھی میں نے کہا مجھے افسوس ہے کہ میں اس ڈنر میں
شریک نہ تھا ورنہ جس وقت پرنس نے محل کا رخ کیا تھا دست بستہ
عرض کرتا سرکار! موسم نہایت خوشگوار ہے مضائقہ نہ ہو تو

آج مشاعرہ بھی لان ہی پر منعقد ہو۔ فانی بے اختیار ہنسنے لگے۔
پھر بولے۔ بیشک کہنے کی بات تھی مگر تم ہی کہہ بھی سکتے تھے۔

چمن کی بے تمیزی

فانی کی رام کہانی خود اُن کی
زبانی سن کر حیران و ششدر
میں گھر پلٹا تو شام ہو چکی تھی۔ آج پہلا کام میں نے یہ کیا کہ کچھ کھا کر
بارہ ایک بجے رات تک دربار میں باطمینان بیٹھنے کا بندوبست کر لیا۔ منہ
ہاتھ دھو کر کنگھا کیا۔ کپڑے تبدیل کئے۔ آٹھ بجے موٹر آگئی۔ آج بھی فانی نہ
تھے۔ میں تنہا ہی طلسمی مکان کی طرف روانہ ہوا۔ جو ریڈ ہل پر واقع تھا۔
موٹر سے اُترتے ہی اسی خوبصورت خادم نے مسکرا کر میرا استقبال کیا اور
اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے خود آگے آگے ہو لیا۔ مختلف گیلریوں اور
آراستہ کمروں کو طے کرنے کے بعد ایک نئے کمرے کے سامنے پہنچ کر۔ مجھے
ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ خود اندر جا کر میری حاضری کی اطلاع دی۔ ایک
منٹ کے بعد اندر سے باہر آکر مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے مجربہا و
مرسیہا کہہ کر کمرے میں قدم رکھا۔

پرنس آج آئینہ خانہ میں تشریف فرما تھے۔ پہلو میں دوسری کرسی
پر وہی حسینہ جلوہ افروز تھی۔ اس کمرے کا فرش، فرنیچر، پردے سب
نہایت بیش قیمت تھے۔ دیواروں پر ہلکے گلابی رنگ کی قلعی تھی۔ چھت
میں طرح طرح کے نقش و نگار تھے۔ جس دروازے سے میں داخل ہوا
تھا اس کے علاوہ کوئی دروازہ نہیں تھا۔ دیوار میں ہر طرف
بیش قیمت آئینے جڑے ہوئے تھے جو طول میں کسی طرح سات
سات فٹ سے کم نہ ہوں گے۔

پرنس کا سامنا ہوتے ہی میں نے درباری سلام کیا انھوں
نے ایک خوشگوار تبسم کے ساتھ سر کو جنبش سی دی۔ پھر اس
آفتِ جان کے رُوبرو، سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر ادب سے سر
جھکایا۔ پرنس نے فرمایا آؤ بیٹھو پھر ایک بار آداب بجا لا کر میں
نے سامنے کی کرسی پر بیٹھنا چاہا۔ حکم ہوا۔ وہاں نہیں، ادھر آؤ۔ ہمارے
پاس بیٹھو۔ میں نے اٹھ کر سات سلام کئے اور دست بستہ عرض
کیا۔ خانہ زاد آقا کے برابر کیوں بیٹھے۔ ارشاد ہوا۔ ہم حکم جو دے رہے
ہیں۔ میں نے پھر سات سلام کئے اور ادب سے پرنس کی برابر والی
کرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں خادم نے شیام صاحب کی اطلاع کی۔ حکم
ہوا بلا لو۔ شیام صاحب آج بڑی دھج سے تشریف لائے تھے۔ کھدی

ہوئی داڑھی۔ مونچھوں پر جاپانی خضاب کی پالش، نئی شیروانی، نئی دستار، کمر میں مانگے تانگے کا نیا بکلوس۔ پاؤں میں کم قیمت سے بے پالش پمپ پاجامہ پر پیک کے دس بیس دھبے۔ سامنے آتے ہی آداب بجا لائے حکم ہوا ان کے پاس والی کرسی پر بیٹھو (اشارہ مجھ کی طرف تھا) شیام صاحب اس بے تکلفی سے اس کے برابر ڈٹ گئے گویا بے تکلف دوستوں کی محفل ہو۔ نہ ادب نہ آداب۔ ارشاد ہوا "کہو بغلول دوپہر کا کھانا تم نے ان کو سلیقے سے کھلایا تھا کسی چیز کی کمی تو نہ تھی؟" شیام صاحب نے دست بستہ عرض کی "سرکار کے اقبال سے کسی شے کی کمی نہ تھی۔ غلام موٹر پر اتنا خاصہ لدوا لایا تھا جو دس آدمیوں کے لئے کافی ہوتا۔ یہ بیچاری تو تنہا کھانے والی تھیں۔ اور شریک صرف یہ غلام تھا"

پرنس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا فرمایا۔ "صدق! میں نے شیام کو بغلول کا خطاب دیا ہے۔ تمہاری رائے میں کیسا خطاب ہے۔؟" میں نے دست بستہ عرض کیا "نہایت موزوں اور بہت ہی زیبا" وہ گلفام کھل کھلا کر ہنسی۔ شیام صاحب نے قہقہہ لگا کر قہر ڈھایا۔ پرنس فرمانے لگے آج جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھو انھیں کا جلوہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ تم انھیں کی طرف دیکھو۔ جدھر چاہے دیکھو۔ دکھائی یہی دیں گی۔ میں نے دست بستہ شعر پڑھا ؎

جڑے ہیں ہر طرف خلوت کدے میں اُن کے آئینے
تنِ تنہا چلا کرتی ہیں چوٹیں ہر مقابل سے

پرنس بے حد محظوظ ہوئے اس رشکِ ماہ نے بھی پسندیدگی کا اظہار کیا۔

تھوڑی دیر بعد کیرپو (قاری سلیمان صاحب) تشریف لائے پرنس نے بڑی شگفتگی سے فرمایا۔ "آؤ کیرپو۔ کل میں عجلت میں تمہیں بلانا ہی بھول گیا تھا تم آجاتے ہو تو محفل میں جان سی آجاتی ہے" کیرپو "سرافرازی، بندہ نوازی" کہتے ہوئے میرے پاس بیٹھ گئے ان کے بعد اے ڈی سی اور وہی درباری جو کل کی صحبت میں شریک تھے حاضر ہوئے۔

آج مہمانِ عزیز کی دلچسپی کے لئے لکھنؤ کا آیا ہوا ایک طائفہ بلوایا گیا تھا کچھ دیر میں صحنِ مکان سے ساز کی آواز آنے لگی اور پرنس اُٹھ کر صحن میں تشریف لے گئے ناچ شروع ہوا اور رقاصہ فنِ رقص کے کمالات دکھانے لگی۔ اتفاق سے ایک چکر میں کیرپو کی سفید اور مقدس داڑھی کا مغنیہ کی ساڑھی کے آنچل نے بھری محفل میں بوسہ لے لیا کیرپو اس بد اتفاقی پر چین بہ جبیں ہوئے۔ پرنس بے اختیار ہنسنے لگے مجھ سے ارشاد فرمایا "صدق یہ ہمارے اُستاد ہیں۔ میں ان کا بہت ادب کرتا ہوں۔ اسی لئے جب کوئی میری محفل میں آجاتی ہے تو میں تبرکاً اور تیمناً ان کی داڑھی سے اس کی ساڑھی کے دامن کو مس کر لیتا ہوں تاکہ اس کے گناہ نامۂ اعمال سے محو کر دیئے جائیں" کیرپو نے نہایت برہمی سے کہا "بجا ارشاد ہوا" اس اظہارِ خفگی پر سارے درباری کھل کھلا کر ہنسنے لگے۔ وہ غیرتِ ماہ بھی بہت ہنسی۔ غرض انھیں رنگ رلیوں میں ایک بج گیا۔ پرنس کے اشارے پر ناچ موقوف ہوا۔ حکم ہوا میز پر خاصہ لگاؤ۔

مجھے حکم ملا کہ ہاتھ منہ دھو ڈالو۔ میں ہاتھ منہ دھو کر ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ پرنس کے داہنے ہاتھ پر مجھ کی نشست تھی بائیں ہاتھ کی پہلی کرسی پر مجھے بیٹھنے کا حکم ملا۔ میرے بعد اے۔ ڈی۔ سی، ان کے بعد دوسرے درباری تھے۔ مجھ کے بعد شیام صاحب ان کے بعد مصاحبوں کی لائن تھی۔ بے چارے فانی، امک جنگ، ڈھمک جنگ اور دوسرے عام مصاحب آج کی محفل میں بھی باریابی سے محروم رہے۔

آج میز گوناگوں نعمتوں سے لدی ہوئی تھی خصوصیت کے ساتھ بریانی، پلاؤ فنکار باورچی نے ایسا نفیس تیار کیا تھا جس پر گمان ہوتا تھا کہ یہ قاب بہشت بریں سے اتری ہے یہی حال دوسری نعمتوں کا تھا جو شے تھی لاجواب پکی تھی۔ میری نظر اس گل اندام کے روئے روشن پر تھی۔ اٹکل سے چھری اور کانٹے کی مدد سے کھانا بھی کھاتا جاتا تھا مگر کھانے سے کہیں زیادہ لذت نظارۂ جمال سے حاصل ہوتی تھی۔ دل ہی دل میں قدرت کی صناعی پر عش عش کرتا تھا۔ رہ رہ کے خیال آتا تھا کہ دولت میں کتنی طاقت ہے جس نے ایسے محبوبِ رنگیں ادا کو بمبئی سے حیدرآباد کھینچ بلایا پرنس کیسے خوش نصیب ہیں جن کی محفل میں ایسی رشکِ حور زینتِ محل ہے۔ ڈنر کے بعد پرنس اسی میز پر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے ان محفلوں میں بیا بھی نہ بلائے جاتے جو درباری شریکِ صحبت رہتے تھے وہ سب کے سب نوجوان اور کم عمر تھے پرنس کسی کی طرف متوجہ نہ ہوتے تھے جو ارشاد ہوتا تھا وہ مجھی سے اس توجہ سے میری جان عذاب میں تھی۔ ذرا سی لغزش ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں اسی سلسلے میں یہ بھی ارشاد ہوا کہ آج دوپہر کو لکھنؤ کا

ایک آدمی میرے پاس راجہ صاحب محمود آباد کا ایک سفارشی خط لیکر آیا تھا میں نے اُسے نظامیہ ہوٹل میں ٹھہرا دیا ہے جب ہل فورٹ میں تم کو یاد کروں کا تو تم اُسے دیکھو گے۔ شعر بھی کہتا ہے میں نے تخلص پوچھا فرمایا تخلص صحیح طور پر تو میں تمہیں نہیں بتا سکتا لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ بھینس کا ہم قافیہ کوئی تخلص اس نے مجھے بتایا تھا اُس ارشاد پر وہ مہ جبین کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔ میں نے عرض کیا کیا عجب ہے کہ بھینس ہی تخلص فرماتے ہوں اس کے اچھوتے ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں۔ اس پر پرنس بھی بے اختیار ہنسنے لگے۔ فرمایا نہیں نہیں بھینس اس کا تخلص نہیں ہے مگر ہے کوئی لفظ اسی کا ہم قافیہ تم خود ہی جو دیکھو گے۔

ادھر میں نے بہت خوب کہا اُدھر پرنس نے گھڑی دیکھی فرمایا ڈھائی بجے ہیں تمہارے جانے کا وقت آگیا مگر جانے سے پہلے ان کو کوئی لطیفہ سُناتے جاؤ جس پر یہ بے اختیار ہنس دیں"

میں نے دست بستہ عرض کیا۔ گذشتہ جولائی میں ورنگل انٹر کالج کا سالانہ مشاعرہ تھا۔ سرکار اس وقت اوٹی میں رونق افروز تھے مجھے فرصت تھی اُدھر ورنگل کے احباب کئی برس سے باصرار بُلا رہے تھے مجھے موقع نہ ملتا تھا۔ اب کی فرصت کو غنیمت جان کر چلا گیا۔

مشاعرہ کی رات کالج کا ہال سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

کالج کے اُستاد محمد اسماعیل صاحب ذبیح اپنی جگہ سے اُٹھکر تخت پر اپنی غزل پڑھنے کی نیت سے بیٹھے اہل مشاعرہ ہمہ تن گوش تھے کہ دیکھیں کیا پڑھتے ہیں انھوں نے مطلع سُنایا ؎

نکلنے کو تو حسرت وصل کی اے نازنیں نکلی
مگر جیسی نکلنی چاہیے ویسی نہیں نکلی

— ہال کے ایک گوشے سے کسی نے باآواز بلند کہا "حضور ہماری رائے میں نازنیں اتنی قصوروار نہیں جتنے خود آپ ہیں۔ اس جملہ پر سارا ہال قہقہوں سے گونج گیا۔ خود پرنس بے اختیار ہنسنے لگے سارا ضبط و نظم درہم برہم ہوگیا۔ حکیم ذبیح صاحب مطلع کے آگے نہ پڑھ سکے غزل پھاڑ کر پھینک دی یکنے جھکتے ڈائس سے اُتر آئے پرنس مارے ہنسی کے خود لوٹے جا رہے تھے اُدھر اس رشک قمر کا ہنسی سے بُرا حال تھا۔ پرنس اس قدر ہنسے کہ آنسو نکل آئے۔ اور خدام

تو لیا لیکر دوڑے بارے ہنسی کا دورہ ختم ہوا۔ اب تین بج چکے تھے۔ مجھے بھی ہنسی خوشی سرکار نے گھر جانے کی اجازت دیدی اور اس گرما گرم لطیفہ کو بہت پسند کیا۔ عیش و نشاط کی یہ محفلیں مسلسل دو ہفتے گرم رہیں۔ انجام کار جس طرح دُنیا میں ہر خوشی کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ یہ خوشی بھی ایک دن ختم ہوگئی مہمان عزیز رُخصت ہوگیا اس شام موٹر مجھے لینے آئی تو فاکی پہلے سے موٹر پر موجود تھے مجھے دیکھکر ہنسے اور کہنے لگے گذشتہ دو ہفتوں میں تم نے جی بھر کے داد عیش دے لی آج پھر ہل فورٹ ہے اور ہم ہیں وہی جانی پہچانی صورتیں ہوں گی وہی حالات ہوں گے۔

آج خاصے کی میز پر وہی قدیم نمک خوار تھے مگر میں نے اپنے سامنے کی صف میں ایک اجنبی کو دیکھا۔ معاً خیال آیا ہو نہ ہو یہی وہ آدمی ہے جس کا ذکر اشارۃً سرکار ریڈ ہل والے مکان میں فرما چکے تھے اتنے میں پرنس نے خود ہی اس کا ان لفظوں میں [illegible] جو تمہارے سامنے بیٹھے ہیں لکھنؤ سے راجہ محمود آباد کا [illegible] لیکر میرے پاس آئے ہیں جھمن نام ہے۔ طپش تخلص کرتے ہیں ایک سرکس میں ان کا بھی کچھ حصّہ ہے۔ راجہ صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ میں ان کے سرکس کے لئے ان کو کوئی موزوں جگہ دلوا دوں۔

پبلک گارڈن کے سامنے کا میدان میری رائے میں نہایت موزوں جگہ ہے وہیں مناسب رہے گا فاکی نے دست بستہ عرض کیا وہ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ [illegible] شہر میں ہے " ایک جنگ ہاتھ باندھ کر بولے "اب تک جتنے اچھے سرکس بلدے میں آئے ہیں وہیں ٹھہرے ہیں"۔ ڈھمک جنگ بولے " سرکار نے بہت اچھی جگہ تجویز فرمائی اس سے بہتر جگہ شہر کے وسط میں ملنی محال تھی۔

پرنس نے ارشاد فرمایا مجھے راجہ صاحب محمود آباد کی سفارش کا بڑا خیال تھا " انھیں باتوں میں ڈنر اختتام کو پہنچا بالائی اور لوز کی آخری ڈش جب پرنس کے سامنے آئی تو انھوں نے پلیٹ منگوا کر کم و بیش اس میں آدھا پاؤ بالائی نکالی پھر اپنے ہاتھ سے دو لوز بادام کے اور وہیں پستے کے رکھ کر وہ پلیٹ جھمن کی طرف بڑھائی فرمایا جھمن تم لکھنؤ کے رہنے والے ہو جہاں کی بالائی مشہور ہے۔ ذرا ہمارے یہاں کی بالائی بھی چکھو " اس نمک خوار نے وہ پلیٹ بغیر ادب و آداب کے لے کر چمچے بھر بالائی مُنہ میں ڈال لی۔ پھر مُنہ بنا کر بولا " ہوں اسے بھی کہتے

نہیں ہے۔

پرنس مجھے اور فانی کو دیکھ کر مسکرائے ہم لوگ بھی ہنس دیئے۔ مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ راجہ صاحب محمود آباد جن کے ادنیٰ خدمت گذار بھی اعلیٰ درجہ کے مہذب اور شائستہ ہیں انھوں نے لکھنؤ ایسے شہر سے جہاں کی تہذیب اور شائستگی ضرب المثل ہے اتنے بڑے دربار میں بھیجا تو ایسے جانگلو کو بھیجا یقین نہ آتا تھا کہ یہ شخص لکھنؤ کا باشندہ ہے یا راجہ صاحب محمود آباد کے دربار سے دور کا بھی تعلق رکھتا ہے مگر چپ تھا کیونکہ اُن کے سفارشی خط کی تصدیق پرنس فرما چکے تھے۔

ناشتے کے بعد جب دربار جما تو پرنس نے مہمان نوازی کی راہ سے اُس سے اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی۔ دو تین غزلوں سے اس نے ہم سب کی سامعہ خراشی کی کسی کو کوئی لطف نہ آیا غالباً پرنس بھی فرمائش کر کے پچھتائے ارشاد ہوا "اچھا جمن اب تم جاکر آرام کرو میں تمہیں پھر یاد کروں گا"۔ اسے رخصت کر کے پیا سے مخاطب ہوئے۔ فرمایا "تم نے اس کا کلام سنا؟" پیا نے کہا "بالکل بے مزہ کلام ہے"۔ پرنس کہنے لگے "میرا منشا یہ ہے کہ فانی اور صدق کا کلام جس طرح دل سے تعلق رکھتا ہے اس کے کلام کو دل سے کوئی تعلق نہیں"۔ امک جنگ اور ڈھمک جنگ نے یک زبان ہو کر دست بستہ عرض کیا لاحول ولا قوۃ تک بندی کرتا ہے شاعری سے اسے کیا سروکار۔

پرنس فرمانے لگے۔ میں تو دعوے سے کہتا ہوں اس کی شاعری کو دل سے کوئی لگاؤ نہیں؟ میں تو پہلے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ عرض کیا "فدوی بھی دعوے سے کہتا ہے کہ اس کی شاعری کو دماغ سے بھی کوئی لگاؤ نہیں"۔ فانی سب سے پہلے کھل کھلا کر ہنسے پھر سب درباری ہنس پڑے۔ پرنس بہت ہنسے فرمایا "میرے قول کے موافق اس کی شاعری کو دل سے تعلق نہیں تمہارے قول کے مطابق دماغ سے لگاؤ نہیں تو آخر پھر کس مقام سے ہے۔" میں نے عرض کیا "دربار میں اس کی وضاحت کا محل نہیں لیکن یہاں سب اہل علم اور اہل کمال بیٹھے ہیں۔ سب کے سب اس اشارے کا پورا لطف اٹھا سکیں گے۔ پرنس پیا کی طرف مخاطب ہوئے "پیا دیکھتے ہو صدق کی ذہانت میں نے ایک معمولی سی بات کہی تھی کہ اس کی شاعری کو دل سے کوئی لگاؤ نہیں۔ آپ جھٹ کھڑے ہو گئے کہ فدوی کی رائے میں دماغ سے بھی کوئی لگاؤ نہیں"۔ پیا ہنسنے لگے پھر کہا "صاحب بادشاہوں اور شہزادوں کی صحبت میں ایسے ہی ذہین اور سہ طباع رہ بھی سکتے ہیں"۔ میں نے اُٹھ کر پیا کو سلام کیا۔

پیا نے کہا "صاحب آپ نے شاید وہ نادر شاہ اور مرزا مہدی کی حکایت نہیں سنی۔ نادر شاہ اپنی پہلی یورش میں جب دریائے اٹک کے کنارے پہنچا مرزا مہدی (سکریٹری) سامنے حاضر تھے۔ اُن سے کہنے لگے مرزا تم مجھے کوئی ایسی غذا بتا سکتے ہو جو کھانے میں ایک ہی لقمہ ہو مگر دُنیا کی ہر غذا سے زیادہ لذیذ ہو۔ مرزا مہدی نے دست بستہ کہا "جہاں پناہ، بیضۂ مُرغ"۔

اس کے بعد ہی نادر شاہ اپنے فوجی کاروبار میں ایسا معروف ہوا کہ یہ گفتگو وہیں ختم ہو گئی۔ دہلی کو تاراج کر کے برسوں کے بعد جب واپس ہوا اور پھر دریائے اٹک کے کنارے گھوڑا روکا تو محولہ بالا گفتگو یاد آ گئی۔ پوچھا "مرزا مہدی! کس چیز کے ساتھ؟" مرزا مہدی نے کہا "سیاہ مرچ اور نمک کے ساتھ"۔ بادشاہ خوش ہو گیا اور جو لوگ اس کے قریب تھے مرزا مہدی کی ذہانت پر عش عش کرنے لگے۔

تمام اہل دربار نے اس لطیفے کو بہت پسند کیا۔ پرنس بھی بہت خوش ہوئے، یکایک مجھ سے اشارہ ہوا۔ "اچھا صدق تم مجھے کوئی ایسا شعر سناؤ۔ جس کا تعلق محض دماغ سے ہو۔ دل سے کوئی لگاؤ نہ ہو" میں نے دست بستہ عرض کیا ؎

ساتویں شب اپنے کوٹھے پر وہ مہ پارہ چڑھا
دونوں ٹکڑے مل گئے اک چاند پورا ہو گیا

پرنس اور فانی بیک وقت پھڑک گئے۔ سب درباری بھی تعریف کرنے لگے۔ پرنس نے فانی کو مخاطب کر کے فرمایا۔ فانی نے کہا "اس کی ان کے پاس کیا کمی۔ دیوان کے دیوان حفظ ہیں"۔

پرنس پھر مجھ سے مخاطب ہوئے فرمایا "صدق کیا تم برجستہ کوئی ایسا شعر مجھے سنا سکتے ہو جو ہو تو بامعنی مگر میری سمجھ میں نہ آئے شرط یہ ہے کہ کوئی ثقیل اور نامانوس لفظ بھی نہ آنے پائے"۔ فانی بیچ میں بول اُٹھے "کمال تو جب ہے کہ میں بھی نہ سمجھ سکوں"۔ میں نے کہا "انشاءاللہ ایسا ہی شعر پڑھوں گا۔ اور جھٹ پرنس کی خدمت میں یہ شعر پیش کر دیا ؎

تصویر کہنہ پر بھی رہیں بدگمانیاں
خط ان کے جس کے پاس گئے بے ٹکٹ گئے

(باقی صفحہ [illegible] پر)

اپنے اسٹیشن کو صاف رکھئے

* اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ صاف ستھرا ماحول ایک طرف کسی شخص کے کردار کا آئینہ دار ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کردار کو نکھارتا ہے۔ صاف ستھرا گرد و پیش خوشی و مسرت بکھیرتا رہتا ہے۔
* ہم اپنے گھر صاف ستھرا رکھتے ہیں تو پھر ان جگہوں کو صاف شفاف کیوں نہ رکھیں جنہیں ہم سب استعمال کرتے ہیں۔
* ریلوے پلیٹ فارموں، ویٹنگ روموں، سواری ڈبوں اور درحقیقت اُن تمام جگہوں کو جہاں بڑی تعداد میں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں اگرد و پیش کو صاف شفاف رکھنا بہت ضروری ہے۔
* ریلوے نے صفائی مہم شروع کی ہے جس کے بہت اچھے نتائج نکلے ہیں۔ اب ریلوے صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہم زیادہ صفائی کے لئے اپنی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔
* آپ بھی اس سلسلے میں ریلوے کی مدد کر سکتے ہیں۔ آپ صرف اتنا خیال رکھیں کہ آپ کے آس پاس کی جگہ بالکل صاف شفاف حالت میں رہے اس طرح اسٹیشن اور منسلکہ مقامات صاف ستھرے رہ سکتے ہیں اور ہاں آپ ریلوے صفائی محکمے کے کارکنوں کی خدمات سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور وہ صرف آپ کی خدمت کے لئے ہی رکھے گئے ہیں۔
* آپ بھی ذرا خیال رکھئے کہ کوڑا کرکٹ آپ کے ہاتھ سے اِدھر اُدھر نہ بکھرنے پائے۔ بلکہ کوڑا دان میں پھینکا جائے۔ آپ کا یہ معمولی سا کام ہمیں آپ کی بہتر خدمات کرنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

ریلوے آپ کی پراپرٹی ہے

اسے صاف شفاف رکھئے

ناردرن ریلوے

مشاعرہ میلہ چھڑیاں کھتولی

کریمی الاحسانی

آج ۲۰ ستمبر ۸۸ء رات کے دس بجے ہیں میونسپل بورڈ کھتولی (مظفر نگر) کے گراؤنڈ کو کرسیوں ۔ فرش ۔ پرتکلف اسٹیج اور روشنی سے پر نور اور مزین بنا دیا گیا ہے اس گراؤنڈ میں آج ایک مشاعرہ آنجہانی سہراب اصید کھتولوی کی یاد میں حسب دستور منعقد ہو رہا ہے ایک طرف خواتین کا بھی جم غفیر ہے جو ساڑیوں اور برقعوں میں ملبوس نظر آرہی ہیں ڈاکٹر امیر اعظم قریشی ۱۱ بجے صدارت کے لئے جناب سبھاش چندر چترویدی کلکٹر مظفر نگر کا اسم گرامی پیش کر رہے ہیں جس پر پرزور تالیوں سے اظہار خوشنودی اور تائید کی جارہی ہے۔ محترم کلکٹر صاحب تالیوں کی جھنکار میں پھولوں میں لدے پھندے مائک پر آکر نہایت شگفتہ زبان میں فرمارہے ہیں :-

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ لوگوں نے مجھے صدارت کا موقع دیا۔ کھتولی کا مشاعرہ بہت زیادہ مشہور ہو چکا ہے عوام ہر سال اس مشاعرہ کا انتظار کرتے رہتے ہیں میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا اور اب انور جلال پوری سے درخواست کروں گا کہ اس مشاعرہ کو چلائیں پھر تالیوں کی جھنکار میں واپس آکر شعراء کرام کے ساتھ ہی بلا تکلفی سے بیٹھ گئے ہیں مسٹر منبل ایس۔ پی۔ مظفر نگر نے اس مشاعرہ کا افتتاح فرمایا۔ ہر دو حضرات کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے ہیں اور ڈاکٹر قریشی نے انور صاحب سے درخواست کی ہے کہ نظامت سنبھالیں انور صاحب کا تالیوں سے خیر مقدم کیا جارہا ہے اور آپ فرمارہے ہیں :-

صدر محترم اور حاضرین مشاعرہ سرزمین مظفر نگر پر آج جو یہ مشاعرہ منعقد ہو رہا ہے وہ اس سرزمین کے ایک استاد سہراب اصید کھتولوی کی یاد میں منعقد ہوتا رہا ہے یہ زبان ہندو اور مسلمانوں کی زبان ہے ہندوستان نے جمہوریت کی صورت اردو کی وجہ سے دیکھی ۔ تالیاں ــــ جب ہم سب ایک ڈائس پر جمع ہو جاتے ہیں تو ہم الہ آباد کے سنگم یعنی گنگا جمنا کے سنگم پر کھڑے ہوتے ہیں ۔ تالیاں ملک میں ایک افرا تفری کا عالم ہے ہم آج جو خون بہا رہے ہیں جب کل سرحدوں پر ضرورت پڑے گی تو کہاں سے اس وقت خون لائیں گے ۔ تالیاں ۔ جب ہم آج اس طرح بے دریغ خون بہانے پر تلے ہیں۔ آئیے کچھ دیر کیف و مستی میں گزار لیں اور اب آپ عبدالستار اختر سے ان کا کلام سنئے ۔ اختر صاحب صیغۂ واحد غائب بنے ہوئے ہیں اس پر انور صاحب فرمارہے ہیں آخر صاحب بے اختر ہو رہے ہیں میں نے عرض کیا کہ مشاعرہ کی بسم اللہ حسرت صاحب سے کرایئے جو خوب پڑھتے ہیں چنانچہ میری درخواست پر امیر اشرف حسرت کھتولوی کو دعوت غزل دی جارہی ہے حسرت صاحب غزل سرا ہیں ؎

وہ جن کو شورشِ طوفاں میں پلتے دیکھا ہے
رخِ زمانہ انھیں کو بدلتے دیکھا ہے
کچھ ایسے ہم نے زمانہ بدلتے دیکھا ہے
کہ گل رخوں کو بھی کانٹوں پہ چلتے دیکھا ہے
برے دلوں میں کریں دشمنوں سے کیا امید
کہ دوستوں کو بھی آنکھیں بدلتے دیکھا ہے

بہت خوب داد پاکر اور تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں اور انور صاحب بابائے کھتولی الحاج حشمت سبزواری جھنجھٹ کھتولوی کو کلام پڑھنے کے لئے دعوت دے رہے ہیں۔ جھنجھٹ صاحب فرمارہے ہیں ؎

بم کے موجد نے کبھی یہ بھی نہ سوچا ہوگا
ہر کوئی ڈھیر ہے یا گنبد کے بیٹھا ہوگا

داد اس مطلع کا حق ہے لہٰذا داد کا شور کم ہوا تو پولی اپنے اصلی رنگ کا مظاہرہ کرتے چلے ہیں ؎

جس تمنا سے بڑھاپے میں کری تھی شادی
یہ نہ معلوم تھا اب سر مرا جھینگا ہوگا
بیوی بہری ... بیٹھی ہے شاطر کر سے
ساتھ اغیار کے وہ سن کے کہیں دیکھا ہوگا

جبتک جعفری صاحب قُلِ مِینائے کرکے داد وصول کئے اپنی جگہ آرہے ہیں اب اگر سبزواری صاحب نے تخلص بدلا تو یقیناً گڑبڑ ہوگا اور یہ تخلص ان کے مزاج کے ... ... عین مطابق بھی ہوگا کیونکہ مزاج کے لئے یہ تخلص بھی لاجواب ہے آیئے پھر منصور عثمانی مُرادآبادی سے سُنئے گا سہ

نہ جانے کب سے جو لوگوں کو سائے دیتا ہے
وہی درخت زمانہ جلائے دیتا ہے
اب ایسے خواب میں نیندیں حرام مت کیجئے
جو سارے شہر کو پاگل بنائے دیتا ہے

آہ اور واہ کا شور کم ہوا تو ارشاد ہوا ہے سہ

تشنگی دل کی بجھا دو تو خبر کر دینا
اشک پلکوں پہ چھپا دو تو خبر کر دینا
ایک مُدت سے ترستی ہیں ہماری نیندیں
تم اگر خواب میں آؤ تو خبر کر دینا

منصور صاحب بھی داد لوٹے چلتے بنے اور اب حسین حیدر زیدی غزل سرا ہیں سہ

دل شکستہ نہ ہو ساقی سے نہ میخانے سے
یہ صدا آئی کھنکتے ہوئے پیمانے سے

حسین صاحب کچھ اس انداز سے الاپ رہے ہیں کہ یار لوگ تو داد سے جھولیاں بھر ہی رہے ہیں لیکن شاہجہاں یا تو یاد کا ہنستے ہنستے بُرا حال ہے ذرا سامنے والے کچھ عجیب انداز سے آہ اور واہ کا نعرہ بلند کر رہے ہیں اور آپ اسی ہنسی مذاق سے بے نیاز الاپ رہے ہیں سہ۔

چشمِ نم کون چلا دیکھنا میخانے سے
مے چھلکنے لگی ساقی ترے پیمانے سے

داغِ دل خونِ وفا رنگِ شفق شامِ اَلم
کتنے عنوان بنے اِک مرے افسانے سے

حسین صاحب جو مائک سے کھسکے تو وہی سامنے والے ایک اور ایک اور کا نعرہ بلند کر رہے ہیں اس پر ڈی۔ ایم صاحب اشارہ کر رہے ہیں کہ ذرا رہنے دیجئے اور ادھر سلیم کھتولوی آپ پڑھنے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ فرمایا ارشاد۔ سلیم صاحب حسبِ عادت یوں گرجدار ترنم سے غزل چھیڑ رہے ہیں سہ

بہاروں کی خوشی میں پھونک ڈالا آشیاں ہم نے
ذرا پہلے نہ پہچانی نگاہِ باغباں ہم نے
سمجھنا چاہتے ہیں رہبروں کا ظرف کتنا ہے
ابھی خود کو بنا رکھا ہے گردِ کارواں ہم نے
تمہاری آستینوں سے ہمارا خوں پکارے گا
ابھی کیا ہے ابھی تو کاٹ رکھی ہے زباں ہم نے

مصرعہ اٹھائے۔ سلیم صاحب چیخ رہے ہیں اس پر کلکٹر صاحب مسکرا رہے ہیں اور آپ خوب خوب داد دے رہے ہیں اور سلیم صاحب داد و تحسین پاکر پلٹ رہے ہیں ادھر وسیم صاحب انور جلا لپوری کا تعارف کرا کر درخواستِ غزل کر رہے ہیں انور صاحب تالیوں کی جھنکار میں آکر فرما رہے ہیں سہ

ہوا ہو تیز تو شاخوں سے پتے ٹوٹ جاتے ہیں
ذرا سی دیر میں برسوں کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں
حمایت اور ہمدردی تو خوشحالی کے جلوے ہیں
مصیبت کی گھڑی میں سب سہارے ٹوٹ جاتے ہیں
ہماری قدر و قیمت کا بھی تب ہوتا ہے اندازہ
ہماری آنکھ کے جس وقت ڈورے ٹوٹ جاتے ہیں

انور صاحب داد میں ڈوبے اپنی جگہ آکر دعوتِ غزل دے رہے ہیں میرٹھ کے جواں سال خوش گلو شاعر راجیو موہن شاداب کو۔ شاداب صاحب لحنِ داؤدی میں غزل سرا ہیں سہ

ہم کو کیا توڑ دے یا سجا آئینہ
تیری انگڑائی ہے اور ترا آئینہ
اُن کی نظروں پہ الزام آنے کو تھا
وہ تو ہم سے ہی خود گر گیا آئینہ
بولتا کیسے ہے آئینہ دیکھ لے
اک ذرا مسکرا کر اٹھا آئینہ
ہونٹ سی بھی لئے اشک پی بھی لئے
پھر بھی چہرہ ہے حالات کا آئینہ
مرا دل، مرا دل، مرا دل، مرا دل
آئینہ، آئینہ، آئینہ، آئینہ

داد دینے والے بے حال ہو چلے ہیں کلکٹر صاحب بھی ہر شعر پر جھوم کر داد دے رہے ہیں ایک بزرگ ڈاکٹر درویش مبارک دراز صوفی

یوسف نظامی ایک جلالی کیفیت طاری کر کے مائک پر آ کر شاداب صاحب کی خدمت میں ایک فلم (چھتر) پیش کر رہے ہیں جسے شاداب صاحب قبول فرما رہے ہیں اس پر تالیوں سے اظہار خوشنودی کیا جا رہا ہے۔ اور شاداب صاحب محفل کو لوٹ کر کاغذات پلٹ رہے ہیں اس عالم نغمگی میں ذائقہ بدلنے کے لئے اعجاز حسین صاحب پالورپری نے آ کر رواں دواں قطعات اور شاعرانہ نظم سنا کر محفل کو قہقہہ زار بنا کر سر پٹ چلد یئے دیکھا تو الیاس شیدائی جانسٹی نے مائک پر قبضہ کر لیا ہے اور ادھر تالیاں جاگ اٹھی ہیں غالباً یہ کوئی سازش ہے۔ السلام علیکم ۔۔ دور بیٹھے ہوئے دلشاد فرما رہے ہیں ۔۔۔ غزل اپنی ہی پڑھئے ۔۔۔ دوسری آواز ۔۔ گا کر پڑھئے ۔۔ اگر یہ تفریح نہ ہو تو مشاعرہ مجلس وعظ بنکر رہ جائے لیکن جب یہ تفریح حد سے تجاوز کر جائے تو ذرا کھلتی ہے گذشتہ سال اسی تفریح میں ہی مشاعرہ اڑا دیا گیا تھا اور یہ سب حضرات اردو کے بہی خواہ اور ہمدرد بھی ہوتے ہیں ۔۔ ع

ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہئے

ہاں تو الیاس صاحب کا ایک مطلع سنتے ہی چلئے ۔۔

اس ظالم نے جب آ کر کی جلوہ نمائی محفل میں
میرے جنونِ عشق نے یارو آگ لگائی محفل میں

الیاس صاحب جا رہے ہیں اور راب شریف پروانہ فرما رہے ہیں ۔۔

کہنے کی بات آپ سے ہم نے کہی نہیں
یعنی ہمارے درد میں کوئی کمی نہیں
تشنہ لبوں کے واسطے دو گھونٹ بھی نہیں
ساقی یہ تیرا بخل ہے دریا دلی نہیں

پروانہ صاحب بھی بخیریت تمام جا رہے ہیں کیونکہ اب یار لوگ تفریح کے موڈ میں نظر آ رہے اور ادھر اللہ صاحب درخواستِ غزل کر رہے ہیں شاہجہاں بانو یاد سے۔ ایک صاحب نے آپ کو خاتون کہہ دیا ہے اس پر یاد صاحبہ بڑی طرح سے برہم ہیں اور اسے ڈانٹ رہی ہیں کہ ہم خاتون نہیں ہیں ہم نے مردوں سے کم مشاعرے نہیں پڑھے وغیرہ ۔۔۔ حالانکہ بات اتنی اہم نہ تھی جو وہ اس قدر برہم ہو گئی ہیں میں نے درخواست کی موڈ بدلئے ذرا مسکرائیے اس طرح کیسے پڑھا جائے گا اور واقعی مسکرا کر فرما رہی ہیں نہیں نہیں ایسی بات نہیں ہے اور پھر

حسب عادت مائک پر آ کر بیٹھکر ہی یوں ترنم کے پھول برسانے لگی ہیں ۔۔

خبریں نہ پڑھا کیجئے باتیں نہ کیا کیجئے
حالات یہ کہتے ہیں خاموش رہا کیجئے

داد نے پہلی بار دھماکے کو جنم دیا ہے مطلع حالات کا آئینہ دار ہے شعلہ سا لپکتا ترنم ۔ اور پھر پڑھنے والی وہی خاتون ۔۔ بس کچھ نہ پوچھئے پنڈال انگڑائیاں لے رہا ہے۔ کئی بار دہرا کر اسی بانکپن سے محفل کو لوٹنے چلی ہیں ۔۔

فرمائشیں لوگوں کی ہوتی ہیں جدا گانہ
ہر شعر کو غزلوں میں تقسیم کیا کیجئے

پھر داد کا وہی عالم ہے اور آپ اس ہنگامے سے بے نیاز محفل کو نئی توانائی عطا کر رہی ہیں ۔۔

ہر تیز قدم اکثر تنہا نظر آتا ہے
جب ساتھ چلے کوئی آہستہ چلا کیجئے

اب کلکٹر صاحب بھی جھوم جھوم کر داد دے رہے ہیں کئی بار دہرا کر ابھی جان لیوا ترنم سے پنڈال کو چونکا رہی ہیں ۔۔

ملنا ہے تو ملنے کے آداب ضروری ہیں
ٹوٹے ہوئے رشتوں کی باتیں نہ کیا کیجئے

مجسم غزل ایک حسین غزل سے محفل کو گرما کر تالیوں کے بے ہنگم شور اور ایک اور ایک اور کے غل غپاڑہ میں مائک سے جدا ہو رہی ہیں اور ادھر کلکٹر صاحب شعراء کی طرف پان کی تھالی خود ہی سرکا رہے ہیں اور نسیم میرٹھی نے ایک چاشنی بھرا غزل پیش کی ہے آئیے دو مطلع پھر سن لیجئے گا ۔۔

اس قدر مجھ پہ کرم رہنے دو
بارِ احساں سے نکل جانے قدم رہنے دو
میرے سجدوں کیلئے نقشِ قدم رہنے دو
یہ شوالے یہ کلیسا یہ حرم رہنے دو

نسیم صاحب بھی مناسب داد لے اٹھے مدینہ یاد کے بعد کسی نے دیے سے دیا جلانا آج بھی مشکل ہے لیجئے ضلع کے مشہور مترنم شاعر تمنا جمالی تالیوں کی جھنکار میں غزل سرا ہیں ۔۔

بدن تو شیشے کے دل پتھروں سے سخت ملے
زبان پھول سی لہجے میں تند سخت ملے

نہ مل سکا کہیں سایہ بھی سر چھپانے کو
وفا کی راہ میں سوکھے ہوئے درخت ملے
مرے نصیب میں زنداں کی تیرگی لکھ دے
اگر یہ دل میں ہوس ہو کہ تاج و تخت ملے
گدا و شاہ محبت میں سب برابر ہیں
اس آئینے میں سکندر کو لخت لخت ملے

اور تمنا صاحب لازم و ملزوم لہٰذا داد و تحسین لوٹتے بانکپن سے
جا رہے ہیں اور ہلال سیوہاروی فرما رہے ہیں سے

کل کلاسوں میں جو پابند رہا کرتے تھے
آج کالج میں وہ آزاد رہا کرتے ہیں
بچے اسکول میں پٹنے سے ڈرا کرتے تھے
اب اُسی فکر میں اُستاد رہا کرتے ہیں

واہ واہ اور ہاؤ ہو کا ایک شور سا شور ہے فرمائشوں نے بھی ایک
ہنگامہ بپا کر رکھا ہے کلکٹر صاحب جوتا کی فرمائش کر رہے ہیں ہلال صاحب
سُنا کر محفل میں ہڑبونگ کر کے تالیوں کے شور میں جا رہے ہیں اور
صاحب نہایت ادب و احترام سے وسیم بریلوی سے درخواستِ کلام
کر رہے ہیں وسیم صاحب تالیوں کی جھنکار میں آکر عطا کر رہے ہیں سے

وہ میری پیٹھ میں خنجر ضرور اُتارے گا
مگر نگاہ ملے گی تو کیسے مارے گا

کسی کا راز کسی سے کبھی نہیں کہتے
یہ احتیاط اندھیروں میں پائی جاتی ہے

واہ واہ کا ایک ریلا سا آیا ہے اور آپ فرما رہے ہیں ایک
ملاحظہ فرمایئے — آپ تو دو قطعے سنایا کرتے ہیں — ایک
— ایک قہقہہ — اور وسیم صاحب عنایت کر رہے ہیں سے

روشنی سُن رہی ہے کان لگائے
جیسے اک راز بڑھتا آتا ہے
کیا کرے نغمگی بدن کی طرح
تیرا سایا بھی گنگناتا ہے

اس نے ہنگامہ کو جنم دیا ہے اور آپ اپنے مخصوص اور دلکش ترنم
(۱۰۶) چھیڑ رہے ہیں سے

اسے سمجھنے کا کوئی تو راستہ نکلے
میں چاہتا بھی یہی تھا وہ بیوفا نکلے

لیجئے اب کلکٹر صاحب بھی ہاتھ لہرا کر داد دے رہے ہیں گویا زبردستی کر
اسی نغمگی سے پنڈال کو گرما رہے ہیں سے

کتاب ماضی کے اوراق اُلٹ کے دیکھ ذرا
نہ جانے کون سا صفحہ مڑا ہوا نکلے
میں تجھ سے ملتا ہوں تفصیل میں نہیں جاتا
مری طرف سے ترے دل میں جانے کیا نکلے
جو دیکھنے میں بہت ہی قریب لگتا ہے
اسی کے بارے میں سوچوں تو فاصلہ نکلے

داد کا پھر دھاکہ ہوا ہے اور میں حبیب حالب کے اس شعر سے لطف
اندوز ہو رہا ہوں سے

جو سوچئے تو بہت سلسلے بہت رشتے
جو دیکھئے تو جہاں میں ہر آدمی تنہا

اُدھر منچلے تالیوں پر اُتر آئے ہیں اِدھر وسیم صاحب مائک سے
جدا ہونا چاہتے ہیں اور ایک گیت کا ہنگامہ سر اُٹھا رہا ہے آپ ایک
حسین گیت سُنا کر جا رہے ہیں اور ناظم صاحب گوہر عثمانی مرادآبادی
کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں۔ گوہر صاحب کلکٹر صاحب سے سرگوشی کر
اجازت طلب کر کے فرما رہے ہیں کہ کلکٹر صاحب۔ صاحب دل، سخن
فہم اور ادب نواز ہیں — اماں چھوڑو بھی — کلکٹر صاحب مُسکرا کر
فرما رہے ہیں (گوہر صاحب مرادآباد میں آپ کے پیشکار رہ چکے ہیں)۔
ارشاد ہوا ہے سے۔

عظمتِ اہلِ وفا اور بڑھا دیتا ہے
غم مسلسل ہو تو پھر غم بھی مزا دیتا ہے
دل دھڑکتا ہے تو پہروں نہیں سونے دیتا
نیند آتی ہے تو احساس جگا دیتا ہے
تم نے شاید کبھی اس بات کو سوچا ہو گا
وقت ہاتھوں کی لکیریں بھی مٹا دیتا ہے

گوہر صاحب خوب خوب داد پاکر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور اب ناظم
صاحب کا اصرار کہ تم بھی پڑھو اور وقت کی نزاکت دیکھتے ہوئے
میں نے معذرت چاہی لیکن خانہ پُری کے لئے مجھے بھی اس

فہرست میں ضرور شامل ہوتا ہے اس لئے میں نے بھی اسعد گوالیاری

... ہے

من گیا تاج کا تبسم ہے یہ اجنتا کا اک تکلم ہے
من گا ہے اذان ہے یا زر گا ہے ناقوس کا ترنم ہے

چہرے پہ اس کے رنگِ وفا دیکھتے چلیں
اس معجزے کو آؤ ذرا دیکھتے چلیں

لیئے پھر ایک آہنگ ایک انداز ایک حسین غزل الحاج شمیم جے پوری سے سنیئے سے

زیرِ شمشیر مرا سر ہے پکاروں کس کو
ایک ہنگامۂ محشر ہے پکاروں کس کو

جہاں منصف ہے وہیں قاتل و رہزن بھی ہے
مرتبہ سب کا برابر ہے پکاروں کس کو

یوں تو داد مطلع ہی سے شباب پر ہے لیکن اس شعر پر ایک ہنگامہ سا ہنگامہ ہے کئی بار دُہرا کر اسی بانکپن سے محفل کو گرما رہے ہیں سے

راہزن نے تو کبھی کوئی بھی نہ چھوڑی لیکن
راہبر اس سے بھی بڑھ کر ہے پکاروں کس کو

اپنے ہمسائے کے گھر جا کے اماں لے لیتا
وہ بھی میری طرح بے گھر ہے پکاروں کس کو

اب داد کی جگہ تالیاں جاگ اٹھی ہیں اور آپ محفل میں نغمگی بکھیر کر تالیوں کے بے ہنگم شور میں مائک سے جدا ہو رہے ہیں آپ کے ساتھ ہی نہایت کامیابی کے ساتھ پونے تین بجے یہ لاجواب اور یادگاری مشاعرہ ختم ہو رہا ہے۔!

امسال یوپی میں ہنگامی حالات کی وجہ سے میلے ختم کرا دیئے گئے تھے لیکن جوں جوں حالات سازگار اور معمول پر آتے رہے اسی طرح میلوں کی اجازت ملتی رہی چنانچہ اسی سلسلے کی کڑی یہ میلہ بھی ہے اس مشاعرہ میں انہماک سے دلچسپی لینے والے کنڑ صاحب مظفر نگر ہیں اور ساتھ ہی ایس۔ڈی۔ایم صاحب جناب قریشی صاحب۔ ڈاکٹر امیر اعظم وسیم کھتولوی اور اراکین ٹاؤن ایریا بورڈ نے بھی خصوصی توجہ کی اور مہمان شعراء کی خوب خوب خاطر مدارات کی اور کھتولی و مظفر نگر کے ماحول کو ایک تر و تازگی اور شگفتگی دی اُردو زبان زندہ باد اس نے پھر سکو

ایک اسٹیج ایک پلیٹ فارم پر لا جمع کیا۔!

دعا ہے بیکل اتساہی۔ فنا نظامی۔ خمار بارہ بنکوی۔ نظر ایٹوی وغیرہ نے وعدۂ شرکت کے باوجود اس مشاعرہ میں کیوں شرکت نہیں کی ●●●

بقیہ: کچھ نہ پوچھو داستانیں .....

شہر اودھ کیوان حشم، فانی اور ساار در بار دریائے فکر میں غوطے لگاتا تھا، مگر گوہرِ مقصود کسی کے ہاتھ نہ آتا تھا میں کچھ دیر کے لئے پورے دربار کو اسی حال میں چھوڑتا ہوں اور ذرا دیر کے لئے ناظرین کی طرف متوجہ ہوتا ہوں وہ بھی اپنے اپنے ذہن رسا کی آزمائش کریں۔

"صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے"

(باقی آئندہ)

قسط دوم

بزمِ عباسی چڑیاکوٹ

سبحان الہند حضرت علامہ کیفی چڑیاکوٹی مرحوم

(حیات اور ادبی و علمی کارنامے)

نمونہ کلام علامہ کیفی چڑیاکوٹی | نعتیہ اشعار :-

آئینہ رکھا ہے حسنِ دلربا کے سامنے
ہیں محمد مصطفیٰ یعنی خدا کے سامنے

یہ اہلِ حشر سے کہہ دو کہ راہ سے ہٹ جائیں
محمد عربی کا غلام آتا ہے

زانوں پہ اُس کے فرقِ رسالت مآب ہے
رکھی ہوئی رحل پہ خدا کی کتاب ہے

حسن اس دوش پہ بیٹھے حسین اُس دوش پر بیٹھے
نبوت کی ترازو میں امامت حق نے تلوائی

سجدۂ شوق میں ہے سر لب پہ صدائے اُمتی
شان وہ بندگی کی ہے اور یہ بندہ پروری

وہم بھی جب رسا نہیں مرتبۂ کمال تک
کہنے لگیں حقیقتیں تھک کے اسے پیمبری

آپ مصورِ ازل رنگ میں اس کے آگیا
حدِ کمالِ حسن سے بڑھ گئی جب مصوری

دیکھ کے رعبِ حسن کو سائے نے منہ چھپالیا
کس کو سرِ برابری کس کو مجالِ ہمسری

منقبت :

رہے جو فرق دوش پر تو حسن کی نمود ہے
کٹے جو سر تو عشق کی عبادتِ سجود ہے

حسن کا حسنِ طلب دیکھئے سلیقہ عشق کا
پہلے سر بھجوا دیا پھر آپ جاتے ہیں حسین

اور بھی باقی ہے کچھ دامانِ دل میں یا نہیں
عشق جب یہ پوچھتا ہے مسکراتے ہیں حسین

دُعا کو کچھ غرض نہیں کہ جائے عرش کی طرف
جھکا ہوا ہے عرش خود زمیں کے فرش کی طرف

بتا نہ دوں میں تم کو رازِ آیتِ نزول کے
اُتر کے کوئی آگیا ہے دوش سے رسول کے

اصغر کنارِ شاہ میں خاموش ہو گئے
کس نے یہ توڑ لی کہ کلی تھی گلاب کی

نیزے کے سر پہ فرقِ امام حسین ہے
اونچی ہوئی ہے بات شہ بوتراب کی

مختلف نظموں کے مختلف اور متفرق اشعار :

مسئلہ خلافت :-

بلبلیں آزاد ہیں اپنے نشیمن کے لئے
مرحبا ہائے بوئے گل ہیں صحن گلشن کے لئے
غنچہ و گل ہیں سبھی گلچیں کے دامن کے لئے
دیکھتے ہیں ہم ٹھکانہ اپنے مسکن کے لئے

تحریک آزادی :-

چاہیئے جنبش ثبوتِ زندگانی کے لئے
دست و پا ہیں ہو تڑپ سوز نہانی کے لئے
زندگی اچھی نہیں ہے عیشِ فانی کے لئے
کر رہو کچھ آج لطفِ جاودانی کے لئے

بیت المقدس :-

وہ زیارت گاہِ رسمِ پاکبازی کیا ہوا
تختگاہِ ذوالجلالِ بے نیازی کیا ہوا
وہ دُرِ تابانِ فرقِ امتیازی کیا ہوا
گوہرِ تاجِ صلاح الدین غازی کیا ہوا

مکہ معظمہ:-

وہ حرم کہ جس کا گوشہ امن وراحت کی دلیل
وہ کہ ہے ہر ذرہ جس کا رونقِ شرعِ خلیل
یاد ہے ہم کو وہاں کا قصۂ اصحابِ فیل
اِک اشارہ میں کیا تھا جن کو طائر نے ذلیل
دیکھتے ہیں اُس جگہ اب رسمِ دلجوئی نہیں
لُٹ رہی ہے نقدِ جاں اور پوچھتا کوئی نہیں

قسطنطنیہ:-

باغ میں ہر شخص نے پھولوں سے دامن بھر لیا
بچ رہے تھے جو کہ دامن سے اُنھیں سر پر لیا
بے کھلے غنچوں کو مٹھی میں کسی نے دھر لیا
رفتہ رفتہ اس طرح سامانِ محفل کر لیا
پھول اِک سوکھا ہوا تھا آشیانے کے لئے
جُھک پڑی ہیں آندھیاں اس کو اُڑانے کے لئے

عید کا چاند دیکھ کر:-

جنوں کا جوش بھی ہے آپ کا خیال بھی ہے
بقدرِ ہمتِ دل ہجر بھی وصال بھی ہے
کہا یہ مہرِ جہاں سوز سے قیامت نے
جسے عروج کبھی ہے اُسے زوال بھی ہے
گلے پہ تیغ ہے رُخ کی طرف نگاہِ کرم
ستم کا شوق بھی ہے پُرسشِ ملال بھی ہے
زمین ہی نہیں دشمن ترے اسیروں کی
شنا ہے تیغ بہ کفِ چرخ پر ہلال بھی ہے
لہو شہیدوں کا کہتا ہے چھپ کے دامن سے
رہے خیال کہ اس کا کوئی مآل بھی ہے
نسیمِ صبح گلستاں میں بھیجنے والے
قفس میں اپنے اسیروں کا کچھ خیال بھی ہے

متفرق اشعار:-

دو عالم جس کو کہتے ہیں مرا چاکِ گریباں ہے
ملا دیتا ہے جو دونوں کو وہ تارِ رگِ جاں ہے

دل اور نمازِ اُلفت اور ملتِ وفا کی
کعبے میں جو قضا کی بُت خانے میں ادا کی

منتخب غزلوں کے منتخب اشعار:-

جنت یہی ہے اور یہی جنت کی کائنات
اُن کے خیال میں تھا کہ نیند آ گئی مجھے

نہ سمجھا جینے والوں نے نہ جانا مرنے والوں نے
نفس کیوں بار بار آیا اجل کیوں بابلد آئی

اپنے دل کو سجدہ کر لوں تُو نے جسے پامال کیا
یُوں تو قدم میں دونوں ترے کعبہ بھی بُتخانہ بھی

کیفی کو اہلِ عرفاں آؤ ذرا پہچانو تو
باتیں ہیں کچھ بہکی بہکی لغزش کچھ مستانہ بھی

دل چیز ہماری ہے مٹھی میں تمہاری ہے
تڑپے تو ہمارا ہے ٹھہرے تو تمہارا ہے
محشر سے سوئے جنت لے جاتے ہیں کیفی کو
تم بڑھ کے ذرا کہہ دو عاشق یہ ہمارا ہے

جو کچھ میں کروں گا وہ تدبیر ہوگی
جو کچھ تم کہو گے وہ تقدیر ہوگی
سمجھتا ہوں مہرِ قیامت کا پردہ
پسِ پردہ تیری ہی تصویر ہوگی

زبانِ شمع کھلتی ہے نہ کچھ پروانہ کہتا ہے
مگر سارا زمانہ بزم کا افسانہ کہتا ہے
یہی کیفی یہی ہے بے پئے ساقی کا متوالا
قدم مستانہ رکھتا ہے سخن مستانہ کہتا ہے

آدمی دیر میں یا خانۂ داور میں رہے
سر رہے دوست کے قدموں پہ کسی گھر میں رہے

بجز لیلیٰ نہ تھا کوئی نگاہِ ہوشِ مجنوں میں
جنوں لیلیٰ کو تھا جو اپنا دیوانہ نہ پہچانا
یہی کہنا ہے مجھ کو قصۂ دار و انا الحق پہ
کہ اہلِ میکدہ نے ذوقِ رندانہ نہ پہچانا

دور میں ساغر جام ہے گرداں گردش میں پیمانہ بھی
جتنا برسا جھوم کے بادل برسا ہے میخانہ بھی

مری دنیا کی یاد آتی رہے گی
تری جنت میں گھبراتا رہوں گا
یہی کیفی مرا حسنِ طلب ہے
کرم پر اُس کے شرماتا رہوں گا

مجھے زیست دینے والے بس اسی پہ فیصلہ ہے
تری آرزو کی خاطر مجھے زندگی گوارا
اسی بحرِ غم میں مجھ کو کبھی تھک کے ڈوبنا ہے
نہ ملا کبھی سہارا نہ ملے گا اب سہارا
مری زندگی کا حاصل مری زندگی نہیں ہے
مجھے تاب ہے نہ شب کی نہ سحر مجھے گوارا

دمِ سرد کی ہوا میں ہے سکونِ دل کا کیفی
کہ رکی رکی سی موجیں کہ بجھا ہوا شرارا

جس قدر ہیں حسن کی زیبائیاں
اُس قدر ہیں عشق کی رسوائیاں
دینے والے اب تو دامن بھی نہیں
اس قدر تیری کرم فرمائیاں

حسن کا نازِ پشیماں دیکھ کر
عشق کو آنے لگی انگڑائیاں
غم کی شب کیفی مرا کوئی نہیں
دور مجھ سے ہو گئیں پرچھائیاں

جو گم ہوئی میری زندگانی میں کیا بتاؤں کہاں ملے گی
وہ خلد ہو یا تری گلی ہو جہاں ملے گی جواں ملے گی
میں کیوں نہ پھیلاؤں اپنا دامن بقدرِ تقدیرِ کامرانی
رُکے گا دستِ کرم تو غم کیا نظر اگر مہرباں ملے گی
نصیب کیفی کرم ہے ان کا کہاں کے زیر و حرم کے سجدے
جبیں جہاں تک جبیں ہے میری وہ کل سرِ آستاں ملے گی

اُمید کی شکست سے اُمید ہی بنائیں گے
تم آکے دل کو توڑ دو کہ زندگی بنائیں گے
جمال اُن کا بے حجاب ہے نظر کے سامنے
کلامِ کیفی حزیں کو شاعری بنائیں گے

دل ٹوٹنے والا تھا کہ ٹوٹی مری توبہ
ساقی کی نگاہوں کی یہ تاثیر نئی ہے

جام کے سانچے میں ڈھالی جائیگی
بات ساقی کی اُچھالی جائے گی
میکدے کو کچھ بگڑ لینے تو دو
شکل کعبے کی بنالی جائے گی
سجدوں کا مرے ناز اُٹھانے کے واسطے
کعبے کے سامنے درِ جاناناں آگیا
ساقی کی بارگاہ میں توبہ ہوئی قبول
خود ڈھونڈتا ہوا مجھے میخانہ آگیا

قطرہ قطرہ نظر رُخ پہ پسینے کی بہار + چاند پر اوس کے آئے ہوئے تارے شبنم
خدا جانے یہ میرے آب دگرگ میں ہاتو کس کا ہے
کہ گریہ بے قرار آیا ہنسی بے اختیار آئی
بہار آئی جو گلشن میں [illegible] اعتبار آئے
گلوں کے خندۂ بیہم پہ شبنم اشکبار آئی

ڈاکٹر اُدے سرن اتصالوی

تپسیا کا پھل

مہترانی تم نے یہ کیا بھیس بنا رکھا ہے۔ بڑھیوں کی طرح پھٹی پرانی میلی کچیلی دھوتی پہنے ہوئے ہو۔ ابھی تو تمہاری شادی کو ایک ہی سال ہوا ہے۔ یہی کھانے پہننے کے دن ہیں " سُریش نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

" بابوجی ہم لوگ غریب ہیں۔ بن ٹھن کر کیسے رہ سکتے ہیں۔ نا بیے (؟) ہی کھیر یت سے بکھت کٹ جائے تو بہت ہے " مہترانی نے سر پہ دھوتی سنبھالتے ہوئے کہا۔

" ہماری مہترانی اس طرح رہے گی تو ہماری بدنامی نہ ہو گی؟ لو یہ پچاس روپیہ کا نوٹ اور ایک اچھی سی دھوتی خرید لینا " مہترانی نوٹ دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ اس نے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا۔ اس پر سُریش نے پھر کہا۔

" لو بہن جی شرماتی کیوں ہو "۔ بہن جی شرماتی کیوں ہو یہ فقرہ کئی بار اس کے دل و دماغ میں گونجا۔ اس امداد کے پس پردہ اس کو کوئی غلط مقصد نظر نہیں آیا۔ اور اس نے نوٹ لے لیا۔ دوسرے گھر وں کو کماتی ہوئی اپنے گھر آ گئی وہ اس وقت بغیر کچھ کہے سُنے روپے لے تو آئی لیکن اس کی روح بے چین رہی رات بھر اس کے دل و دماغ پر وہ نوٹ مقوں وزنی بنا رہا۔ طرح طرح کی باتیں اس کے دماغ میں آ رہی تھیں۔ وہ جتنا سوچتی اتنی ہی پریشان ہو ہو جاتی۔ آخر کار اس نے یہ فیصلہ کیا کہ اسے یہ نوٹ نہیں لینا چاہئے تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ سب سے پہلے سُریش کے گھر کمانے گئی اور نوٹ واپس کرتے ہوئے کہنے لگی۔

" بابوجی یہ لو اپنی امانت "

" کیسی امانت میں نے تو یہ نوٹ تمہیں امداد کے طور پر دیا ہے "

" مگر میری ساس نے اس امداد کو منظور نہیں کیا " وہ بولی کہ اگر دینا ہی تھا تو سُریش بابو کی ماں دیتیں۔

" تم نے اتنی سی بات اپنی ساس سے بھی کہہ دی "

" ایسی باتیں بڑے بوڑھوں کو بتانے ہی میں گھر کی عزت ہے "

یہ سُنتے ہی سُریش چپ چاپ آگے بڑھا اور صحن پار کر کے باہر کے دروازے کی کنڈی لگا دی دروازے کی کنڈی لگانے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ پاروتی خوب سمجھ گئی۔ مگر سُریش تو کل بہن جی کہہ رہا تھا تو پھر آج وہ ایسا پاپ کیسے کر سکتا ہے اس طرح کے خیالات پاروتی کے دماغ میں آئے۔ سُریش نے آتے ہی اس کے ہاتھ سے نوٹ تھامنے کی بجائے اس کی کلائی کس کر پکڑ لی اور کمرے کی طرف کھینچنا شروع کر دیا " یہ کیا کر رہے ہو بابوجی " پاروتی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے تلخی سے کہا۔

" ایک رات رکھے گئے روپیوں کا سُود وصول نہیں کر دوں گا کیا؟ "

" تم تو کل بہن جی کہہ رہے تھے اور آج میرے ساتھ یہ ۔۔۔ ! " دانت پیستے اور پیچھے کو زور لگاتے ہوئے اس نے کہا۔

" وہ زبان سے کہا تھا دل سے نہیں "

" اب سمجھی کہ مردوں کی زبان دل سے الگ ہوتی ہے " یہ کہہ کر پاروتی پورے زور سے خود کو آزاد کرانے میں لگ گئی سُریش بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ بھاگ کر دروازہ کھول کر باہر نکل جانے کی کوشش میں چھٹپٹا رہی تھی۔ اس نے پاروتی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا تھا اور کمرے کے اندر اُسے لے جا رہا تھا کہ آواز آئی " سُریش دروازہ کھولو " (ماں کی آواز ہے یہ تو) سُریش نے فوراً بھانپ لیا اور پاروتی کو الگ کر دیا دروازہ کھلتے ہی ماں اندر داخل ہوئی اور پاروتی بجلی کی سی تیزی سے باہر ہو گئی " ماں اتنی جلدی کیسے آ گئیں " پوجا کا سامان جلدی جلدی میں یہیں رہ گیا تھا اسے لینے آئی ہوں " ماں نے سادگی سے کہا۔ سُریش کو کیا پتہ تھا کہ اس کی ماں نے باہر کھڑے کھڑے اماں (؟) کواڑ کی دراڑوں میں سے دیکھ لیا ہے۔ ماں بغیر کچھ بھید کھولے اور آگے سخت سُست کہے پوجا کا سامان لے کر مندر چلی گئی۔ اکثر مائیں بیٹے کے عیوب پر پردہ ڈال ہی دیتی ہیں۔

پاروتی نے یہ واقعہ ساس کو نہیں بتایا مگر بنا وٹی شگفتگی دل

اُداسی کو چھپا نہ سکی ساس کچھ پوچھے بغیر ہی مشکوک نظروں سے
دیکھ رہی تھی۔ مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ اس واقعہ کے تین چار دن بعد
ساس نے بہو سے پوچھا "بیٹی پہلے تو کام کرتے میں چار پانچ گھنٹے لگ
جاتے تھے لیکن اب تین چار دنوں سے تو بہت جلدی آجاتی ہے کیا بات ہے؟"
"ماتاجی سارے ٹھکانے میں نے پڑوس کی ایک مہترانی کو گروی
رکھ دیئے ہیں اب میں صرف تین گھروں کا کام کرتی ہوں یہ وہ سب ہی
بدھو اور گنگو نائی کا۔"
"تونے اچھی آمدنی کے گھر گروی کیوں رکھ دیئے مجھ سے پوچھا
تک نہیں۔ یہ لوگ وقت پر ہماری مدد کرتے ہیں اب وہ بھی راستہ
بند ہو گیا۔ بیاہ میں جو قرض ہو گیا تھا وہ ادا نہیں ہوا ہے اب کیسے ہوگا"
"ماں جی ایک راستہ بند ہوتا ہے تو بھگوان دوسرا کھول دیتا ہے
میں کم آمدنی میں ہی لوں گی مگر آبرو بیچ کر زیادہ رقم نہیں لوں گی"
ساس نے پاروتی کا حسین چہرہ دیکھا اس کا گداز جسم دیکھا
اور پھر خاموش ہو گئی وہ سب باتیں سمجھ گئی اور بہو سے کہیں بھی کام کرنے
نہیں کہا نہ جانے کیا کیا سوچ رہی تھی اس کی ساس کہ بہو نے خاموشی
توڑتے ہوئے کہا۔
"ماتاجی کیا سوچ رہی ہو۔"
"بیٹی کتنی ہی باتیں ایسی ہیں جو تجھ کو بتانا نہیں چاہتی لیکن
اب باتیں چھپانے سے بھی کچھ فائدہ نہیں ہے تجھے معلوم ہے کہ تیرا
[illegible] شراب پیتا ہے بینک کی چوکیداری میں جو ملتا ہے سب پھونک دیتا
ہے اب تک تو کوئی بات نہیں تھی۔ اکیلا تھا۔ اب شادی ہو گئی ہے
یہ ڈھنگ اب بھی چلتا رہا تو لٹیا ڈوب جائے گی۔"
"ماتاجی [illegible] مت کرو میں اُن کی شراب چھڑا کر رہوں گی
بہت آئے دو میرے باپ نے جو خود بھی شرابی ہے شرابی لڑکا ڈھونڈ
کر میری شادی کی تھی تاکہ ان کو بھی شراب پینے کو ملتی رہے
لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہیں ہونے دوں گی۔ میری ماں میرے باپ
کی شراب نہ چھڑا سکی اور زندگی بھر روتی رہی میں اپنے پتی کی
شراب چھڑا کر رہوں گی اور اپنے گھر کو سورگ بنا کر رہوں گی۔"
"پاروتی" کسی نے دروازے پر آواز لگائی۔
"کون ہے"
"کیا باپ کو بھی نہیں پہچانتی پاروتی" پاروتی کے باپ نے
ذرا اونچی آواز میں بولتے ہوئے کہا۔
"تم فوراً چلے جاؤ۔ یہ دروازہ تمہارے لئے ہمیشہ کو بند
ہو گیا ہے تم جیسا باپ بھگوان کسی کو نہ دے" بنا دروازہ کھولے
پاروتی پیچھے لوٹ آئی اور کمرے میں آکر کھڑکی سے سڑک کی طرف دیکھنے
لگی جہاں سے اسپتال کا پچھواڑا خوب نظر آتا تھا اس کی نظر سامنے
کوڑا دان پر گئی جس میں ہر روز صبح سے شام تک کئی پلاسٹروں کی روئی
لا کر ڈال دی جاتی تھی۔ ڈاکٹر لوگ زخموں کی صفائی وغیرہ میں کتنی روئی
خراب کر کے باہر پھینک دیتے ہیں جس کا کوئی استعمال نہیں ہوتا
وہ اس کے استعمال کا طریقہ سوچ رہی تھی ساس باہر بیٹھی بیٹھی
دروازہ پر ٹوہ لے رہی تھی کہ سمدھی ہیں یا چلے گئے۔ کئی بار ساس
کے دماغ میں آیا کہ سمدھی کو دروازہ کھول کر اندر بلا لے مگر اس نے
بہو کو ناخوش کرنا نہیں چاہا اور من مار کر رہ گئی اب تو سمدھی چلے
بھی گئے تھے شاید کیوں کہ دروازہ پر کوئی آہٹ نہیں تھی۔ ساس
اُٹھ کر اندر اپنا لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی جو دس سال پرانا تھا
اور اس کی روئی ٹوٹ کر لحاف کے اندر گیندوں کی طرح لڑھک رہی
تھی۔ پاروتی بھی اپنی چارپائی پر لحاف اوڑھ کر سو گئی۔
دن نکلا پاروتی نے سارا زیور باندھا اور ایک دوکان پر جا کر
بیچ آئی۔ اس رقم سے اس نے پانچ کلو دودھ دینے والی گائے خرید لی۔
جب گائے گھر آئی تو ساس چونکی۔
"بیٹی گائے کہاں سے لے آئی"
"ٹھکانے گروی رکھنے پر جو روپے آئے تھے اُن سے"
"مگر اتنا دودھ تو ہمارے یہاں خرچ بھی نہیں ہوگا"
"ایک گلاس تم کو دوں گی ایک گلاس میں پیوں گی باقی دوکان پر
بیچ آیا کروں گی۔"
"بیٹی ہم لوگ تو اچھوت ہیں ہمارے یہاں کا دودھ حلوائی نہیں لیگا"
"ماتاجی میں اچھے کپڑے پہن کر جایا کروں گی کوئی پہچان نہیں
پائے گا مجھے اور پھر یہاں کے لئے تو میں نئی ہوں کون جانے کہ میں
کون ہوں تھوڑی دیر کے لئے دھنوری بن جاؤں گی اور دوسرے
محلے کے حلوائی کے گھر جا کر بیچوں گی اور گائے کے گوبر کے اوپلے
جلانے کے کام آیا کریں گے اور جو بچ جایا کریں گے وہ بیچ دیا کروں گی"
"مگر گائے کے کھانے کا خرچہ بھی تو ہوگا" ساس نے پوچھا۔

"اور پھر بیچ کر بھوسا لے لیا کروں گی اور اسپتال میں روز صبح جاکر مریضوں کا باسی بچا کچا کھانا لے آیا کروں گی اس کو پانی میں بھگو کر اس کی بھینس کو سانی کر دیا کروں گی خرچ کچھ بھی نہیں ہوگا. اس طرح دس روپیہ روز کمانا لیا کروں گی"

"ہاں بیٹی شیخ چلی بھی ایسے ہی پلان بنایا کرتا تھا۔

"ماتا جی مجھ میں اور شیخ چلی میں بہت انتر ہے" یہ کہکر پاروتی اُٹھی اور بازار چلی گئی وہ وہاں سے دو چرخے لے آئی۔ صبح کو وہ ہسپتال کے کوڑا دان سے اچھی اچھی روئی چُن کر لے آتی۔ سب سے پہلے تو اس نے ساس کا لحاف بھروایا پھر شوہر کا لحاف بنوایا پھر دو لحاف اور دو گدّے آنے جانے والوں کے لئے تیار کرائے پھر سوت کاتنا شروع کیا۔ صبح سے شام تک دونوں اتنا سوت کات لیتی تھیں کہ دس بارہ روپے کا بک جاتا تھا اس طرح چھ سات سو روپے ماہانہ گھر میں آنے لگے ایک دن جب پاروتی جب کاتنے گئی تو اس کے پیچھے ساس ایک پڑوسی سے خط لکھوانے چلی گئی۔ لوٹ کر آنے پر پاروتی نے ساس کو گھر نہ دیکھ کر ادھر اُدھر ڈھونڈنا شروع کیا دو گھروں کے بیچ میں بنی دیوار کے سوراخ سے جھانک کر دیکھا تو بڑوس والے گھر میں وہ خط لکھوا کر پڑھوا رہی تھی پاروتی نے غور سے سُننا شروع کیا سب خط سُن کر وہ ہنسی اور چپ چاپ پیچھے ہٹ گئی اور اپنے چرخے پر آ بیٹھی ساس بھی آگئی دونوں کاتنے لگیں لیکن نہ ہی ساس نے بھید کھولا اور نہ ہی پاروتی نے پوچھا کہ وہ کہاں گئی تھی کچھ دیر بعد پاروتی نے کہا ماتا جی تین مہینے ہو گئے ہیں انھوں نے کوئی پیسہ نہیں بھیجا ہے۔ اگر ہم یہ جگت نہ کرتے تو کیسے گذر ہوتی"

"تو فکر مت کر بیٹی جب اچھے دن آنے کو ہوتے ہیں تو سب کام اچھے ہی ہوتے چلے جاتے ہیں تیرے قدم جس دن سے اس گھر میں آئے زمین مٹی بھی سونا بننے لگی ہے بھگوان نے چاہا تو تیری پرتگیا پوری ہو جائے گی"

"کونسی پرتگیا"

"وہی ایک شرابی کی شراب چھڑانے والی" یہ سُن کر پاروتی بڑی کھلکھلا کر ہنسی مگر اس ہنسی کی وجہ ساس نہیں سمجھ سکی وہ یہ جان گیا جانتی تھی کہ پڑوسی سے بینک منیجر اور لڑکے کو لکھوائے گئے خطوط اس نے سُن لئے تھے ساس بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئی

اتنے میں باہر سے آواز آئی خط ہے۔

"کس کا" جلدی سے چرخہ چھوڑ کر پاروتی اٹھی ڈاکئے سے خط لیا۔ اور پڑھا۔

"کس کا ہے کیا لکھا ہے" اپنا چرخہ بند کرکے ساس نے پوچھا۔

تمہارے بیٹے نے لکھا ہے کہ ماتا جی نے بینک منیجر کو خط لکھا تھا کہ لڑکا شرابی ہے اس کی تنخواہ اس کی بجائے اس کی بیوی کو دی جایا کرے جسے منیجر نے منظور کر لیا۔ اب تنخواہ مجھے ملا کرے گی اور لکھتے ہیں کہ تم نے بہو کے گھر چلانے کے جو ڈھنگ لکھے ہیں اس سے میں بالکل بدل گیا ہوں اور شراب کبھی نہ پینے کی کسم کھا چکا ہوں اور لکھا ہے سچ مچ مجھے نہیں بہو کو ہی ملنی چاہیئے جس کی بہو پاروتی جیسی ہو اس کی تنخواہ ایسی بہو ہی کو ملنی چاہیئے میں تو شرابی ہوں" بہو نے خط پڑھ کر چوما اور سینے سے لگا لیا اور مسکراتی ہوئی چرخے پر آ بیٹھی "ماتا جی تم نے اُن کو خوب بدلا"

"نہیں بیٹی یہ سب تیری تپسیا کا پھل ہے"

لیا اور مٹھیاں بھینچ کی طرف نظروں سے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے کیا آج کسی دشمن پر چڑھائی کا ارادہ ہے۔ جواب دیتے ہوئے ایک بھائی بولا تاؤجی نصرت نے ہماری بہن کے پانی سے بھرے مٹکے میں پیچھے سے کنکر مارا ہے ہم اس کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"بالکل ایسا ہی ہونا چاہئے اس بدتمیزی کا جواب یہی ہے جو تم دینے جا رہے ہو بستی کی لڑکی چاہے کسی بھی قوم کی ہو سارے بستی والوں کی بیٹی ہوتی ہے اس کمینے کو اس کی سزا ملنی ہی چاہئے۔ تاکہ کسی دوسرے کو آئندہ اس قسم کی حرکت کرنے کی ہمت نہ ہوسکے۔"

"مگر اگر میری ایک صلاح ہو تو عرض کروں۔"

تینوں بھائی یک زبان ہو کر کہنے لگے تاؤجی۔ آپ حکم کریں ہم آپ کا کہنا کیسے ٹال سکتے ہیں۔ ہمارے محلے میں آپ ہی ایک ایسے بڑے ہیں جن کا کہنا ٹالا نہیں جاسکتا ہے۔" بڑے بھائی نے کہا۔

"اگر تم نے اس نالائق کا قتل کر دیا تو پولیس تم تینوں کو گرفتار کرے گی۔ سارے گھر پر مصیبت آجائے گی وہ تو جان سے جائے گا ہی مگر تم کو عذاب میں ڈال جائے گا اُلٹے مجرم بننے سے کیا فائدہ اس کو سزا ملے اور تم بالکل بے داغ رہو تو کیا رہے یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ میں اس کو چار آدمیوں کے سامنے بلاتا ہوں اور بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی گاؤں کے اچھے اچھے معزز اور سمجھدار لوگ وہاں موجود ہوں گے جو وہ فیصلہ دیں گے وہی کیا جائے گا۔ ٹھیک ہے نا، حمید نے پیار سے سمجھاتے ہوئے تینوں بھائیوں سے کہا۔

"ٹھیک ہے تاؤجی" اور گرمی کی دوپہر میں مرجھائے سبزے کی طرح تینوں سر خم کئے گھر کو چلے گئے۔ حمید نے بستی کے معززین کو بلایا اور نصرت کو بھی بلایا گیا۔ سب کے سامنے یہ مسئلہ رکھا گیا جس نے بھی سنا نصرت کو تھو تھو کرتے ہوئے بُرا بھلا کہنے لگا۔ نصرت جو ایک ملزم کی طرح ایک طرف کھڑا تھا جھنجھلا کر بولا۔

"تم لوگوں نے مل کر یہ کس خطا کی سزا دے کر مجھ سے بدلہ لینے کی ٹھانی ہے۔ ایک لڑکی کی غلط بات کو صحیح مان لیا اور مجھے غلط ٹھہرایا جا رہا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے۔"

"کیا تم نے اس کے مٹکے پر کنکری نہیں پھینکی" ؟ حمید نے پوچھا۔

"بالکل نہیں" نصرت نے پُر اعتماد لہجہ میں کہا۔

"کوئی مجرم اپنے جرم کا اقبال تھوڑے ہی کرتا ہے" لچھمی کے باپ رام چندر نے خفگی کے لہجے میں کہا۔

"بالکل صحیح ہے ہر آدمی اپنے عیب کو چھپانے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتا" حاجی غفار حسین نے کہا۔

"میں قرآن شریف کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے اس لڑکی کے مٹکے کو کنکر نہیں مارا تھا میں تو صرف اپنے دروازے پر کھڑا تھا اور اس کی دونوں لمبی لمبی چوٹیوں کو دیکھتے ہوئے یہ سوچ رہا تھا کہ ہندوستان کی عورتیں ان چوٹیوں کو بنانے میں گھنٹوں صرف بیکار کر دیتی ہیں اگر سب عورتیں اندرا گاندھی کی طرح باب کٹ بال رکھنے لگیں تو لاکھوں لوگوں کے تن ڈھک سکتے ہیں۔ اسی دوران لچھمی نے میری طرف دیکھا تو مجھے اچانک اپنے اس خیال پر ہنسی آگئی اور یہ آگے بڑھ گئی بس مجھے کیا پتہ تھا کہ قوم کی بھلائی کے لئے سوچنا یہ مصیبت نازل کر دے گا" یہ بات سن کر مسلمانوں کی بیٹھک کچھ بھاری ہوئی اور یکطرفہ شرارت کا پہلو ابھرنا شروع ہوا۔ حمید نے لچھمی سے پوچھا بیٹی تم کو یہ کیسے یقین ہے کہ کنکر نصرت نے ہی مارا تھا۔"

"تاؤجی اس وقت یہی باہر کھڑا تھا اور کنوئیں کے آس پاس دور تک کوئی چڑیا بھی نہیں تھی۔ کنکر پیچھے سے لگا تھا اور یہ مسکرا رہا تھا۔ ایسی حالت میں آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حرکت نصرت کی ہوسکتی ہے یا نہیں۔ رہا قسم کھانے کا معاملہ تو قسم کھائی ہی اسی لئے جاتی ہے کہ دوسرے دھوکے میں آجائیں۔ لچھمی نڈرتا سے یہ کہہ کر اور نظر جھکا کر چپ ہوگئی۔ کچھ دیر سب لوگ ایسے چپ بیٹھے رہے جیسے کہ ماتم پرسی میں آئے ہوں۔ سب اپنی اپنی جگہ مسئلے کے سلجھاؤ کی ترکیبیں سوچ رہے تھے مگر حمید کو یہ خاموشی اچھی نہیں لگی اور اس نے بڑی خود اعتمادی سے کہا۔

"لچھمی بہن تم کنوئیں پر چپل پہن کر گئی تھی کہ جوتے"

"چپل"

"بہن ذرا ادھر تو آنا۔ لچھمی اپنے باپ سے اجازت لے کر حمید کے قریب آگئی۔ سب لوگوں نے سوچنا چھوڑ کر دونوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ دیکھو ابا جی لچھمی بہن چپل پہن کر پانی بھرنے گئی تھی چپل نے اتنی گندگی اچھالی ہے کہ اس کی ساڑھی کا رنگ خراب ہو گیا ہو سکتا ہے کہ کیچڑ سے لپٹا کنکر کا کوئی ٹکڑا اس کی چپل کے سا

(بقیہ ص ۳۲)

از محمد تحسین عباسی پرویز
ریسرچ اسکالر شعبہ اُردو
بنارس ہندو یونیورسٹی

ادبِ لطیف

۱۔ بنارس کے ایک آل انڈیا مشاعرہ میں شعرائے کرام میں نیرنگ بنارسی کے علاوہ جناب بزمی چریاکوٹی، جناب ذکی لکھنوی جناب فنا کانپوری وغیرہ بھی شریک تھے۔ جناب نیرنگ بنارسی اپنی ایک نظم "ہندو مسلم اتحاد" بڑے زور شور سے سنا رہے تھے جب انھوں نے یہ مصرع پڑھا "ایک کشتی پہ بیٹھ سکتے ہیں ایک رستہ پہ چل نہیں سکتے" جناب ذکی عباسی چریاکوٹی نے برجستہ کہا کہ وہ لنگڑے ہیں (اتفاق سے جناب نیرنگ بنارسی لنگڑے ہیں)

۲۔ لکھنؤ کے آل انڈیا مشاعرہ میں ایک بار جناب مانی جائسی جو بڑے کہنہ مشق شاعر اور اساتذہ میں سے تھے اپنی ایک غزل سنا رہے تھے جس کا مطلع تھا۔

نکلنے کو تو میرے دل کی حسرت نازنیں نکلی
مگر جتنی نکلنی چاہئے اتنی نہیں نکلی

جیسے ہی مانی صاحب نے اپنا مطلع ختم کیا سامعین میں سے ایک من چلے نے کہا کہ اس میں نازنیں کا کیا قصور ہے۔

۳۔ علی گڑھ کے ایک مشاعرے میں مولانا تمنا عمادی پھلواروی تشریف لائے اور جب ان کو ڈائس پر لایا جا رہا تھا (وہ ضعیف اور کافی کمزور تھے) اور وضع قطع بھی کچھ ایسی تھی کہ یعنی لمبا چغہ پہنے ہوئے سر پر پگڑی اور ہاتھوں میں ڈنڈا لئے ہوئے تھے کہ پورا مجمع ان کی طرف متوجہ ہو گیا تھا اتنے میں تین چار طلبا نے ایک ساتھ بہت بلند آواز میں کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۴۔ کلکتے کے ایک مشاعرہ میں جناب ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم سابق چیرمین شعبۂ فارسی و اردو ڈھاکہ یونیورسٹی مشاعرے کی نظامت کا فرض انجام دے رہے تھے اور انھوں نے ایک مولانا شاعر کو کلام سنانے کے لئے زحمت دی۔ مولانا اپنی غزل سنا رہے تھے "دکھانے پڑتے ہیں زخم کو نشتر کبھی کبھی" وغیرہ شادانی صاحب مسکرائے اس لئے کہ مولانا بڑی رنگین اور بڑی بے تکی غزل سنا رہے تھے۔ اور مولانا نے جیسے ہی اپنی غزل ختم کی شادانی صاحب نے کہا کہ میرے استاد مجھکو اکثر ایک شعر سنایا کرتے تھے اور وہ یہ ہے۔

آتے ہیں ان دنوں وہ میرے گھر کبھی کبھی
لگا ہے کبھی کبھی، کبھی اکثر کبھی کبھی

۵۔ اٹاوہ میں نمائش کا آل انڈیا مشاعرہ تھا اور اخترپوری جو اپنے کو جناب احمق پھپھوندوی کا شاگرد بتاتے تھے گاندھی جی کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھ کر لائے تھے جسے وہ سنانا چاہتے تھے اُس قصیدے کا پہلا مصرعہ یہ تھا، "باپو اب ایک دور میں تجھ سا بشر کہاں" اور انھوں نے بڑی زور دار آواز میں "باپو" کہا اس پر ایک کالج کے طالب علم نے اتنی ہی زوردار آواز میں جواب دیا۔ "بیٹا"

۶۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک بار جگر مراد آبادی اسٹریچی ہال میں اپنی ایک نظم سنا رہے تھے اور جیسے ہی انھوں نے پہلا مصرعہ پڑھا۔ بڑھ چل اے مسلم سپاہ اشہد ان لا الٰہ بہت سے طلبا نے ایک ساتھ اور ایک آواز ہو کر کہا۔ نعرۂ تکبیر اللہ اکبر اور اس کے بعد جگر صاحب کو خاموش ہو جانا پڑا۔

۷۔ بمبئی کے ایک مشاعرہ میں عارف عباسی مرحوم شریک مشاعرہ تھے اور بھی بہت سے شعرائے کرام مدعو تھے۔ لیکن عارف کا نام پکارا گیا اور انھوں نے غزل شروع کی جس کا مطلع تھا "پھونک کر میرے آشیانے کو ... زمانے کو" اس غزل

پر نشتر بارہ بنکوی کو ... ... عباسی بیچ وتاب کھا رہے تھے اور اپنے قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ یہ غزل خود اُن کی ہے جو نشتر بارہ بنکوی اپنے نام سے پڑھ رہے ہیں۔ جب عارف عباسی کا نام پکارا گیا تو انھوں نے بھی وہی غزل پڑھی جو نشتر پڑھ چکے تھے۔ اتفاق سے عارف عباسی اور نشتر بارہ بنکوی دونوں اپنے آپ کو جگر مراد آبادی کے شاگرد بتاتے تھے۔ عارف عباسی نے جیسے ہی غزل ختم کی نشتر بارہ بنکوی کود کر ڈائس پر آئے اور مائک پر بولے حضرات نہ اس میں نہ میرا قصور ہے نہ جناب عارف کا یہ تو استاد محترم کو سمجھنا چاہئے تھا کہ انھوں نے وہی غزل کہہ کر مجھے بھی دی اور عارف صاحب کو بھی۔

شہرِ غزل کی تشکیل

۲ر اکتوبر ۱۹۸۰ء یوم پنجشنبہ بوقت ۸ بجے شب گاندھی جینتی کے پُرمسرت موقع پر زیر صدارت حضرت حکیم شبیر علیخان شبیر کانپوری۔ صدر موصوف کے عشرت کدے پر ایک ادبی ادارہ بنام شہر غزل کا قیام عمل میں آیا بمتفقہ طور پر جس کا انتخاب مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل ہے۔

سرپرست حضرات: (۱) عالیجناب عارف محمد خاں ایم پی کانپور (۲) جناب عبدالرحمان خاں نشتر وزیر صنعت و اوقاف اترپردیش (۳) عالیجناب دھمی۔ این۔ آریہ انکم ٹیکس آفیسر الہ آباد (۴) محترمہ محمودہ اشرف (۵) عالیجناب سرور تونسوی ایڈیٹر شان ہند، دہلی۔

صدر:- عالیجناب حکیم شبیر علی خاں شبیر کانپوری

نائب صدر:- حق کانپوری (۲) ڈاکٹر سید محمد ہاشم ہاشمی

جنرل سکریٹری:- چاند بدایونی۔ سکریٹری: (۱) مولانا قمر شاہجہانپوری (۲) سید ضیاءاللہ ضیا کانپوری۔ خازن:- محمد رفیق محشر کانپوری آڈیٹر:- ایس۔ ایم۔ سعید بیتاب کانپوری۔ سکریٹری نشر و اشاعت:- اشفاق رحمانی۔ آفس انچارج:- منشی رمضان علی۔

مجلس عاملہ:- (۱) ڈاکٹر امتیاز احمد (۲) محمد یعقوب (ایگزیکیو ممبر کانگریس آئی) (۳) محمد عرفان (ایگزیکیو ممبر کانگریس آئی) (۴) محمد شفیق عرف منّو (۵) شفق شہیری کانپوری (۶) اسلم سیتاپوری (۷) محمود علی خاں (۸) اظہر محمد حسن سلولوی (۹) کمال احمد۔

سکریٹری نشر و اشاعت اشفاق رحمانی

عید

نور ثروت عثمانی

عید کا چاند نظر آئے گا جس دم مجھ کو
ایک اک زخم مرے دل کا اُبھر آئے گا
تیری یادوں کی طرح عید کا رنگیں لمحہ
تیر کی طرح مرے دل میں اُتر جائے گا

ملتفت آج جو حیات ملی
غم دل سے مجھے نجات ملی
عید کے دن جو تم ملے مجھ سے
ایسا لگتا ہے کائنات ملی

پُرکیف پُر بہار نظاروں کی عید ہے
ہر سُو حسین چاند ستاروں کی عید ہے
ہر سُو رواں ہے ماہ جبینوں کا کارواں
ہر ایک سمت راہ گزاروں کی عید ہے

لارہے ہیں
کتا ہے۔ فوراً
ہے آپ کو
لیے گی۔ اگر
سے میں مشو
ہیں آن

پریشان ہیں، لیکن یہ نہ سمجھیے کہ ایسی پریشا
ادویات سے تیار کیا ہوا کونسلیکر
رنگ کی سرسراہٹ، خراش ہوگی
ایسا مریض جو دمہ کے

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ — رجسٹرار آف نیوز پیپرز آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۹۴۴/۵۷ — رجسٹرڈ نمبر ڈی ۳۴۳

ہندو پرست ہوں نہ مسلمان پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیضانِ [illegible]
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
([illegible])

ماہنامہ
شانِ ہند نئی دہلی

ایڈیٹر:
سرور تونسوی

زرِ سالانہ: ۱۵/- روپے
فی پرچہ: ۱/۵۰ روپے

جلد نمبر ۲۴ ٭ نومبر ۱۹۸۰ء ٭ شمارہ نمبر [illegible]

رُباعیات

(حضرت علامہ کرسن لعل ادیب لکھنوی)

جو خواب سے بیدار نہیں ہوتا ہے
ہمت سے جو سرشار نہیں ہوتا ہے
جو اپنی خبر آپ نہیں لیتا ہے ادیب
اُن کا کوئی غم خوار نہیں ہوتا ہے

تحریر سے تحریر نہیں ملتی ہے
تقدیر سے تقدیر نہیں ملتی ہے
ہے مانعِ ہستی کا ہر اک نقش جُدا
تصویر سے تصویر نہیں ملتی ہے

٭ ٭ ٭

ہر آہ کی تاثیر مٹی جاتی ہے
احساس کی توقیر مٹی جاتی ہے
انسان کی ہستی کو مٹانے والے
اللہ کی تصویر مٹی جاتی ہے

احساس کا اظہار بہت مشکل ہے
خود جرم کا اقرار بہت مشکل ہے
دل اور زباں میں نہ سہی فرق ادیب
یہ عظمتِ کردار بہت مشکل ہے

ودیا پرکاش سرور ایڈیٹر پرنٹر پبلشر نے لبرٹی کے مضمون خواجہ پریس، پرچہ شیخ منگو، جامع مسجد دہلی اور صدیقی پاپولر پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند لطیف نمبر ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

نوائے وقت

الحاج انجم وزیرآبادی
(لاہور) (پاکستان)

گو مذاہب مختلف ہیں ایک ہے لیکن وطن
مختلف پھولوں سے ہی مل جل کے بنتا ہے چمن

ویسے ہٹ دھرمی تو شیخ و برہمن کا کام ہے
رام کہہ لو یا خدا سب ایک ہی کا نام ہے

امتیازِ نیک و بد سے آدمی ہے آدمی
ورنہ دنیا میں نہیں ہے چارپایوں کی کمی

زندگی سرمایہ ہائے زندگی، سب خاک ہیں
موت کے امواجِ طوفاں میں خس و خاشاک ہیں

یہ زمین یہ آسماں یہ آفتاب و ماہتاب
ہندو و مسلم ہیں اِن سب سے برابر فیض یاب

یہ ہوائیں، یہ گھٹا، بادل یہ لہراتا ہوا
شور کرتا، جھومتا، موتی سے برساتا ہوا

چاہے مسجد ہو کہ مندر، اُس کو پروا ہی نہیں
خاص کس جا پر برسنا ہے یہ سوچا ہی نہیں

یہ ندی نالے یہ دریا اور یہ بحرِ بیکراں
اُس خدائے پاک و بالاتر کی عظمت کے نشان

مرضیٔ مولا کے آگے سر جھکا کر ہیں رواں
امتیازِ ہندو و مسلم سے سب دامن کشاں

طفلِ نوزائیدہ کے ماتھے پہ ڈالو اِک نظر
اور پڑھ لو ہندو و مسلم لکھا پاؤ اگر

یہ نہیں تو کر لو روشن دھرم اور ایمان کو
آؤ مل کر دُور کر دیں بُغض کے شیطان کو

دردمندوں، دل شکستوں کی سُنیں فریاد ہم
اور اُجڑی بستیاں پھر سے کریں آباد ہم

گھر بنا کر اُن کو دیں جو خانماں برباد ہیں
شام کے بھٹکے پرندے کی طرح ناشاد ہیں

آؤ سب مل کر پکاریں اللہ اللہ، رام رام
اور بنائیں ٹوٹے دل کے جوڑنے کا اِک نظام

مرحبا کیا کہہ گیا اِک صاحبِ عقلِ سلیم
چیست ہندو یا مسلماں کوزۂ از یک کلیم

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ و صبا چہ کرد؟

کیا سارا پاکستان بیمار ہے ؟

ہندوستانی مسلمان جو پاکستان اپنے عزیزوں سے ملاقات کرنے یا کسی شادی، غمی کے سلسلے میں جانا چاہتے ہیں اُنھیں شکایت ہے کہ نئی دہلی میں سفارت خانہ پاکستان اُنھیں ویزا دینے میں انتہائی بخیلی سے کام لیتا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں کی ہر ممکن طور پر بےعزتی کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتا۔ اس قسم کی شکایات آئے دن اخبارات میں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں اور زبانی طور پر بھی سُننے میں آتی ہیں۔ دفتر شانِ ہند میں بھی ملک کے مختلف حصوں سے اکثر حضرات پاکستانی ویزا کے حصول کے لئے اس نظریئے سے تشریف لاتے رہتے ہیں کہ ہم اپنے اثر و رسوخ سے اُنہیں ویزا دلا دیں گے۔

چنانچہ پچھلے دنوں ایڈیٹر شانِ ہند نے پاکستانی سفارتخانہ کے کونسلر جناب خالد زماں صاحب سے ملاقات کی (کیونکہ پاکستان جانے والوں کے لئے ویزا دیئے جانے کے سب سے بڑے افسر یہی ہیں) تاکہ اصل صورتِ حال پر تبادلہ خیال کیا جائے اور قارئین شانِ ہند کو بتایا جاسکے کہ اُنھیں اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیئے۔

جناب خالد زماں صاحب نے بتایا کہ ہمیں ان لوگوں کو ویزا دینے میں کوئی اعتراض نہیں جن کا پاکستان جانا کسی جائز ضرورت کے تحت ہو۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ اکثر و بیشتر ویزا لینے والے وہاں کا پتہ غلط لکھتے ہیں اور پاکستان جاکر پاسپورٹ پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں اور اپنے رشتہ داروں کے پاس مستقل رہائش اختیار کر لیتے ہیں۔ پولیس ان کی تلاش میں بھٹکتی پھرے مگر ان کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ اس جرم کی حوصلہ افزائی یوں بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی ایسا شخص جو ناجائز طور پر پاکستان میں رہ رہا ہو پکڑا بھی جائے تو زیادہ سے زیادہ اُسے ہندوستان کی سرحد پر لاکر چھوڑ دیا جائیگا خلیجی ممالک میں لوگ اب زیادہ تعداد میں جا نہیں سکتے کیونکہ حکومت نے پابندیاں لگا دی ہیں تو اب لوگوں نے پاکستان کو بھی ایک طرح سے خلیجی ملک سمجھ لیا ہے کیونکہ پاکستان میں مزدوروں میکینکوں، راج مزدوروں، غرضیکہ ہر دستکار اور فنکار کو معاوضہ بہت اچھا ملتا ہے تو یہاں سے جانے والے اکثر لوگ زیادہ اجرت کے لالچ میں وہیں ناجائز طور پر رہائش اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ایک اندازے کے مطابق تیس ہزار ایسے ہندوستانی باشندے ناجائز طور پر پاکستان میں رہائش پذیر ہو چکے ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہمیں کافی چھان بین کرنی پڑتی ہے۔ اور ہم ایسے لڑکے اور لڑکیوں کو ویزا نہیں دیتے جو غیر شادی شدہ ہوں۔ کیونکہ یہ نا کتخدا لوگ وہاں جاکر شادی کر لیتے ہیں اور پھر ہندوستان نہیں آتے۔ ایسے لوگ جو میکینک، دستکار، کاریگر اور مزدور پیشہ ہیں ہم اُنھیں بھی ویزا نہیں دیتے۔ کیونکہ وہ بھی روپیہ کمانے کے لالچ میں پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ اور ایسے لوگ وہاں جاکر واپس نہیں آتے۔

ویزا کونسلر صاحب نے مزید بتایا کہ ہم ایسے اصحاب کے ساتھ ضرور رعایت کرتے تھے۔ جن کے عزیز تشویشناک بیمار ہوں یا کوئی موت ہوگئی ہو یا کسی نزدیکی رشتہ دار کی شادی کی ہو۔ ایسے لوگوں کو ایمرجنسی ویزا دے دیا جاتا تھا۔ مگر یار لوگوں نے ایمرجنسی کو بھی پاکستان جانے کا ایک بہانہ بنا لیا۔ اور مثال کے طور پر اگر ایک دن میں ایک ہزار درخواستیں ویزے کے حصول کے لئے دستی یا بذریعہ ڈاک آئیں تو ان میں نو صد نوے درخواستوں کے ساتھ کسی نہ کسی عزیز کے تشویشناک علالت کے ٹیلی گرام ثبوت کے لئے لگے ہوتے ہیں ان ٹیلی گرامز کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ سارا پاکستان بیمار ہوگیا ہے اور یہ ویزا حاصل کرنے والے ہندوستانی مسلمان ہی ان بیماروں کی تیمارداری کرنے والے ہیں۔ اور ان ٹیلی گرامز کی حقیقت یہ ہے کہ ان میں نوے فیصد قطعاً غلط اور جھوٹے ہوتے ہیں اب آپ ہی بتایئے کہ ہم بخیلی سے کام کیوں نہ لیں۔ ہمارے عزّت کا معاملہ تو جب کوئی سراسر جھوٹ بول رہا ہو یا ہمیں دھوکہ دے رہا ہو تو کیا وہ اپنی نظروں میں باعزت ہے؟ اور اگر اس قسم کے دھوکے بازیوں اور کذب بیانی کرنے والوں سے کوئی افسر سخت کلامی سے پیش آتا ہے تو اسے بُرا منانے کی بجائے

یسے لوگوں کو اپنے کردار پر نظر دوڑانی چاہیئے۔

ہاں ہم ایسے لوگوں کو ضرور ویزا دیتے ہیں جن کے بارے میں یقین ہوتا ہے کہ یہ حضرات واپس اپنے وطن میں آجائیں گے یا ایسی ایمرجنسی درخواستوں کو بھی منظور کر لیتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ درخواست دہندہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے یا دھوکہ نہیں دے رہا۔

جناب کونسلر خالد دماں صاحب کی اس تشریح کے مطابق یہ بات ذہن نشین ہو گیا ہوگا کہ پاکستانی ویزا حاصل کرنے میں مشکلات درپیش ہیں ان کو ہندوستانی مسلمانوں نے خود کیا ہے۔

ہم یہ بھی گذارش کر دیں کہ ہمارا یا کسی ادارے کا پاکستانی افسران پر دباؤ یا ذاتی اثر ورسوخ نہیں کہ اس کے زیر تحت ویزا ملنے کا امکان طور پر پاکستانی متعلقہ افسران کے فیصلہ پر انحصار رکھتا ہے اور وہ اس ذمرہ میں کامل خود مختار ہیں۔

عموماً ویزا لینے والوں کو گمراہ کیا جاتا ہے کہ رشوت دینے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ تاثر پاکستانی سفارتخانے کے باہر بیٹھے ٹائپسٹ۔ فارم پر کرنے والے۔ فوٹوگرافرز۔ اور فریب کاروں کی طرف سے بھولے بھالے عوام کو دیا جاتا ہے اور کئی حضرات ان فریب کاروں کے ہاتھوں لٹتے بھی ہیں۔ اور ایسے جعلی ویزا دے دیتے ہیں جو بارڈر پہ جاکر گرفتاری کا باعث بنتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستانی سفارتخانے کے معمولی سے معمولی ملازم کو بھی کافی معقول تنخواہ اور غیر ملکی الاؤنس وغیرہ دستیاب ہیں کہ انہیں رشوت کا ناجائز لالچ متاثر نہیں کر سکتا دوسرے یہ خیال رکھئے کہ حکومتیں اپنے سفارتخانوں میں ایسے ملازمین کو بھجواتی ہیں جنہیں اپنے ملک کی عزت کا خیال ہو لہذا آپ کو پاکستانی سفارت خانے میں کوئی ادنی سے ادنی ملازم بھی ایسا نہ مل سکے گا جو اپنے ملک کی عزت کا خیال نہ رکھتا ہو۔

ایڈیٹر شان ہند کو سکروڈہ ضلع سہارنپور کے ایک بزرگ مسلمان نے بتایا کہ وہ پاکستانی سفارتخانے کے ایک افسر سے ذاتی طور پر ملاقات کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے انہوں نے گیٹ کیپر کو کچھ رشوت پیش کرنی چاہی تو اس گیٹ کیپر نے رشوت کو قبول نہ کرتے ہوئے ان کو جھڑک سے بھری باتیں کہیں ان کے پیش نظر ان صاحب کو گیٹ کیپر سے معافی مانگنی پڑی۔ اس گیٹ کیپر نے ان صاحب کو سفارت خانے کے اس افسر تک تو پہنچا دیا مگر اس کے ساتھ ہی افسر مذکورہ سے کہہ بھی دیا کہ صاحب انھوں نے مجھے رشوت پیش کی تھی۔

لہذا آپ پاکستانی سفارت خانے میں کسی کو رشوت مت دیجئے اور اگر آپ کو کوئی ایسی صلاح دیتا ہے تو اس کی رپورٹ سفارت خانے کے افسران سے کیجئے۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ پاکستانی سفارت خانے کے متعلقہ افسران بھی انسان ہیں۔ اور وہ انسانی قدروں کو پہچانتے ہیں اور وہ جائز طور پر پاکستان جانے والوں سے دلی ہمدردی بھی رکھتے ہیں چنانچہ بعض اوقات ویزا دو چار گھنٹوں میں بھی مل جاتا ہے۔ صرف شرط یہ ہے کہ آپ جھوٹ اور دھوکے نیز غلط بیانی سے کام نہ لیں اس سلسلے میں یہ مخلصانہ گزارش بھی ہے کہ ایڈیٹر شان ہند کسی کو بھی پاکستانی ویزا نہیں دلا سکتا۔ لہذا اس خدمت کے لئے ہمیں معاف فرمایا جائے۔ اور براہ راست پاکستانی سفارت خانہ سے رجوع کیجئے۔

پنجاب اینڈ سندھ بینک

پنجاب اینڈ سندھ بینک جاری ہی اس قومی جذبہ سے ہوا تھا کہ اکثر دوسرے بینک سکھ نوجوانوں کو اپنے ہاں ملازمتیں نہیں دیتے تھے لہذا اس حق تلفی کے جذبے کے تحت ہی اس بینک میں سکھ نوجوانوں کو زیادہ ملازمتیں دی گئیں اور سکھ حضرات نے اپنے کاروباری ضروریات کے لئے بینکنگ کی تمام سہولتیں اسی بینک سے حاصل کرنا شروع کر دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ بینک شاہراہ ترقی پر ایسا گامزن ہوا کہ اس کی ترقی سے کچھ لوگوں کو ذہنی تکلیف ہونے لگی اور یار لوگوں نے اس بینک کو نیشنلائزڈ کرا کے ہی دم لیا تاکہ سکھ نوجوانوں کو اس بینک میں ملازمتیں حاصل کرنے میں فوقیت نہ مل سکے۔

ہماری حکومت دعویٰ کرتی ہے کہ وہ غریبی دور کرنا چاہتی

ہمیں مگر افسوس ہے کہ اگر کسی فرقے میں اپنے نوجوانوں کو بے کاری سے بچانے کے لئے کوئی عملی قدم اٹھایا جاتا ہے تو اسے اس طرح نادر نینڈ ڈ کیا جاتا ہے کہ حکومت کی نیت پر شک ہونے لگتا ہے ملک کے سیاسی سکھوں کا یہ طرزِ عمل واقعی قابلِ تعظیم ہے ناچاہیے کہ کسی فرقے کے مالدار حضرات اپنے فرقے کے بےکار نوجوانوں کو کام پر لگائیں اور یہ قدم واقعی غریبی دور کرنے کا ایک عملی قدم ہے۔ مگر حکومت نے پنجاب اینڈ سندھ بینک کو نیشنلائز ڈ کر کے سکھ نوجوانوں کے ساتھ یقیناً ناانصافی کی ہے۔ پنجاب اینڈ سندھ بینک کے کارکنان نے اپنی حلیمی اور خوش خلقی سے عوام پر ایسا اچھا اثر ڈالا کہ اس بینک کی مختلف شاخوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہزارہا کھاتے کھل گئے اور اس بینک کے ہردلعزیز چیئرمین سردار اندرجیت سنگھ صاحب نے تمام فرقوں کے نوجوانوں کو بینک میں ملازمتیں دینے میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔

ہمیں اس حقیقت کا اظہار حکومت تک پہنچانا چاہیئے کہ حکومت کے اس اقدام سے سکھ قوم میں مایوسی ہوئی ہے اور جن لوگوں کے مشورہ پر یہ قدم اٹھایا گیا ہے انھوں نے کوئی ملک کی خدمت نہیں کی ہے۔

سکولوں میں یوگ ودیا

جناب دھریندر برہمچاری ٹیلی ویژن پر ہفتے میں دو بار یوگ ودیا کے بارے میں جو عالمانہ اور یوگیانہ درس دیتے ہیں اس کی جس قدر بھی تعریف کی جائے کم ہے اور عوام ان اسباق سے جو فائدے اٹھا رہے ہیں ان کا اظہار ٹیلی ویژن پر ان خطوط کو سننے سے ہوتا رہتا ہے جو عوام اس پروگرام سے اٹھائے گئے فوائد کے بارے میں لکھتے ہیں۔ برہمچاری دھریندر جی ایک عرصہ سے کوشاں تھے کہ سکولوں میں طالب علموں کو شروع سے ہی یوگ ودیا کا گیان کرایا جائے۔ برہمچاری جی کی برسوں کی یہ کوششیں کامیاب ہو گئی ہیں اور حکومت نے سکولوں کے نصاب میں یوگ شکشا کو شامل کر لیا ہے۔ اور اس وقت اس پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ برہمچاری جی ٹیلی ویژن پر یوگ کے اسباق دیتے وقت اکثر یوگ شاستروں کے حوالے دیتے ہیں جن سے یہ صاف عیاں ہوتا ہے کہ یوگ صرف آسنوں یا جسمانی ورزش کا ہی نام نہیں ہے بلکہ یوگ کا براہِ راست تعلق روحانیت سے ہے۔ جسمانی ورزش یا آسن وغیرہ تو یوگ کے ابتدائی مراحل ہیں۔

ہمیں خوشی ہے کہ سرکار نے برہمچاری جی کے اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ ہمارے بچے سکولوں میں یوگ ودیا سیکھ کر اپنے جسم کو تو ٹھیک رکھ ہی سکیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کے دل و دماغ پر روحانیت کی چھاپ بھی لگنی شروع ہو جائیگی اور جس دل میں روحانیت کی جوت جل اُٹھتی ہے تو وہ مذہبی نفرت سے دور ہی رہتا ہے اور اس کی نظروں میں دنیا کا ہر آدمی اس کا بھائی ہے۔ اگر ہمارے سکولوں کے معلم حضرات بچوں کو یوگ شکشا کے ساتھ ساتھ روحانیت کی طرف بھی مائل کر دیں تو قومی یکجہتی کا مسئلہ از خود کچھ ہی سالوں میں حل ہو جائیگا۔

ہنومان جی کی توہین

"چہار رنگ" کی حالیہ اشاعت میں کسی مکرم مرزا صاحب کا تحریر کردہ ایک واقعہ "شنکر کی لاٹ" شائع ہوا ہے۔ مکرم مرزا صاحب کے بیان کردہ اس واقعہ میں صداقت کی بجائے افسانوی رنگ صاف صاف جھلکتا ہے۔ اہلِ ہنود میں ہنومان جی کا کیا مرتبہ ہے شاید مکرم مرزا صاحب اور مدیرانِ "چہار رنگ" کو اس کا پوری طرح علم نہیں ہے ورنہ وہ ایسا واقعہ جس کا ماخذ محض سنی سنائی داستان اور ضعیف الاعتقادی پر مبنی ہے شائع کر کے کروڑوں ہندوؤں کے دلوں کو نہ دُکھاتے۔

رامائن میں یہ صاف الفاظ میں لکھا گیا ہے کہ ہنومان جی امر (زندہ جاوید) اور اجر (جو نہ تو کبھی بیمار ہو اور نہ ہی بوڑھا ہو) ہیں اور وہ پورن برہمچاری ہیں۔ انھیں پون پتر (ہوا کے بیٹے) بھی کہا جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جہاں بھی رام چرچا ہوگی وہاں ہنومان جی کی موجودگی لازمی ہوتی ہے۔ یہ انھیں سیتا جی کا آشیرواد ہے۔ چنانچہ جہاں بھی رام کتھا ہوگی وہاں ہنومان جی کا آسن الگ بچھایا جاتا ہے وہ بیشک نظر نہیں آتے مگر وہ یقیناً وہاں موجود ہوتے ہیں۔

ایسے جری۔ بااخلاق، پورن برہمچاری اور خادمِ رام کے نام نامی سے ایسی توہین آمیز باتیں منسوب کرنا افسوس ناک ہے۔ ہم شانِ ہند کی اشاعت آئندہ میں اس سلسلے میں تفصیل سے لکھیں گے۔ مدیرِ "چہار رنگ" سے درخواست گزارش ہے کہ وہ اس سلسلے میں مناسب طور پر معذرت چاہیں — — —

گوشۂ عقیل صدیقی

بہ کوئے یار بہ اندازِ محرمانہ گزر

سرور تونسوی

ساحر لدھیانوی

حصولِ آزادی کی جدوجہد میں برصغیر کا نوجوان طبقہ برطانوی استعمار کے خلاف برسرِپیکار تھا۔ ملک میں کئی انقلابی اور سیاسی تحریکیں نئے نئے طریقوں سے چل رہی تھیں۔ کانگریس اور کچھ دیگر تنظیمیں آئینی اور قانونی حدود میں رہ کر آزادیٔ وطن کے لئے سرگرداں تھیں۔ مسلم لیگ انگریز کی سرپرستی میں کانگریس کی مخالفت اور مذہبی جنون پھیلانے میں اپنا رول نہایت خوش اسلوبی سے ادا کر رہی تھی۔

مگر نوجوان طبقہ بلا تخصیصِ مذہب و ملت (عیسائیوں کے علاوہ) "انقلاب زندہ باد" کے نعرے بلند کر رہا تھا۔ ان کی خفیہ تنظیمیں بھی تھیں۔ اور دہشت پسندی کے گروہ بھی تھے۔ کاکوری کا مقدمہ بھی انہیں دنوں میں ہوا۔ جس میں اشفاق خان سے

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے سر میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

گاتا ہوا پھانسی کے تختے پر چڑھ گیا۔ بھگت سنگھ راج گرو اور دت کا مقدمہ اور پھانسی کا قصۂ دلدوز بھی انہی ایام کی یادگار ہے۔

ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی نئی نئی وجود میں آئی تھی اس کے کارکن بھی زیرِ زمین سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ ٹریڈ یونینیں بھی بن رہی تھیں۔ لاہور۔ امرتسر۔ دہلی۔ کلکتہ۔ بمبئی ان سرگرمیوں کے مرکز تھے۔ ساحر لدھیانوی اس پارٹی کے ممبر تھے اور وہ اپنے داخلی حالات کی بنا پر آمادہ بغاوت رہتے تھے۔ آغا شورش کاشمیری نڈر صاحبِ قلم، دوسرا ابوالکلام آزاد اور ساحر رومانی اور انقلابی شاعر دونوں اچھے دوست تھے۔ اور دونوں ہی حصولِ آزادی کی جملہ تحریکوں سے متاثر تھے۔ مگر دونوں کے طریقِ عمل کا راستہ الگ الگ تھا۔

آغا شورش کاشمیری کے چھوٹے بھائی یورش کاشمیری اس گروپ میں شامل تھے اور وہ بھی آزادی کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ میں، ان دنوں غالباً جالندھر میں رسالہ "ایجوکیشنل گزٹ" کی ادارت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ہر ہفتہ لاہور آنا جانا رہتا تھا۔ "ادبِ لطیف" کے دفتر میں عموماً ساحر لدھیانوی سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ ساحر لدھیانوی کی شاعری ان دنوں پروان چڑھ رہی تھی۔ اور انہوں نے دنیائے شاعری میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔

یورش کاشمیری جتنا خوبصورت نوجوان تھا۔ اس سے بھی زیادہ خوبصورت آزادی کی دیوی اس کے دل و دماغ پر چھائی رہتی تھی۔ چنانچہ لاہور میں حکومت کے خلاف ایک زبردست جلوس نکلا۔ جس میں یورش نے بھی حصہ لیا۔ پولیس نے اس جلوس پر شدید لاٹھی چارج کیا۔ یورش جو جلوس میں سب سے آگے تھا پولیس کی لاٹھیوں کا شکار ہو گیا اور آزادی کے اس جانباز سپاہی نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر دی

اس وقت پنجاب کے گورنر ایک ڈانلڈ اور وزیرِ اعلیٰ ملک خضر حیات ٹوانہ تھے۔ یورش کی جواں مرگی پر ایک نوحہ لکھا جو آج بھی ساحر کی انقلابی شاعری کا آئینہ دار ہے۔ آیئے آپ بھی اس نوحہ کو اس تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے پڑھئے۔

اک دیا اور بجھا

اک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی
شب کی سنگین سیاہی کو مبارک کہہ دو

جاؤ بجھتی ہوئی آنکھوں کے سسکتے اشکو
جاؤ فرعون کی مسند کو مبارک کہہ دو

جاؤ جمہور کے روندے ہوئے بے بس جذبو
جاؤ کچلا ہوا ایک ہوا لاوا بن جاؤ

جاؤ معصوم جنازے کے افسردہ پھولو
جاؤ قانون کے ایوان پہ شعلے برساؤ

جاؤ اسے وقت کے تاریک بھیانک سایو
میکڈانلڈ سے کہہ دو اب کوئی زحمت نہ کرے

جاؤ اس قتل کے بالواسطہ مجرم سے کہو
اب کوئی وعدۂ تکلیفِ مروّت نہ کرے

جاؤ پنجاب کی سرکار سے جاکر کہہ دو
سینکڑوں سینوں میں چنگاریاں درخشندہ ہیں

موت ایوانِ وزارت پہ کھڑی ہنستی ہے
جاؤ اور خضر سے کہہ دو ابھی ہم زندہ ہیں

یہ نظم اس وقت پورے برصغیر میں مشہور ہو گئی تھی اور یورشس کا یہ مرثیہ نوجوانوں کا ترانہ بن گیا تھا۔ آج بھی ساحر کی یہ نظم اُن کی مشہور نظموں میں سرِ فہرست ہے۔ مگر آج کا نوجوان تو کیا اُدھیڑ عمر کا اُردو داں بھی یہ نہیں جانتا کہ یہ نظم یورش کاشمیری کا مرثیہ ہے۔

آج نہ تو شورش کاشمیری اور نہ ان کا یارِ غار ساحر لدھیانوی اس دُنیا میں ہیں لیکن مظلوم یورش کاشمیری ظالم میکڈانلڈ بھی اپنے مظالم کا حساب دے چکا ہوگا اور انگریز کا وفادار ملک خضر حیات ٹوانہ بھی حشر کے روز جواب دہ ہوگا۔ مگر ساحر کی یہ نظم اب بھی آزادی پر قربان ہونے والے نوجوان یورشس کاشمیری کا سرِ افتخار بلند کئے ہوئے ہے۔ اور ساحر بھی اپنی ایسی نظموں کے باعث امر رہے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ساحر نے اپنے گیتوں سے مظلوم انسانیت کے اس گروہ کی حمایت کی جس پہ مغربی طاقتوں کی گرفت تھی۔ مگر انھوں نے ان لوگوں کو نظر انداز کر دیا۔ جن پر اشتراکی حکومتوں نے ظلم روا رکھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ساحر اُردو کے وہ باکمال شاعر تھے جنہوں نے اشتراکیت کی تبلیغ کے لئے اُردو زبان کو اپنا وسیلہ بنایا۔

ساحر نے رُومانی اور انقلابی شاعری کی، وہ آزادی کا متوالا تھا اور پرورش لوح و قلم کرتا رہا۔ مگر ساحر مارکسزم اور اشتراکیت سے متاثر تھا اور یہی وجہ ہے کہ ساحر اپنی زندگی کے آخری حصّہ میں مایوس ہو گئے تھے ..... رہے نام اللہ کا۔

محمد رفیع

محمد رفیع صاحب کے انتقال کے بعد بالتخصیص مذہب و ملّت جو سوگ منایا گیا ہے وہ عوام کی دلی عقیدت کا ایک ایسا اظہارِ عقیدت ہے جسے کوئی بھی مذہبی جذبہ زہر آلود نہیں کر سکا۔ ہر زبان کے اخبارات اور رسائل نے جس ڈھنگ سے مسلسل دو دو بلکہ تین تین اشاعتوں میں اس عظیم موسیقار کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ تو شاید پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال پر بھی پیش نہیں کیا گیا تھا۔ کیونکہ نہرو کی نسبت رفیع کی موت نے بھی ان اخبارات و رسائل کے مالکان کی جھولیاں بھر دیں۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ کچھ مسلم جرائد و رسائل نے اپنی فرقہ وارانہ ذہنیت کا کمال رفیع صاحب کے انتقال پر اس قدر بے مثال دلی سوگ منائے جانے کے باوجود دکھانا شروع کر دیا ہے۔ اور بغیر کسی وجہ سے یہ لکھا جا رہا ہے کہ ریڈیو اور دُوردرشن نے اس سلسلے میں فراخدلی سے کام نہیں لیا اور کچھ ایسے الزامات بھی لگائے ہیں کہ محمد رفیع کی وطن پرستی پر شک کیا جانے لگا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک ریڈیو اور دُوردرشن والوں کا معاملہ ہے اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اُن پہ یہ بہتان محض کسی ذاتی پرخاش کے باعث ہی لگایا گیا ہے۔ وگرنہ ان دونوں اداروں نے اپنی بساط بھر اس سلسلے میں پورا حق ادا کیا ہے یہ کہنا کہ خصوصی پروگرام میں رفیع کے گائے ہوئے جو گانے پیش کئے گئے ان کا انتخاب صحیح نہ تھا۔ اب اعتراض کرنے والے بھلے مانس سے کون پوچھے کہ حضرت یہ حق آپ کو کس نے دیا ہے کہ آپ کی پسند کے گانے تمام سُننے والوں کو بھی پسند ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس خصوصی پروگرام میں رفیع کے گائے ہوئے جو گانے پیش کئے گئے اُن سے بہتر گانے اس قدر مخصوص وقت میں پیش کرنا مشکل تھا۔

موقر "فلمی ستارے" کا "رفیع نمبر" ہمارے سامنے ہے۔ معاصر نے دعویٰ فرمایا ہے کہ وہ اس خاص نمبر میں محمد رفیع کے بارے میں صحیح انکشافات کر رہے ہیں۔ مگر معاصر مذکور نے رفیع صاحب کے ساتھ عقیدت کے طوفان میں یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ رفیع کے بارے میں نہ صرف ایک واقعہ بالکل غلط شائع کر رہے ہیں بلکہ اس واقعہ سے رفیع کی توہین کی گئی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ مہاتما گاندھی کا قتل ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو ہوا۔ سُنو سُنو اے دنیا والو باپو کی امر کہانی کا گانا جناب راجندر کرشن نے ۱۹۴۸ء میں ہی لکھا اور یہ گانا اپنی شہرت کے لحاظ سے آج بھی اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ جتنی کہ ۱۹۴۸ء میں رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ گانا

رفیع کی شہرت کو بھی نصف النہار تک لے گیا۔

اب آپ فلمی ستارے کے رفیع نمبر کے صفحہ ۴۹ کالم ۲ کی یہ عبارت پڑھئے "جب ویش آزاد ہوا اور لال قلعہ پر جشن آزادی کا اہتمام ہوا جس میں نہرو بھی موجود تھے اپنی دلی خواہش (نہرو جی کو قریب سے دیکھنے اور ان کے سامنے گانے کی خواہش) کو انجام دینے کی حسرت لئے رفیع چند مشہور گلوکاروں کے ہمراہ اس پروگرام میں پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن انھیں گانے کا موقع دینے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ ظاہر ہے ایسا اس لئے ہوا کہ اس وقت رفیع کا کوئی خاص نام و مقام نہیں ہوا تھا لیکن رفیع نے ہمت نہیں ہاری اور ایک اعلیٰ افسر سے گذارش کی۔ افسر نے کہا اچھا گاؤ۔ مگر یاد رکھو تین منٹ سے ایک سیکنڈ بھی زیادہ مت گانا۔"

اس تحریر میں رفیع کی سہ گونہ توہین کی گئی ہے۔ پہلی یہ کہ وہ بن بلائے چند مشہور گلوکاروں کے ہمراہ اس پروگرام میں آنے میں کامیاب ہوئے۔ اور دوسری یہ کہ اس وقت رفیع کا نام و مقام کوئی خاص نہ تھا۔ حالانکہ اس وقت رفیع باپو کی امر کہانی گا کر صرف اپنا نام اور مقام ہی پیدا کر چکا تھا۔ بلکہ شہرت کی بلندی پر ایک ہی اڑان سے پہنچ چکا تھا۔ اور تیسری یہ کہ انھیں اس محفل میں کوئی گانے کا موقع دینے کو تیار نہ تھا اور انھیں افسر سے گانا سنانے کے لئے التجا کرنی پڑی۔

راقم الحروف پاکستان سے ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچا پھر یہیں بس گیا آپ ملک بھر کے کسی بھی اخبار میں یہ نہیں دکھا سکتے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء یا ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء کو لال قلعہ میں جشن آزادی منایا گیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اولین ری پبلک ڈے ۲۶ جنوری کو منایا گیا ہے۔ چنانچہ ۴، ۵، اور ۶ فروری کو لال قلعہ دہلی میں جمہوریت منایا گیا۔ ۱۵ اگست کو راشٹرپتی بھون میں راشٹرپتی کی طرف سے جشن آزادی کے سلسلے میں ہر سال ایٹ ہوم دیا جاتا ہے۔ اس جشن میں مرحوم محمد رفیع اور مکیش دونوں مدعو تھے۔ اس جشن کی روداد جو راقم الحروف نے لکھی اور اخبار ... کے شمارہ ۱۳ فروری میں شائع ہوئی کا وہ حصہ ملاحظہ فرمایئے جس میں جناب رفیع کا ذکر ہے۔

"اب ہندوستان کے مشہور پلے بیک سنگر "محمد رفیع" جنھوں نے باپو کی امر کہانی گائی ہے سٹیج پر تشریف لائے ہیں اور حاضرین ہیں کہ کرسیوں سے اٹھ اٹھ کر اس فلمی موسیقار کو دیکھ رہے ہیں۔ محمد رفیع کو بھی حاضرین کی خواہش پر مکیش کی طرح کرسی پر بٹھا کر گوایا جا رہا ہے۔

قدر پرستی کی آزادی کا آؤ سب تہوار مناؤ
نگر نگر اور ڈگر ڈگر لہراؤ ترنگا لہراؤ

گیت عجیب سماں پیدا کر رہا ہے۔ جس قدر چیرز اس گانے پر دیئے گئے ہیں شاید ہی کسی گانے پر دیئے گئے ہیں۔ گیت ختم ہونے پر جب رفیع جانے لگے تو حاضرین نے شور برپا کر دیا کہ ہم رفیع سے ایک گیت اور سنیں گے۔ منتظمین کو حاضرین کی خواہش کے سامنے جھکنا پڑا اور رفیع نے مدھری آواز میں یہ گیت۔

آزاد ہوا آج کے دن دیش ہمارا
اس واسطے ہے پندرہ اگست ہم کو پیارا

گا کر خوب داد حاصل کی۔"

رفیع نمبر میں اس سلسلے میں اور بھی کافی کچھ لکھا گیا ہے اس بارے میں صرف یہ کہنا ہے کہ وہ یہی موقع تھا کہ رفیع نے پہلی بار پنڈت نہرو کی موجودگی میں گایا اور اسی موقع پر نہرو نے انھیں گلے لگایا اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور جناب شنکر پرشاد صاحب آئی۔ سی۔ ایس جو اس وقت چیف کمشنر تھے۔ اس جشن کے جملہ انتظامات ان دونوں حضرات کے رہین منت تھے۔ ان حضرات سے تصدیق کی جا سکتی ہے کہ رفیع باقاعدہ دعوت سے اس جشن میں شریک ہوئے اور انھوں نے پہلی بار نہرو جی کے سامنے "ترنگا لہراؤ" گایا۔

اس شعر پر مشاعرے میں وہ تہلکہ مچا ہوا کہ کچھ نہ پوچھئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ سامعین پر خاص سحر جادو کر دیا گیا ہے۔ عجب حال تھا۔ جی چاہتا تھا دوڑ کر داغ صاحب کے گلے سے لپٹ جاؤں۔

پرنس: "پھر تم اس حرکتِ ناشائستہ کے مرتکب تو نہیں ہوئے؟"

پیارے: "نہیں صاحب! بھلا اس مجمع میں اس کا کیا موقع تھا۔"

غرض جب تمام شہر داغ صاحب کی شہرت سے گونج اُٹھا تو ایک موقع پاکر مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے سرکار مرحوم سے داغ صاحب کے کمالِ شاعری کی بڑی تعریف و توصیف کی۔ سرکار مرحوم نے مشتاق ہو کر داغ صاحب کو یاد فرمایا۔ کلام سنا اور بے حد خوش ہوئے بڑی تعریف فرمائی۔ اس دن سے داغ صاحب کبھی کبھی یاد کئے جانے لگے۔ جلسے میں شریک ہوتے۔ گھنٹوں سرکار کے سامنے حاضر رہتے لیکن ابھی تک نہ ملازمت ملی تھی نہ سرکار نے انھیں کچھ عطا فرمایا تھا۔ مگر ہم سب جانتے تھے کہ عنقریب اُن کا ستارۂ اقبال دکن کے اُفق پر چمکا ہی چاہتا ہے۔

باریابی و حاضری کو بھی ایک سال گزر گیا اور ہم میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ داغ صاحب کی پریشان حالی کے متعلق سرکار مرحوم سے کچھ عرض کر سکتے۔ ناگہاں سرکار مرحوم شیر کے شکار کو تشریف لے گئے۔ جنگل میں اُن کو داغ صاحب یاد آگئے۔ مہاراجہ بہادر کو حکم دیا کہ داغ کو فوراً حاضر کرو۔ آدمی گاڑی لے کر بھاگے اور دو گھنٹے کے اندر اندر داغ صاحب موکب ہمایونی میں شامل تھے۔

دوسری شام کو سرکار مرحوم ایک وسیع میدان میں کرسی پر رونق افروز تھے۔ اسٹاف کے تمام افراد دست بستہ دائیں اور بائیں کھڑے تھے۔ چابک سوار شاہی اصطبل کے گھوڑوں پر سوار شہ سواری کے کمالات دکھا رہے تھے۔ سرکار مرحوم بہ نگاہِ غور ایک ایک کے ہنر کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔ ایک سرکش گھوڑا اپنے چابک سوار کو بہت تنگ کر رہا تھا۔ چابک سوار اپنے فن میں ایسا ہی کامل تھا کہ میخ کی طرح اس کی پیٹھ پر جما بیٹھا تھا۔

یکایک سرکار مرحوم داغ صاحب کی طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا "کیوں داغ! تم بھی گھوڑے پہ کبھی بیٹھے ہو؟" انھوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ جوانی میں خانہ زاد کا یہی شغل رہا ہے۔ مگر اس کو مدتیں گزریں، زمانہ ہو گیا۔ ارشاد ہوا "اچھا آج ہمیں اپنی شہ سواری دکھاؤ۔" داغ صاحب نے عرض کیا "بہت خوب"۔ سرکار کے اشارے پر وہی بد لگام سرکش گھوڑا حاضر کیا گیا۔ بیچارے داغ صاحب اللہ کا نام لے کر سوار ہوئے۔ ادھر انھوں نے باگ ہاتھ میں لی۔ اُدھر سرکار کے اشارے پر چابک سوار نے گھوڑے کے چابک رسید کیا۔ چشم زدن میں داغ صاحب زمین پر قلابازیاں کھا رہے تھے اور گھوڑا تھا کہ آندھی کی طرح جنگل کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔

پہلے داغ صاحب اٹھائے گئے پھر سولہ چابک سوار اپنے اپنے گھوڑوں پر اس کے تعاقب میں جنگل کی طرف بھاگے۔ بارے داغ صاحب کو چوٹ نہ آئی تھی۔ گرد جھاڑ کر سرکار مرحوم کے سامنے حاضر ہوئے۔ سرکار کا ہنسی کے مارے بُرا حال تھا۔ جب خوب جی بھر کے ہنس چکے تو فرمایا۔ "تم بہت اچھے سوار ہو۔ میں تمہیں ان چابک سواروں کا افسر مقرر کروں گا۔" داغ صاحب آداب بجا لائے۔ پوچھا۔ "ہماری ریاست میں کتنے دن سے ہو؟" انھوں نے عرض کیا "دس سال سے۔" سرکار نے مہاراجہ بہادر کی طرف دیکھا۔ فرمایا۔

"مہراج۔" انھوں نے ہاتھ باندھ کر سر جھکایا۔ ارشاد ہوا۔ "ہم نے داغ کو ایک ہزار ماہانہ پر شاعرِ دربار مقرر کیا۔ ان کی دس برس کی تنخواہ ایک ہزار ماہانہ کے حساب سے ابھی ابھی ان کو دیدو۔" مہاراجہ بہادر "بہت خوب" کہہ کر پیچھے ہٹے اسی وقت ایک سوار خازن کے نام احکام لے کر شہر بھاگا۔ سرکار تو یہ حکم دیکر اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے۔ امرا نے بڑھ بڑھ کر داغ صاحب کو مبارکبادیں دیں۔

دوسرے دن بارہ بجے سارے شہر نے دیکھا کہ بہنڈیوں (چھکڑوں) پر داغ صاحب کی دس سال کی تنخواہ لدی ہوئی پولیس کے دستے کی حفاظت میں داغ صاحب کے گھر جا رہی ہے۔ عابد روڈ پر اب جس مکان میں حکیم چند وکیل رہتا ہے اسی گھر میں داغ صاحب کا قیام تھا۔ مکان کی صورت اب تبدیل ہو گئی ہے۔ مگر روپیہ اسی گھر میں آیا تھا اور داغ صاحب پھر عمر بھر اسی مکان میں رہے۔

سخاوت بھی کیا چیز ہے جس کے ذکر سے پرنس کی محفل

…ارا مناسب اور یہی درست ہے "۔ اتنے بلند مرتبے پر فائز ہونے کے بعد جو دکن کے جونیئر پرنس کا تھا، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ پرنس …یت مہذب اور بڑے ہی اعلیٰ ظرف تھے۔ میری طرف دیکھ کر ہنس دیئے۔ جواباً میں بھی ہنس دیا۔ جیسے وہ بات گئی گذری ہو گئی۔ مگر فانی نے چہل قدمی کے وقت مجھ سے علیحدہ کہا۔ "نجم کو کیا ہو گیا ہے کیا سمجھتے ہیں کہ پرنس بھی کسی سکول کے طالب علم ہیں کہ جب جس استاد کا دل چاہا جھڑک دیا۔ یہاں تو یہ کہنے کا محل تھا کہ فدوی نے ناچیز رائے ظاہر کر دی تھی۔ اب سرکار جو مناسب اور بہتر خیال فرمائیں"

میں نے کہا "جلیل صاحب اعلیٰ حضرت سلطانِ دکن کی غزلوں میں بھی یہاں کچھ ترمیم فرماتے ہیں۔ یہ لکھتے ہیں "سرکار کا شعر لاجواب ہے خانہ زاد کی ناقص رائے میں ایک صورت یہ بھی ہے۔ اب سرکار جسے پسند فرمائیں" فانی کہنے لگے "یہی لکھنا بھی چاہئے جب جلیل صاحب کی ساری عمر دربار میں بسر ہو گئی۔ ایک ہزار ماہانہ پاتے ہیں۔ اگر اعلیٰ حضرت آج ان کو جواب دے دیں تو کیا دوسری سرکار میں ان کو پانچ سو کی جگہ مل سکتی ہے۔ ہمارے شاہ عالیجاہ کی یہ بھی پرورش ہے جو ایک شاعر کو اتنی تنخواہ دیتے ہیں۔ ورنہ انصاف سے کہو کیا جلیل نہ ہو تو سلطنت کے نظم و نسق میں کوئی فرق آ جانے کا اندیشہ ہے "ایاز قدرِ خود بشناس" افسوس کہ نجم صاحب اس قولِ مشہور کو بھول رہے ہیں مجھے اس آغاز کا انجام بخیر نظر نہیں آتا" اس قسم کی باتیں فانی تنہائی میں مجھ سے اکثر کیا کرتے۔ اپنے گھر پر رات کی قدمی میں یا جب میرے پاس اقامت خانہ میں آ جاتے تو مجھ سے کہتے "خدارا نجم کو سمجھاؤ۔ وہ جس راہ پر چل رہے ہیں وہ نہایت خطرناک ہے" میں ہر مرتبہ ایک ہی جواب دیتا ضرورت ہے کہ میں یہ ذکر چھیڑ دوں اور نجم مجھ کو میری طرف سے بدگمانی ہو کہ صدق بھی میرے عروج اور مدحت بڑھتے ہوئے نہ دیکھ نہیں سکتے۔ اس لئے چپ رہنا ہی مصلحت ہے"

کچھ ہی عرصے کے بعد اسی طرح کا ایک اور واقعہ پیش آیا جس میں نجم کی رائے سے پرنس نے اختلاف فرمایا۔ نجم عادت اپنی بات پر اڑے رہے پرنس کے ایما پر وہ تصفیہ اس دریافت کے بعد کہ پرنس کیا چاہتے ہیں انھوں نے پرنس ہی کی بات کو ترجیح دی۔ اب خاص پر پرنس نے اس واقعہ کا اعادہ کیا۔ اور کہا "فانی استاد جلیل نے ہمارے موافق فیصلہ کیا ہے لیکن ہمارے استاد نجم صاحب اب بھی اپنی ہی بات پر اڑے ہوئے ہیں" نجم نے کہا "بیشک میں جو کہتا ہوں وہ صحیح ہے۔ جلیل کی بات کو آپ آیت و حدیث سمجھیں میں نہیں سمجھتا" ہر شخص چپ تھا کسی نے کچھ نہیں کہا۔ پرنس میری طرف متوجہ ہوئے۔ فرمایا "بیٹا صدری کی تعلیمات ہی جھگڑا ہے" میں نے دست بستہ ہو کر عرض کیا "بجا ارشاد ہوا"۔

اِس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں آئے دن پیش آنے لگیں میں اور فانی دونوں اپنی اپنی جگہ افسوس کرتے دبارہ خاموش ہوتے اور تنہائی میں بجائے پرنس سے کیا کیا کہتے ہوں گے۔

نجم اگر ذرا سی عقل معاملہ فہم سے کام لیتے تو بات بنی رہتی۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا مشہور شعر ہے۔

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پروین

پیا کو میں نے کسی بات سے اختلاف کرتے نہ دیکھا۔ اُن کی تائید کا تو یہ عالم تھا کہ اگر کسی وقت پرنس فرما دیتے کہ فانی اور صدق دونوں گردن زدنی ہیں۔ تو پیا بے تامل پکار اٹھتے "بہت صحیح ارشاد ہوا۔ صاحب فدوی کی رائے میں دونوں واجب القتل ہیں۔ اگر ارشاد عالی ہو تو خانہ زاد اپنے ہاتھ سے قتل کر دے" حالانکہ پیا مجھے اور فانی دونوں کو نہایت عزیز رکھتے تھے۔ مگر شاہزادے کی کسی بات سے اختلاف کرنا ان کو آتا ہی نہ تھا اور ایسے ہی لوگ بادشاہوں کے دربار میں پھلتے پھولتے ہیں۔

کسی دوسرے موقع پر ہماری جانیں بچانے کے لئے پیا ہی پرنس کے قدموں پہ سر رکھ کر التجا کرتے "سرکار غلاموں کا قصور بخش دیں ہم سب خاطی ہیں۔ خطا اور قصور ہماری سرشت میں ہے۔ اور سرکار کا کام خانہ زادوں کے قصور سے چشم پوشی کرنا ہے" یہ سب [illegible] مگر پیا ان کی تائید کرتے اور "بہت صحیح ارشاد" [illegible]

رہے۔ لیکن ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ درباری مسلسل ان کے کان بھرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک رات سرخوشی کے عالم میں پرنس نے ایک مہمان عزیز کے پاس کوئی پیغام پہنچانا چاہا۔ جن کا قیام کسی دوسرے کوٹھی میں تھا۔ شیام صاحب اس کوٹھی کے مہتم اور انچارج تھے۔

پرنس نے مصاحبوں سے پوچھا۔ کس کو بھیجوں۔" ایک منافق نے موقع پاکر صلاح دی: "سرکار! نجم صاحب نہایت موزوں ہوں گے۔ پرنس نے اپنی سادگی سے غور و فکر کے بغیر اے۔ ڈی۔ سی کو حکم دیا۔ "نجم صاحب سے کہو۔ ذرا تکلیف فرما کر دوسری کوٹھی تک چلے جائیں اور میرا یہ پیغام پہنچا کر اس کا جواب لے آئیں۔"

اس میں کلام نہیں کہ بات بہت بیجا تھی اور کوئی مرد شریف اس ننگ کو گوارا نہ کر سکتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے نجم صاحب بھی اس وقت اس عالم میں تھے جہاں آدمی کو فکر انجام نہیں ہوتی۔ انھوں نے نہایت درشتی سے جواب دیا۔ "پرنس سے کہہ دیجئے کہ یہ میرا کام نہیں ہے۔ میرا جو کام ہے وہ مجھ سے لیجئے۔ اس کام کے لئے شیام اور پتن نصیب موزوں ہیں۔"

اے۔ ڈی۔ سی واپس گئے۔ تھوڑی دیر میں پلٹ کر دوسرا حکم سنایا۔ "سرکار فرماتے ہیں۔ میں آج سے تم کو ایک سو پچیس ہی تنخواہ دوں گا اور یہ کام بھی لوں گا۔" نجم صاحب اب فرطِ غضب سے رہے سہے حواس بھی کھو بیٹھے۔ کانپنے لگے اور کہا: "ان سے کہہ دو کہ جب میں نے ڈھائی سو پر اس ذلیل کام سے انکار کیا تو تنخواہ پر کیا کروں گا۔" یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ادھر پرنس اپنے کمرے سے نکل آئے اور غصے سے دریافت فرمایا: "کیا آپ کو تعمیلِ حکم سے انکار ہے؟" نجم نے اسی سخت لہجے میں جواب دیا۔ "قطعی انکار ہے۔" یہ کہہ کر سر سے دستار اور کمر سے بکلوس کھول کر صوفے پر ڈال دیا۔ پھر کہنے لگے۔ "یہ رہی آپ کی ملازمت۔ میں اپنے گھر جاتا ہوں۔"

نجم درباریوں کی نگاہ میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ آج ان کے پیر۔ حیدر تھی۔ میں اور فانی اس خبر سے دل گرفتہ ہوتے۔ مگر تیر از کمان جستہ کا معاملہ تھا۔ ہم دونوں نجم کی شریفانہ جرأت پر دل میں خوش بھی تھے مگر سوال ان کے اہل و عیال کی

پرورش کا تھا۔ کہ اب بچوں اور متعلقین کا کیا ہوگا۔؟

ادھر درباریوں نے ہم لوگوں کی غیر حاضری میں پرنس کے کان یوں بھرنے شروع کر دیئے: "سرکار! نجم صاحب کی علیٰحدگی اچھی ہی ہوئی۔ وہ قدیم رنگ کے شاعر تھے۔ اور ماشاءاللہ سرکار جدید رنگ میں شعر فرماتے ہیں۔" مگر پرنس کئی ہفتے خاموش رہے۔ نہ ڈائننگ ہال میں ان کا ذکر ہوا۔ نہ دربار میں معلوم ہوتا تھا نجم صاحب کو دربار سے کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

کئی مہینے بعد خاصے پر پرنس نے اس طرح ابتدا کی۔ "پیارے جس طرح صدق اور فانی کی شاعری کا تعلق دل سے ہے۔ ہمارے استاد حضرت نجم کی شاعری کا تعلق محض دماغ سے تھا۔" پیارے اپنے مشتق فقرے کا اعادہ کیا: "بہت صحیح ارشاد ہوا۔ صاحب فدوی کا بھی یہی خیال ہے۔ ان کی شاعری محض دماغی کاوش کا نتیجہ ہوتی تھی۔ اس کا دل سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔"

پرنس:۔ "مگر ان کی استادی مسلّم ہے ان کے استاد ہونے میں کوئی شک نہیں۔"

پیارے:۔ (دست بستہ ہو کر) "بیشک ان کی استادی میں کیا شک ہے۔ اس کے علاوہ ذی علم بھی ہیں۔ صاحب! فدوی کو ۔۔۔ دو ایک بار ان سے بات چیت کا موقع ملا ہے۔ صاحب استعداد ہیں پھر چار برس سرکار کی صحبت میں رہے۔ رنگ ادب بھی چوکھا ہو گیا۔"

(باقی آئندہ)

بقیہ:۔ علامہ چرِیا کوٹی مرحوم ۔۔۔۔۔

۵۔ راس الافاضل نواب عماد الملک بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ حیدرآباد۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بلند مضامین، بہترین زبان استقام سے پاک۔ اندو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ یہ کون صاحب ہیں اب معلوم ہوا کہ آپ کی تجلیاں ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ یہ اعلیٰ مضامین علیحدہ کتابی صورت میں شائع کئے جائیں اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپ کر برباد نہ کئے جائیں۔

اور اب

8%

15 سالہ پبلک پراویڈنٹ فنڈ سکیم سے آپ 81-1980ء کے دوران 8 فیصد سالانہ سود مرکب کما سکیں گے۔

اس لاثانی سکیم کی جو کہ خود روزگار لوگوں کے لئے اور ملازمت پیشہ افراد کے لئے بھی ایک مثالی سکیم ہے۔ درج ذیل خصوصیات ہیں:۔

- ایک صد روپے سے 30,000 روپے تک رقم لگا سکتے ہیں۔
- سود پر انکم ٹیکس نہیں لگتا۔
- لگائی گئی رقم پر دولت ٹیکس نہیں لگتا۔
- جمع شدہ رقوم زندگی بیمہ، کیومیلیٹو ٹائم ڈیپازٹ وغیرہ میں جمع کرائی گئی رقوم کے ساتھ چھوٹ کی مستحق ہیں۔
- اس میں جمع کل رقم کی عدالتی ڈگری کے ذریعے قرقی نہیں ہو سکتی۔

آج ہی کسی بڑے ڈاک گھر یا سٹیٹ بنک آف انڈیا

اور اس کے ذیلی بنکوں کے کسی بھی دفتر میں اپنا کھاتہ کھولیے۔

قومی بچت ادارہ

(بھارت سرکار)

پوسٹ بکس نمبر 96 - ناگپور - 440001

2avp 80/224

علامہ کے ہندی کلام کے منتخب اشعار:۔

نیا لگا دے پار مدینے والے — آن پھنسی منجدھار مدینے والے
رین اندھیری کھیوٹ ہیرا سا — آن پھنسی منجدھار مدینے والے
کشٹن کلیش میں ناؤ ہمارا — جگ کا پالن ہار مدینے والے
اپنی بپتائیں کاسے کہوں اب — تم ہی پران ادھار مدینے والے
کیفی کی نت آس تمہیں سے — مایا ہے سنسار مدینے والے

بدریا گھیر گھمنڈ جل برسے — جیرا اُن بن ترسے نا
اُن پیا رے بن کاری بدریا — نینن برسے نا
ایسے سمے او چک پیا کیفی — نکسے گھر سے نا

جن جاؤ پردیس جو تیا — جن جاؤ پردیس جو تیا
نیر نین میں ڈوب مرونگی — مورے سہاگ کی لاج رکھیا
کیفی کو نت آس تمہاری — ہم پاپن تم کنور کنہیا

پیارے چھیلا سے پیت لگا نا پڑا — پاچھے پھر پچھتا نا پڑا
پاپی جیا اب مانت ناہی — دھیرج دے سمجھا نا پڑا
بہت دنا پر آئے ہر کیفی — نینن سیج سجا نا پڑا

کئی نت رین مو ہے مارے گن گن — موری چھاتی پر سو تیا ہے ناگن
جو نہ گی برہ میں اب میں برہ گن

کنھیا پیارے آدین بجاوت بینا — آس من کیفی پیارے بت ہیں
جیسی مندری میں نگینا — کنھیا پیارے آدین بجاوت بینا

اپنے دُکھ میں آپ جرے ہم دکھ نا بوجھے کوئی
داہی دردی اور نر موہی اور بیدا بیری ہوئے
جنم کی تھاکھی ہنس ہنس چھینا — درب بنا اس اہ دیس کو کینا

ہر کی مرلی گھر گھر باجے من سُن بیاکل ہوئے
ہر میں گھر اور گھر میں ہر ہے آنکھ نہ دیکھے کوئے

اُن کی گائی گیت سناؤ — من میں دیپک نیہہ جراؤ
تم روٹھے تو بات تہاری — ہم سے روٹھی بھاگ ہماری۔

گھونگھٹ کھول درس دکھا دو لاج تہارو ہاتھ
رین اندھیری بجھے تپت لاگے سنگت نہ کوئی ساتھ

اُن بچھڑے ہم سے ملے کہ پلٹی ہمری بھاگ
اپنے رنگ میں چندر بدری یا ہی بھاگ سُہاگ

ہر اُپدیش میں نیہہ کہانی ۔ ہردے میں بل جور جوانی

نیہہ انل سر پر جرائیو ۔ اُسکو پائیو ہم دُکھ پائیو

علامہ کیفی چریا کوٹی مشاہیر کی نظر میں:۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہندو پاکستان کے مُلک گیر بلکہ عالمی شہرت رکھنے والے صفِ اوّل کے پچاس شعراء، ادباء، عُلماء، زعماء، دانشور، ماہرینِ علم و فن اور اہلِ علم حضرات نے اپنے مکتوبات میں وقتاً فوقتاً علامہ کیفی چریا کوٹی کے تبحرِ علمی اور عظمت کا اعتراف صاف الفاظ میں کیا ہے اور جو علامہ کے ادبی سرمائے کے ساتھ محفوظ کر لئے گئے ہیں۔ ان مذکورہ بالا مکاتیب کے اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

۱۔ مولانا شبلی نعمانی مرحوم علامہ کو تاریخی نظموں کے سلسلے میں لکھتے ہیں

”تاریخی نظموں کا سلسلہ خوب ہے آپنے یہ چیز مجھ سے چھین لی حضرت اُستاد کا رنگ نمایاں ہے ابتدا کی ہے تو اس کی انتہا بھی کیجئے۔“

۲۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ:۔

”رسالہ سبحان ملا جیسے آپ کے آباء فضل و کمال میں ممتاز تھے الحمدللہ آپ بھی ویسے ہی ہیں اس کے مضامین سبق آموز ہیں۔“

۳۔ قبلہ و کعبہ مولانا ناصر حسین لکھتے ہیں۔

”محرم کی رباعیات لاجواب ہیں آپنے دادِ تحقیق دی ہے۔“

۴۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم:۔

”آپ میرے اُستاد تو نہیں ہیں آپ نے خوب کیا کہ رسالہ العلم کے ذریعہ علوم کو زندہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔“

(باقی صفحہ پر)

مُشاعرہ مُسلم سوشل ایسوسی ایشن بانسواڑہ

بسمل نقشبندی رتلامی

بانسواڑہ مدھیہ پردیش اور گجرات کی سرحد پر راجستھان کا ایک چھوٹا سا مگر خوبصورت شہر ہے چاروں طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا حصار شہر پناہ کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ پہاڑیوں کے دامن میں چھوٹے چھوٹے تالاب ہیں اور ان ہی پہاڑیوں کا جگر چیرتی ہوئی ماہی ندی بھی اِدھر سے گذرتی ہے اسی ندی پر راجستھان سرکار ایک بہت بڑا باندھ بنا رہی ہے۔ بانسواڑہ کی خوبصورتی کو اور دلفریب و دلکش بنانے میں اسی زیر تعمیر باندھ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

گجرات اور مدھیہ پردیش کی قربت سے یہاں کی زبان پر بھی گجراتی اور مالوی کا کافی اثر پایا جاتا ہے۔ راجستھانی مالوی اور گجراتی تینوں زبانیں مل کر ایک چوتھی زبان وجود میں آکر یہاں کے لوگوں کی ثانوی زبان بن چکی ہے۔ جسے "واگڑی" بھاشا کہتے ہیں۔

گزشتہ چھ سات سال سے یہاں کے اُردو دانشوروں اور باشعور و خوش ذوق لوگوں نے اُردو کی طرف خصوصی توجہ دینی شروع کی جس کے نتیجے میں آج یہاں پچاس فیصدی عوام اُردو داں ہیں اور بانسواڑہ کی قدیم لسانی قدروں پر اب نکھار آگیا ہے۔ جس کی زندہ مثال مُسلم سوشل ایسوسی ایشن کی جانب سے اس عظیم الشان مشاعرہ کا انعقاد ہے۔ آئیے اب ذرا مشاعرہ گاہ کی طرف چلیں۔ آج ۲ اکتوبر ۱۹۷۸ء کی رات کے دس بجا چاہتے ہیں محلہ پرتوی گنج کے طویل و عریض چوراہے پر ایک شاندار سٹیج بنایا گیا ہے اسٹیج پر اور راستوں پر دُور دُور تک روشنی کا خاصہ اہتمام کیا گیا ہے فرش کا بھی معقول انتظام ہے۔ شعری ذوق رکھنے والے حضرات جوق در جوق آرہے ہیں اور فرش پر کافی دُور تک سامعین کی قطاریں نظر آرہی ہیں ماحول بہت ہی مضطرب اور سیماب صفت بنا ہوا ہے۔ اسٹیج پر میزبان اور مہمان شعراء تشریف لا چکے ہیں۔ ایسوسی ایشن کے سکریٹری جناب عبدالغفور صاحب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں مہمان شعراء کا تعارف کراؤں۔ تعارف کے ساتھ ساتھ شعراء حضرات کی گلپوشی ایسوسی ایشن کی جانب سے جناب عبدالمجید صاحب بابرنے

کی رسم گلپوشی کے بعد صدارت کے لئے بوہرہ سماج کے "جناب داؤد علی صاحب" کا اسم گرامی پیش کیا گیا جس کی تائید جناب ماسٹر ہدایت اللہ صاحب نے فرمائی پھر اناؤنسر کے لئے مہمان شاعر و فلمی گیت کار جناب فیض کا نام پیش کیا گیا۔ جناب فیض نے مائک سنبھال لیا۔ ایسوسی ایشن کے اس مشاعرے کی افتتاحیہ رسم یعنی تلاوتِ کلام پاک کے لئے جناب خاور مانی کو زحمت دی۔ خاور صاحب اچھی شیریں آواز میں کلام ربانی کا ایک رکوع پڑھ کر واپس ہو رہے ہیں اور اب مشاعرے کا پہلا دور شروع ہوا۔ جس کو سامعین نے بہت ہی ادب احترام اور سکون سے سُنا۔

اس وقت گھڑی میں پونے بارہ بجا چاہتے ہیں پہلا دور ختم ہو چکا ہے۔ صاحب صدر خطبہ صدارت میں فرما رہے ہیں حاضرہ کے تحت ہمیں آپس میں اتحاد و اتفاق اور امن کی ضرورت ہے نیز صالح اعمال کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ دینی ہے۔ صاحب صدر تشریف لے جا چکے ہیں اور اب مشاعرے کا دوسرا دور کے لئے پروفیسر شاہد میر مسند صدارت پر تشریف فرما ہیں۔ تقریباً ڈھائی تین ہزار شائقین شعر و ادب اپنے پسندیدہ شعراء سے ان کا منتخب کلام سُننے کے لئے بیقرار دکھائی دے رہے ہیں۔ جناب فیض نے اس انتشاری کیفیت کو دُور کرتے ہوئے حسن فتحپوری کو زحمتِ غزل سرائی دی ہے۔ سُنئے حسن صاحب تحت میں فرما رہے ہیں ؎

ہندو و مسلم کے جھگڑے میں کل جب گھر گھر پھونک
اُس کی اونچی الماری پہ گیتا اور قرآن
ایک آواز آئی ہے۔ حسن صاحب ترنم سے سُنائیے۔
اور حسن صاحب نے ترنم میں سنانا شروع کیا ہے غزل

جانے کیا بات نکل آئی ہے دیوانوں میں
لوگ سنجیدہ ہوئے جاتے ہیں میخانوں میں

ہاں مری عقل پہ پتھر ہی پڑے ہیں شاید
میں خدا ڈھونڈنے نکلا ہوں صنم خانوں میں

پھر داد پاتے ہوئے حسن صاحب غزل ختم کرکے مائک سے ہٹتے ہیں تو ایک غزل اور ایک غزل اور کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں لیجئے حسن صاحب دوسری غزل اسی دلنواز ترنم سے سنا رہے ہیں دو شعر آپ بھی سن لیجئے ؎

خوشی کے بعد جو غم آئے گا تو دکھ دے گا
خوشی نہ دے مجھے بندہ نواز رہنے دے
وہ جس میں خوف تو شامل ہو پر خلوص نہ ہو
خدا کے واسطے ایسی نماز رہنے دے

حسن صاحب کو غالباً علم نہیں کہ "پر" بمعنی "لیکن" متروک ہے۔ لیجئے اب اناؤنسر صاحب خود اپنا کلام پیش کر رہے ہیں۔ ان کے دو اشعار ملاحظہ فرمایئے۔ فرماتے ہیں ؎

کسی کی موت پہ کرتا ہے یہ جہاں سے ماتم
یہاں تو جیتے جی ماتم ہے کیا کیا جائے
شمار ہوتا فرشتوں میں فیض انساں کا
گناہ فطرتِ آدم ہے کیا کیا جائے

فیض صاحب بھی داد پاتے اور شکریہ ادا کرتے ہوئے جناب رہبر وتنامی کو دعوتِ کلام دے رہے ہیں۔ رہبر صاحب غزل عطا فرما رہے ہیں۔ دو شعر آپ بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

رہِ حیات میں جس وقت غم سے گھبرایا
تو دفعتاً مرے لب پہ تمہارا نام آیا
یہ اور بات ہے اب تم ہمیں نہ پہچانو
تمہاری زلفِ پریشاں کو ہم نے سلجھایا

رہبر صاحب کو کافی داد ملی ہے اور وہ غزل ختم کرکے خوش خوش واپس ہو رہے ہیں کہ اب اناؤنسر نے ایک اور نوجوان شاعر جناب شرر رتلامی کو کلام سنانے کی دعوت دی ہے۔ شرر صاحب تبسم بکھیرتے ہوئے مائک پر آکر یوں گویا ہوئے۔

افسانے زندگانی کے اشکوں میں ڈھل گئے
آنسو جہاں گرے وہیں پتھر پگھل گئے
منزل کی جستجو میں ہر اک راہبر کے ساتھ
دو ہی قدم چلے تھے کہ رستے بدل گئے

شرر صاحب کامیاب و کامراں اپنی جگہ تشریف لے آئے ہیں اور اب اناؤنسر نے رشید امرکانی اوجینی کو دعوتِ سخن دی ہے۔ رشید صاحب غزل سنا رہے ہیں۔ چند اشعار آپ بھی سنئے ؎

شام ہوتے ہی گھروں میں بند ہو جاتے ہیں لوگ
کیسے نیند آتی ہے اُن کو کیسے سو جاتے ہیں لوگ
جی رہا ہوں اُن کی خاطر کاغذوں کی زندگی
جو کتابیں سر کے نیچے رکھ کے سو جاتے ہیں لوگ
راکھ کے اِک ڈھیر میں تبدیل ہو جاتا ہوں میں
مجھ میں جب جلتی ہوئی آنکھیں چبھو جاتے ہیں لوگ

داد کی بوچھار میں رشید صاحب فاخرانہ انداز میں مائک سے جدا ہوئے تو اناؤنسر اعلان کر رہے ہیں کہ اب میں جس شاعر کو زحمتِ سخن دے رہا ہوں وہ سرزمینِ بانسواڑہ ہی کے ایک اُبھرتے ہوئے شاعر ہیں۔ میری مراد ہے جناب محمد ایوب صاحب محشر مجددی سے۔ محشر مجددی مائک پر تشریف لاکر سامعین سے مخاطب ہیں ایک مطلع اور دو اشعار آپ بھی سن لیجئے ؎

تم نے چاہت بھری نظروں سے جو دیکھا مجھکو
اجنبی لگنے لگا خود مرا سایا مجھکو
جذبۂ عشق کا اندازِ کرم تو دیکھو
ایک سنسان سی بستی میں بسایا مجھکو
جب عزیزوں کی محبت پہ نظر جاتی ہے
یاد آتا ہے رقیبوں کا دلاسا مجھکو

اہلِ بانسواڑہ کے ساتھ اسٹیج پر بیٹھے سبھی شعراء حضرات نے محشر صاحب کو خوب نوازا۔ محشر صاحب غازہ کامرانی چہرے پر ملتے ہوئے خوش و خرم واپس ہو رہے ہیں اور اناؤنسر جناب خلجی کولوٹی کو پکارا ہے۔ خلجی صاحب ماہی ڈیم پر انجنیئر کی پوسٹ پر فائز ہیں اور بہت اچھا کہتے ہیں۔ مائک پر تشریف لاچکے ہیں اور اپنے مخصوص انداز میں غزل سرا ہیں۔ آپ بھی لطف اٹھایئے ارشاد ہوا ہے ؎

ماضی بہ شکلِ غار نہ بھر ذہن میں چھپے
یادوں کی سبز شاخ سنبھل کر جھنجھوڑیے

خلّی ہمارے عشق کی معراج ہے یہی
بنکر لہو کسی کی رگِ جاں میں دوڑیئے

خلّی صاحب اس کامیاب غزل پر بھرپور داد وصول فرماکر اپنی جگہ واپس ہو رہے ہیں اور اناؤنسر نے قمر تلامی کو زحمت سخن دی ہے۔ قمر صاحب مائیک پر آکر بڑے پُر سکون انداز میں غزل ارشاد فرما رہے ہیں آپ بھی ایک مطلع اور ایک شعر سن لیجئے ؎

راہزن ہے نہ کبھی راہنما لگتی ہے
زندگی مجھکو مری لغزشِ پا لگتی ہے
مجھکو جینے نہیں دیگی ترے ماتھے کی شکن
تو ہوا جب سے خفا زیست خفا لگتی ہے

قمر صاحب بھی داد کے شور میں مسکراتے ہوئے تشریف لے جا رہے ہیں اور اب پکارا گیا ہے جناب عرشی انصاری تلامی کو سامعین میں سے ایک آواز آئی کہ ترنم وا سے چھائے ہوئے ہیں اور اس پر مہر صداقت عرشی صاحب یوں لگا رہے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے ؎

یہ زیست اک دریدہ سی چادر دکھائی دے
پاؤں اِدھر چھپاؤ اُدھر سر دکھائی دے

مطلع مطلع انوار ہے۔ داد کا ریکارڈ توڑ گیا ہے۔ عرشی فرما رہے ہیں ؎

اک تیری آرزو کو ترے غم کو بھول کر
جس کو خدا بناؤں وہ پتھر دکھائی دے

عرشی صاحب کی غزل کے سبھی اشعار نے خوب خوب داد پائی ہے۔ عرشی صاحب فاتحِ مشاعرہ کی طرح اپنی جگہ پر آ رہے ہیں اور اب اناؤنسر نے ایک بزرگ شاعر جناب محبّ گلشن آبادی کو دعوتِ سخن دی ہے۔ محبّ صاحب ادائے بے نیازی سے اُٹھ کر مائک پر تشریف لائے ہیں اور اپنے مخصوص ترنم میں غزل سنا رہے ہیں کچھ اشعار آپ بھی سن لیجئے ؎

جواب دے کہ نہ دے اب یہ تیری مرضی ہے
مگر پکارنے والے تجھے پکار چلے
بساطِ عشق پہ رکھی دونا کی ہم نے لاج
جہاں سے جیتی تھی بازی وہیں سے ہار چلے
جنوں کے فیض سے صحرا میں جام چھلکیں گے
کہ آج آبلہ پا سوئے خارزار چلے

ہر ایک شعر پر مناسب داد پاکر محبّ صاحب مائیک سے جدا ہوئے تو اناؤنسر نے ماہر تلامی کو پکار لیا ہے ماہر صاحب ارشاد فرما رہے ہیں ؎

مسلسل خموشی کا مطلب بتا دو
خطا میں نے کی ہے تو بیشک سزا دو
جو تھی مجھ سے نفرت مرا گھر جلاتے
یہ کس نے کہا تھا کہ بستی جلا دو

دوسرا شعر حالاتِ حاضرہ کی جیتی جاگتی تصویر ہے لہٰذا سامعین نے جی بھر کر داد دی ہے اور ماہر صاحب بھی داد میں نہائے اپنی جگہ پر آگئے ہیں۔ اناؤنسر صاحب فرما رہے ہیں: یہ میخانہ ہے جامِ جم نہیں ہے۔ یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے، لیجئے اب طنز و مزاح کے شاعر جناب بیکل گیاوی سے ان کا کلام سنئے۔ بیکل صاحب صوفیانہ لباس زیب تن فرمائے ہوئے ہیں اور بیضوی چہرے پر ریشِ مبارک بہت ہی بھلی معلوم ہو رہی ہے۔ چند قطعات سناکر ایک غزل سنا رہے ہیں۔ لیجئے آپ بھی محظوظ ہوتے چلئے ؎

اگر تم مسکرا کر دیکھ لیتے پیار سے مجھکو
تو پوزیشن بدل کر لیفٹ سے دل رائٹ ہو جاتا
نگاہِ شوق میں مجنوں کے خامی تھی کوئی ورنہ
اگر وہ دیکھتا تو حسنِ لیلیٰ وائٹ ہو جاتا
اگر اک بار پی لیتا وہ ساقی کی نگاہوں سے
دماغِ ناصحا کا اسکرو بھی ٹائٹ ہو جاتا
بہت اچھا ہوا بیکل کہ تم اب تک کنوارے ہو
وگرنہ اور بھی گلا یہ تمہارا اٹائٹ ہو جاتا

محفلِ مشاعرہ میں ہر طرف قہقہوں کا طوفان اُمنڈ پڑا ہے بیکل صاحب مائک سے ہٹنا چاہتے ہیں مگر ایک اور ایک اور کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ مجبوراً بیکل صاحب دوسری غزل ارشاد فرما رہے ہیں۔ ایک مطلع اور ایک شعر دوسری غزل کا بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

بیکل ہے اگر نام تو بیکل ہی رہیں گے
شادی نہ کریں گے کبھی سنگل ہی رہیں گے
جب لعبارے کا اُلو ہمیں کہتی ہے یہ دنیا
تو ہم بھی ہمیشہ یہ وفشتل ہی رہیں گے

بیکل صاحب اپنی جگہ بیٹھ گئے تو اناؤنسر نے جناب عبدالحکیم شاہد کو دعوتِ نغمہ سرائی دی ہے۔ شاہد صاحب خوشنما انداز میں ایک قطعہ ارشاد فرمارہے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

ہو سکے تو پناہ دیجئے ہمیں آج کے شاہکار ہیں ہم لوگ

چادرِ گل چڑھا دیجئے ہم پر چلتے پھرتے مزار ہیں ہم لوگ

شاہد صاحب نے ماحول پر بہت جلد قابو پالیا ہے سامعین سنجیدہ ہوگئے ہیں اور اب شاہد صاحب غزل کا مطلع پیش کررہے ہیں۔

بستیاں چھوڑ کے جب شہر میں بس جاؤگے

دیکھنا ایک دن جینے کو ترس جاؤگے

خوب داد پاتے ہوئے شاہد صاحب فرمارہے ہیں ؎

میں اُس وقت کہوں گا تمہیں ابرِ باراں

جب تمناؤں کے صحرا میں برس جاؤگے

دُور ہی رہنا مرے پاس نہ آنا لوگو

میں شبِ ہجر کا سورج ہوں جھلس جاؤگے

اس مرصّع غزل پر خاصی داد پاکر شاہد صاحب مائیک سے جُدا ہوئے تو اناؤنسر نے کاوش قادری کو آواز دی ہے۔ کاوش صاحب کا مطلع آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

اُٹھو کہ دہر میں وفا کو جہاں میں عام کریں

جو کام کر نہیں پایا کوئی وہ کام کریں

وہ آرہے ہیں تو کچھ ایسا اہتمام کریں

کہ شمس و قمر کو چراغِ شام کریں

کاوش صاحب مائک سے الگ ہوئے تو فیض صاحب کہہ رہے ہیں کہ اب جگر تھام کے بیٹھو مری باری آئی۔ یعنی اب دعوتِ سخن دی جارہی ہے جناب انجم جمیل پوری کو انجم صاحب بانسواڑہ پہلی بار تشریف لائے ہیں۔ سامعین کو انھیں سننے کا بڑا اشتیاق ہے۔ مگر انجم صاحب کی طبیعت ناساز ہے۔ آپ آہستہ آہستہ چل کر مائک تک تشریف لائے ہیں۔ کچھ غزلوں کے منتخب اشعار سنانے کے بعد ترنم سے ایک غزل[1] ارشاد فرمارہے ہیں۔ ایک مطلع اور تین اشعار آپ بھی سن کر لطف لیجئے!

یُوں خوابِ پریشاں کی تعبیر بنالیں گے

جو زلف کبھی بکھرے گی زنجیر بنالیں گے

ہاتھوں کی لکیریں تو ہاتھوں میں مقید ہیں

جب چاہیں گے ہاتھوں سے تقدیر بنالیں گے

ہم لفظوں کے خالق ہیں ہم رنگوں کے خالق ہیں

گویا تجھ سے بھی حسین تیری تصویر بنالیں گے

جو غم بھی ملیں تیری نسبت سے عطا ہوگا

اُس غم کو محبت کی جاگیر بنالیں گے

تحسین و ستائش کی صداؤں سے فضا گونج رہی ہے اور یوں محسوس ہورہا ہے کہ مشاعرہ کامیابی کی معراج حاصل کرچکا ہے۔ اسی کیف آور ماحول میں انجم صاحب سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مائک سے الگ ہورہے ہیں۔ اور اب اناؤنسر نے جناب خاور رواتی کو زحمتِ سخن دی ہے۔

خاور صاحب پوری آب و تاب کے ساتھ مائک پر تشریف لائے اور ایک قطعہ ارشاد فرمایا ہے۔ جس پر داد کا شور بلند ہوا یہ قطعہ آپ بھی سُنئے ؎

زندگی موت کا آزار لئے پھرتی ہے

سانس کی تیزی رفتار لئے پھرتی ہے

اہلِ دانش مجھے اتنا تو بتائیں خاور

روح کیوں جسم کی بیگار لئے پھرتی ہے

قطعہ کے بعد خاور صاحب غزل سنارہے ہیں۔ چند اشعار سُن لیجئے ؎

صنم پرستم کررہے ہیں مسلسل — نگاہیں بچاکر شریفانہ چہرہ

ذرا دیکھو تعبیر اے روحِ بابو — یہی خواب تھے کیا سنہرے سنہرے

یہ آئین وہ آئینہ بن گیا ہے — کہ جس میں نظر آئیں مخصوص چہرے

خاور صاحب اپنی کامیاب غزل پر مناسب داد پاکر اپنی جگہ پر ہیں۔ اور اناؤنسر نے اس ناچیز کو پکارا ہے۔ لیجئے ایک مطلع اشعار پیشِ خدمت ہیں ؎

فریب کاروں کی نگری سے دُور کیسے رہوں

قصور واروں میں بے قصور کیسے رہوں

لگے جو چل تو ہر اک شاخ بار ور نے کہا

چمن میں لے کے سرِ پُر غرور کیسے رہوں

ہنوز یاد ہے انجامِ حضرتِ موسیٰ

[1] اگر ناسازیِ طبع پر کلام سنانے کا یہ حال ہے تو عالمِ صحت مندانہ حال میں کیا غضب ڈھاتے ہوں گے۔ (ایڈیٹر)

اُمید دار ہے سر کو جو طور کیسے رہوں
میں خود سے دُور تو رہ لوں گا تا حیات مگر
وہ میرا سایا ہے سائے سے دُور کیسے رہوں

میرے بعد جناب صدر مشاعرہ جناب پروفیسر شاہد میر سرونجی سے کلام سنانے کی درخواست کی گئی ہے۔ شاہد صاحب دنیائے شعر و سخن میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ فنِ شعر گوئی انہیں وراثت میں ملا ہے۔ جتنا اچھا کہتے ہیں۔ اتنے ہی اچھے انداز سے پڑھتے ہیں۔ دو تین آزاد نظموں کے بعد اب غزل ترنم میں ارشاد فرما رہے ہیں۔ ایک مطلع اور تین شعر آپ بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

ملتا ہے تو اب کوئی شکایت نہیں کرتا
شاید کہ وہ پہلی سی محبت نہیں کرتا
بچوں کی طرح ناز اٹھاتا ہے ہمہ وقت
شاعر کبھی لفظوں پہ حکومت نہیں کرتا
آتے ہیں مرے گھر میں چراغوں کو لئے لوگ
یوں تو کوئی اندازۂ ظلمت نہیں کرتا
عرفان جسے دھوپ میں تپ تپ کے ملا ہو
اشجار کے سائے میں عبادت نہیں کرتا

داد پھر اپنے نقطۂ عروج پہ ہے ہر اک شعر کو بار بار پڑھوایا جا رہا ہے۔ شاہد صاحب دامک جھولیاں بھرے مائیک سے جدا ہو رہے ہیں۔

اس وقت گھڑی کی سوئیاں پونے چار بجا کر آگے بڑھ رہی ہیں اور فیض صاحب اس کامیاب ترین مشاعرے پر انہیں [illegible] آرائین کے ساتھ تمام اہلِ بانسواڑہ کو مبارکباد دے رہے ہیں اور جملہ شعرائے کرام کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مشاعرے کے اختتام کا اعلان کر رہے ہیں۔

یہ قصۂ حیات ابھی ناتمام ہے
جو کچھ بیاں ہوا ہے وہ آغاز بھی نہ تھا

(ڈاکٹر آدے سرن ارمان بلاری)

پیف

میں اپنی آنکھوں کی جانچ کرانے کے لئے ڈاکٹر بیدی کے منگر جی کے کلینک پہنچا تو اس کے کھلنے میں قریباً ایک گھنٹہ تھا۔ میں باہر ہی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ جلدی اس لئے چلا گیا تھا کہ جنرل سیکرٹری کلکتہ میں ملازم ہوں پہلے نمبر لگ جاتا تو ڈیوٹی پر جلدی چلا جاتا۔ اسی وقت ایک اندھا دس گیارہ سال کے لڑکے کے کندھے پر ہاتھ رکھے ہوئے رکشے سے آیا کلینک کے سامنے اُترا۔ رکشے والے نے پوچھا۔

"بابا جلدی واپس چلو گے تو رکوں "

"تم جاؤ۔ کیا پتہ ڈاکٹر کتنی دیر میں آئے اور مجھے کتنی دیر میں چھٹی دے" اندھے نے جواب دیا اور میرے پاس ہی بنچ پر بیٹھ گیا لڑکا سامنے کھڑا رہا میں نے لڑکے کی صورت میں اور اس اندھے کی صورت میں بہت سی علامتیں ملتی جلتی دیکھیں وہ دونوں باپ بیٹے لگ رہے تھے میں نے اندھے سے پوچھا۔ "بابا یہ لڑکا آپ کا کون ہے "

" پوتا ہے "

" کتنے بیٹے بیٹیاں ہیں آپ کے ؟ "

" دو بیٹے ہیں بچے اور دو بچے اور ایک لڑکی تھی رونا" اندھا اتنا کہہ کر رونے لگا۔ میں نے سمجھا کہ لڑکی بہت ہونہار حسین ہو گی اور چل بسی اس لئے اس کا دل بھر آیا ہے میں نے اس کا موڈ بدلنے کے خیال سے دوسرا سوال کیا "بابا! کیا تمہیں بالکل دکھائی نہیں دیتا ؟" یہ سُن کر پہلے تو وہ میری بات پر ہنسا جیسے میرا سوال احمقانہ تھا۔ میں نے ایسا محسوس کرتے ہوئے من ہی من میں سوچا کہ میرے اس سوال میں کوئی نہ کوئی خامی ضرور ہے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولا۔

" بیٹا اگر میں اندھا ہوتا تو یہاں علاج کرانے کیوں آتا"

" یہ سنتے ہی میں اس کے ہنسنے کا کارن سمجھ گیا اور اپنی جھینپ مٹاتے ہوئے اُسی کی بات بڑی کر دی" ٹھیک کہتے ہو بابا۔ تمہیں کتنا دکھائی دیتا ہے" ایک گھنٹے کا وقت تو بتانا تھا ہی یوں ہی گپ شپ سہی۔

" وہ بولا بیٹا ایک آنکھ میں موتیا بند کا پانی آ چکا ہے اور بالکل دکھائی نہیں دیتا ہے دوسری کچھ ٹھیک تھی سو اس میں بھی پانی آنا شروع ہو گیا۔ اب کام چلانے لائق ہی دکھائی دیتا ہے دیکھو وہ لنگڑا آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اس کے کپڑے سفید ہیں۔ ایک پیر میں جوتا ہے۔ دوسری ٹانگ گھٹنے تک کٹی ہوئی ہے ایک بغل میں بیساکھی لگی ہوئی ہے دوسری میں جھولا لٹک رہا ہے۔ چہرہ صاف صاف دکھائی نہیں دے رہا ہے" اتنا کہہ کر اندھا چپ ہو گیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لنگڑے کو دیکھتا رہا اب لنگڑا ہمارے پاس ہی آ چکا تھا۔ وہ قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے سر سے پیر تک دیکھا وہ تھکا ہوا سا لگ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے بیساکھی بغل میں چبھتی ہو اور وہ اسی لئے کچھ سستانے کے لئے کھڑا ہو گیا ہو۔ میں نے کچھ کہا نہیں وہ چپ چاپ کھڑا تھا اور ہم تینوں کی طرف باری باری سے دیکھ لیتا تھا۔ اس انداز سے میں نے یہی سمجھا کہ وہ کچھ چاہتا ہے اور مانگ نہیں رہا ہے اس لئے میں نے چار آنے نکال کر اُس کے بڑھا دیئے اس نے لینے سے انکار کرتے ہوئے پیچھے ہٹ کر کہا" میں کوئی بھکاری ہوں"

"معاف کیجئے گا بھائی صاحب" میں نے بڑی نرمی سے کہا۔

" کیا اپاہج بھیک ہی مانگ سکتے ہیں کچھ اور نہیں کر سکتے بھیک مانگنا بُری بات ہے اس سے آدمی کی خود داری پر حرف آتا ہے" یہ سُن کر مجھے دلی مسرت ہوئی اور اب مجھے اندھے سے لنگڑا زیادہ جچنے لگا۔ اور اس سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔

" تمہارے خاندان میں کتنے آدمی ہیں ؟ "

" صرف دو ! ایک میں دوسرا بھگوان "

" اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارا اور کوئی نہیں ہے "

" میں نے تو یہ نہیں کہا کہ میرا اور کوئی نہیں ہے۔" لنگڑے کی اس بات نے مجھے پھر مات دیدی میں پھر سوچ کر بولا۔

" تم کیا کام کرتے ہو " یہ سنتے ہی اس نے جواب دیئے بغیر کندھے پر پڑی جھولی میری طرف پھیلا دی میں نے اس میں جھانکا تو وہ ان کھیلوں سے بھری ہوئی تھی اور ترازو بھی سا تھ ہی رکھی تھی لیکن باٹ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ " یہ تو کھیلیں ہیں " میں نے کہا۔

" جی یہ کھیلیں ہیں" اس نے میرے ہی الفاظ دہرا دیئے اور پھر ایسے

انداز سے گلا صاف کیا جیسے وہ لمبی بات چیت شروع کرنے والا تھا۔ وہ بولا "بابوجی میں گاؤں گھومتا ہوں اور عورتوں کے سر کے ان بالوں کو جو کنگھی کرتے وقت جھڑ جاتے ہیں۔ کھلونوں کے برابر تول کر اکٹھا کر لیتا ہوں ان سے طرح طرح کے وِگ بناتا ہوں"

"ہاتھوں سے یا مشین سے"

"جی شروع شروع میں تو ہاتھوں سے ہی بناتا تھا اب بینک سے وِگ بنانے کی مشین لون میں مل گئی ہے"

"تمہاری تعلیم کیا ہے"

"بی اے پاس ہوں"

"لیکن گریجویٹ ہوتے ہوئے ایسے کام کی نسبت تو آپ اگر دس پانچ ٹیوشن کر لیتے تو بہتر کما لیتے اور اس کے ساتھ ساتھ عزت بھی ہوتی۔ لنگڑا عجیب و غریب مسکراہٹ لبوں پر لئے کہنے لگا۔

" مجھے وِگ بنانے میں جو مزہ آتا ہے وہ دنیا کے کسی بھی دھندے میں نہیں آسکتا تھا۔ میں روپیہ تو کئی طریقوں سے کما سکتا ہوں مگر وہ دولت سکونِ قلب نہ دے سکتی۔ سکونِ قلب تو کوئی مقصد پیدا ہونے میں ہے۔ دولت جمع کرنے میں نہیں" یہ کہہ کر اس نے بیڑی سلگائی اور اتنی زور سے دم لگایا جیسے کہ وہ اس کو ثابت ہی نگل جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اندر سے وہ لنگڑا زیادہ سادہ اور دلچسپ معلوم ہوا۔ میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا "بھائی صاحب آپ کی ٹانگ کیسے کٹی ہے۔"

"کہانی لمبی ہے ذرا تسلی سے بیٹھ کر سناؤں گا۔ یہ کہتے ہوئے وہ اندر سے کو ذرا کھسکا کر میرے پاس بیٹھ گیا: اور بولا۔

" آج سے قریباً دس سال پہلے جب میں بی اے کر چکا تھا اور ایم اے میں داخلہ لینے والا تھا اُسی وقت کی بات ہے: کہتے کہتے وہ کچھ رُکا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے اُس نے دامن سے آنسو پونچھے اور سنجیدگی کے ساتھ کہنے لگا۔ رونا نام کی ایک لڑکی تھی جو کہ جنرل بجہ داس ڈگری کالج کلکتہ میں پڑھتی تھی" یہ کہتے ہی اندھا بھی ذرا سرک کر بیٹھ گیا۔ اور بڑے غور سے سننے لگا " مجھے اس سے پیار ہو گیا۔ لیکن یہ کوئی بڑی بات نہ تھی بڑی بات تو یہ تھی کہ اُسے بھی مجھ سے پیار ہو گیا۔ لیکن مصیبت کا پہاڑ اس وقت ٹوٹا جب اُس کے ماں باپ کو یہ معلوم ہوا کہ میں جیٹ لیا دھیایہ ہوں وہ چترجی تھی اور یہ جیٹ لیا دھیایہ غوتر

گوتر کی بات ہے ہوتے دونوں ہی برہمن ہیں) لڑکی کے پتا پُرانے خیال کے تھے اس لئے لڑکی کو مجھے بھول جانے کے لئے زور دینے لگے مگر پیار اگر سچا ہو تو وہ ایسی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا۔ لہٰذا اس لڑکی نے مجھ ہی سے شادی کرنے کے مضبوط ارادے کا اظہار کیا۔ بات اتنی بڑھی کہ گھر میں متواتر لڑائی رہنے لگی۔ اس بیچاری سے کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ کڑے پہرے رہنے لگے۔ پڑھائی روک دی گئی جس سے وہ مجھے ملنے سے ناامید سی ہو گئی۔ گھر والے بڑی تیزی سے کسی دوسرے لڑکے کی کھوج میں لگ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ موقع پاتے ہی خودکشی کرنے ریل کی پٹری پر پہنچ گئی۔ سنجوگ کی بات کہ میں بھی دمدم اسٹیشن پر اپنی ماں کو لینے گیا ہوا تھا جو اپنے میکے سیل پانی گری سے ایک شادی میں شرکت کر کے واپس لوٹ رہی تھی۔ سامنے سے آتی ہوئی گاڑی نے سیٹی دی میں نے جھانک کر دیکھا کہ گاڑی اسٹیشن سے کتنی دور ہے۔ تو ایک لڑکی ریلوے لائن کے درمیان اسٹیشن کی طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہوئی دکھائی دی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ کوئی خودکشی کے ارادے سے کھڑی ہے میں ریل گاڑی کی طرف اسے بچانے کے لئے بھاگا۔ پلیٹ فارم پر سبھی مسافر اُدھر ہی دیکھ رہے تھے اور اپنی جگہ کچھ نہ کچھ سوچ رہے ہوں گے جیسے ہی اس سے کچھ فاصلے پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ وہ رونا تھی۔ میں اور زور سے بھاگا اپنے جسم کی پوری طاقت کا استعمال کیا اور آواز دی "رونا گاڑی پاس آچکی ہے ہٹ جا ورنہ مر جائیگی۔ وہ نہیں ہٹی میں نے پھر کہا" تو نہیں ہٹے گی تو میں بھی کٹ کے مر جاؤں گا۔ اب کی بار اُس نے مجھے مڑ کے دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا مگر ہٹی نہیں میں پوری طاقت سے بھاگتا ہوا اُس کے پاس پہنچ گیا گاڑی کے آتے آتے میں نے رونا کو گود میں اٹھا لیا اور لائن سے باہر لے چلا۔ گاڑی سر پہ آچکی تھی اُس کی بھیانک آواز میرے کانوں کو پھاڑے دے رہی تھی۔ بس میرا ایک پیر لائن میں رہ گیا تھا باقی پورا جسم باہر تھا۔ انجن پہیئے سے ٹکرایا اور ریل کا پہیہ ایک بولٹ میں اُلجھ گئی میں رونا کو لئے ہوئے لائن سے باہر گر پڑا میری ایک ٹانگ کٹ گئی۔ میں نے رونا کو نہیں چھوڑا مجھے خوف تھا کہ وہ کہیں پھر کرشن جی کے چکر کی طرح گھومتے ہوئے پہیوں کے نیچے نہ کود پڑے میری ٹانگ کو کاٹتے ہوئے گاڑی بزدل قاتل کی طرح اسٹیشن کی طرف بھاگ گئی۔ رونا اُٹھ کر کھڑی ہو گئی میں [illegible]

ٹانگ جسم سے الگ کٹی پڑی تھی۔ خون بہہ رہا تھا۔ کچھ دیر تو یہ سب کچھ رُوناد یکھتی رہی مگر بہت دیر تک اس دردناک منظر کی تاب نہ لا سکی اور نیچے گر گئی۔ اس کو غش آ گیا تھا۔ اب میں اُس کی مدد کرنے سے مجبور تھا۔ مجھے کچھ ہونے سا لگا تھا۔ میں دونوں ہاتھ سینے پر رکھے اور سینہ سہلایا تو مٹھی میں اُلجھا ہوا روتا کا پھٹ میرے ہاتھ میں آ گیا میں نے اس کو سنبھال کر نکالا چوما اور رکھ لیا۔ رونا کچھ کہہ تو نہیں رہی تھی لیکن افیونچی کی طرح آنکھیں ٹمٹما دیتی تھی۔ میں نے اُس سے کہا " رونا زندگی جدوجہد سے حسین بنتی ہے تم اسی سے گھبرا گئیں۔ اور خودکشی پر اُتر آئیں خودکشی ہی محبت کے لئے سب سے بڑی قربانی نہیں ہوتی ہے "، وہ خاموش سُنتی رہی اور دیکھتی رہی۔

مجھے ریلوے کی پولیس اُٹھا کر لے گئی اور اسے بھی کوئی نہ کوئی لے ہی گیا ہوگا۔

اگلے دن وہ مجھے دیکھنے اسپتال پہنچی اور اپنے تپتے ہوئے گال میرے ہونٹوں پہ رکھ دیئے۔ اور بولی " میں تو یہ سمجھ رہی تھی کہ اب انت ہو جائے گا۔ مگر تم نے مجھے مرنے سے روک لیا اب میں سماج کے بے جان اصولوں اور بندھنوں سے نہیں ڈروں گی اور تمہاری ہو کر رہوں گی "

اُس کی یہ باتیں سُن کر میرا آدھا دُکھ گھٹ گیا میں نے اُس سے پوچھا " کیا تم گھر والوں کا مقابلہ کر سکو گی ؟"

" تمہاری یہ قربانی مجھ سے سب کچھ کرا سکتی ہے " یہ کہتے ہوئے میرے سینے سے چمٹ گئی اور روتی رہی اسی وقت ایک نرس آ گئی اور میں نے رونا کو سیدھا بیٹھا دیا۔ وہ بیٹھی بیٹھی آنسو پونچھتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجبوراً گھر چلی گئی۔ اس کے جانے سے مجھے ایسا لگا جیسے میری جان نکل گئی ہو۔ میرا بازو بھی بچھڑ گیا میری آنکھ بھی لگی اس کے بعد پھر وہ مجھے آج تک نہیں ملی اس کا پھٹ آخری نشانی کے روپ میں میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔

میں نے پوچھا " وہ کہاں گئی ؟ "

" بھگوان کو پیاری ہو گئی "

" کیوں ؟ "

اُس نے زہر کھا لیا۔ کیونکہ گھر والوں کے طعنے لعنت ملامت گالیاں اس کو برداشت نہ ہو سکیں اس کے علاوہ اور چارہ ہی کیا تھا۔ میرے علاوہ وہ کسی دوسرے سے شادی نہیں کر سکتی تھی کنبہ اس کے خلاف تھا "، یہ کہہ کر وہ زار زار رونے لگا اور ہچکی بندھی آواز میں کہنے لگا " یہی اس کی آخری دین ہے پھٹ کے بالوں کی طرح میں بھی اس دھندے کے طفیل اس کی یاد میں الجھا رہتا ہوں "

اندھا میرے پاس سے یوں کہتا ہوا اُٹھا " بھگوان میں بالکل ہی اندھا ہو جاؤں تو اچھا ہے "

" کیوں بابا " میں نے تعجب سے پوچھا۔

" تاکہ ٹھوکریں کھاتا پھروں۔ میں نے بھی تو کسی کو ٹھوکریں کھلائی ہیں۔ مجھے کسی کا دل دُکھانے کا نتیجہ ملنا ہی چاہیئے " یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور آئی کلینک کے کھلنے کا انتظار بھی نہیں۔ لنگڑا سر جھکائے کچھ سوچ رہا تھا مگر میں اس راز کو نہ سمجھ سکا اور نہ ہی میں نے اس اندھے سے کچھ پوچھا۔

ناردرن ریلوے

ٹائم ٹیبل نوٹس

ناردرن ریلوے ٹائم ٹیبل کی خاص خاص باتیں جوکہ یکم نومبر 1980ء سے درج ذیل کی طرح لاگو ہو رہا ہے۔

ٹرینوں کی توسیع

ج 2 S/ ج ج 3 سلطانپور جونپور پسنجر وارانسی تک نئے نمبروں V 2 SJ/V 1 SJ درج ذیل شیڈول کے مطابق کردی گئی ہے۔

1 SJV			2 SJV	
A	[illegible] 1.30	سلطان پور	D	6.35
D	18.20	ظفر آباد	A	9.15
A	17.50		D	9.55
D	17.30	جون پور	A	10.15
A	17.05		D	11.30
D	15.00	وارانسی	A	13.45

لہٰذا ٹرین نمبر 3 J 4 کا نیا نمبر J.S 2 کر دیا جائے گا۔

مسافت میں تخفیف

1.ML/ 2.ML مغل سرائے لکھنؤ پسنجر کی مسافت گھٹا کر مغل سرائے اور وارانسی کے درمیان کردی جائے گی۔ یہ ٹرینیں اب وارانسی اور لکھنؤ کے درمیان نئے نمبر 1.LV/ 2.LV کے تحت چلیں گی۔

ٹرینوں کے دنوں میں تبدیلی:

(۱) 82 ڈاؤن امرتسر سے اتوار منگلوار کی بجائے سوموار اور منگلوار کو ہوڑہ کے لئے اور نئی دہلی سے ویروار کی بجائے شکروار کو ہوڑہ جائے گی۔

(۲) 104 ڈاؤن امرتسر سے منگلوار کی بجائے اتوار کو اور نئی دہلی سے شکروار کی بجائے ویروار کو جائیگی۔

نئے اسٹاپ جو مہیا کئے گئے ہیں:

ٹرین نمبر	اسٹیشن	ٹرین نمبر	اسٹیشن
207/208	بانہ	11.UP	مالوان
17.UP/18.DN	باڑی براہمن	175.UP/176.DN	علی گڑھ
92.DN	پٹودی روڈ	191/192.DN	ٹونڈلہ - علی گڑھ
183.UP/184.DN	علی گڑھ - سونی پت	1.PN	سملوتی
13.UP	دنکور - ماڈل ٹاؤن - دادری	6.JJ	مہنا گروال - دوآبہ
	عجائب پور	1.DG/4.DG	دوکیہ وہار
167.UP/168.DN	علی گڑھ - ٹونڈلہ	6.SH	کیسا نیاں
63.UP/64.DN	بھرتانہ		

اسٹاپ جو ختم کئے گئے

ٹرین نمبر	اسٹیشن	ٹرین نمبر	اسٹیشن
1.JF	جوگی والا - گدڑ پنڈی - بوٹے والا	4.DN	بیدن پور
11.UP	نئی سیدہ ساہو اور مہالم	67/169	جیونتھ پور - امروہہ روڈ
55.UP	جگنا اور گاچھورہ		جیونتھ پور - امروہہ روڈ
64 DN	حکیم پور - کیلسانہ کا دور پور		

تقرو اور سیکشنل کیریجز میں تبدیلیاں

۱۔ 2 عدد 2 ٹائر سلیپر کوچیز دیغر مخصوص لکھنؤ اور امرتسر کے درمیان 49 اپ، 50 ڈاؤن ٹرین میں شروع کئے جائیں گے۔

2۔ ایک عدد 3 ٹائر سلیپر (GSCN) لکھنؤ اور کوٹ دوار کے درمیان موجودہ جزوی سلیپر کوچ (GSCG) کی جگہ 9 اپ/ ۱۰ کے این۔ E۔ کے این/ ۱۰ ڈاؤن گاڑی میں میں شروع کیا جائیگا۔

3۔ ایک عدد 3 ٹائر سلیپر (GSCN) نئی دہلی اور نیو جلپائی گوڑی کے درمیان ایک عدد S/T سلیپر کوچ کی جگہ 155/156 آتن سکھیا میل ایاں شروع کیا جائیگا۔

4۔ ایک عدد تین ٹائر سلیپر (GSCN) ہفتہ میں دو بار حضرت نظام الدین براستہ ناگپور ہوڑہ کے درمیان 138 اپ/137/134-133 ڈاؤن میں شروع کیا جائیگا۔ یہ کوچ حضرت نظام الدین سے بدھوار اور اتوار کو لگایا جائے گا۔ اور ہوڑہ سے منگلوار اور شکروار کو شروع کیا جائے گا۔

5۔ ایک عدد عام سیکنڈ کلاس کوچ (GS) جودھپور اور بیچ کے درمیان 265/266 اے/ 65 لے 66 گاڑیوں میں شروع کیا جائیگا۔

گاڑیوں کے اوقات میں اہم تبدیلیاں

5۔ اپ امرتسر 8/5 بجے کی جگہ 8/55 بجے پہنچے گی۔
49 اپ امرتسر 10/15 بجے کی جگہ 10/45 بجے پہنچے گی۔
173/171 جموں توی 10/45 بجے کی جگہ 10/11 بجے پہنچے گی۔
51 اپ جموں توی 7/10 بجے کی جگہ 7/45 بجے پہنچے گی۔

177 اپ نئی دہلی 18/25 بجے کی جگہ 20/8 بجے پہنچے گی۔ اور 19/20 کی جگہ 20/30 پر چلے گی جموں توی 8/05 کی جگہ 5 25/ 9 پر پہنچے گی۔

33 اپ دہلی سے 20/55 کی بجائے 21/20 پر چلے گی اور جموں توی 9/35 بجے کی جگہ 10/40 بجے پہنچے گی۔

17. اپ۔ دہلی 21/45 کی جگہ 22.00 بجے پہنچے گی۔ اور جموں توی 13.00 بجے کی جگہ 13/35 بجے پہنچے گی۔

31. اپ امرتسر 7/0 بجے کی بجائے 7/15 بجے پہنچے گی۔

103/ 8/25۔ امرتسر 18/50 کی بجائے 19/5 بجے پہنچے گی۔

53. اپ دہلی سے 21/25 کی بجائے 20/45 بجے چلے گی اور ناگل ڈیم 8/55 کی بجائے 8/15 بجے پہنچے گی۔

185. اپ بھرانی 20/15 کی بجائے 20/0 بجے پہنچے گی۔

137 ڈاؤن حضرت نظام الدین 19/05 کی بجائے 19/20 بجے پہنچے گی۔

151 اپ۔ وارانسی سے 14/40 کی بجائے 14/15 بجے چلے گی۔

70 ڈاؤن۔ لکھنؤ سے 17/0 بجے کی بجائے 16/30 بجے چلے گی۔

97 اپ۔ بارمار 5/25 بجے کی جگہ 4/20 بجے پہنچے گی۔

208 ڈاؤن آئی پی اٹاری سے 18/25 کی جگہ 18 بجے روانہ ہوگی۔ اور امرتسر 19 بجے کی جگہ 18/40 بجے پہنچے گی۔

52. ڈاؤن جموں توی سے 19/50 بجے کی جگہ 18/50 بجے روانہ ہوگی۔

34 ڈاؤن جموں توی سے 15/45 بجے کی جگہ 15/30 بجے روانہ ہوگی۔

178 ڈاؤن جموں توی سے 21/45 بجے کی جگہ 21/25 بجے روانہ ہوگی۔

186 ڈاؤن بھرانی سے 7/5 کی جگہ 7/20 بجے روانہ ہوگی۔

144 اپ/132 ڈاؤن حضرت نظام الدین سے 9/25 بجے کی بجائے 9/10 بجے روانہ ہوگی۔

78. اپ حضرت نظام الدین سے 12 بجے کی جگہ 11/45 بجے روانہ ہوگی۔

24. اپ دہلی سے 14/10 بجے کی بجائے 13/55 بجے روانہ ہوگی۔

58. اپ نئی دہلی سے 21/45 کی بجائے 21/30 بجے روانہ ہوگی۔

50. ڈاؤن۔ جودھپور سے 5/50 بجے کی جگہ 6/10 بجے روانہ ہوگی۔

504 ڈاؤن جودھپور سے 5/50 بجے کی جگہ 6/10 بجے روانہ ہوگی۔

349. اپ امرتسر 9/15 بجے کی بجائے 9/55 بجے پہنچے گی۔

5 اے اے امرتسر سے 17/23 بجے کی بجائے 17/40 بجے روانہ ہوگی واٹاری 18/15 بجے کی جگہ 18/45 بجے پہنچے گی۔

1. ایل جے ایل لدھیانہ سے 10/40 کی بجائے 10/20 بجے روانہ ہوگی۔

3. جے ایچ جالندھر سٹی 9 بجے کی جگہ 8/40 بجے پہنچے گی۔

5. جے ایم پی پٹھان کوٹ 18/35 بجے کی جگہ 18/55 بجے پہنچے گی۔

3. ایل ایل لوہیاں خاص 13/55 کی جگہ 14/38 بجے پہنچے گی۔

3. ڈی ایس ایس شاملی 13/10 بجے کی جگہ 13/35 بجے پہنچے گی۔

5 ڈی ایس ایس دہلی شاہدرہ سے 12/45 کی بجائے 13/10 بجے روانہ ہوگی اور شاملی 16/35 کی بجائے 17/22 بجے پہنچے گی۔

7 ڈی ایس ایس شاملی 20/55 بجے کی بجائے 21/15 بجے پہنچے گی۔

9 ڈی ایس ایس شاملی 22/25 بجے کی جگہ 22/45 بجے پہنچے گی۔

سی ٹی - 1 حضرت نظام الدین سے 7/32 کی جگہ 7/13 بجے روانہ ہوگی۔

سی ٹی - 2 حضرت نظام الدین سے 7/40 بجے کی جگہ 7/10 بجے روانہ ہوگی۔

2 ڈی ایس کے۔ انبالہ کینٹ سے 11/44 بجے کی جگہ 9/27 بجے روانہ ہوگی۔

سہارنپور 14/2/14/22 کی جگہ 11/55 بجے 13/45 بجے پہنچے/روانہ ہوگی۔

2 ایس یو این انبالہ کینٹ سے 9/23 کی جگہ 11/43 بجے روانہ ہوگی۔ سہارنپور 11/45 کی جگہ 14/15 بجے پہنچے گی۔

2 ایل ایس لدھیانہ سے 3/20 بجے کی جگہ 3/55 بجے روانہ ہوگی۔

2 پی جے جموں توی سے 8/15 بجے کی جگہ 8/40 بجے روانہ ہوگی پٹھانکوٹ 11/40 بجے کی جگہ 12 بجے پہنچے گی۔

4 جے ایل جالندھر سٹی سے 11/23 کی جگہ 11 بجے روانہ ہوگی۔ نکودار 12/25 بجے کی جگہ 12/2 بجے روانہ ہوگی۔

1 جے ایف۔ جالندھر سٹی سے 6/25 بجے کی بجائے 6/50 بجے روانہ ہوگی۔

2 جے ایل کے لوہیاں خاص سے 22/5 بجے کی جگہ 22/25 بجے روانہ ہوگی۔ جالندھر سٹی 3/15 بجے کی بجائے 23/35 بجے پہنچے گی۔

1 پی جے پٹھانکوٹ سے 15/25 کی بجائے 15 بجے روانہ ہوگی۔

2 آر کے بی بھوانی سے 10/3 بجے کی بجائے 11.00 بجے روانہ ہوگی۔ روہتک 12/25 بجے کی بجائے 12/40 بجے پہنچے گی۔

8 ڈی ایس ایس شاملی سے 11/45 کی بجائے 12/20 بجے روانہ ہوگی۔ دہلی شاہدرہ 15/35 کی بجائے 15/10 بجے پہنچے گی۔

1 سی سی ایم چوپن سے 4/5 بجے کی بجائے 3/45 بجے چلے گی۔

1 اے بی علی گڑھ سے 15/00 بجے کی بجائے 13/15 بجے روانہ ہوگی۔ بریلی 21/50 بجے کی بجائے 20/30 بجے پہنچے گی۔

1 جے بی بارمر 17/15 کی بجائے 16/50 بجے پہنچے گی۔

2 جے بی بارمر سے 4/45 بجے کی بجائے 5/35 بجے روانہ ہوگی۔

1 ایس۔ پی سمباری سے 6/15 بجے کی بجائے 6/30 بجے روانہ ہوگی۔

2 ایس پی سمباری 22/30 بجے کی بجائے 22 بجے پہنچے گی۔

مکمل معلومات کے لئے براہ کرم ناردرن ریلوے ٹائم ٹیبل نومبر 1981ء کا شمارہ دیکھیں جو ہر بڑے سٹیشن پر بکری کے لئے موجود ہے۔

چیف آپریٹنگ سپرنٹنڈنٹ

10-138

ذرا ٹھہریئے

HELP THE AFGHAN REFUGEES

AN APPEAL

You are doubtless aware that as a result of the Soviet occupation of Afghanistan, a large number of Afghan patriots are now languishing in ill-equipped refugee camps near Peshawar in Pakistan. The well being of the refugees is a matter of humanitarian concern and has nothing to do with politics. All civilized nations have to make their contribution for the upkeep and maintenance of this unfortunate section of humanity.

We therefore appeal to you for generous donations in cash or in kind. The primary objective is to provide the refugees with blankets and quilts to enable them to bear up with the rigors of the coming winter.

We look forward to a generous contribution from you.

Cheques/bank drafts may kindly be drawn in favour of:

FRIENDS OF AFGHANISTAN ASSOCIATION
10, Dr. Rajendra Prasad Road, New Delhi.

RAM JETHMALANI, SIKANDER BAKHT,
J. P. MATHUR, ARIF BAIG,
ACHARYA DHARMENDRA NATH

Space donated by :

Acharya Dharmendra Nath

جناب سکندر بخت سابق وزیر حکومت ہند جے پور میں انجمن افغان دوستاں
کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے۔

انجمن افغانِ دوستاں کے اجلاس میں ڈاکٹر پرشانت تقریر کرتے ہوئے

دہلی یونیورسٹی ٹیچرز ایسوسی ایشن کے سیمنار برائے مسئلہ افغانستان کی ایک جھلک

دہلی یونیورسٹی ٹیچرز ایسوسی ایشن کے سیمنار برائے مسئلہ افغانستان میں
جسٹس وی۔ ایم۔ تارکنڈے تقریر فرما رہے ہیں

دہلی یونیورسٹی ٹیچرز ایسوسی ایشن کی طرف سے مسئلہ افغانستان پر سیمنار
کے موقع پر جناب اچاریہ دھرمیندر ناتھ جنرل سکریٹری انجمن افغانِ دوستاں
تقریر کر رہے ہیں۔

PSB. Growing with families for over 70 years.

ASP/PSB/3 202

"Thirty years ago, my father opened an account for me at PSB. Today, I've done the same for my son."

Banking with PSB is a legacy that is handed down from father to son in all PSB families—families who have grown up with us, and stayed with us. For over 70 years. Because we have traditions of banking service very few can match.

PSB—The name of total banking service

PUNJAB & SIND BANK

(A Government of India Undertaking)

ٹیلیفون نمبر ۲۷۵۶۰۲ | رجسٹرار آف نیوز پیپر آف انڈیا کا رجسٹریشن نمبر ۶۴۴/۵۷ | رجسٹرڈ نمبر ڈی ۷۰/۳۷۰

ہندو پرست ہوں نہ مسلماں پرست ہوں
دامن پرست ہوں نہ گریباں پرست ہوں

ہر ذرۂ وطن سے ہے فیاض مجھ کو پیار
یعنی وطن پرست ہوں انساں پرست ہوں
(فیاض گوالیاری)

ماہنامہ شانِ ہند

ایڈیٹر: سرور تونسوی

زر سالانہ ۱۵/ روپے
فی پرچہ ۱/۵۰ روپے

جلد نمبر ۱۴ ✿ دسمبر ۱۹۸۰ء ✿ شمارہ ۱۲

قطعات

جناب کرشن لال ادیب

ہو چکا ہے سرد بازارِ جنوں
اب وہ اگلی سی کہاں ہے زندگی
بجھ گیا دل نور ظلمت بن گیا
شمعِ کشتہ کا دھواں ہے زندگی

✿

اڑتے ہیں انساں پرندوں سے بھی تیز
یہ نئی تہذیب کا اعجاز ہے
آدمی خوش ہیں ترقی سے مگر
آدمیت مائلِ پرواز ہے

کس طرح طے ہو معرفت کی راہ
جب میسر نہ ہو کوئی رہبر
اپنی صورت نظر نہیں آتی
آئینہ ہو اگر نہ پیشِ نظر

✿

فکر کو جس میں کوئی زحمت ہو
کام ایسا کوئی کیا ہی نہیں
قافیہ میرا تنگ کیا ہوگا
میرے شعروں میں قافیہ ہی نہیں

اگلے لوگوں کا یہ مقولہ تھا
پارسائی نہیں تو کچھ بھی نہیں
عہدِ حاضر کا یہ تقاضا ہے
خود نمائی نہیں تو کچھ بھی نہیں

ودیا پرکاش سرمد ایڈیٹر پرنٹر پبلیشر نے لیتھو کے صفحات خواجہ پریس، چھتہ شیخ منگلو، جامع مسجد دہلی اور سرورق پائیلٹ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر شانِ ہند، فلیٹ نمبر ۸، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ــ ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

بلبل چہ گفت؟ گل چہ شنید؟ صبا چہ کرد؟

دوسری کُل ہند غیر مُسلم اُردو مصنفین کانفرنس

مسلمانوں کے اللہ۔ ہندوؤں کے بھگوان۔ عیسائیوں کے گاڈ۔ اور سکھوں کے واہگورو جو ایک اور صرف ایک ہی ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں مگر مسلمانوں۔ عیسائیوں۔ سکھوں اور ہندوؤں نے جس کے نام الگ الگ رکھ لئے ہیں۔ اُسی ہم سب کے مالک سے عاجزانہ التجا ہے کہ وہ جناب رام لعل صاحب کو عمر طویل دے تاکہ یہ عاشقِ اُردو اپنی انتھک کوششوں کو جاری رکھتے ہوئے اُردو کی بقا و حیات کے لئے کچھ کر دکھائے۔

آپ کو یاد ہوگا سات سال پہلے جناب رام لعل صاحب نے کُل ہند غیر مسلم اُردو کانفرنس لکھنؤ میں منعقد کی تھی جس کی وجہ سے حکومت اور دشمنانِ اُردو کو بخوبی علم ہوگیا کیونکہ ہندوستان میں اُردو کی بقا و حیات اور اس کی حفاظت کے لئے غیر مسلم اُردو مصنفین سینہ سپر ہیں۔

اب پھر رام لعل صاحب دوسری کُل ہند غیر مُسلم اُردو مصنفین کانفرنس کے لئے پر تول چکے ہیں اور یہ کانفرنس مارچ کے شروع میں لکھنؤ میں ہوگی۔

اس بار یہ کانفرنس صرف اور صرف اس لئے منعقد ہو رہی ہے کہ مُلک بھر کے غیر مُسلم اُردو مصنفین مل کر یہ مطالبہ کریں کہ حکومت اُتر پردیش میں اُردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے۔ اور یہ ایسا حق بجانب مطالبہ ہے کہ بلا تخصیص مذہب و ملت ہر اُردو داں اس کی حمایت کرے گا۔ لہذا ہندوستان کے ہر محبِ اُردو داں کا یہ اوّلین فرض ہونا چاہیئے کہ وہ اس کانفرنس کو کامیاب کرنے کے لئے ہر طرح سے مدد دے۔

ایڈیٹر شانِ ہند علالت کے باوجود اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لئے جنوری کے آخری ہفتے میں ممبئی جا رہا ہے تاکہ وہاں کے فلمی اور غیر فلمی غیر مسلم نیز ہر اُردو دوست سے بالمشافہ ملاقات کر سکے اور انہیں اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کی درخواست کر سکے۔ اس موقعہ پر ایک سووینیر بھی شائع کیا جا رہا ہے اور یہ سووینیر محض حصولِ اشتہارات کے لئے ہی شائع نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ یہ اس تاریخی اُردو کانفرنس کی ایک ایسی یادگار دستاویز ہوگی جسے مُدتوں اُردو دوست اپنے پاس رکھینگے۔

اس کانفرنس کے سلسلے میں مزید تفصیلات جناب رام لعل R-39-II. ملٹی سٹوری، چار باغ، لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱ (یوپی) سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔

سفارت خانہ پاکستان میں ویزا حاصل کرنیوالوں کی بدنظمی

شان ہند کی گزشتہ اشاعت میں "کیا سارا پاکستان بیمار ہے" پڑھنے کے بعد ہمیں اپنے مُلک کے علاوہ پاکستان سے بھی تعریفی خطوط آئے ہیں کہ شانِ ہند نے ہندوستانی مسلمانوں کو ویزا حاصل کرنے کے سلسلے میں صحیح طور پر رہنمائی کی ہے اس سلسلے میں ہمیں ان ہندوستانی مسلمانوں سے یہ کہنا ہے کہ جو حصولِ ویزا کے لئے پاکستانی سفارت خانہ میں جاتے ہیں۔

گزشتہ پیر کو مدیر شانِ ہند صبح پونے نو بجے سفارت خانے کے قریب پہنچا تو مردوں جن میں بوڑھے۔ ادھیڑ عمر اور نوجوان تھے اور عورتوں جن میں ضعیف۔ نوجوان اور بچیاں بھی تھیں کا جم غفیر اس انتظار میں تھا کہ کب نو بجیں اور سفارت خانہ کا دروازہ کھلے اور یہ لوگ سفارت خانہ کے حدود میں داخل ہو کر اپنی اپنی لائن میں ایک دوسرے سے پہلے لگنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ جونہی نو بجے دروازہ کھلا تو ایسا عالم ہوتا تھا کہ میدانِ حشر میں ہر کوئی اپنے اپنے بچاؤ کے لئے کوشاں ہے نوجوان حضرات تو دیوار پھاند کر سفارت خانے میں داخل ہوئے اور یہ تھا کہ کسی کو یہ پتہ ہی نہ تھا کہ اس کے پاؤں کے نیچے کوئی بوڑھی عورت کچلی جا رہی ہے یا کوئی بچہ روندا جا رہا ہے۔ کوئی بوڑھا گرنے کے بعد اُٹھ ہی نہ سکا ہے یا کوئی نوجوان لڑکی نوحہ خوان ہے کہ تماش بینوں نے

ان کی چھاتیوں پر بھی ہاتھ مارتے ہیں اور گال بھی نوچ لیتے ہیں۔ جب یہ اودھم کم ہوا تو دیکھا کہ پانچ چھ ضعیف عورتیں اور دو بچے کچلے جانے کے باعث نیم بے ہوشی میں ہیں اور انھیں چوٹیں بھی آئی ہیں۔ پتہ چلا کہ یہاں ہر روز یہ تماشہ ہوتا ہے۔ سفارت خانے والوں نے خاردار تار لگوائے تاکہ عوام لائن میں آئیں مگر یار لوگوں نے یہ تار بھی اکھاڑ دیئے۔ غرضیکہ ہر وہ بدقماشی اور بدتہذیبی وہاں دیکھنے میں آتی ہے جس کی امید کسی بھی شریف آدمی سے نہیں ہو سکتی۔ کیا غضب ہے کہ ویزا حاصل کرنے والے یہ ہندوستانی مسلمان اپنی مسلمان ماؤں۔ بہنوں اور بچیوں کی اس طرح بے عزتی کرتے ہیں۔ اور الزام دیا جاتا ہے پاکستانی سفارت خانہ کے افسران کو کہ وہ سختی کرتے ہیں حالانکہ یہی پاکستانی افسران ان ہندوستانی خواتین کو اپنے طور پر ہسپتال میں بھجوانے کا ہر روز انتظام کرتے ہیں جو ان ہندوستانی سورما مسلمانوں کے پاؤں تلے کچلی جاتی ہیں۔

ہم کمشنر پولس سے استدعا کریں گے کہ وہ پاکستانی سفارت خانہ کے باہر دلی پولس کی ڈیوٹی لگائیں کہ وہ صبح کے وقت ان ویزا لینے والوں کو لائن میں کھڑے ہونے پر مجبور کریں اور جب سفارت خانے کا دروازہ کھلے تو ہر کوئی لائن میں ہی اندر جائے۔ اور سفارت خانے کے احاطہ میں پاکستانی گارڈ اس کا خیال رکھے کہ کوئی تماشبین بے راہ روی اختیار نہ کرے۔

دلی دُوردرشن کی نیو ایر ایو

حسب سابق دلی دُوردرشن نے ۳۱ دسمبر ۷۹ء کو رات کے دس بجے سے بارہ بجے کے بعد تک نیو ایر ایو منائی جس کے پروگراموں میں کچھ بہت اچھے تھے کچھ درمیانہ مگر غزلوں کا پروگرام گھٹیا اور اناؤنسمنٹ تو سو فیصدی بورنگ رہی۔ نہ معلوم دُوردرشن والوں کو یہ غلط اطلاع کس نے دی کہ پنیثال اناؤنسر بھی ہے۔ پنیثال کے ساتھ جو دو "محترمات" بطور روشنی بہنیں (؟) کھڑی کی گئیں وہ تو مضحکہ خیز حد تک اپنے فرائض میں ناکام رہیں دُوردرشن کے ارباب بست وکشاد کو شاید یہ علم ہی نہیں کہ ٹی۔ وی دیکھنے والے ٹی۔ وی کے ان اناؤنسر خواتین اور دوسرے حضرات ... پروگرام کے سامنے آتے رہتے ہیں اپنا فیملی ممبر سمجھتے ہیں ... ہر سال نیو ایر ایو میں کم و بیش یہ سب اناؤنسر خواتین ... اندر فی وی کے دوسرے ارکان اس پروگرام میں شریک ہوتے تھے اور وہی پروگرام کی دیکھ ریکھ کرتے تھے۔ مگر اب کی بار تو سب کچھ ہی "امپورٹیڈ" تھا۔ کوئی محترمہ سری نگر دوردرشن سے تشریف لائیں تو کوئی پارٹی مہاراشٹر یا گجرات سے۔ یعنی سارے پروگرام میں ایک بھی ایسی صورت دکھائی نہ دی جو ٹی۔ وی دیکھنے والوں کی شناسا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دلی دوردرشن والوں کو اپنے مداحوں کے ساتھ یہ خوشی منانے کی بجائے ہی کر دی گئی ہو۔ تاہم پروگرام کی کامیابی کا سہرا انگریزی فلم کی نقل کرنے والے نوجوان اکثر ہندی گویوں کے رنگ میں گویتا کہنے اور پڑھنے والے کوی ہندی بولنے والی پردیسی خاتون کے سر رہا۔ اور پینیل لفظی طور پر واہ واہ واہ کرنے اور گھسے پٹے لطیفے سنانے کو ہی اپنی کامیابی سمجھتا رہا۔ تاہم دلی دُوردرشن کے کارکنان شکایت ہم عوام کی یہ رائے پہنچانے کا ناخوشگوار فرض ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس سال مجموعی طور پر یہ پروگرام دیکھنے والوں کو پسند نہیں آیا۔

غلطی کا اعتراف

"شانِ ہند" کی سابقہ اشاعت میں جناب کرشن لال ادیب کی چار رباعیات شائع ہوئی ہیں مگر پہلی رباعی کے تیسرا مصرعہ اس طرح غلط چھپا ہے ع جو اپنی خبر آپ نہیں لیتا ہے ادیب: یہ مصرع صحیح اس طرح ہے ع جو اپنی خبر آپ نہیں لیتے ادیب"۔ مطبوعہ مصرعہ وزن رباعی سے خارج ہے علاوہ ازیں جب چوتھے مصرعہ میں "ان" ہے جو صیغۂ جمع ہے تو مصرعۂ ثالث میں "لیتا ہے" واحد کیونکر ہو سکتا ہے۔ ہم حضرت ادیب کے ممنونِ احسان ہیں کہ انھوں نے ہماری اس غلطی کی طرف دھیان دلایا۔

انجمن افغان دوستاں

۲۴ نومبر مالک ہوک چوپڑے پور میں راجستھان انجمن افغان دوستاں کا ایک جلسہ سردار اجیت سنگھ ساگر ایڈوکیٹ کی صدارت میں ہوا جس میں اوم پرکاش صاحب اگروال، شری جگدیش زرگر، شری ستیہ دت اچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب مسافر جناب سکندر بخت صاحب نے تقاریر کیں اور دلائل و براہین سے ثابت کیا کہ افغانستان سے روسی فوجوں کا واپس جانا ہی افغانستان، پاکستان اور ہندوستان کے لئے بہتر ہے۔ سکندر بخت صاحب کو سکوں میں تولا گیا ۵۰۰ ۳ روپیہ کے سکے ان کے وزن کے برابر ہوئے جو انھوں نے انجمن افغان دوستاں کو دے دیئے۔ دن میں پریس کانفرنس میں سکندر بخت نے

قریباً چالیس صحافیوں کے مختلف سوالات (جو کہ محض مسئلہ افغانستان سے ہی تعلق رکھتے تھے) کا جواب تفصیلی طور پر دیا۔

۸ دسمبر ۸۰ء کو دہلی یونیورسٹی کے روم نمبر ۲۳ میں دلی ٹیچرز ایسوسی ایشن نے بھی انجمن افغان دوستان کی ایک زوردار میٹنگ کی۔ جس میں جسٹس وی.ایم تارکنڈے صاحب۔ ڈاکٹر پرشانت۔ افغان لیڈر جناب سید محمدؐ ماٹی وند نیز اچاریہ دھرمیندر ناتھ صاحب نے مسئلہ افغانستان پہ تقاریر میں بتایا کہ روسی افواج کا افغانستان میں آنا نہ صرف افغانستان کی آزادی کو ختم کرنا ہے بلکہ اس سے پاکستان اور ہندوستان کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ افغان پناہ گزین جو اس وقت چودہ لاکھ کی تعداد میں پاکستان میں پشاور کے نزدیک کیمپوں میں رہ رہے ہیں ان کے لئے اس سردی کے موسم میں لحافوں اور کمبلوں کی اشد ضرورت ہے۔ انجمن افغان دوستان ایک لاکھ کمبل فراہم کر رہی ہے جس کے لئے اہل خیر کو اس نیک کام میں حصہ لینا چاہیئے تاکہ ہمارے افغان بھائی اس کڑاکے کی سردی میں نہ مریں۔ حکومت پاکستان اپنی طاقت سے زیادہ ان پناہ گزینوں کی خدمت کر رہی ہے۔ اس کے باوجود ہم سب کا فرض ہے کہ اس اخلاقی اور انسانی فرض کو نبھائیں۔

ترقی اُردو بورڈ کی غلط بخشی

حکومت ہند کی یہ پالیسی ہے کہ کوئی بھی ایسا سرکاری یا غیر سرکاری ادارہ جس کا تعلق اُردو کے ساتھ ہو۔ اس میں کسی غیر مسلم کا گزر تک بھی نہ ہو۔ اور کوشش کی جائے کہ جو روپیہ کتابوں پر اخراجات یا دوسری مدات پہ صرف ہو اسے بھی صرف اور صرف مسلمانوں پہ ہی صرف کیا جائے۔ تاکہ ان لقمہ بانٹنے سے مسلمانوں کو یہ احساس ہو کہ حکومت ان کی مدد کر رہی ہے لہٰذا مسلمانوں کے ووٹ حکومتی پارٹی ہی کو ملیں۔ جہاں تک روپیہ کی غلط بخشی کا سوال ہے ہمیں اس سے کیا خواہ حکومت جسے چاہے نوازے مگر اس انداز سے اُردو کے مسلمان دانشور محض لقمہ ہائے تر کے حصول میں ہی خوش ہیں اور انہیں اُردو کی بقا و حیات کا کوئی فکر ہی نہیں رہتا۔ اُردو اکاڈمیوں کے کارکنان کا یہ احسان ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کو اس کی تصنیف پر انعام دے دیتی ہیں ورنہ سرکار تو اُردو کو مسلمانوں کی ہی زبان سمجھتی ہے اور انگریز کی طرح یہ حکومت بھی کوشاں ہے کہ ہمارے مسلمان اُردو دانشور غیر مسلم اُردو مصنفین۔ صحافیوں اور ناشرین کو منہ نہ لگائیں۔ حالانکہ اُردو کی کتابیں چھاپنے والے اچھے ناشر غیر مسلم ہیں اُردو کے بہترین اور کثیر الاشاعت اخبارات کے ادارے غیر مسلموں کے ہیں۔۔۔ اُردو ماہناموں میں شمع گروپ کو چھوڑ کر باقی کے رسائل میں سے اکثر غیر مسلم اداروں ہی سے شائع ہوتے ہیں۔

ترقی اُردو بورڈ کی مطبوعات کا گاہک اُردو کے رسائل میں سب سے زیادہ شانِ ہند ہے۔ مگر ترقی اُردو بورڈ والوں کو خدا نے یہ توفیق بھی نہیں دی کہ وہ اپنی مطبوعات کا اشتہار شانِ ہند میں بھی شائع کرانے کے لئے ڈی.اے.وی.پی کو لکھیں یہ دوسری بات ہے کہ ڈی.اے.وی.پی کے کسی واقف حال افسر نے از خود شانِ ہند کو اُردو ترقی بورڈ کا اشتہار بھجوا دیا ہو۔ ابھی پچھلے دنوں اُردو ترقی بیورو کا اشتہار تیرہ رسائل و جرائد میں اشاعت کے لئے دیا گیا۔ کیا بیورو کے ذمہ دار حضرات بتا سکتے ہیں کہ ان تیرہ رسائل و جرائد میں کتنے ایسے تھے جو غیر مسلم اداروں سے شائع ہوتے ہیں۔؟ ان تیرہ جرائد و رسائل کی فہرست میں ڈی.اے.وی.پی والوں نے اپنی طرف سے چار مزید اخبارات و رسائل کا اضافہ کیا۔ اور بیورو نے چھ ہزار روپیہ اُجرت اشتہار کی صورت میں ادا کیا۔ اور ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ جن رسائل و جرائد میں یہ اشتہار چھپا ان سے چھ صد روپیہ کی کُتب کا بھی آرڈر نہیں آ سکتا۔ اور جبکہ ان دنوں شانِ ہند نے ایک ہزار روپیہ کے قریب اُردو کتابیں اُردو ترقی بورڈ سے خریدیں۔ گذشتہ ماہ مئی یا جون میں بھی بیورو کی مطبوعات کا اشتہار رسائل و جرائد میں چھپا جو زیادہ تر نصابی کتب پر مشتمل تھا مگر بیورو کے لائق کارکنان کو یہ علم ہی نہ ہو سکا کہ مئی۔ جون میں ملک بھر کے اسکول کالج بند رہتے ہیں۔ جب حالت یہ ہو تو نصابی کتابوں کا اشتہار کون پوچھے گا۔ یہ نصابی کتابیں زیادہ تر آندھرا پردیش کی منظور شدہ ہیں اور بیورو والوں نے زیادہ تر اشتہار ایسے رسائل و جرائد میں دیا جن کا گزر آندھرا پردیش میں خال خال ہی ہوتا ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی اُردو بورڈ ایک سرکاری ادارہ ہے اور اس ادارے کو قوم کا روپیہ برباد کرنے کا اختیار بھی ہے۔ مگر کتابیں جس مقصد کے لئے شائع کی جاتی ہیں اگر وہ اس مقصد کو پورا نہیں کرتیں تو اس میں نہ تو سرکار کو فائدہ ہے اور نہ ہی ترقی اُردو بورڈ کو۔ لہٰذا تجارتی اصولوں پہ کتابوں کی فروخت گی کی جائے تو حکومت اور بیورو دونوں کے لئے بہتر ہوگا۔ لہٰذا اشتہار دیتے وقت ایسے رسائل و جرائد کا انتخاب ضروری ہے جو اس مقصد کے لئے مفید ہوں۔

بہ کوئے یار بہ انداز محرمانہ گزر

سرور تونسوی

میں چاہ بوہڑ والا ملتان چھاؤنی (پاکستان) میں جناب ...یم سین ظفر ادیب کے کرایہ دار کی حیثیت سے رہائش پذیر تھا کہ ...ایک دن میری والدہ محترمہ (جو بفضلِ خدا حیات ہیں) میری چھوٹی بہن ستیا کو ہمراہ لئے اچانک تشریف لائیں اور کہنے لگیں کہ تونسہ شریف اور آس پاس کے سب حکیموں کو دکھا لیا ہے اسے آرام ہی نہیں آتا۔ اس لئے اسے تمہارے پاس لائی ہوں۔ ملتان بہت بڑا شہر ہے یہاں بڑے بڑے ہسپتال ہیں۔ اور اچھے حکیم بھی اسے دکھاؤ ورنہ یہ مر جائے گی۔

یہ ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے۔ اس وقت میری بہن کی عمر بارہ تیرہ سال کی تھی۔ مجھے اور میری بیوی کو اس کی حالت دیکھ کر کافی تشویش ہوئی۔ ان دنوں ملتان کے "لقمان" جناب حکیم چیلا رام کا حکمت کی دنیا میں طوطی بولتا تھا۔ اور ان سے میرے مراسم نیازمندانہ تھے دوسرے دن وہ میری درخواست پر میرے غریب خانہ پہ تشریف لائے۔ میری بہن کو انہوں نے بڑے غور سے دیکھا۔ متعدد سوالات کرتے رہے جن کے جواب میری بہن یا میری والدہ صاحبہ دیتی رہیں۔ حکیم صاحب نے فرمایا تمہاری بہن کو کوئی جسمانی بیماری نہیں ہے اس پر میں نے ڈرتے ڈرتے گذارش کی کہ ہمارے گاؤں کی کچھ عورتوں کا کہنا ہے کہ اسے اوپری اثر ہے اس پر حکیم چیلا رام صاحب مسکرائے کیونکہ وہ بھی میری طرح اوپری اثر پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

ملتان کا سول ہسپتال جو آج کل نشتر ہسپتال کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بڑے ڈاکٹر میرے جاننے والے تھے میں ستیا کو انہیں دکھانے لے گیا۔ انہوں نے خون۔ تھوک۔ پیشاب۔ ٹٹی وغیرہ کا معائنہ کرایا۔ مگر کچھ بھی تو نہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے۔ تمہاری بہن بالکل ٹھیک ہے اور اسے کوئی بھی جسمانی تکلیف نہیں ہے ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا تھا کہ میری بہن نے خون کی الٹی ان کے سامنے ہی کر دی۔ ڈاکٹر صاحب حیران اسی وقت ایکسرے سیکشن میں بھجوایا دوسرے دن ایکسرے کی رپورٹ ملی تو وہ بھی بالکل ٹھیک تھی یہ ڈاکٹر مسلمان تھے۔ اور ایک اعلیٰ پایہ کے ڈاکٹر ہونے کے باوجود اوپری سائے پر کسی حد تک یقین رکھتے تھے۔ فرمانے لگے میرا خیال بھی یہی ہے کہ اس لڑکی کو اوپری سایہ ہے آپ کچھ دن اور دیکھئے اگر حالت ایسی ہی رہی تو پھر کسی بزرگ وغیرہ سے مشورہ کیجئے گا۔

ملتان چھاؤنی گجر کھڈہ میں ایک لیڈی ڈاکٹر مس سالومن کی ان دنوں بڑی شہرت تھی۔ اس وقت اس لیڈی ڈاکٹر کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔ میرے ان سے بھی اچھے تعلقات تھے (انجیل انہوں نے ہی مجھے ذہن نشین کرائی) میں نے مس سالومن سے اپنی بہن کا ذکر کیا تو کہنے لگیں کہ کل جمعرات ہے اسے میرے پاس لانا۔

گرمی کا موسم تھا شام کے چھ سات بجے ہم دونوں بہن بھائی مس سالومن کی کوٹھی پر گئے تو وہ لونگ، گھٹوار ہی تھیں گرمی کے موسم میں یہ ہر روز لونگ، بادام چاروں مغز اور دودھ پیتی تھیں۔ مس سالومن نے اپنے خواجہ سرا ملازم سے کہا کہ وہ ایک اپلے پر دہکتے ہوئے کوئلے لائے۔ پندرہ بیس منٹ میں ملازم اپلے کے ٹکڑے پر دو دہکتے ہوئے کوئلے رکھ لایا۔ تو سالومن صاحبہ نے پسی ہوئی لال مرچوں کی ایک چٹکی ان کوئلوں پہ ڈال کر میری بہن کے ناک کے پاس لے جا کر مرچوں کی دھونی دی۔ ہم سب کا کھانسی سے برا حال تھا یہاں تک کہ ہم سب کمرے سے باہر آ گئے۔ مگر سالومن صاحبہ اپنے ناک پہ کپڑا رکھے یہ عمل کرتی رہیں اور میری بہن کو ایک چھینک تک بھی نہ آئی جب نصف پون گھنٹے کے بعد کمرے اور کوٹھی کے صحن سے مرچوں کی ناقابلِ برداشت دھونی کا اثر ختم ہوا تو مس سالومن فرمانے لگیں بھائی صاحب آپ کی بہن کو سو فیصدی اوپری اثر ہے۔ لہٰذا اس کا ڈاکٹری علاج نہ کرائیے بلکہ کسی بزرگ سے رجوع کیجئے مس سالومن کے اس فتوے سے مجھے فکر ہوئی اور گھر آ کر میں نے ماں سے کہا کہ آپ بیشک تونسہ شریف لوٹ جائیں۔ معاملہ وہی ہے جس کا شک تھا۔ میں مناسب معالج مل جانے پر اس کا علاج کراؤں گا دوسرے دن میری والدہ تونسہ شریف روانہ ہو گئیں اور میں اپنے

کام کاج میں لگ گیا۔

میں نے اپنے احباب سے اس سلسلے میں تاکید کر دی کہ اگر ان کو کسی ایسے معالج کا پتہ معلوم ہو سکے تو مجھے مطلع کر دیں۔ میری بہن کو دورے زیادہ تعداد میں پڑنے شروع ہو گئے۔ کبھی کبھی تو دن میں کئی کئی بار ایسا ہوتا ورنہ دن بھر میں ایک بار ضرور ایسا ہوتا اور خصوصاً جمعرات کو دوروں کی تعداد زائد رہتی۔ بیٹھے بٹھائے یا کیسی بھی حالت میں ہوتی یہ دورے پڑ سکتے تھے۔ ہاتھ کی مٹھیاں اتنی مضبوط بھنچ جاتی تھیں کہ کوئی طاقت انہیں کھول نہیں سکتی تھی۔ بے ہوشی مکمل طور پر چھا جاتی اور دس پندرہ منٹ کبھی آدھ پون گھنٹے اور کبھی ایک ڈیڑھ گھنٹہ میں بے ہوشی کا یہ دورہ اپنے آپ ختم ہو جاتا اور جب مٹھیاں کھلتیں تو چھوٹی الائچی کبھی دو کبھی تین اور کبھی چار کی تعداد میں ان میں سے برآمد ہوتیں۔ تما جھوٹ نہ بلوائے ہم نے ایسی لمبی اور بہترین الائچی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی دیکھنے والوں نے بتایا کہ یہ الائچی ہانگ کانگ میں ہوتی ہے۔ ہم ڈر کے مارے ان الائچیوں کا استعمال نہیں کرتے تھے مگر ایک دن میری بہن نے بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ بھابی وغیرہ تو مجھ سے ڈرتی ہیں کیا تم بھائی ہو کر بھی ڈرتے ہو۔ میرا ذمہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ یہ الائچیاں تم کھا لیا کرو۔ میں نے اندر سے ڈرتے ڈرتے مگر ظاہری طور پر اپنی بہن کی بات رکھتے ہوئے اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ میں تم سے یا ان الائچیوں سے ہرگز نہیں ڈرتا اس کے سامنے ہی ایک الائچی منہ میں ڈال لی اور اس کے بعد یہ عالم رہا کہ جب بھی یہ الائچیاں مٹھی میں سے برآمد ہوتیں میں بے تابی سے انہیں کھا جاتا۔ دو تین مُلّا مولوی آئے کچھ نے آیات پڑھیں اور کچھ نے آسیب نکالنے کے لئے ثابت ماش بکرے کی کلیجی سالم مولی کالا دھاگہ وغیرہ سے کچھ ٹونے ٹوٹکے کئے۔ مگر جو مولوی قرآن کی آیات پڑھتے وہ تو خیریت سے چلے جاتے مگر جن ملاؤں نے ڈھونگ رچائے ان کی میری بہن کافی بے عزتی کرتی اور وہ ایسی ڈراؤنی شکل بنا کر ان کو بُرا بھلا کہتی کہ ہمیں خود بُرا لگتا۔ مگر وہ مُلّا مولوی پھر تشریف نہ لاتے۔

۴۷ء آگیا اور ملک کی تقسیم کی مصیبت نازل ہوئی۔ شروع اگست میں نواب عاشق حسین کو لاہور میں ایک پولیس مین نے گولی مار دی تو سارے ملتان میں خوف و ہراس چھا گیا۔ پاکستان بننے کا اعلان ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے ملتان میں آتش زنی وغیرہ کے واقعات ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مگر بھلا ہو ریڈیو والوں کا کہ بہت جلد قاتل کے نام کا اعلان کر دیا گیا اور ملتان کے غیر مسلموں نے شکر کا سانس لیا۔ اسی روز میری بہن کو بڑا طویل دورہ پڑا اور میں پاک دروازہ سے ایک مولوی صاحب کو بلانے کے لئے جانا چاہتا تھا مگر شہر میں جو خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا اس کے پیش نظر میری بیوی نہیں چاہتی تھی کہ میں گھر سے باہر جاؤں مگر میں اپنی بہن کی غیر حالت دیکھ کر خاموش نہ رہ سکا اور بیوی کے منع کرنے پر بھی گھر سے نکل گیا۔ ابھی میں چاہ بوہڑ والا کی مین سڑک پر بھی نہیں گیا تھا کہ میری بیوی بھاگتی ہوئی اور ہانپتی ہوئی مجھے آوازیں دیتی ہوئی دکھائی دی۔ معلوم کرنے پر اس نے بتایا کہ ستیا کی بے ہوشی جاتی رہی ہے اور اس نے کہا ہے کہ بھائی کو بُلا لو پاک دروازہ پر ابھی ابھی دو آدمیوں کا قتل ہوا ہے۔ میں واپس آگیا اور شام کو معلوم ہوا کہ واقعی پاک دروازہ پر اسی وقت دو غیر مسلم دوکاندار قتل کر دیئے گئے تھے۔ اب ہم نے بھی پاکستان سے ہندوستان آنے کی تیاریاں شروع کر دیں کہ میرا لڑکا پریم ساگر جو ملتان چھاؤنی کے کانونٹ بورڈ میں پڑھتا تھا اور اس کی عمر اس وقت چھ سات سال ہوگی سکول سے گھر آرہا تھا کہ ملٹری ٹرک نے اسے ٹکر ماری اور اس کی بائیں ٹانگ کی ہڈی توڑ دی۔ ملٹری والے اسے ٹرک میں ڈال کر ملٹری ہسپتال لے گئے۔ جوں ہی ہمیں معلوم ہوا میں اور میری بیوی دیوانہ وار ملٹری ہسپتال تانگے پر پہنچے۔ مگر وہاں جانے پر پتہ چلا کہ ہسپتال والوں نے ضروری کارروائی کرنے کے بعد بچے کو سول ہسپتال ملتان شہر بھجوا دیا ہے۔ چنانچہ ہم نے تانگے والے سے سول ہسپتال جانے کو کہا تو اس نے کہا کہ راستہ میں ہندو محلے پڑتے ہیں میں نہیں جاؤں گا۔ میں مسلمان ہوں کوئی مجھے مار دے گا۔ بڑی مشکل سے اسے اس بات پر راضی کیا گیا کہ اچھا ہمیں وہاں تک چھوڑ دے جہاں تک تم اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہو اس نے بوہڑ دروازہ پر لاکر چھوڑ دیا وہاں سے ہم پیدل ہی سول ہسپتال پہنچے۔ ہسپتال کے انچارج مسلمان ڈاکٹر میرے واقف کار تھے۔ ان سے ملا تو پتہ چلا کہ جو کچھ وہ کر سکتے تھے انہوں نے کر دیا ہے اور لڑکا جنرل وارڈ میں بستر پر ہے اور اس کی ٹانگ کو ویٹ باندھ کر لٹکا دیا گیا ہے۔ اب ہماری پاکستان سے بھاگنے کی سب تیاریاں ماند

پڑ گئیں اور ۲۱ دن تک ہسپتال میں ہپتال کی دیکھ بھال کے لئے رہنا پڑا قدرت نے یہ کرم مزید کیا کہ ان دنوں میں میری بہن کو کوئی دورہ نہیں پڑا۔ اور وہ روٹی وغیرہ پکا رکھتی۔ اور گھر کا سارا کام کاج کر رکھتی۔ ان دنوں میں ہم اپنی پریشانی کے باعث اس کی طرف کوئی دھیان نہ دے سکے اور نہ ہی اس کا کوئی علاج کرایا مگر یہ بالکل ٹھیک رہتی جس سے ہم نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر اس کا علاج نہ کرایا جائے تو یہ اچھی رہتی ہے اور اگر علاج کرایا جاتا ہے تو اسے دورے وغیرہ زیادہ پڑتے ہیں۔

میرا چھوٹا بھائی ان دنوں ملتان میں ہی محکمہ پولیس میں تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اہل وعیال کو لے کر ہندوستان چلا جاؤں وہ والدہ صاحبہ اور والد صاحب کو تونسہ شریف کیمپ سے لیکر ہندوستان آجائے گا۔ چنانچہ میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ ۲۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دہلی آگیا۔ اور ایک سال بعد میری بہن کی شادی شری لوک ناتھ پٹواری سے کر دی گئی کیونکہ کچھ ڈاکٹروں نے ہمیں یہ صلاح دی کہ اگر اس لڑکی کی شادی کردی جائے تو ہو سکتا ہے یہ دورے وغیرہ پڑنے ختم ہو جائیں۔ مگر ہوا یہ کہ شادی کرنے کی دیر تھی کہ میری بہن کی حالت ایسی بگڑی کہ وہ گھنٹوں ہوش میں نہ آتی۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد خون کی اُلٹی۔ بہرکیف اب یہ اپنے خاوند کے ساتھ کشمیری گیٹ جس بلڈنگ والے سرکاری کوارٹرز میں رہنے لگی۔ مگر اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی گئی۔ اس کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی اور اس کے دو سال بعد لڑکا پیدا ہوا۔ اگر وہ کسی کام کے لئے مکان کو تالہ لگا کر باہر جائے تو جب تالہ کھولے تو کمرہ میں جوت جل رہی ہوتی۔ آٹے کا دیا ایسا خوبصورت ڈیزائن سے بنایا ہوتا جیسے کسی انجینیئر نے بنایا ہوا ور اس میں اصلی گھی ہوتا اور جوت جل رہی ہوتی۔ یہ بے چارے ڈالڈہ گھی کھاتے تھے ان کے گھر میں اصلی گھی ہوتا ہی نہیں تھا۔ اگر کوئی مہمان آجائے تو رسوئی میں خود بخود پکا پکایا کھانا آجائے۔ عجیب وغریب واقعات ہونے لگے چھوٹی بچی گم ہو گئی۔ تھانے میں رپورٹ لکھائی گئی مگر چار دنوں کے بعد دیکھا کہ لڑکی اپنے آپ گھر کے آنگن میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اور اس کے پاس بڑے اچھے اچھے کپڑے بسکٹ مٹھائی وغیرہ کا بندھا ہوا پیکیٹ رکھا ہے لڑکی سے پوچھا گیا کہ تو کہاں گئی تھی کہنے لگی کہ ایک بابا تھا وہ کہیں لے گیا تھا۔ خوب مٹھائی دیتا تھا۔ آئس کریم لے کر دیتا تھا۔ ٹافیوں کا ڈبہ دیا ہے اور کہتا تھا کہ تو رو نہیں اور نہ ڈر میں تجھے تمہارے ماں باپ کے پاس چھوڑ آؤں گا۔ جب بھی میں روتی تو فوراً نیند آجاتی تھی تھانے پر اطلاع دی گئی کہ لڑکی آگئی ہے اور وہ یہ بیان دیتی ہے۔ پولیس والوں نے کپڑے مٹھائی وغیرہ دیکھی اور چپ ہو رہے۔ پھر یہ معمول ہو گیا کہ ہر دس بیس دنوں کے بعد لڑکی گم ہو جاتی اور ایک یا دو دن کے بعد آجاتی اور سامان سے لدی پھندی ہوتی۔

جب میں اپنی بہن کے ہاں جاتا تو لازمی طور پر کوئی نہ کوئی چیز دھڑام سے گرتی۔ کبھی لمبے لمبے چھوہارے ہوتے کبھی چھوٹی الائچیاں وہی جو ملتان میں آتی تھیں۔ کبھی سردیوں میں آم۔ کبھی کوئی ایسا پھل جس کا نہ ہمیں نام معلوم ہوتا اور نہ اس کے کھانے کا ہمیں کبھی تجربہ ہوا ہوتا میرا بھائی ان سب باتوں کو ڈھونگ سمجھتا تھا میرے بھائی شری دھرم پال سب انسپکٹر سی آئی ڈی فیروز پور جھرکا ضلع گوڑگانواں ایک دن میرے ساتھ ستیا کے مکان پر گئے تو ستیا نے عجیب سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا کہ آج تو میرے بھائی کو تنخواہ ملی ہے۔ اور پانچ پانچ روپے کے نئے نئے نوٹ ملے ہیں۔ میری بہن کہنے لگی کہ ان میں سے یہ ایک نوٹ ہے اپنے نوٹ گن لو یہی نوٹ کم ہوگا۔ میرے بھائی نے سرکاری وردی پہن رکھی تھی جیب کا بٹن کھولکر نوٹ نکالے تو واقعی وہ سب پانچ پانچ کے تھے اور بالکل نئے اور سلسلہ وار نمبر کے تھے۔ دیکھا تو واقعی اس نمبر کا نوٹ جیب میں نہ تھا۔ جو میری بہن نے واپس کیا۔ ابھی ہمیں بیٹھے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ دھڑام سے ایک پیکٹ گرا۔ میری بہن نے کھولا تو اس میں بہترین قسم کے بسکٹ تھے۔ چائے میری بہن نے بنائی اور ہم دونوں بھائیوں نے یہ بسکٹ مزے سے چائے کے ساتھ کھائے جب چلنے لگے تو ستیا کہنے لگی بھائی دھرم پال جی آپ ان باتوں کو ڈھونگ کہتے اور سمجھتے ہو۔ اموری گیٹ کی فلاں دوکان پر جاؤ اور دریافت کرنا کہ یہ بسکٹ کون لے گیا تھا۔ ہم دونوں بھائی اس دوکان پر پہنچے تو سامنے ہی شیشے کی مرتبان میں وہی بسکٹ موجود تھے۔ ہم نے دوکاندار سے پوچھا کہ ابھی آدھ پون گھنٹے پہلے یہ بسکٹ کون لے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک بوڑھا آدمی آیا تھا اور سوا روپیہ کا پاؤ بھر لے گیا تھا (ان دنوں کلوگرام کا سلسلہ نہیں تھا)۔ —— (باقی آئندہ)

گوشۂ عقیل صدیقی

مشاعرۂ نمائش مظفر نگر

کریم الاحسان

نمائش مظفر نگر امسال نومبر ۸۰ء کے آخری ہفتہ سے شروع ہوئی جب کہ اپریل یا مئی میں ہوا کرتی ہے کئی مجبوریاں اور کئی وجوہات تھیں دارالعلوم دیوبند کا صدسالہ جشن، مظفر نگر میں تبلیغی اجتماع اور پھر بجلی کی کمی وغیرہ۔

سادات ہوسٹل سے برادرم دانش علیگڈھی اور موقس بریلوی کے ہمراہ مشاعرہ کے پنڈال میں جو کہ نمائش میں واقع ہے آگیا ہوں۔ آج ۹ دسمبر ۱۹۸۰ء کی برفیلی رات ہے پنڈال میں شیدائے مشاعرہ جمے اور ڈٹے بیٹھے ہیں۔ اسٹیج پر دیکھا کہ مقامی شعراء آج اپنے ارمان پورے کر رہے ہیں اور خوب خوب شمار رہے ہیں چونکہ مجوزہ صدر جناب خورشید عالم خاں یونین اسسٹنٹ منسٹر برائے کامرس ابھی تشریف نہیں لائے ہیں اس لئے ابھی مشاعرہ بے صدارت ہی چل رہا ہے سردی کی یہ برفیلی رات اور فرش پر بیٹھنا دو بھر ہو رہا ہے لہٰذا یار لوگ تالیوں اور ہلڑ بازی سے منتظمین مشاعرہ کو توجہ دلا رہے ہیں کہ اب بہت کچھ ہو چکا مشاعرہ شروع کرایا جائے۔ کب تک یہ تفریح اور دل لگی چلیگی اور یہی تاڑتے ہوئے اٹھا ہے جناب الحاج مظہر صاحب کنوینر مشاعرہ صدارت کے لئے چودھری شفقت جنگ سابق ایم پی کا اسم گرامی پیش کر رہے ہیں جس پر تالیوں سے اظہار خوشنودی کیا جا رہا ہے ابھی یہ اعلان ہوا ہی تھا کہ کمشنر صاحب اور کلکٹر صاحب مظفر نگر تشریف لے آئے ہیں اور چودھری شفقت جنگ صاحب صدارت کے لئے کمشنر صاحب کا نام نامی پیش کر رہے ہیں۔ اس پر بھی تالیاں گونج اٹھی ہیں کمشنر صاحب سٹیج پر جلوہ افروز ہوگئے ہیں آپ کے ساتھ ہی کلکٹر صاحب چودھری شفقت جنگ اور سعید مرتضیٰ صاحب تشریف فرما ہیں لیجئے مظہر صاحب نے یہ اعلان کیا ہے کہ اس مشاعرہ کی نظامت والی آسی فرمائیں گے پھر والی صاحب شعرائے کرام کے اسمائے گرامی شکر ضلع کے مشہور شاعر سلیم کھتولوی سے درخواست غزل کر رہے ہیں سلیم صاحب غزل سرا ہیں ؎

مسکراتے ہوئے جو دار تک آپہونچے ہیں
وہ تجلی رخِ یار تک آپہونچے ہیں

نئی غزل سنائیے — آوازیں — غزل اور بیوی کبھی پرانی نہیں ہوتی — سلیم صاحب چیخ رہے ہیں — اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے — ارشاد ہوا ہے ؎

المدد ننگِ وفا رازِ درونِ سینہ
رفتہ رفتہ لبِ گفتار تک آپہونچے ہیں

کیا ڈرائے گا انھیں خوف شکستہ پائی
گرتے پڑتے جو در یار تک آپہونچے ہیں

جن کے پھونکے تھے کبھی تو نے نشیمن صیاد
اب وہ شعلے تری دیوار تک آپہونچے ہیں

سلیم صاحب فرما رہے ہیں کہ بھائی والی صاحب اس سلسلہ میں مجھے ہی قربان کر دیں گے مجھے یہ علم نہیں تھا اس لئے میں غزل کا انتخاب نہ کر سکا! اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا ہے اور سلیم صاحب کو لایا جا رہا ہے (سلیم صاحب نابینا ہیں) اور والی صاحب مسکرا کر شمیم دیوبندی کو زحمتِ سخن دے رہے ہیں۔ شمیم صاحب فرما رہے ہیں ؎

مجھے ساقیا اب نشہ دے تمامی + وگرنہ ہے بہتر مری تشنہ کامی
مے خواروں کی غفلت تو دیکھو + جنہیں بجلیاں دے رہی ہیں سلامی

لیجئے ہلڑ بازی شباب پر ہے اور شمیم صاحب مائک سے کھسک آئے ہیں ادھر مظفر نگر کے صحافی و مترنم شاعر نجم صاحب کو دعوتِ غزل دی جا رہی ہے نجم صاحب فرما رہے ہیں ؎

تیری نظروں کا اشارہ جو نہ پایا ہوتا
میں نے یہ بارِ محبت نہ اٹھایا ہوتا

آج خلافِ توقع نجم صاحب کو مطلع ہی سے داد دی جا رہی ہے ویسے داد اس مطلع کا حق ہے۔ ارشاد ہوا ہے ؎

رہے ہیں اور تمنّا صاحبہ کہہ رہی ہیں سہ

کہاں کی دوستی کیسا خلوص کیسی وفا
حیات پائی ہے ہم نے فریب کھانے کو

یہ تو صحیح ہے ـــــ یاد صاحبہ مسکرا کر کہہ رہی ہیں دوسری غزل کے لئے پھر ایک شور و غل ہے اور آپ نے ایک غزل کچھ ایسے ترنم سے چھیڑی ہے کہ ردیف کیا کیا جائے تو سمجھ میں آتی ہے اور باوجود کوشش کے کوئی شعر نوٹ نہ کر سکا یا تو سیٹیوں اور تالیوں سے غزل کی فرمائش ہو رہی تھی یا پھر جانی میاں اڑ رہے ہیں غزل ہی ایسی دھن میں الاپی گئی کہ سامعین کو لطف ہی نہیں آیا اور اس پاؤ ہوا اور تفریح کے ماحول میں والی آسی لکھنوی نہایت اعتماد سے عطا کر رہے ہیں سہ

یوں تو ہنستے ہوئے لڑکوں کو بھی غم ہوتا ہے
کچی عمروں میں مگر تجربہ کم ہوتا ہے
اس طرح روز ہم انھیں خط لکھ دیتے ہیں
نہ تو کاغذ نہ سیاہی نہ قلم ہوتا ہے

تم نے اک شام چراغوں سے سجا رکھی ہے
شرط لوگوں نے ہواؤں سے لگا رکھی ہے
ہم بھی انجام کی پرواہ کہاں کرتے ہیں
جان ہم نے بھی ہتھیلی پہ اٹھا رکھی ہے
شاید آ جائے کوئی ہم سے زیادہ پیاسا
بس یہی سوچ کے تھوڑی سی بچا رکھی ہے

والی صاحب اور داد ـ لازم و ملزوم لہذا ہر شعر پر داد کے ڈونگرے برستے رہے اور آپ داد لوٹ کے اپنی جگہ آ کر مونس بریلوی سے درخواست کلام کر رہے ہیں. مونس صاحب سادگی سے فرما رہے ہیں سہ

یوں تو ہر سال جلا کرتی ہے ہولی لیکن
کاش بھارت میں کسی سال جلے وہ ہولی

جس میں یہ فرقہ پرستی کا چلن جل جائے
اونچ اور نیچ کا زہر یلا یہ پن جل جائے
ڈھول نفرت کی ہر جس میں وہ پہلا جل جائے
پیار کی بو نہ دے خوشبو وہ چمن جل جائے
کاش بھارت میں کسی سال جلے وہ ہولی

آگ پھر آگ ہے جل جائے اگر آگ کا بس
آگ کے شعلوں میں انسان بھی جاتے ہیں جھلس
چاہے مسجد کے ہوں مینار یا مندر کے کلش
دوستو آگ کسی شے پہ نہیں کھاتی ترس
پیار کے رنگ سبھی گھولو کے [illegible]
دوستو کود پڑو آگ کے اس جنگل میں

تعجب ہے کہ اس تفریحی پنڈال میں مونس صاحب کو کیسے [illegible] اب ایک غزل سُننے مشہور و معروف شاعر دانش علیگڑھی سے ـ [illegible] ہوا ہے سہ

آنکھوں میں نہاں ہوں کبھی ہونٹوں پہ عیاں ہوں
میں خون کی طرح آپ کی رگ رگ میں رواں ہوں
جس نے تری محفل کو نیا حسن دیا ہے
اس پیار کے بجھتے ہوئے دیپک کا دھواں ہوں
تو ڈھونڈنا چاہے تو مجھے ڈھونڈ لے اے دوست
میں تو تری ہاتھوں کی لکیروں میں نہاں ہوں

دانش صاحب بھی داد پا کر اپنی جگہ آ رہے ہیں اور [illegible] دانش صاحب کا تعارف کرایا کہ ان کی کتاب "قلم کا سفر" [illegible] صاحب کی خدمت میں پیش کی جسے انھوں نے قبول کرتے ہوئے فرمایا میں ان کو جانتا ہوں دیکھا تو فوراً نہوری الکاپ [illegible] سہ

بات کیا تھی جو پہلی ملاقات میں
آپ کا ہو گیا بات ہی بات میں
تیرگی چاہے کتنی بڑھے رات میں
غم کو کیا فکر جب تو ہے ساتھ میں

اُدھر وہی بھیڑ سے نوجوان من چلے بے تکے [illegible] کوئی نئی غزل سناؤ. پھر کلکٹر صاحب مائک پہ جا کر فرما رہے ہیں میں نے سنا تھا کہ یہاں کے ادب نواز شعراء کو سنتے ہیں لیکن [illegible] نہیں دیکھ رہا ہوں. یہ آنے والے مہمان شعراء کیا کہیں گے انھیں [illegible] [illegible]. ویدی دیال جی للہ جی سے خاص طور سے درخواست کر رہا ہوں

نور صاحب اندر کا الاپ رہے ہیں۔

جہاں سب کے ہاتھوں میں پتھر ملیں گے
اسی شہر میں کانچ کے گھر ملیں گے

اس قافیہ کی داد دیجئے محترمہ ـــ نور صاحب یاد کو مخاطب کر کر رہے ہیں ـــ یہ داد لینے کا طریقہ کیا ہے ـــ یاد صاحبہ نے بے نیازی سے فرمایا اور آج نور صاحب سے پڑھا بھی تو نہیں جا رہا ہے پھر وہ حسب دستور چیخ رہے ہیں ؎

محبت کے موتی زمانے میں بانٹے
خبر کیا تھی بدلے میں پتھر ملیں گے
کہاں اس برس غنچہ و گل چمن میں
پرندوں کے ٹوٹے ہوئے پر ملیں گے
چلو ر نور صاحب سے آتے ہیں مل کر
وہ مغرب سے پہلے تو گھر پہ ملیں گے

چونکہ نور صاحب کسی اور ہی عالم میں تھے اس لئے آج وہ جمے نہیں لہٰذا خراماں خراماں پلٹ رہے ہیں اور والی صاحب نہایت مناسب الفاظ میں تعارف فرما کر درخواست کلام کر رہے ہیں بوگس سہ آبادی سے۔ بوگس صاحب نے مائک پر آ کر آداب عرض کیا اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا اور پھر سنجیدگی سے عطا کر رہے ہیں ؎

ایک لڑکے نے یہ جھنجھلا کے کہا ابا سے
الو الو نہ ہر وقت مجھے ابا کہئے
آٹھ نو سال کا بچہ نہیں ہوتا الو
میں تو بچہ ہوں مجھے الو کا پٹھا کہئے

لیجئے پنڈال میں ایک شور اور غل غپاڑہ ہے یہ شور ذرا کم ہوا تو بوگس صاحب، یوں حضرت غالب پہ ہاتھ صاف کر رہے ہیں کہ دوسرا مصرعہ غالب کا لیکر اس پہ پہلا مصرعہ اپنے رنگ کا چسپاں کیا ہے اور یہ کس قدر اہم اور بڑی بات ہے۔ داد واہ اور شور غل کو چھوڑیئے یہ منفرد اشعار سنئے ؎

ہو گئیں اللہ کو پیاری وہ جب ماں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں
بیویاں مر تی گئیں میں شادیاں کرتا گیا
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

دوسری دلہن بھی آ جائے مرے گھر میں اگر
میں نہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں
کر رہی تھیں کل کلب میں رقص چند اک لڑکیاں
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
رکھ دیا تھا ایک دن ظالم نے میرے دل پہ ہاتھ
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں
یوں ہی گر بڑھتی گئی بوگس سخن گویوں کی بھیڑ
دیکھنا ان بستیوں کو اک دن کہ ویراں ہو گئیں

ہر شعر پر وہ دھماکے اور ہلڑ بازی رہی کہ بس کچھ نہ پوچھئے اور آپ اسی سنجیدگی اور پُروقار انداز سے محفل کو قہقہوں پہ آمادہ کر چلے ہیں ارشاد ہوا ہے ؎

وہ دلہن ہماری تھی جو اسے بھی پیار ہوتا
یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
نہ ہوا تقرر اپنا اسی غم میں مر گئے ہم
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
کوئی چاند کا مسافر وہیں جا کے مر بھی جاتا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

ایک اور ایک اور کے غل غپاڑہ میں بوگس صاحب چپ چاپ آ رہے ہیں اور اس ہلڑ بازی میں نگار بارہ بنکوی آ کر غزل سرا ہیں ؎

سر پھرے تلوار کی باتیں کریں + آؤ ہم تم پیار کی باتیں کریں
رہنما رہزن سے بھی شرمائے گا + ہم اگر کردار کی باتیں کریں
شیخ ہم کیا دیکھ لیں تو آپ بھی + صرف حسن یار کی باتیں کریں

نگار صاحب مناسب داد وصول کئے چلتے بنے اور اب آ رہے ہیں گوشن بہاری نور لکھنوی۔ فرمائشوں کو نظر انداز کر کے عرض کر رہے ہیں ؎

گلستاں سے آئے چاہے ویرانے سے آئے
نور آواز محبت دل کے کاشانے سے آئے
ہندو مسلم میں ایسا ربط ہونا چاہئے
ہر اذاں کعبہ کی تو آواز بتخانے سے آئے

بر خلاف معمول ایک طویل نظم ادھوری ہی سنا کر پلٹ رہے ہیں اور وہ اس لئے کہ آپ تو غزل گو شاعر ہیں لہٰذا غزل سنانے برابر

ازیں بلند ہوتی رہیں لیکن آپنے ممنی ان سُنی کرتے ہوئے آج
ب اچھی نظم پیش کی مگر اس کا کیا علاج کہ آپ کی غزل پر اسس
تے کے سخن فہم مرتے ہیں ایسی نظمیں رسائل و اخبارات کے لئے
زوں ہوتی ہیں نہ کہ مشاعرہ میں بھی سُنائی جائیں بہرکیف
ر صاحب کے اس انداز سے سامعین کو بڑی کوفت اور مایوسی
ئی جب کہ مظفر نگر کے سامعین ان کی غزلوں پر والہانہ فدا
ر دیوانہ وار شیدا ہیں آئیے پھر ایک حسین غزل الحاج شمیم جے پوری
یے سنئے سے

میں ترے لمس کا احساس لئے بیٹھا ہوں
دُور رہ کر بھی تجھے پاس لئے بیٹھا ہوں
غیرتِ تشنہ لبی نے مری عزت رکھ لی
لب دریا ہوں مگر پیاس لئے بیٹھا ہوں
تشنگی پھونک نہ ڈالے ترے میخانے کو
آج ساقی میں بڑی پیاس لئے بیٹھا ہوں

شمیم صاحب داد لوٹتے مائک سے کھسک چلے ہیں اور ادھر فرمانشوں کا
ہنگامہ ہے اور آپ ایک پُرانی غزل سے

سوزِ دل سوزِ جاں سوزِ غم زندگی
اصل میں انہیں ... ہے اہم زندگی

سُنا کر آرہے ہیں غالباً آج شمیم صاحب کا موڈ خراب تھا
اور سننے والے بھی کسی اور رنگ اور عالم میں دکھائی دیتے ہیں
سی شاعر کو ڈھنگ سے نہیں سُنا جا رہا ہے یہ انداز صریحاً غلط ہے
اراکین مشاعرہ نے تو شعراء کا انتخاب لاجواب کیا ہے بلکہ یہ کہئے
ہمت اور گنجائش سے کہیں بڑھ چڑھ کر شعراء کو مدعو کیا ہے لیکن اس
کور ذوقی اور تفریح کو کیا کیا جائے آئیے ذرا موڈ بدلئے اور شاہجہاں
بانو یاد سے یہ حسین غزل سنئے سے

نہ غزل نہ پڑھا کیجئے باتیں نہ کیا کیجئے
حالات یہ کہتے ہیں خاموش رہا کیجئے
جا جا کے پلٹ آنا اچھا بھی نہیں لگتا
بے سوچے کسی جانب ایسے نہ بڑھا کیجئے
اب اس کے سوا کیا ہے انجام وفاؤں کا
برسات کی راتوں میں خاموش جلا کیجئے

پھر کلکٹر صاحب مائک پر آکر فرماتے ہیں محترمہ لکھنؤ سے آئی ہیں
ہم نے انھیں بُلایا ہے۔ آپ سُنئے لیکن آج چند ممبر پیروں نے
مشاعرہ کو اُڑانے کی قسم کھا رکھی ہے اور ذرا بھی نہیں سوچتے کہ
یہ ضلع یا شہر کی بدنامی اور مشاعرہ کمیٹی کی رسوائی ہے ایسا لگتا
ہے کہ یہ بکواس کسی پلان کے تحت ہو رہی ہے یاد صاحبہ جلیٹ آئی ہیں
اور دوبارہ بُلانے پر بھی وہ نہیں جا رہی ہیں اور اب الحاج شمسی مینائی
آکر حسب دستور لیں گے اور برس رہے ہیں ایسے مجمع کے کہ
یہ پُرانے قطعات ہیں ہو سکتا ہے آپ کے لئے نئے ہوں بہرحال سُن لیجئے
سے

موت کا وقت آگیا جس دم
ایک لمحہ کوئی ہٹ نہیں سکتا
جان دیتے تھے اس پہ کتنے لوگ
جان اس کی کوئی بچا نہیں سکتا

چین مل جائے مرے دل کو یہ کیا مشکل ہے
دل سے یہ بات کبھی تو نے بھی چاہی ہوتی
دوستی کا یہ حسیں خواب دکھانے والے
دُشمنی تو نے سلیقے سے نبا ہی ہوتی

غم دیئے ہیں حیات نے ہم کو۔ ہم سے غم نے حیات پائی ہے
مر بلانے مرے قدم چومے ۔ تیرے غم کی بھی کیا رسائی ہے
پھر شمسی صاحب نے ایک ایسی طویل نظم تاج محل شروع کی کہ جب وہ ختم
ہونے میں نہ آئی تو ایک آواز بلند ہوئی فرمائش کرنے والے تو کبھی
کے چلے گئے لیکن داد دیجئے قبلہ شمسی صاحب کو کہ نظم پوری ہی سُنا
کر ہٹے اور اس سے بے نیاز کہ کوئی سُن رہا ہے کہ نہیں۔ خدا خدا
کرکے نظم ختم کی تو یار لوگ بھی کھسک چکے تھے اور اب آرہے ہیں
مشہور فلمی نغمہ نگار کیف بھوپالی۔ تالیاں شباب پر ہیں اور آپ
راجہ بنے مائک پر آکر پہلے چند کلمات عنایت کر رہے ہیں۔ اور میں حضرت
جگر مرحوم کے اس شعر سے لطف اندوز ہو رہا ہوں سے

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

محترم کیف صاحب یوں اپنے مخصوص ترنم اور انداز سے غزل سرا ہیں سے

ہائے لوگوں کی کرم فرمائیاں
تہمتیں۔ بدنامیاں۔ رسوائیاں

زندگی شاید اسی کا نام ہے
دوریاں ۔ مجبوریاں ۔ تنہائیاں
کیا زمانے میں یونہی کٹتی ہے رات
کروٹیں ۔ بیتابیاں ۔ تنہائیاں

پاس بیٹھے ہوئے خمار صاحب فرما رہے ہیں بیتابیاں نہیں بیماریاں ۔ اس پر آواز کا بیٹھتے ہوئے بُرا حال ہے اور کیفیت لہرا رہے ہیں ؎

کیا یہی ہوتی ہے شامِ انتظار
آہٹیں ۔ گھبراہٹیں ۔ پرچھائیاں
میرے دل کی دھڑکنوں میں ڈھل گئیں
چوڑیاں ۔ موسیقیاں ۔ شہنائیاں
کیفیت پیدا کرو سمندر کی طرح
وسعتیں ۔ خاموشیاں ۔ گہرائیاں

داد و تحسین یا ہُلڑ بازی کا عالم نہ پوچھئے من چلے اور قلم زدہ تالیوں پر آئے ہیں اور اب آپ رضیہ سلطانہ فلم کا اپنا لکھا ہوا ایک ... رنگ دے ایک بار سنا کر خراماں خراماں آ رہے ہیں ادھر والی صاحب درخواستِ کلام کر رہے ہیں شہریار غزل خمار ... سے خمار صاحب کو سننے کے لئے پنڈال ہمہ تن گوش ہے ... سکوت اور پنڈال کا جائزہ لیکر یوں غزل سرا ہیں ؎

عشق میں آسرا دینے والے ✦ مجھے بھیڑ میں راستہ دینے والے
بے خبر حالات کا ہے یہ ورنہ ✦ بڑے باوفا تھے دغا دینے والے
اس طرح دو دن تو جی کر دکھائے ✦ مری میکشی کو ہوا دینے والے
... اک ایسے تیری دوا پوچھتے ہیں ✦ مجھے دردِ دل کی دوا دینے والے
... میں کیسے نہ کرتا خطائیں ✦ سنبھل کے سزا و جزا دینے والے
... نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے ✦ خفا ہو کے وہ مسکرا دینے والے
... کہیں بھی تو بدظن نہ ہوتا ✦ مجھے اپنے در سے اٹھا دینے والے

آپ حضرات خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب خمار صاحب سناتے ہیں تو داد و تحسین کیا عالم ہوتا ہے لہذا اب کیف ... سرور و کیف کے عالم میں مائک کی جانب لپک کر خمار صاحب سے بغلگیر ہو رہے ہیں اس پر تالیاں جاگ اٹھی ہیں اور اس پُرکیف منظر سے سامعین خوب محظوظ ہو رہے ہیں ادھر فرمائشوں کا ایک شور ہے ۔ اور آپ ایک پرانی غزل ؎

گذر اشباب دل کو لگانے کے دن گئے
.... اٹھانے کے دن گئے

سُنا کر محفل کو گرما کر تالیوں کے شور میں اپنی جگہ شاداں و فرحاں جھومتے ہوئے آ رہے ہیں اور آپ کے ساتھ ہی دو بج کر دس منٹ پر یہ مشاعرہ ختم ہو رہا ہے ۔ دوسرا دور سننے کے لئے یار لوگ تیار نظر نہ آئے کیوں کہ پہلا دور ہی بیدلی سے سُنا گیا جس کا احساس ہے کہ منتظمین مشاعرہ کی جدوجہد اور کوششوں کو چند سرپھرے اور گروہ بندی اُڑا کر رکھ دیتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ اس پارٹی بازی یا گروپ بندی میں ضلع کی بدنامی و رسوائی ہوتی ہے اس طرح سوچنا اور اس قسم کی حرکتیں کرنا قابلِ مذمت ہے ۔ اب میں اور کیا عرض کروں ۔ میں کلکٹر صاحب کے اس کہنا سے مطمئن تھا کہ کوشش کی جا رہی ہے امسال مشاعرہ مثالی ہو لیکن میں اس مشاعرہ کو ہرگز مثالی مشاعرہ نہیں کہہ سکتا شاید محترم کو یہ علم نہیں ہے کہ یہاں کے مشاعرے صبح تک چلا کرتے ہیں اس طرح دو بجے اللہ کو پیارے نہیں ہوا کرتے جناب مظہر صاحب نے شب و روز جو کوشش کی وہ اپنی جگہ قابلِ صد تحسین ہے مگر وہ ان سرپھرے لونڈوں کو کیسے رام کرتے جو شروع سے آخر تک پاؤ ہو اور چیخ ۔ پکار کرتے رہے بہرحال ان تمام ادب دشمنوں اور بدذوق لونڈوں کی مذمت کئے بغیر نہ رہوں گا جنہوں نے اچھے شعرا تک کو اڑانے کی کوشش کی یا ستم ہے کہ ملک کے مشہور شعرا تک کو اڑا دیا گیا ۔ یہ اردو کے ہمدرد ، شعر و سخن کے دلدادہ اور شعرا کرام کے مداح ہیں اور اس بدذوقی اور تفریح کا کیا جواب ہو سکتا ہے ۔

پھر ملوں گا ذرا سا دم لیکر

ڈی لٹ (اردو) اور شریمتی ثریا حسین

ڈاکٹر محمد انصار اللہ
شعبہ اردو
مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

علی گڑھ میگزین کا وہ شمارہ جسے شہریار صاحب نے مرتب کیا تھا میرے پیش نظر ہے۔ اس میں کہیں "ایسا اندراج نہیں معلوم ہوتا جس سے میں یہ متعین کر سکوں کہ یہ فلاں سال میں چھپا تھا۔ اس کے "حرفِ اوّل" میں یہ "مژدہ" سنایا گیا ہے کہ علی گڑھ تاریخ ادب اردو کی "دوسری جلد اشاعت کے لئے تیار ہو رہی ہے اور بقیہ جلدوں کی ترتیب کا کام بھی جاری ہے"۔ یہ بات ممکن ہے کہ صحیح ہو! البتہ میری معلومات کے مطابق پہلی جلد جیسی بھی چھپی تھی اب تک جلد ساز کے پاس سے واپس نہیں آ سکی ہے۔ شعبہ اردو میں کرسیٔ صدارت پر بیٹھنے والے یکے بعد دیگرے دو اشخاص جا چکے۔ معلوم نہیں کہ اس انقلاب کے بعد بھی دوسری اور بقیہ جلدوں کے "باقیات الصالحات" محفوظ بھی رہ گئے ہیں یا نہیں۔

شہریار صاحب نے اپنے "حرفِ اوّل" میں میگزین کے اس شمارے میں شامل بعض مضامین کا تعارف بھی کرایا ہے لیکن جس زمانے میں یہ میگزین انھوں نے مرتب کی تھی اس وقت "شریمتی" حسین یا ان کے مضمون کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہوئی تھی کہ ان کا ذکر بھی حرفِ اوّل میں کیا جاتا۔ بہرحال ان کا ایک مضمون "پیرس میں اردو" اس میگزین میں شامل ہے۔

شریمتی ثریا حسین کے نام کے ساتھ لفظ "ڈاکٹر" چھپا ہے اس کی کیفیت یہ سننے میں آئی ہے کہ شریمتی جی فرانس کی کسی یونیورسٹی سے اردو میں ڈی لٹ کی ڈگری لیکر آئی ہیں۔ اس روایت کی حقیقت کی جستجو ہمیں ان ہی کے مذکورہ مضمون کی روشنی میں کرنی ہے۔

شریمتی جی نے فرانس میں مشرقی زبانوں کی تعلیم دینے والے مدرسے کا نام اور اس کی جو تاریخ بیان کی ہے وہ غلط ہے۔ میرے سامنے اس مدرسے کا جو اب ایک انسٹی ٹیوٹ بن چکا ہے پراسپکٹس ہے۔ اس میں لکھا ہے کولبرٹ — (COLBERT) نامی ایک شخص نے ۱۶۶۹ء میں اسے قائم کیا تھا۔ تین برس بعد اس نے مدرسے کی باقاعدہ صورت اختیار کر لی اور اس کا نام مشرقی زندہ زبانوں کا قومی اسکول مقرر ہوا۔

شریمتی جی نے یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ اسکول کسی یونیورسٹی سے ملحق یا منظور شدہ تھا یا نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس زمانے تک اس کا یونیورسٹی سے باضابطہ کوئی تعلق پیدا نہیں ہوا تھا اور یہ آزادانہ مشرقی زبانوں کی تعلیم کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں اس اسکول کو یونیورسٹی اسٹیٹس کی حیثیت ملی اور ۱۹۷۱ء میں اسے ایک انسٹی ٹیوٹ بنا دیا گیا۔ اس کے سائنسی اور تہذیبی کردار کے تعین کے لئے ضابطے بنائے گئے اور اس کا نام یعنی مشرقی تہذیبوں اور زبانوں کا قومی ادارہ رکھا گیا۔ اس کو مختصراً INALCO (اِنل کو) بھی کہہ دیتے ہیں۔

شریمتی جی نے یہ صحیح لکھا ہے کہ گارساں دتاسی مذکورہ اسکول سے متعلق تھا لیکن یہ غلط بات ہے کہ ہندوستانی کو اردو کا مترادف خیال کیا جاتا ہے۔ خود گارساں کے خطبات اور مقالات سے یہ بات واضح ہے کہ وہ ہندوستانی میں اردو اور ہندی دونوں کو شامل کرتا ہے۔

شریمتی جی کا کہنا ہے کہ گارساں اردو کا پروفیسر تھا۔ یہ دعویٰ محتاجِ ثبوت ہے۔ کسی بھی مدرسہ یا اسکول کے استاد کو خواہ وہ کتنا ہی بڑا علامہ ہو پروفیسر نہیں کہتے۔ شریمتی جی کے زیرِ نظر مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذکورہ مدرسے میں اردو کی تدریس کا سلسلہ وقتاً فوقتاً منقطع بھی ہوتا رہا ہے چنانچہ ۱۹۳۹ء میں بھی یہ سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔

شریمتی جی نے زمانۂ حال میں اردو کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"پیرس میں یونیورسٹی سطح پر اردو اختیاری مضمون کی حیثیت

سے شامل ہے۔ اس کی تدریس مدرسہ السنہ مشرقیہ میں ہوتی ہے جہاں دوسال کا کورس ہے۔

اس ابہام کی تفصیل یہ ہے کہ پیرس کی وہ یونیورسٹی جس نے مکمہ مشرقی دفعہ ہاؤں کے قومی سکول کو اپنا انسٹی ٹیوٹ بنایا سوربون یونیورسٹی ہے اس یونیورسٹی کے تحت متعدد انسٹی ٹیوٹ ہیں۔ انھیں میں سے ایک "انل کو" بھی ہے۔

انل کو میں انٹرمیڈیٹ کی سطح سے ہندوستان ایم فل کے مساوی درجہ تک کی سندوں کا انتظام ہے لیکن ڈی لٹ کی سطح تک کی کوئی سند اس ادارے کی طرف سے نہیں دی جاتی۔

انل کو میں اردو کی تدریس کا انتظام انٹرمیڈیٹ کی سطح تک ہے جسے وہاں PREMIER CYCLE کہتے ہیں۔ بی اے کی سطح تک کی تعلیم کا بندوبست ہنوز نہیں ہے جو ان کی اصطلاح کے بموجب[1] ہے۔ البتہ اس سطح تک ہندی کی تدریس کا انتظام ہے۔

ثانوی سطح کے درجے کی تیاری کے لئے اردو میں ایک ڈپلوما دیا جاتا ہے۔ جسے مختصراً D.R.E.A بھی کہتے ہیں اسی کو ہندوستان میں آکر ناواقفوں کے سامنے ریسرچ ڈگری کی حیثیت سے پیش کر کے کوئی شخص خود کو عالم کہہ سکتا ہے لیکن اس بابت مغالطہ نہیں ہونا چاہیئے کہ یہ محض ڈپلوما ہے اور انٹرمیڈیٹ سے برتر نہیں ہے۔

شریمتی جی نے لکھا ہے کہ اپنے مقالے کے ممتحنوں کے نام اس طرح بتائے ہیں:

پروفیسر لوی رینو
" جین فلیوزا
" ہنری ماسے

ان کے زیرِ بحث مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ فلیوزا تامل کے عالم ہیں باخبر اہلِ علم نے اطلاع دی ہے کہ رینو سنسکرت کے اور ماسے عربی کے عالم ہیں۔ بہرحال ان تینوں میں سے ایک بھی اردو کے عالم نہیں ہیں۔ یہ قطعی حقائق ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شریمتی جی کے پاس اردو میں کس درجے کی اور کس نوعیت کی اردو کی سند ہو سکتی ہے اور وہ اردو میں واقعی ڈی لٹ ہیں یا نہیں۔ فقط — — —

[1] DEUXIEME سائیکل

غزل

خلیل انجم ۔ کا

اے کاش ادھر سے وہ پاکیزہ نظر جائے
ہر شاخِ شجر مہکے ہر پھول نکھر جائے

اپنے رُخِ روشن سے زُلفوں کو ہٹا لیجئے
ممکن ہے اندھیروں کی تقدیر سنور جائے

غیروں کے سہارے پر جینا کوئی جینا ہے؟
اس جینے سے بہتر ہے انسان کہ مر جائے

اے گردشِ روز و شب کل کس کو خبر کیا ہو؟
جو مجھ پہ گزرنی ہے وہ آج گزر جائے

وہ ہم ہیں محبت کی کیا بات کرے انجم
جو موت سے گھبرائے الزام سے ڈر جائے

ابوالبلاغت حضرت رتن پنڈوری

حضرت ارمان ادیبی بلاروی کی قطعہ نگاری

قطعہ بمعنی ٹکڑا بالکسر اور بسکونِ ثانی۔ مطلع کے سوا باقی غزل یا قصیدہ کا ایک حصّہ جو متفق المضمون اور کم سے کم دو شعر ہوں دو بیتوں یا اُس سے زیادہ کو جو بامطلع یا بلا مطلع مگر مضمون میں ایک دوسرے کے متعلق ہوں قطعہ کہتے ہیں۔ (فرہنگ آصفیہ صفحہ ۳۹۱)

صاحب سفیرِ سخن صفحہ ۱۰۶ پر رقم طراز ہیں کہ قطعہ اُس کو کہتے ہیں جس کے مطلع سے قافیہ منقطع ہوگیا ہو یعنی پہلے مصرع میں قافیہ ردیف کی پابندی نہیں ہوتی۔ دوسرے مصرع میں اوّل سے آخر تک ہوتی ہے۔ اشعار کی تعداد محدود نہیں۔ بحر کی خصوصیت بھی نہیں۔ مسلسل ایک مضمون کو ادا کرنے کے لئے خوب ہے۔ غزل میں پہلے قطعے بھی لکھے جاتے تھے اب کم رائج ہیں۔

مصنف نسیم البلاغت صفحہ ۱۲۶ پر لکھتے ہیں کہ قطعہ لغوی معنی کے لحاظ سے ٹکڑے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں وہ مسلسل نظم ہے جس کے ہر شعر کا مطلب دوسرے شعر پر موقوف ہو اور اُس کے مطلع میں قافیہ نہ ہو۔ بلکہ قافیہ کی بنا شعر کے دوسرے مصرع پر ہو۔ قطعے میں کم سے کم دو شعر اور زیادہ سے زیادہ سترہ شعر ہوتے ہیں لیکن بعض شعرائے اس سے بھی زیادہ اشعار کے قطعے لکھے ہیں۔

سرمایۂ بلاغت میں قطعہ کی نسبت یوں لکھا گیا ہے کہ قطعہ بکسرِ اوّل وسکونِ ثانی ہے اس کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں، حرف اوّل کے فتح کے ساتھ خطا ہے۔ مطلع میں قافیہ نہ ہو تو احسن ہے اگر قافیہ ہو تو جائز ہے۔ رُباعی کے مقررہ اوزان میں نہ ہو۔

بحرالفصاحت کا فاضل مصنف صفحہ ۱۱۲ پر یوں رقم طراز ہے کہ قطعہ بکسرِ اوّل وسکونِ ثانی اس کے لغوی معنی ٹکڑے کے ہیں۔ اصطلاح شعرا میں مراد ان چند ابیات سے کہ جن میں ایک بیت کا مطلب دوسری بیت سے متعلق ہو۔ اور بیتِ اوّل مقفّٰی نہ ہو۔ بنائے قافیہ بیتِ اوّل کے مصرع ثانی پر ہو۔ شعرا نے حد قطعہ کی دو بیت سے لیکر ایک سو ستّر شعر تک مقرر کی ہے۔ فنی کتب میں علما نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اصلی حد کوئی مقرر نہیں۔

صاحب مخزن الفوائد اس کی وجہ تسمیہ یوں لکھتے ہیں کہ

"وجہ تسمیہ اش این است کہ از مصرعہ نخستین مطلعش قافیہ منقطع شدہ والا مجوں قصیدۂ مسلسل است یا غزلِ مسلسل و باید کمتر از دو شعر نباشد و از رُباعی ممتاز می شود۔ ازیں معنی کہ در اوزانِ مقررہ رباعی نباشد" (مخزن الفوائد صفحہ ۱۵۶)

سید محمد رضا دانی جواد "علم بدیع در زبانِ فارسی" میں لکھتے ہیں کہ "قطعہ بکسرِ اوّل صحیح است و در لغت پارۂ از ہر چیز را گویند و در اصطلاح ابیات متحد در وزن و قافیہ است کہ تعدادِ آن از دو بیت کمتر نمی شود و سرتاسر قطعہ در بیانِ یک معنی مقصود و شرح یک فکر مخصوص می باشد۔ رعایتِ قافیہ در مصرعِ اوّل از مطلعِ آن لازم نیست وگاہ قافیہ داشتہ باشد" (علم بدیع در زبانِ فارسی ص ۳۱۸)

دوسری اصنافِ سخن کی طرح قطعہ کا رواج بھی فارسی کے ذریعہ اثر ہوا ہے اور قدما سے لے کر آج تک ہر شاعر نے بصورتِ قطعہ کچھ نہ کچھ کہا ہے۔ لیکن فی الحقیقت قطعہ نگاری کا عروج اُنیسویں صدی کے آخر سے شروع ہوتا ہے۔ مولانا حالیؔ۔ شبلیؔ۔ اکبر الہ آبادی۔ اسمٰعیل میرٹھی۔ آرزو لکھنوی اور اقبال نے کثرت سے قطعے کہے ہیں اور صنفِ قطعہ کو ہر قسم کے سنجیدہ اور فلسفیانہ مضامین کا متحمل بنا دیا ہے اکبر الہ آبادی نے خصوصاً اس طرف توجہ کی ہے۔ اُن کی ظریفانہ شاعری عموماً قطعہ ہی کی صورت میں ہے۔ بیسویں صدی کے شعرا نے قطعہ کو اپنانے کی خوب کوشش کی ہے۔ چنانچہ دو چار قطعے تو آج تک ہر شاعر نے کہے ہیں۔ لیکن ان میں جو حضرات ممتاز مقام پر فائز ہیں اس میں احسان دانش، سیماب اکبر آبادی۔ اختر انصاری دہلوی۔ احمد ندیم قاسمی اور حضرت ارمان ادیبی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ موخر الذکر نے دو مجموعے "ارمانِ دل" اور "آئینے" ایسے شائع کئے ہیں جو محض قطعات پر حاوی ہیں پہلے مجموعہ میں ۲۸۵ اور دوسرے میں

م ۱۲م قطعے ہیں گویا کل ۵۰۰ قطعے ہیں۔

خیالات کی بو قلمونی۔ موضوعات کی گوناگونی۔ مضامین کی رنگینی۔ مطالب کی معنی آفرینی۔ جوشِ عمل کی حرارت۔ جذبات کی صداقت موسیقیت و لفظم، شیریں بیانی و تکلم۔ روانی و سلاست۔ شعریت و لطافت۔ حلاوت و ملاحت۔ سنجیدگی و متانت۔ صحت مند انفرادیت اجتماعی حقیقت۔ عامۃ الورود ادوار کی ترجمانی۔ درد انسانی اور داستانِ قلبی کی صحیح عکاسی۔ تحلیل و تجزیۂ نفسیاتی۔ دُکھی دلوں کی غمازی۔ بے چاروں کی چارہ سازی۔ وسیع المشربی۔ رواداری۔ غم آشناؤں کی غم خواری دبے لفظوں کی غم گساری غرض کہ اس ادبی و شعری گلشن کو اس طرح گلہائے رنگا رنگ سے مزین و پیش کیا گیا ہے کہ چشمِ ناظر پُر نور اور دل مسرور ہو جاتا ہے۔ ایک طرف توحید و تصوف کے دریا بہائے جا رہے ہیں۔ ایک طرف بادۂ سرجوش کے خم کے خم لنڈھائے جا رہے ہیں۔ کہیں حُسن کی چیرہ دستیاں ہیں کہیں شباب کی سرمستیاں۔ کہیں عشق کی نیازمندی ہے کہیں محبت کی دردمندی کہیں اکبر کا طنز و مزاح ہے کہیں غالب کا فلسفۂ مرگ و حیات۔ کہیں حالی کی پند و موعظت ہے کہیں میر کا سوز و گداز۔ کہیں بے ثباتیِ عالم کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہیں راہِ عدم کی شدائد و مصائب کا ذکر ہے ایک طرف روحانیت ہے ایک طرف رومانیت۔ ایک طرف جوشِ عمل کی تلقین ہے ایک طرف رحمتِ یزدانی کا یقین۔ کہیں خودداری کا درس دیا جا رہا ہے۔ کہیں اخلاق کو بلند کیا جا رہا ہے۔ کسی جگہ انسان و انسانیت کا چرچا ہے تو کسی جگہ امدادِ باہمی و یکسانیت کی درس آموزی۔ کہیں حالاتِ زمانہ کی افتاد کا ماتم ہے کہیں دورِ حاضر کی طرزِ عمل کا غم۔ کہیں عزمِ راسخ و بلند ہمتی کی مشکل کشائی ہے تو کہیں صلح و آشتی کی درس آشنائی۔ کہیں سرمدی نغمے ہیں کہیں دُنیوی ترانے۔ کہیں صنائع بدائع کی حیرت انگیزی ہے تو کہیں ادب و انشا کا کیف بے اندازہ۔

دیکھئے ٹیکس کی مذمت کس انداز سے کی گئی ہے ؎

دُکھی جنتا پہ جب دن رات کر ہی کر برستے ہیں
تو ہم جذبۂ برداشت پہ رشک کرتے ہیں
ضرورت سے زیادہ ٹیکس جب لگتے ہیں لوگوں پر
تو خوشحالی کے منصوبوں کے گھر بیٹھ رہتے ہیں

طنز و مزاح ملاحظہ ہو ؎

نہیں جیتے زیادہ بیشتر جو نیک ہوتے ہیں
مجھے ایسے رویئے کی نہ تھی اُمید مولیٰ سے
اُسے شاید یہاں اچھائی کا بڑھنا نہیں بھاتا
جو نیک انسان کو جلدی بلا لیتا ہے دُنیا سے

دیکھئے مندرجہ ذیل قطعے میں محاکات و حقیقت کتنا لطف دکھا رہے ہیں اور کس پتے کی بات پیدا کر رہے ہیں ؎

ریلوے لائن سے ملتا ہے ثبوت اس بات کا
دُور جا کر مل نہیں جاتے ہیں متوازی خطوط
دل کو سمجھا لے بشر لیکن نظر کو کیا کرے
دُور ملتے ہی نظر آتے ہیں متوازی خطوط

طریقِ کار کی تلقین کس انوکھے انداز سے کی گئی ہے ؎

یہ سچ ہے دھوم مچ جاتی ہے پہلے ساری دُنیا میں
کسی بھی کام کا جب آدمی آغاز کرتا ہے
مگر قدرت کا اندازِ عمل برعکس ہے اس کے
چمک جاتا ہے پہلے ابر پھر آواز کرتا ہے

حبِ وطن کی اہمیت و عظمت کا اظہار ارمان صاحب کے الفاظ میں سنئے ؎

ہماری روح جنت میں مکیں ہے + زباں کا شکوہ کہیں باہر نہیں ہے
تعلق پھر بھی رکھتی ہے لحد سے + وطن کا عشق بھی کتنا حسیں ہے

حضرت ارمان نے بعض مقامات پر صنعتِ جمع کے خوبصورت حیرت خیز۔ نصیحت آمیز اور عبرت ریز نمونے دکھائے ہیں۔ دو قطعے سُنتے جائیے اور شاعر کی طبعِ روشن اور ذہنِ رسا کی داد دیجئے ؎

ہوا۔ ابر۔ پانی۔ زباں۔ حکم۔ نام
رواج۔ آنکھ۔ سکّہ۔ عصا۔ تیغ۔ جام
یہ چلتے ہیں سب جب کہ بے پَیر ہیں
نظر۔ بات۔ فیشن۔ وبا۔ سایہ۔ کام

تکنیک۔ طشت۔ تکیہ۔ تحریر۔ ساز۔ روزی
خامہ۔ دوات۔ ڈنڈا۔ زر۔ زن۔ زمیں۔ گدی
ان میں سے کوئی بھی شے دینا نہ تم کسی کو
یہ غیر پہ پہنچ کر اپنی نہیں رہے گی

ہندی شاعری میں اس قسم کے پُر لطف و پُر کیف نمونے بکثرت ملتے ہیں یہاں طوالت سے بچنے کے لئے گردھر کا ایک کنڈلیا چھند پیش کیا جاتا ہے۔ جو مندرجہ بالا قطعے کی مانند تیرہ چیزوں کو جمع کر کے خاص نصیحت کا پہلو نکالتا ہے۔ ؎

سائیں ویر نہ کیجئے گرو۔ پنڈت۔ کوی۔ یار
بیٹا۔ بنتا۔ پنوریا۔ یگیہ کراون ہار
یگیہ کراون ہار راج منتری جو ہوئی
وپر پڑوسی۔ وید۔ آپ کو تپے رسوئی
کہے گردھر کوی رائے یگن سے یہ چلی آئی
ان تیرہ سوں طرح دئیے بن آوے سائیں

رنگِ اکبر الٰہ آبادی کا نمونہ بھی دیکھتے جائیں ؎

شیخ جی کرنے لگے لندن کے اک ہوٹل میں ریسٹ
اُن کی نیچر کا ایسا اک مردِ لیڈی نے ٹیسٹ
کون سی شے تم کو لگتی ہے عجب انگلینڈ میں؟
بولے "ہم نے مرد میں دیکھا یہیں عورت کا چیسٹ"

مساوات کی درس آموزی کا انداز دیکھئے ؎

بزمِ ساقی میں جو پہلا سا قرینا ہوتا
ایک نے دوسرے سے جام نہ چھینا ہوتا
ایک پیتا ہے تو ہیں سینکڑوں محروم افسوس
بات تو جب تھی کہ ہر ہاتھ میں مینا ہوتا

مندرجہ ذیل قطعات معجز نگار شاعر کے اعلیٰ ترین تخلیقِ فن۔ معیارِ سخن۔ حسنِ شعریت اور جمالیاتی تجربات کی کامیاب نمائندگی کر رہے ہیں ؎

عیاں ہوتا نہیں بھیدِ آسمانی — کوئی کہتا نہیں اس کی کہانی
خبر کیسے ملے مُلکِ عدم کی — جوابی خط نہیں ہے زندگانی

سبحان اللہ! چوتھے مصرعے میں جوابی خط کا لفظ کتنا دقیع۔ پُر معنی۔ پُر کیف اور پُر لطف ہے۔ حقیقت نگاری اسی کا نام ہے۔ جذبِ محبت کی انتہائی صورت دیکھئے ؎

تم نے ہنس کر کر دیئے اپنے ارشاد سے باقی ہے
بن گئی بگڑی ہوئی قسمت تمہارے ہاتھ سے
بے تعلق ہو نہیں سکتا کبھی تو سے دھیان

چھُٹ نہ پاؤ گے کبھی تم بھی ہمارے ہاتھ سے

ذیل کا قطعہ پڑھئے اور مصرعۂ آخر کی حقیقت طرازی اور محاکات آفرینی پر تحسین و آفرین کے دونگڑے برسائیے ؎

کون کرتا ہے کرم ناچار پر — مہرباں ہوتے ہیں یا جب خوشنما ہے
ظالموں کے خوف کا یہ فیض ہے — پھول چھتری تانتے ہیں خار پر

دراصل ارمان صاحب نے دورِ حاضر کے مادی و غیر مادی حقائق کی پردہ کشائی اس انداز سے کی ہے کہ ایک ایک مصرعہ ان کے سماجی احساس۔ تہذیبی شعور۔ اجتماعی نظر۔ حقیقت پسندی۔ ژرف نگاہی۔ بلند آہنگی۔ نکتہ رسی۔ اور ریاضتِ شاقہ کا پتہ دے رہا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کتنا خوش قسمت ہے وہ سینہ جو گلشن ہو گیا
خوب ہے وہ دل محبت کا جو مسکن ہو گیا
آدمی کی زندگی چمکی ہے سوزِ عشق سے
شمع کی لو پہ پتنگا جل کے روشن ہو گیا

کتنا ہمہ گیر اور لاجواب ثبوت چوتھے مصرعے میں مہیا کیا گیا ہے۔ ذیل کا قطعہ ملاحظہ فرمائیں اور آخری مصرع کی حقیقت آفرینی کی داد دیں ؎

تیرے دریائے کرم پر ہی جھکا رہتا ہے دل
غیر کی جانب نہ دیکھے گا یہ دیوانہ کبھی
ابرِ نیساں بھی جو گھر آئے تو اس کے سامنے
بُلبلہ سیدھا نہیں کرتا ہے پیمانہ کبھی

یہاں "بُلبلہ" کا لفظ خاص طور پر قابلِ توجہ اور قابلِ ذکر ہے۔ یہ گلدستہ نگارنگ پھولوں کا۔ خوش رنگ۔ دل فریب۔ دلکش۔ فرحت آفریں اور سدا بہار گلدستہ اس قدر جاذبِ نظر ہے کہ اس کا سیر سے طبیعت سیر نہیں ہوتی بلکہ مضمون کی طوالت کے خوف سے یہی کہنا پڑتا ہے کہ ارمان صاحب کا اندازِ نگارش۔ تخیل کی حقائق افروزی۔ غم و نشاط۔ امید و یاس۔ شعور و لاشعور۔ انفرادیت و تنظیم۔ ماحول۔ حقیقت۔ خیر و شر۔ اور جذبہ و ادراک کے متضاد تصورات کو یکجا کر دیا ہے۔ انفرادی و اجتماعی تاثرات و محاکات کے اظہار کے لئے نئے نئے سانچے تلاش کئے ہیں اور اپنے رومانی اندازِ نظر میں سنجیدگی فکر۔ عناصر شامل کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہر حال عزیزان مطالعہ

۴۴ - کائنات۔ جاذبیت اور افادیت کو دیکھ کر راقم الحروف یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ ارمان صاحب قطعہ نگاری کے بادشاہ ہیں۔ فقط۔

چپل کی شرارت

(ڈاکٹر اڈے سرن ارمان بلاری)

" وحید برسات میں چپل پہن کر باہر مت جایا کرو" ماں نے وحید کو سکول جاتے ہوئے سمجھایا۔

"کیوں ؟" وحید نے بستہ کاندھے پہ سنبھالتے ہوئے ماں سے پوچھا

" بیٹا راستے کی کیچڑ چپلوں سے اُچھل اُچھل کر کپڑے خراب کر دیتی ہے"

" تمہاری تو یہی باتیں رہتی ہیں ماں ۔ دُنیا چپل پہن کر باہر نکلتی ہے " وحید یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل کر باہر کھڑے ہم سکول بچوں کے ساتھ سکول چلا گیا لیکن جب وہ سکول سے واپس آیا اور بستہ رکھ کر کپڑے بدلنے لگا تو ماں نے کہا " کپڑے بدلنے سے پیشتر میرے پاس آؤ ۔"

" ابھی آیا اماں جی " اُچھلتا ہوا وحید ماں کے پاس آیا اور پوچھنے لگا کیا بات ہے ماں ۔"

" تم پائجامہ بدل کر آؤ ۔"

" ابھی لیجئے ۔" وحید نے کمر بند کھولنا شروع کر دیا لیکن بارش کے باعث بھیگ جانے کی وجہ سے اسکی گرہ اس کے نرم نازک پوروں سے کھل نہیں پا رہی تھی ماں اس کی پریشانی کو تاڑ گئی اور اس نے وحید کے ازار بند کی اُلجھی ہوئی گانٹھ کھول دی تو وحید نے پائجامہ اتارا تو اس کا پچھلا حصہ دکھاتے ہوئے وحید سے کہا۔ برسات میں چپل پہن کر باہر اس لئے نہیں جاتے ہیں ۔ ہو گیا نہ تمہارا پائجامہ گندہ " وحید پائجامہ پر مٹی کی بے شمار چھینٹیں دیکھ کر جھینپ گیا اور اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے کہنے لگا " اماں جی آپ ٹھیک کہتی ہیں میں اب کبھی چپل پہن کر باہر نہیں جاؤں گا لیکن ماں ایک بات بتاؤ بہت سارے بچے سکول میں ایسے آتے ہیں جو چپل پہنے ہوتے ہیں کیا ان کے ماں باپ انھیں تمہاری طرح نہیں سمجھاتے ۔"

" ہو سکتا ہے وہ غریب ہوں ان کے پاس اور جوتے نہ ہوں یا پھر وہ بچے تمہاری طرح اپنی ماؤں کا کہنا نہیں مانتے ہوں گے ۔"

یہ سُن کر وحید کو پھر شرم سی محسوس ہوئی کیونکہ یہ بات بھی اس ... ۔ وحید ... اس کے ... وہ سوچ رہی تھی کچھ ہی لڑکے ... وحید گھر سے باہر آیا اور بولا - اماں جی ایک بات تو بتاؤ سانپ آدمی کو کاٹ لیتا ہے تو آدمی مر جاتا ہے مگر سانپ خود کیوں نہیں مرتا جب کہ وہی زہر ہر وقت اس کے منہ میں بھرا رہتا ہے ۔"

" بیٹا اگر ایک سانپ دوسرے سانپ کو ڈس لے ... "

ابھی وحید کی ماں بات پوری بھی نہ کہنے پائی تھی کہ پڑوسی رام چندر کے گھر سے غصے بھری آواز سنائی دی ۔

"نصرت کی یہ ہمت کیسے ہوئی کہ اس نے میری بہن کے پانی سے بھرے مٹکے میں پیچھے سے کنکر مارا ۔" اس کے بعد دوسرے بھائی نے کہا " ہم تو پانچ بھائی ہیں اور وہ کُل دو ہی ہیں چلو اس کی ہڈی پسلی توڑ دیں ہندوؤں کے گاؤں میں ایک مسلمان کی یہ ہمت " اس پر تیسرے بھائی نے گنّے کاٹنے والی گنڈاسی کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا چلو آج اسے اس چھیڑ خوانی کا مزہ چکھا دیں ۔"

" دونوں بھائی باہر ہیں انھیں آجانے دو جب چلیں گے پھر پتا جی بھی تو یہاں نہیں ہیں ۔ ذرا اور ٹھہر جاؤ ۔ ایک بھائی نے کہا ۔

" کیا ہم تینوں کائر ہیں جو ان کے بغیر کچھ کر ہی نہیں سکتے ۔ نصرت تو کُل دو ہی بھائی ہیں اور ہم تین ہیں اس سے اب بھی زیادہ ہیں پھر ڈر کس بات کا ۔ اگر بہن کے ساتھ اس سے بھی بڑی گھٹنا ہو جاتی تب بھی کیا ہم ان کا انتظار کرتے ۔ دوسرے نے جواب دیا ۔ ان الفاظ نے تینوں کے گال پر طمانچے کا کام کیا اور تینوں گھر سے باہر نکل پڑے ۔

" آج خیریت نہیں ہے نصرت نے بُرا کیا ہے لیکن آپ اس مصیبت کو ٹالنے کی کوشش کیجئے گا ورنہ غضب ہو جائے گا ، وحید کی ماں نے اپنے شوہر حمید سے کہا ۔ حمید نے فوراً موقع کی نزاکت کو پہچان لیا اور باہر نکل گئے ادھر اُدھر دیکھا وہ تینوں گلی میں کچھ کانا پھوسی کر رہے تھے " ارے بیٹے ما دھے کیا یہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کچھ میرے لائق خدمت ہو تو بتاؤ ۔"

" تاؤ جی سلام " تینوں نے سلام کیا ۔

" بیٹے رمیش بڑی ... کی خاص بات ہے کیا " کہتے کہتے حمید ان کے پاس پہنچ گئے تینوں کے ہاتھ میں ہتھیار دیکھے ۔ حمید نے سمجھ لیا کہ سچ مچ آج خیر نہیں ہے انھوں نے بڑی سنجیدگی اور سمجھداری سے کام

(۱) مولانا شبلی نعمانی مرحوم (۲) مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (۳) مولانا جواد علی بہاری مرحوم (۴) اکبر الہ آبادی مرحوم (۵) مولانا عبد الباری فرنگی محلی مرحوم (۶) مولانا عظمت اللہ فرنگی محلی مرحوم (۷) مولانا جمال الدین افغانی مرحوم (۸) جسٹس محمود مرحوم خلف الرشید سر سید احمد خاں مرحوم (۹) جسٹس سر شاہ محمد سلیمان مرحوم (۱۰) جسٹس سر سید عبد الرؤف مرحوم (۱۱) مولانا شاہ سلیمان پھلواری مرحوم (۱۲) مولانا تمنا پھلواروی عمادی مرحوم (۱۳) مولانا عبد الوہاب بہاری منطقی مرحوم (۱۴) مولانا عثمان صاحب فلسفی مرحوم (۱۵) مولانا احمد حسن صاحب کانپوری مرحوم (۱۶) اقبال سہیل مرحوم (۱۷) مولانا نیاز فتحپوری مرحوم (۱۸) اور حکیم اجمل خاں مرحوم۔

علامہ کیفی کا لاثانی جذبۂ ایثار و قربانی :-

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ علامہ کیفی چریاکوٹی ایک خوشحال زمیندار خاندان کے ایک فرد تھے۔ مگر انھوں نے اپنی جائیداد کا بیشتر حصہ ملک کی آزادی سے کافی پہلے غربا اور بے زمین اور بے گھر لوگوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ علامہ مرحوم کی جائیداد یوپی کے تین ضلعوں اعظم گڈھ، غازی پور اور بلیا میں تھیں جسکا بہت بڑا حصہ غربا میں تقسیم کر دیا تھا اس کے علاوہ علامہ مرحوم کی شادی بھی ایک خوشحال اور ذی علم خاندان میں موضع دریا دیال پور ضلع اعظم گڈھ میں ہوئی تھی (اور سسرال سے بھی جو جائیداد علامہ مرحوم کو ملی تھی وہ بھی انھوں نے غریبوں اور ضرورتمندوں اور پست اقوام میں تقسیم کر دی علامہ کے خسر صاحب مولانا محمد عیسٰی صاحب بھی پائے کے عالم اور درویش تھے۔ جو علامہ سے بے حد محبت کرتے تھے اور انھوں نے اپنی جائیداد کا کچھ حصہ علامہ مرحوم کو دیا تھا علامہ مرحوم کی اہلیہ بھی جو اب کافی ضعیف ہو چکی ہیں بڑے پایہ کی عالمہ ہیں جنہوں نے موضع دریا دیال پور اور اعظم گڈھ اور اٹاوہ میں متعدد مدرسے قائم کئے اور غریب بچے اور بچیوں کی تعلیم کا انتظام کیا۔

ہندوستان کے مشہور علمی ادارے جو چریاکوٹ کی علمی شمع سے روشن ہوئے :-

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سر سید احمد خاں مرحوم نے اپنے استاد مولانا عنایت رسول چریاکوٹی مرحوم (جو علامہ کیفی کے حقیقی چچا تھے) کے شاگرد تھے اور اپنے استاد کے ہی حکم اور مشورے پر انھوں نے اس مسلم ادارے کی بنیاد ڈالی اسی طرح اعظم گڈھ میں شبلی کالج اور شبلی اکیڈمی کے بانی مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے جو علامہ کیفی چریاکوٹی کے والد ماجد مولانا فاروق چریاکوٹی مرحوم کے شاگرد رشید تھے اپنے استاد کے ہی مشوروں پر شبلی کالج اور شبلی اکیڈمی قائم کی اس کے علاوہ غازی پور کے علوم عربیہ اور علوم مشرقیہ کے مشہور و معروف مرکز مدرسہ چشمۂ رحمت کے بانی علامہ کیفی چریاکوٹی مرحوم کے والد ماجد مولانا فاروق چریاکوٹی مرحوم تھے۔

علامہ کیفی چریاکوٹی کے علمی و ادبی مضامین اور غزلیں اور نظمیں ملک کے جن معیاری، مستند اور مشہور روزگار ماہ ناموں اور جرائد میں شائع ہوئیں وہ مندرجہ ذیل ہیں :-

ماہنامہ زمانہ کانپور۔ ماہنامہ معارف اعظم گڈھ۔ ماہنامہ نگار لکھنؤ۔ ماہنامہ شاعر آگرہ ۔ مولانا محمد علی جوہر کا ہمدرد دہلی۔ فاراں لاہور۔ نیرنگ خیال لاہور ۔ خیام لاہور۔ زمیندار لاہور۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڈھ ۔ مدینہ بجنور۔ ہفتہ وار۔ ہفتہ وار تیج دہلی اور مولانا ابو الکلام آزاد کا الہلال اور البلاغ وغیرہ (ختم شد)

بقیہ : باب انتقاد

مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال : مصنف آر۔ پی ترپاٹھی۔ مترجم ڈاکٹر ریاض احمد خاں شروانی۔ ناشر ترقی اردو بیورو۔ نئی دہلی ۲۲۔ ضخامت ۵۸۳ صفحات۔ کاغذ، کتابت طباعت اور گٹ اپ سب کچھ اعلیٰ۔ قیمت تیئس روپے پچاس پیسے۔ یہ کتاب بھی دفتر شان ہند سے خریدی جا سکتی ہے۔ جناب آر۔ پی ترپاٹھی کی انگریزی کتاب "رائیز اینڈ فال آف مغل ایمپائر" ایک مستند کتاب ہے۔ اور زیر نظر کتاب اسی قابل قدر اور قابل مطالعہ کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ جس کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں شائع ہوا ہے جو اصلاح شدہ ہے۔ یہ کتاب اکیس ابواب پر پھیلی ہوئی ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کیلئے یہ کتاب ایک بیش بہا تاریخی خزانہ ہے۔ عرصہ ہوا کہ شان ہند میں اس کتاب کے اولین ایڈیشن پر مفصل تبصرہ ہو چکا ہے۔

لالہ سیتارام

انجم وزیرآبادی (لاہور)

یادش بخیر لالہ سیتارام شہر وزیرآباد کے ان جوانوں میں سے ایک تھے جن کا مذہب انسانیت ہے۔ سیتارام صراف برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اور گلی صرافاں میں مقیم تھے۔ میرے محلہ دار ہی تھے۔ کوچہ صرافاں سے آگے حویلی رام سنگھ سے مڑ جائیں تو میرا گھر آجاتا ہے۔

سیتارام سے میری صاحب سلامت تھی۔ وہ میرے کلاس فیلو بھی رہ چکے ہیں۔ وہ اکہرے بدن کا ایک لمبا تڑنگا جوان تھا۔ سادہ دل بسادہ منش۔ پبلک سپرٹ۔ بلا امتیاز مذہب وملت سماج کے دل میں دوئی کا نام ونشان نہ تھا۔ یوں سمجھیے کہ وہ وزیرآباد کے سرور تونسوی تھے۔ کیونکہ دونوں کا مشن ایک ہی ہے۔ حق گوئی و بیباکی اور ہندو مسلم بھائی چارہ۔

ایک بار ساون بھادوں میں بارش اتنی زور سے ہوئی کہ گلی کوچے جل تھل ہو گئے۔ کئی ایک مکانات زمین بوس ہو گئے۔ محلہ کٹڑا میں مائی کے محل اس طوفانِ باد و باراں سے بطور خاص متاثر ہوئے اور مائی کے محل کی بالائی منزل بھی گر پڑی۔ یہ مائی نہ معلوم قارون کے خزانہ کی مالکہ تھی۔ مائی کے محل مائی کا باغ۔ نہ صرف وزیرآباد میں بلکہ حافظ آباد اور بھاولپور میں بھی مائی کے باغ موجود تھے۔ یہ مائی مہاراجہ رنجیت سنگھ شیرِ پنجاب کے عہد کی کوئی محترمہ تھی۔

مائی کا محل مسجد کے ہاتھ کر انٹے پانڈو کی طرف حویلی دیوان صاحب وہ بھی چھوٹی اینٹ سے تیار شدہ قلعہ نما تھی۔ مائی کے محل کا کچھ حصہ گرنے سے پانی کے نکاس میں خاص دشواری ہو گئی اور اسی محلے وقوع میں پانی اتنا جمع ہو گیا کہ کمر تک پہنچ گیا۔ میونسپل کمیٹی کے کان پہ جوں تک نہ رینگی۔ ڈر تھا کہ پانی دوسرے مکانوں کو بھی اپنے لپیٹ میں نہ لے لے۔ ادھر نالہ پلکھو میں بھی طغیانی آچکی تھی۔ خطرہ ممکن تھا کہ دریا کا پانی بھی شہر میں گھس آئے۔ صرف لالہ سیتارام نے یہ خطرہ محسوس کیا۔ اسی لیے کمر ہمت باندھی، ڈنگوٹا

کسا۔ اور گینتی بیلچہ لے کر اس آفت زدہ علاقہ میں کچھ پڑا ڈیکی لگا لگا کر۔ پتھر روڑے۔ کنکر ہٹا تا رہا اور پانی کے نکاس کے لیے رستہ ہموار کرتا رہا۔ وہ میدان میں کود تو سہی پڑا اس کی دیکھا دیکھی اور جوان بھی اس کے ساتھ ہو لیے۔ مگر یہ خطرہ مول لینے کا سہرا لالہ سیتارام کے سر ہی تھا۔ اور یہ اسی کا کارنامہ تھا۔

ان دنوں ابھی تک دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں برقی لیمپ موجود نہیں تھے۔ ہم کتابوں میں پڑھ رہے تھے کہ ہائیڈرو الیکٹرک سکیم مکمل ہو گی تو برقی روشنی ہر گھر کو جگمگا دے گی۔ گلی کوچوں میں لیمپ ہوتے تھے جنہیں عرف عام میں چمنی کہتے تھے۔ رات کو انہیں روشن کیا جاتا تھا۔ ان میں مٹی کا تیل جلتا تھا یہ انتظام میونسپل کمیٹی کے ذمہ تھا مٹی کے تیل کا کنٹراکٹ ایک ملکی پھلکی سی اسپرٹ اٹھائے کمیٹی کا ملازم آتا وہ ان چراغوں میں مٹی کا تیل ڈالتا اور چراغ روشن کر کے چلا جاتا آدھا تیل لیمپوں میں انڈیل دیتا اور آدھا فروخت کر دیتا جس کے نتیجہ کے طور پر لیمپ آدھی رات سے قبل ہی سرد پڑ جاتے۔ اتفاق سے رمضان شریف کا مقدس مہینہ بھی آپہنچا۔

روشنی کی کمی۔ تیل کی فروخت۔ گلی کوچوں میں تاریکی۔ یہ اندھیر نگری سیتارام سے نہ دیکھی گئی۔ حسب معمول انہوں نے اپنی گھنٹی سنبھالی۔ اور گلی کوچوں میں منادی شروع کر دی۔ ٹن ٹن ٹن سنو نگر واسیو روزہ دار اتنے سخت موسم گرما میں آرہے ہیں۔

مسلمان بھائیوں نے سحری کے لیے۔ دودھ، دہی لینے۔ بازار جانا ہے۔ گلی کوچوں کی دوکانوں کا رخ کرنا ہے اور باب کمیٹی خاموش ہیں۔

گلی کوچوں کے لیمپ ۱۲ بجے رات سے ہی گل ہو جاتے ہیں روزہ داروں کو تکلیف ہو گی۔ میونسپل کمیٹی کو چاہیئے کہ اس کا سدباب کرے اور فوراً ماہِ رمضان کے چاند طلوع ہونے سے قبل۔ یہ آواز کسی مسلمان یا کسی روزہ دار کی نہ تھی بلکہ خادم انسانیت لالہ سیتارام

گلہ ہوتے ہوتے ممبری کے دن بھی آگئے۔ الیکشن شروع ہو گئے۔ پہلی ووٹنگ لالہ سیٹھ آڑو مل چند کی تھی۔ ان دنوں وزیر آباد کی ایک روحانی ہستی سائیں اللہ بخش کی ذات تھی۔ موصوف پنجابی کے ایک اعلیٰ پایہ کے شاعر بھی تھے۔ ان کو جوگ حضرت سائیں کرم الٰہی عرف سائیں کانواں والی سرکار گجرات شریف سے ملا تھا۔ ہندو بھائی سائیں اللہ بخش کو چمٹ گئے بس سائیں بابا دعا کرو۔ آشیرواد دو۔ لالہ سیٹھ آڑو ڑ چند ہی ممبر منتخب ہو جائیں۔ ابھی ووٹنگ شروع نہیں ہوئی ووٹ بکس موجود نہیں۔ سائیں اللہ بخش نے فرمایا جاؤ۔ واہجے وجائی دیوو۔ واہجے۔ وجائی دیوو۔ خدا کی شان۔ خدا کی شان لالہ آڑو ڑ چند ہی ممبر منتخب ہو گئے۔ ہندو بھائیوں نے سائیں اللہ بخش کو کاندھوں پر اٹھا لیا اور پورے شہر کا گشت لگایا۔ بس سائیں اللہ بخش زندہ باد۔ سرکار کانواں والی زندہ باد۔ لالہ آڑو ڑ چند زندہ باد

اتفاق سے اس بار لالہ سیتارام نے بھی انتخاب میں حصہ لیا۔ اگلے ہفتے انکا الیکشن تھا۔ مگر لالہ سیتارام کا مقابلہ چیڑی اور بازکا تھا ان کا مدمقابل دیوان لالہ بدری ناتھ سیٹھ تھا۔ جاگیردار۔ کوٹھی باغ۔ باغیچہ کے مالک دھن دولت کی فراوانی اور ان کا حریف لالہ سیتارام جو صرف پبلک سیوک تھا۔ ہندو مسلم کا خادم انھوں نے بھی خیال کیا کہ قسمت آزمائیں۔ اور دیکھیں کہ دنیا والے ایک مخلص خادم کی قدر و منزلت کس حد تک کرتے ہیں

الیکشن مقررہ تاریخ پر شروع ہوا۔ سیٹھ دیوان بدری ناتھ نے چاندی بھرے توڑے کھول دیئے۔ سدا برت لگا دیا۔ دنیا والے اپنا ضمیر بیچتے رہے۔ ووٹنگ ختم ہوئی۔ اب گنتی کی باری تھی۔ اور نتیجہ کا اعلان ہونا تھا۔ لالہ سیتارام مضطرب تھے۔ جب تک نتیجہ کا اعلان نہ ہو ہر امیدوار مضطرب ہوتا ہے وہ چھڑی ہاتھ میں لئے ووٹنگ ہال کے گرد چکر کاٹ رہے تھے مگر رک گئے۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی اپنے دوست کامریڈ عبدالکریم کو آواز دی وہ احراری تھا۔ کریم بھجن کہو۔ عبدالکریم نے حکم کی تعمیل کی۔ حلقہ باندھا۔ ہمنوا ہندو نوجوان تھے۔ سیتارام کی پارٹی۔ عبدالکریم نے بھجن شروع کیا۔ پوری عقیدت سے خوش الحانی سے اور ادب و احترام سے۔

در تیرے تے آیا کرشنا پہلاں دے بار دے
در تیرے تے آیا کرشنا

آسرے تیرے تے ڈبے ڈوب دے یا تار دے
در تیرے تے آیا کرشنا بھلاں دے بار دے

مجھے یہ بھجن آج بھی یاد ہے۔ لالہ سیتارام کے الیکشن کا منظر ایک متحرک تصویر کی طرح آنکھوں کے سامنے گردش کر رہا ہے۔ الیکشن ہندو بھائی کا ہے۔ پرچار تھا مسلمان کر رہا ہے مگر یہ صرف انسانیت کی سیوا ہے۔ لالہ سیتارام زندہ باد کامریڈ عبدالکریم زندہ باد۔ جذبۂ خدمتِ انسانیت زندہ باد

غزل

زخمی حصاری

آپ اپنے میں مجھ کو کھونے دے
حسن والوں کا راز ہونے دے

اے دلِ نازِ ہر مسرت کو
بحرِ غم میں مجھے ڈبونے دے

حلف جینے کا لے چکے ہیں ہم
اب جو ہونا ہے اس کو ہونے دے

آبِ زر سے نہ اب سیاست کو
خونِ ناحق کے داغ دھونے دے

ان خزاں آشنا بہاروں میں
ہم کو بحالِ چمن پہ رونے دے

سوکھ جائے نہ یاس کا دامن
آنسوؤں سے مجھے بھگونے دے

جذبۂ شوق اور پختہ ہو
حسن کو عشق میں سمونے دے

ارضِ قلبِ بشر میں اے زخمی
بیج مجھ کو وفا کے بونے دے

دُوردرشن ہندی کوی سمیلن میری نظر میں

سرور تونسوی

سال ۱۹۸۱ء کی آمد کی خوشی میں دِلّی دُوردرشن نے یکم جنوری کی رات کے بارہ بجے ایک ہندی کوی سمیلن کا انعقاد کیا جس کے اناؤنسر کی حیثیت سے شری بال سروپ راہی نے اُردو مشاعروں کے پیشہ ور اور شوقیہ اناؤنسروں کو عملی طور پر بتایا کہ بغیر چلے دار تمہیدی کلمات اور وزراء کی خوشامدانہ تعریف کے بھی شعراء کو بہتر انداز میں مائیک پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ وزارتِ نشریات و اطلاعات کے وزیر جناب ساٹھے صاحب اور وزیرِ مملکت شریمتی کمد جوشی صاحبہ کوی سمیلن کے آخر تک تشریف فرما رہے۔ راہی صاحب نے ساٹھے صاحب سے کوی سمیلن کے افتتاح کی درخواست پُروقار انداز میں کی اور ساٹھے صاحب نے اپنی روایات کے مطابق نہایت نپے تلے الفاظ میں کوتا اور کوی کی اہمیت پہ تبصرہ فرماتے ہوئے اور سب ہندوستانیوں کو نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوئے کوی سمیلن کا افتتاح فرمایا۔ سب سے پہلے ہندی شاعری کے شہریار عالیجناب ہرونش رائے بچن کو راہی صاحب نے پورے احترام سے کلام سنانے کی زحمت دی۔ بچن جی نے پہلے تو تحت اللفظ کلام عطا فرمایا مگر بعد میں دُوردرشن کی مبارکباد سے متعلق مختصر سی کوتا اپنے روایتی ترنم میں سُنائی۔ کون ہندوستانی ہے جو بچن جی سے متعارف نہیں ہے۔ ان کی شاعری کے مجموعے جس بڑی تعداد میں شائع ہوئے ہیں، ہندوستان میں کسی دوسرے شاعر کے شائع نہیں ہوئے۔ جس وقت آپ نے اپنی کوتا میں یہ شعر پڑھا کہ میری شاعری کے بے شک دوسرے ممالک میں بھی ترجمے شائع ہوئے ہیں مگر مجھے تو اپنے گیت سُننے کا جبھی لُطف آتا ہے جبکہ اُسے کوئی دیوانہ گنگ و جمن کے کنارے پہ گا رہا ہو۔ تو سامعین نے جی بھر کر داد دی۔ بچن جی کے بعد راہی صاحب نے نئی پیڑھی کے نمائندہ کوی شری کمار شو کو کلام سُنانے کی دعوت دی ہے۔ کمار شو کی کوتا میں عربی۔ اردو۔ فارسی الفاظ کی بھرمار ہے اور اُن کا تلفظ اتنا شُستہ ہے کہ اُردو والے بھی رشک کریں۔ اگر ہندی اسے کہتے ہیں تو پھر نہ معلوم ہندی کے جنونی طرفدار اُردو کی مخالفت کیوں کرتے ہیں۔ شری کمار شو مناسب داد پانے کے بعد اپنی جگہ تشریف لے گئے تو اناؤنسر صاحب نے شری دیوراج دنیش کو نہایت موزوں انداز سے دعوتِ سخن دی ہے۔ دنیش جی کی کوتا کا عنوان ہے "گاؤں کی طرف سے شہری مترکے نام"، کوتا کیا ہے پوری ہندی شاعری اپنے عروج پر نظر آرہی ہے۔ گاؤں کی زندگی کی سادگی۔ سچائی بے غرضانہ محبت اور دیہاتی ماحول کی پاک صاف فضاؤں کا جو نقشہ دنیش جی نے بیان فرمایا ہے اس کی داد جس قدر دی جائے کم ہے اور ساتھ ہی شہری زندگی کے جُملہ دلفریب مگر پُرفریب اور چمکدار مگر کھوکھلے مناظر کو جس چابک دستی سے نظم کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ جناب ساٹھے اور محترمہ کمد جوشی صاحبہ نے دنیش صاحب کو ہر شعر پر خوب خوب داد دی ہے اور سامعین نے بھی جس فراخ دلی سے داد دی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس مرتبہ دُوردرشن والوں نے واقعی سخن فہم سامعین کو دعوت دی ہے۔ دنیش جی کے بعد جناب رامانند اوستھی مائیک پر تشریف لائے۔ اوستھی جی ہندی شعراء میں اپنا انفرادی مقام رکھتے ہیں۔ ان کے گیت اپنی ایک جُداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کا ترنم خالص شاعرانہ ہے۔ ان کی شاعری کے انداز کو اگر کوئی نقل کرنا چاہے تو نہیں کرسکتا بقول راہی صاحب کہ جیسے کوئی شخص بھیڑ میں بھی اکیلا ہو اسی طرح ان کا رنگِ شاعری بھی منفرد اور جُداگانہ ہے۔ اوستھی جی کا کلام اور ترنم دونوں تعریف کے قابل ہیں اس لئے داد تو ان کے لئے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔ کوتا کی زبان بہت ہی سادہ اور آسان ہے۔ اب راہی صاحب نے شریمتی سینہ لتا سینہ کو کلام سُنانے کی درخواست کی ہے۔ شریمتی جی پورے نسوانی وقار اور ہندوستانی ناری کی شرم و حیا کی مظہر بنی گیت گنا رہی ہیں۔ فرماتی ہیں کہ فرقہ وارانہ جھگڑوں کا بوجھ یہ دھرتی کب تک اٹھاتی رہے گی اور یہ کیسی موسمی ہوائیں ہیں کہ جو ترستے ہوئے دل کی تسلی نہیں کرسکتی ہیں۔ نیز زندگی کی تصویر جبھی خوبصورت بن سکے گی اگر ہم سب ملکر اس میں رنگ بھریں۔ تالیوں کی جھنکار میں شریمتی جی تشریف لے گئیں تو ونید مشری کو راہی جی نے کلام سُنانے کی دعوت دی ہے۔ انھوں نے پہلے ایک نظم ندی کو بھیجا ہے اور پھر ایک گیت الونسٹے من کو اداس نہیں توڑ دے

اور نہیں تو اُردو ہوسکے تو جو اُردو اشعار کہہ کر ایسی داد پائی ہے کہ دل خوش ہوگیا۔ ترنم بھی ان کا خوب ہے۔ انجمن۔ محفل۔ منزلیں۔ راستے ایسے بیسیوں الفاظ انھوں نے اپنے کلام میں استعمال کئے ہیں۔ ہندی کو کا جس تیزی سے ہندی کاشاعری کو عام فہم بنانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ہندی کی مقبولیت کے لئے ایک نیک فال ہے۔ ونید رمشر کے بعد شری لعبارت بھوشن جی نے اپنے گیت (جس دن بھی بچھڑ گیا پیارے۔ ڈھونڈتے پھر گے لاکھوں میں) کو اپنے مخصوص ترنم میں سُنا کر داد کو مالِ غنیمت کی طرح سمیٹا ہے۔ اب شری دھینے سنگھ مائیک پر آئے تو انھوں نے جو کوتا سُنائی شروع کی ہے اس کی بحر اُردو غزل کی ہے اور ترنم بھی ایسا جیسے آپ اُردو غزل سُن رہے ہوں۔ اور تو اور ان کے آخری شعر میں تخلص بھی ہے۔ سنگھ اب رہی صاحب نے مناسب گزارش کے ساتھ شری سوم ٹھاکر جی کو کوتا سنانے کے لئے مدعو فرمایا ہے۔ جنہوں نے ترنم سے کوتا سنائی ہے مگر داد مناسب حدوں سے آگے نہ پا سکے تھکاان کے بعد شری پریم شرما جی سے کلام سُنانے کا نویدن کیا گیا ہے۔ پریم شرما جی نے گنگناہٹ کے بعد خالص لوک گیت کے ترنم میں اپنا گیت سنانا شروع کیا ہے ان کا ترنم باقاعدہ شریں ہے۔ یہ بھی تالیوں کی جھنکار میں اپنی جگہ گئے تو اعلان ہوا ہے کہ اب شری رام اوتار تیاگی کلام بلاغت نظام عطا فرمائیں گے تیاگی جی نے بھی گیت سُنایا ہے جس میں طوفان کے بعد دو بہنوں کی بات چیت کا نقشہ ایسے دل خراش الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ تیاگی جی کی شاعرانہ پختگی کا لوہا ماننا ہی پڑتا ہے۔ جب آپ نے یہ مصرع پڑھا۔ ع " بحرِ طویل خوش میں جو پیاں رکھی ہیں "، تو فضا ہی دلچسپ رہی۔ اب اس کوی سمیلن کے آخری شاعر جناب اناؤنسر شری بال سروپ رہی کو کلام سُنانے کی درخواست جناب رانا سندر دستمی نے کی ہے۔ لیجئے رہی صاحب غزل ارشاد فرما رہے ہیں ؎

کوئی وعدہ کوئی قسم تو نہیں — آنکھ پھر بھی ہماری نم تو نہیں
جتنی ادھی ہیں آپ کی خوشیاں — اُتنے بیکار اپنے غم تو نہیں
جن کے حصے میں قہقہے آئے — اُن کی تقدیر میں قلم تو نہیں

داد ہے کہ ہند درشن کا آڈیٹوریم بھی اُسے یاد رکھے گا اور رہی صاحب کس قدر حقیقت بیانی فرما رہے ہیں ؎

جن کی تلوار ہے زہر ڈوبی — اُن کے بازو میں خاص دم تو نہیں

کیمرہ مین واقعی آرٹسٹ ہے جس نے سامعین کو داد دیتے دکھاتے ہوئے کیمرہ کو ایک ایسی جگہ پر مرکوز کر دیا ہے جن کی مقوی تبسم مسکراہٹ رہی صاحب کو فن کے خلاد میں خوشگوار اضافہ کر رہی ہے۔ سُنئے رہی صاحب کیا فرما رہے ہیں ؎

ظلم کو دیکھ کر رہیں خاموش — اور جھلائے وہ لوگ ہم تو نہیں
کیوں بہا جن کی آنکھ سے ہم پر — ہم کوئی سود کی رقم تو نہیں
جو بھی پایا ہے کھو کے پایا ہے — اس میں کچھ آپ کا کرم تو نہیں
مُٹھیاں کیوں ہماری کھل جائیں — ہم نے مانگا ہے جو رحم تو نہیں
زندگی کو شعور بخشیں گے — ایک اُمید ہے وہم تو نہیں
آبرو کیوں کسی کی لُٹ جائے — دیش ہے یہ کوئی حرم تو نہیں
اپنے احسان سے بھرے رکھا — یہ بھی احسان ہم پہ کم تو نہیں
جن کی منزل ہے پیار کی منزل — اُن کی راہوں میں پیچ و خم تو نہیں

اُردو شعرا کہیں گے کہ ان اشعار میں ایک آدھ فنی خامی ہے مگر اس برتری کو تو تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ ہندی شاعر کس طرح ہندی شاعری کو سنسکرت زدگی سے بچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور زیادہ سے زیادہ عام فہم زبان میں اشعار کہہ کر مقبولیت پا رہے ہیں اور ایک طرف اُردو شعراء اور ادیب ہیں جو دن دن اپنی شاعری اور تحریروں کو زیادہ سے زیادہ فارسی اور عربی زدہ بنا رہے ہیں تاکہ کم سے کم لوگ انھیں سمجھ سکیں۔ اس کے علاوہ جملہ ہندی شعرا نے وصل۔ شراب۔ مینا۔ کاکل۔ زلف۔ ساقی اور حسن و عشق کا ذکر بھولے سے بھی نہیں کیا۔ گیا اُردو شاعری میں ان الفاظ کے بغیر رونق نہیں آسکتی؟ آخر میں رہی صاحب نے محترمہ کند جوشی سے گزارش کی ہے کہ وہ کویوں کے کلام پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے اظہار رائے فرمائیں اور شکریہ ادا کرنے کا بھی فریضہ ادا فرمائیں۔ محترمہ کند جوشی نے چند مگر بامعنی الفاظ میں اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہوئے شکریہ کے ساتھ اس یادگاری محفل کے خاتمے کا اعلان فرمایا ہے۔

●●●

اپنی رقم 7 برسوں میں دگنی سے بھی زیادہ کر لیجئے

نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹ
(پانچواں اجراء) خریدیئے

دلکش سود سالانہ 10.75 فی صد مُرکب (14.93 فی صد سود مفرد) کمایئے۔
100 روپے سات برسوں میں 204.50 روپے ہو جاتے ہیں۔ سرٹیفکیٹ تین سال کے بعد بھنائے جا سکتے ہیں۔ رقم لگانے کی کوئی حد مقرر نہیں۔

دیگر فوائد

انکم ٹیکس کے مقاصد کے لئے سرٹیفکیٹ ڈاک گھروں سے مُفت جاری کئے جاتے ہیں۔
ایک لاکھ 50 ہزار روپے تک دولت ٹیکس سے چھوٹ۔ 3.000 روپے تک سالانہ سود پر انکم ٹیکس نہیں لگتا۔

مزید معلومات کے لئے

• کسی مجاز ایجنٹ • ڈسٹرکٹ سیونگ آفیسر معرفت ڈسٹرکٹ کلکٹریٹ • نزدیکی ڈاک گھر • ریجنل آفس، نیشنل سیونگز آرگنائزیشن (ریاستی یا مرکزی حکومت) سے رابطہ بنایئے۔ ییا

davp 88/111

نیشنل سیونگز آرگنائزیشن

بابِ انتقاد

(ادارہ)

آزادی کی چھاؤں میں

آزادی ملنے کے بعد انسان نے جو حیوانیت کا مظاہرہ کیا اس کی مفصل تاریخ محترمہ بیگم انیس قدوائی نے لکھی۔ ایسے حالات لکھتے وقت اکثر و بیشتر مصنف خود مذہبی تعصب کا شکار ہو گئے۔ مگر بیگم انیس قدوائی صاحبہ نے کہیں بھی یہ الزام اپنے سر نہیں آنے دیا۔ یہ کتاب کچھ سال ہوئے پہلے بھی چھپ چکی ہے۔ مگر حال ہی میں مصنفہ کے حذف و اضافہ کے ساتھ نیشنل بک ٹرسٹ نے اس کا نیا ایڈیشن اپنی روایات کے مطابق ہر لحاظ سے بہتر طور پر شائع کیا ہے یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر لائبریری میں رکھی جائے تاکہ آنے والی نسلیں پڑھ سکیں کہ آزادی ملنے کے بعد ہمارے آبا و اجداد نے کیا کچھ کیا۔ نیشنل بک ٹرسٹ اس کتاب کے تراجم دوسری زبانوں میں بھی شائع کر چکا ہے۔

بیگم انیس قدوائی نے ۱۹۴۷ء کے بعد اپنی انتھک کوششوں سے سیکولرازم کے احیاء کے لئے جو کچھ کیا یہ کتاب اس کی تاریخ ہے جسے پڑھ کر بےساختہ زبان سے نکل جاتا ہے کہ جب تک بیگم انیس قدوائی ایسی مقدس اور قابلِ احترام خواتین ہمارے ملک میں موجود ہیں انسانیت مر نہیں سکتی ۳۴۵ صفحات کی یہ کتاب $\frac{۲۲}{۱۸}$ سائز پر کتاب۔ طباعت اور کتابت کی تمام خوبیوں کے ساتھ نیشنل بک ٹرسٹ۔ انڈیا۔ ا سے ۵، گرین پارک نئی دہلی ۱۶ سے شائع کی ہے اور اس کی قیمت تیرہ روپیہ پچاس پیسے ہے۔ یہ کتاب دفتر شانِ ہند سے بھی دستیاب ہے۔

ضربِ احساس

جناب ذاکر عثمانی راویری مہاراشٹر کے جانے پہچانے شاعر ہیں مرحوم ابراحسن گنوری صاحب نے اپنی زندگی میں ہی انہیں فارغ الاصلاح قرار دے دیا تھا۔ جناب علام عشق آبادی مرحوم سے بھی انہوں نے بہت کچھ سیکھا (بذریعہ خط و کتابت) مگر افسوس کہ ذاکر عثمانی کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ مکمل شاعر، مکمل عروضی اور مکمل انسان کے ساتھ ساتھ دنیا بھر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ جب کسی شخص کو اس قسم کی غلط فہمی ہی نہیں بلکہ یقین ہو جائے تو اس کے لئے ترقی کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں لغت یہی ذاکر عثمانی راویری کے ساتھ بھی ہوا اور ان کی اس قسم کی لن ترانیوں سے خفا ہو کر حضرت علام عشق آبادی نے ان سے ترکِ تعلق کر لیا تھا۔

معائب و محاسنِ کلام سے واقف ہونا ایک فنی بات ہے۔ دیکھنا تو یہ ہوتا ہے کہ شاعر نے کیا کہا ہے۔ کون سا نیا پیغام دنیا کو دیا۔ مگر ذاکر صاحب کا مجموعۂ کلام "ضربِ احساس" پڑھنے سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ اوسط درجے کے کہنہ مشق بوجھو والے شاعر ہیں اور ان کے کلام میں جو زیادہ تر غزلیات پر مشتمل ہے چند اشعار واقعی اچھے ہیں۔ غزلیات سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے "ضربِ احساس" مطالعہ کی چیز ہے۔ ۱۳۶ صفحات کے اس مجموعہ کی قیمت سات روپیہ ہے۔ کاغذ اچھا۔ کتابت صاف اور چھپائی بہتر۔ اس مجموعہ کی اشاعت کے لئے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی نے ایک ہزار روپیہ کا مالی تعاون دیا ہے۔ ناشر: زینب بی شیخ عثمان۔ محلہ ناگ جھیری۔ راویر ضلع جلگاؤں (مہاراشٹر)

یونانی ادویہ مفردہ

یونانی ادویہ مفردہ: مصنف:۔ حکیم سید صفی الدین علی۔ ناشر:۔ ترقی اردو بورڈ۔ ویسٹ بلاک ۸، آر کے پورم۔ نئی دہلی ۱۱۰۰۲۲ سائز ترقی اردو بورڈ کا روایتی یعنی $\frac{۲۲}{۱۸}$۔ ضخامت ۴۳۶ صفحات کتابت اعلیٰ۔ کاغذ بہترین۔ چھپائی بے مثال۔ یہ کتاب دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۶ سے بھی دستیاب ہے۔ قیمت چودہ روپیہ پچاس پیسے۔ اردو ترقی بورڈ نے آج تک جتنی کتابیں شائع کی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ زیرِ نظر کتاب ان سب میں زیادہ مفید اور کارآمد ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ حکیم سید صفی الدین علی فی الحقیقت مبارکباد کے مستحق ہیں۔ جنہوں نے طبِ یونانی کے طلبا اور اس طریقِ علاج کو پسند کرنے والے عوام پر ایک احسانِ عظیم کیا ہے۔ اگر حکومت اور نام نہاد اردو اکاڈمیاں ایسی کتابوں کے مصنفین کو انعامات سے نوازیں تو کیا ہی اچھا ہو۔ اس کتاب کے مصنف واقعی خوش قسمت ہیں کہ اس قدر

خشک مگر دلچسپ موضوع پر ان کی اس تصنیف کا مسودہ ترقی اردو بورڈ کے سربراہوں نے اشاعت کے لئے منظور کر لیا۔ ورنہ عام طور پر یہ ادارہ معقول اور مفید نیز کارآمد کتابوں کی اشاعت پر مشکل سے ہی توجہ دیتا ہے۔ اکثر احباب کا کہنا ہے کہ مصنف چونکہ حکومتِ ہند کی وزارتِ صحت میں ملازم ہیں اس لئے انھوں نے اپنے اثر و رسوخ یا سفارش سے ترقی اردو بورڈ کے ناخداؤں کو مسخر کر لیا ہوگا۔ اگر ایسا نہیں تو پھر کوئی معجزہ ہی ہوا ہے جو ایسی مفید اور کارآمد کتاب ترقی اردو بورڈ نے شائع کر دی (بہت جلد ادارہ شانِ ہند کی طرف سے ابوالبلاغت حضرت رتن پنڈوری کی تصنیف "ہندوستان کے مسلمان شعراء" شائع ہو رہی ہے۔ یہ کتاب کیا ہے اس کا علم اس کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ مصنف نے ہندوستانی مسلمانوں کا سر اس سلسلے میں بھی اونچا کر دیا ہے کہ ہندی زبان کے ارتقار کے لئے بھی مسلمانوں نے اپنے ہم وطنوں کے شانہ بشانہ خدمت کی ہے مگر اس کتاب کو ہر اس ادارے نے شائع کرنے سے معذوری ظاہر کی جسے سرکاری یا نیم سرکاری طور پر عوام کا روپیہ ضائع کرنے کا اختیار ہے جبکہ اس کتاب کے سلسلے میں مصنف نے اپنی عمر کی نصف صدی اور عمر بھر کا سرمایہ برباد کر دیا) یونانی ادویہ مفردہ ایسی کتاب ہے جو ہر اس حکیم کے لئے نعمت ہے جو آیورویدک یا یونانی طریقہ علاج اختیار کئے ہوئے ہو اور یہ کتاب ایسی ہے کہ ہر گھر میں موجود رہنی چاہیئے۔ کیونکہ اس کے مطالعہ سے ہر شخص اپنے اہل و عیال کی معمولی بیماریوں کا از خود بہترین علاج کر سکتا ہے۔ اس کتاب میں مندرجہ ذیل خصوصیات قابلِ تعریف ہیں۔

۱۔ ادویہ مفردہ کی تینوں اقسام نباتی۔ حیوانی۔ اور معدنی کو الگ الگ ابواب میں بیان کیا گیا ہے۔ (۲) عام طور پر ان ادویات کا ذکر کیا گیا ہے جو آج کل مروج اور مستعمل ہیں۔ (۳) ہر دوا کے ساتھ اس کا مترادف انگریزی اور سنسکرت نام بھی دیا گیا ہے۔ (۴) ہر دوا کی توضیح ماہیت مزاج، افعال و مواقع استعمال، ترکیب، مزید تحقیقات کے لحاظ سے کی گئی ہیں۔ اور آخر میں مشہور مرکبات کے نام دیئے گئے ہیں۔

بہر کیف ترقی اردو بورڈ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اس قدر بہترین مفید اور کارآمد کتاب شائع کی ہے۔

کلیاتِ ذوق (اردو)

مرتب۔ ڈاکٹر تنویر احمد علوی اسے بھی ترقی اردو بورڈ نے اپنی تمام روایات کے ساتھ شائع کیا ہے

ضخامت ۴۹۶ صفحات اور قیمت بیس روپیہ پچاس پیسے ناشر کے علاوہ دفتر ماہنامہ شانِ ہند۔ نئی دہلی ۲ سے بھی دستیاب ہے۔

قدیم شعراء کے دواوین اوّل تو دستیاب ہی نہیں۔ اور اگر کچھ دستیاب ہیں تو اُن میں کتابت کی غلطیاں اس قدر ہوتی ہیں کہ بعض مصارع بے وزن ہو جاتے ہیں۔ اردو ترقی بورڈ نے کلیاتِ ذوق (اردو) نہایت ہی بہتر انداز میں شائع کی ہے۔ فاضل مرتب کا مقدمہ جو ۱۳۱ صفحات پر پھیلا ہوا ہے بذاتِ خود ایک مطالعہ کی چیز ہے۔ دیوانِ ذوق (طبع اوّل) مرتبہ ویران، ظہیر، الہٰ نیز دیوانِ ذوق کے ایک نایاب نسخے کے سرورق کے عکس بھی شائع کئے گئے ہیں۔ آخر میں حواشی دیئے گئے ہیں۔ یہ کلیات لائبریریوں نیز کلامِ ذوق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بیش بہا تحفہ ہے۔

دیوانِ حسرت عظیم آبادی

مرتبہ ڈاکٹر اسما سعیدی۔ ناشر ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی ۲۲

کاغذ۔ کتابت اور طباعت اور سائز ترقی اردو بورڈ کی مستند روایات کے مطابق۔ ضخامت ۴۴۱ صفحات قیمت اٹھارہ روپے۔ ناشر کے علاوہ یہ کتاب دفتر شانِ ہند نئی دہلی ۲ سے بھی مل سکتی ہے۔

جب اس کتاب پر اسما سعیدی صاحبہ کو انعام ملا تو یہی سمجھ میں آیا کہ جس طرح آج کل کی اردو اکاڈمیاں انہی کتابوں پر زیادہ تر انعامات دیتی ہیں جو ناقابلِ مطالعہ ہوں کیونکہ اکثر و بیشتر انعامات سفارشی۔ خوشہ چینوں اور مالی امداد چاہنے والوں کو لقمہ تر کے خیال سے دیئے جاتے ہیں ایسے ہی اسما سعیدی صاحبہ کو بھی انعام سے نواز دیا گیا ہوگا۔ مگر جب کتاب تبصرہ کے لئے آئی تو اس کے مطالعہ کرتے وقت سر چکرا گیا کہ ڈاکٹر اسما سعیدی ایسی دھان پان لڑکی ایسا ادبی اور علمی کارنامہ کر سکی۔ دوسری حیرانی یہ ہوئی کہ اردو ترقی بورڈ نے ایسی بہتر کتاب کیسے شائع کر دی تو گزارشِ مرتب میں یہ راز فاش ہوا کہ اس کتاب کے بارے میں مرحوم صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اچھا نظریہ رکھتے تھے جب ترقی اردو بورڈ کے چیرمین مرحوم ڈاکٹر علیم کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے اس کتاب کو ترقی اردو بورڈ کی طرف سے شائع کرنا منظور کر لیا۔ بہر کیف کچھ بھی ہو مرتب اور ناشر دونوں مبارکباد کے مستحق ہیں کہ یہ کتاب اس بہتر انداز میں اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ کی صورت میں سامنے آئی۔ ڈاکٹر اسما سعیدی نے جو محنت اس کتاب کو ترتیب دینے میں کی ہے اس کی داد نہ دینا

یقیناً ناانصافی ہے۔ یہ کتاب بھی ایسی ہے کہ اسے ہر [illegible] میں ہونا چاہیئے۔

تعلیم سماج اور کلچر

مصنف اے۔ کے۔ سی۔ اوٹاوے
مترجم اختر انصاری۔ ناشر ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی ۲۲۔ صفحات ۳۴۳۔ قیمت دس روپیہ۔ پبلشر کے علاوہ دفتر شانِ ہند سے بھی آپ یہ کتاب منگا سکتے ہیں۔ تعلیم سماج اور کلچر ایسے اہم موضوعات پر جناب اوٹاوے کی انگریزی کتاب "ایجوکیشن اینڈ سوسائٹی" کا یہ اُردو ترجمہ اُردو داں حضرات کے لئے واقعی قابلِ مطالعہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مترجم نے فارسی اور عربی کے الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور انھیں زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے ترجمہ کی عبارت کو خاصہ ادق بنا دیا ہے جس کی وجہ سے عام اُردو خواں اس کتاب سے زیادہ فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے۔ تاہم کتاب کی اہمیت اور انفرادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب کو ذیل کے نو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ تعلیمی سماجیات، اس کے تحت سماج کیا ہے؟ تعلیم کا دائرہ کار — تعلیم اور سماج کے رابطے — تعلیم کا مطالعہ بہ حیثیت ایک سماجی علم کے ضمنی عنوانات مقرر کئے گئے ہیں۔ دوسرا باب کلچر کا تصور کی حسبِ ذیل ذیلی سُرخیوں پر مشتمل ہے۔

کلچر کی تعریف۔ کلچری اوضاع اور شخصیت — وراثت کے اثرات۔ مہذب معاشرے اور تحتی ثقافتیں۔ تعلیم اور کلچر۔ تیسرے باب "سماجی قوتیں اور ثقافتی تغیر" کو حسبِ ذیل عنوانات کے تحت قلم بند کیا گیا ہے۔ طریق ہائے کار اور اقدار کا باہمی عمل اور ردِ عمل۔ سماجی طاقتوں کی نوعیت۔ سماجی ضروریات اور کلچری تغیر۔ طاقت اور ہیئت اجتماعی۔ تعلیم سماجی تغیر کے پیچھے پیچھے چلتی ہے اور چوتھا باب "انگلستان میں تعلیم کو متعین کرنے والے سماجی عناصر" حسبِ ذیل معلوماتی عنوانات کی تشریح پر مشتمل ہے۔ انگلستان انیسویں صدی کے وسط میں — سماجی طاقتیں اور ابتدائی تعلیم — پبلک اسکول اور گرامر اسکول — انگلستان، بیسویں صدی کے نصف اوّل میں سماجی طاقتیں اور ثانوی تعلیم۔ پانچواں باب "ہمارے آئندہ سماج کی تعلیمی ضروریات" کے عنوان سے ہے جس میں انگلستان بیسوی صدی کے دوسرے نصف میں — ایک وسیع البنیت سماج، ہماری جمہوریت کی بدلتی ہوئی فطرت تعلیم کا رول — پانچ ضمنی عنوانات سے سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔ چھٹا باب سماجی تعامل (SOCIAL INTERACTION) کا ترجمہ مترجم نے "سماجی تعامل" کیا ہے۔ حالانکہ تعامل جیسے بھاری بھرکم لفظ کی بجائے کوئی آسان اور بامعنی لفظ مل سکتا تھا۔ یہ باب حسبِ ذیل تین موضوعات پر پھیلا ہوا ہے۔ سماجی رول کا تصور، گھریلو زندگی کے تغیرات۔ بیرونی کلچری اثرات۔ ساتواں باب "مدرسہ ایک سماجی اکائی کی حیثیت سے" اس باب کے زیر تحت اسکولی زندگی اور جمہوریت۔ مشترک ذمہ داری۔ اسکول کی سماجی آب و ہوا۔ اختیارات کا استعمال۔ ان عنوانات میں بہت ہی کارآمد باتیں بتائی گئی ہیں۔ آٹھواں باب "انسانی کردار کی سائنس" بھی تین مزید عنوانات۔ ہم جو کچھ ہیں وہ کس طرح ہوئے؟ ہم کس طرح تبدیل ہو سکتے ہیں؟ گروہی حرکیات پر پھیلا ہوا ہے اور آخری باب "ماوراء سماجیات"، جمہوریت کے سماجی فلسفے پر چند اشارات کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ کتاب ہر [illegible] کے لئے ایک اچھے رہنما کا درجہ رکھتی ہے اور ہر باپ کے لئے اپنے بچوں کی زندگی سدھارنے کے لئے ایک نایاب نسخہ ہے۔ (بقیہ صفحہ ۲۱ پر)

بقیہ: چپل کی شرارت

اُچھل کر اس کے مٹکے پر جا لگا ہو اور یہ غلط فہمی کا شکار ہو گئی۔" یوں کہہ کر وحید سب کا منہ دیکھنے لگا جیسے کہ وہ اپنی صحیح تحقیق کی داد چاہتا ہو۔ سب لوگ مسکرائے چھمی بھی سر جھکائے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ سب لوگوں کو اب یہ اُمید دکھائی دینے لگی کہ یہ مسئلہ حل ہوا ہی چاہتا ہے۔

نصرت نے کھڑے ہو کر کہا "حمید چاچا بالکل ایسا ہی ہوا ہے اُس کی چپل سے کوئی چھوٹا سا کنکر اُچھل کر مٹکے پر جا لگا جسے یہ سمجھتی ہے کہ میں نے پھینکا ہوگا۔ یہ تو سبھی لوگ جانتے ہیں کہ چلتے وقت چپلوں کا تلوا ایڑیوں سے پٹا پٹ لگتا ہوا چلتا ہے اور چپل کی پچھلی نوک پر جو چیز آ جاتی ہے وہ غلیل کی طرح اُس کو اُوپر اُچھال کر پھینک دیتی ہے لہٰذا اس کی چپلوں کو سزا دی جانی چاہیئے جیسے اچانک اپنے کا بُرا کرتا ہے غیر نہیں اس کے چپلوں نے اس کے ساتھ شرارت کی ہے۔

میری تو پہلے بھی بہن کی طرح تھی اور آئندہ بھی بہن کی طرح رہے گی۔ اب کے سلونوں پر میں اس سے راکھی بندھواؤں گا ٹھیک ہے نا چھمی،" نصرت نے چھمی کی طرف متوجہ ہو کر کہا چھمی مسکراتی ہوئی چلی گئی اسکو اصل بات کا اندازہ ہو گیا تھا اور وہ سمجھ گئی تھی کہ نصرت بے قصور ہے۔

"رام چندر تم اس بات سے مطمئن ہو گئے یا نہیں؟" حاجی غفار حسین نے پوچھا۔

"حاجی جی صحیح بات یہی ہے کہ نصرت کی اس میں کوئی خطا نہیں ہے چپل ہی سے کوئی کنکری اُچھل ہو گی جو مٹکے میں لگ گئی ہو۔ اگر نصرت وہاں نہ ہوتا تو یہ مٹکا ہی نہ بچتا چھمی کا شک صحیح نہیں ہے۔

•••

زکی عباسی چریاکوٹی

سحبان الہند حضرت علّامہ کیفی چریاکوٹی مرحوم

(حیات اور ادبی و علمی کارنامے) قسط ۴

برصغیر ہند و پاکستان کے مشاہیر شعرائے اعصر ماہرین فن دانشور فنکار اور اہل علم حضرات جو علامہ کیفی چریاکوٹی مرحوم کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے اُن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

مندرجہ ذیل اسمائے گرامی ان مشاہیر کے ہیں جو علامہ مرحوم کے تبحر علمی اور ادبی عظمت سے کافی متاثر ہوئے اور مکتوبات میں علامہ مرحوم کا ذکر بڑی خصوصیت سے کیا ہے۔

(۱) علامہ اقبال مرحوم (۲) سیماب اکبرآبادی مرحوم (۳) سائل دہلوی مرحوم (۴) نوح ناروی مرحوم (۵) بیخود دہلوی مرحوم (۶) وحشت کلکتوی مرحوم (۷) اصغر گونڈوی مرحوم (۸) نواب عماد الملک مرحوم (۹) نواب اسحاق خاں مرحوم (۱۰) نواب حبیب الرحمن خاں شیروانی مرحوم (۱۱) صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم (۱۲) جعفر علی خاں اثر لکھنوی مرحوم (۱۳) نواب نصیر حسین خیال پٹناوی مرحوم (۱۴) آغا حشر مرحوم (۱۵) فانی بدایونی مرحوم (۱۶) ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم (۱۷) دتاتریہ کیفی دہلوی مرحوم (۱۸) آنجہانی کشن پرشاد کول (۱۹) مہاراجہ سرکشن پرشاد آنجہانی (۲۰) مولانا ناصر حسین مرحوم (۲۱) اقبال سہیل مرحوم (۲۲) مولانا اشرف علی تھانوی مرحوم (۲۳) رشید احمد صدیقی مرحوم (۲۴) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم (۲۵) نواب بھوپال حمید اللہ خاں مرحوم (۲۶) نواب صاحب بہاولپور (۲۷) حفیظ جالندھری (۲۸) مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم (۲۹) مولانا آسی غازیپوری مرحوم (۳۰) سکھ دیو پرشاد بسمل الہ آبادی آنجہانی (۳۱) مولانا نیاز فتحپوری مرحوم (۳۲) احسن مارہروی مرحوم (۳۳) رام بابو سکسینہ آنجہانی (۳۴) ڈاکٹر تارا چند آنجہانی (۳۵) عبدالوحید سیف ایمانی مرحوم سابق ایڈیٹر آزادی مشرق برلن (۳۶) حسان سہروردی مرحوم (۳۷) جسٹس سر شاہ سلیمان مرحوم (۳۸) حسن شہید سہروردی مرحوم (۳۹) اے۔ کے فضل حق مرحوم (۴۰) مہاتما گاندھی آنجہانی (۴۱) پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی (۴۲) مولانا محمد علی مرحوم (۴۳) مولانا شوکت علی مرحوم (۴۴) ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم (۴۵) مولانا آزاد مرحوم (۴۶) اعجاز صدیقی مرحوم (۴۷) پروفیسر آل احمد سرور (۴۸) سید ظہیر الدین علوی مرحوم (۴۹) ظفر علی خاں مرحوم (۵۰) بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق مرحوم (۵۱) جناب محمد شفیع صاحب چیئرمین انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کمیٹی لاہور (۵۲) شاہ معین الدین ندوی مرحوم سابق ایڈیٹر معارف اعظم گڑھ (۵۳) حسرت موہانی مرحوم۔

سیاسی اور علمی و ادبی میدان میں علامہ کیفی چریاکوٹی کے رُفقائے خصوصی:۔

(۱) حکیم اجمل خاں مرحوم (۲) ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم (۳) مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (۴) مولانا محمد علی جوہر مرحوم (۵) مولانا شوکت علی مرحوم (۶) ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو آنجہانی (۷) ڈاکٹر سید محمود مرحوم (۸) اے۔ کے فضل حق مرحوم (۹) مہاتما گاندھی آنجہانی (۱۰) سی آر داس آنجہانی (۱۱) ڈاکٹر کیلاش ناتھ کاٹجو آنجہانی (۱۲) ڈاکٹر راجندر پرشاد آنجہانی (۱۳) ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم۔ (۱۴) پنڈت موتی لال نہرو (۱۵) پنڈت جواہر لال نہرو آنجہانی (۱۶) مسٹر عبدالرحمن صدیقی مرحوم (۱۷) مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (۱۸) مسٹر آصف علی مرحوم (۱۹) رفیع احمد قدوائی مرحوم (۲۰) حافظ محمد ابراہیم مرحوم (۲۱) مسز سروجنی نائیڈو آنجہانی (۲۲) ڈاکٹر سمپورنانند آنجہانی۔

مندرجہ بالا شخصیتوں نے علامہ کیفی چریاکوٹی مرحوم کی عظمت کا ذکر اپنے مکتوبات میں بھی بڑی خصوصیت سے کیا ہے۔

علامہ کیفی چریاکوٹی مرحوم کے والد ماجد مولانا فاروق چریاکوٹی مرحوم کے مشہور ارشد تلامذہ کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں: